حدیثِ دوستاں

مؤلف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور اعظم گڈھ، یوپی

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

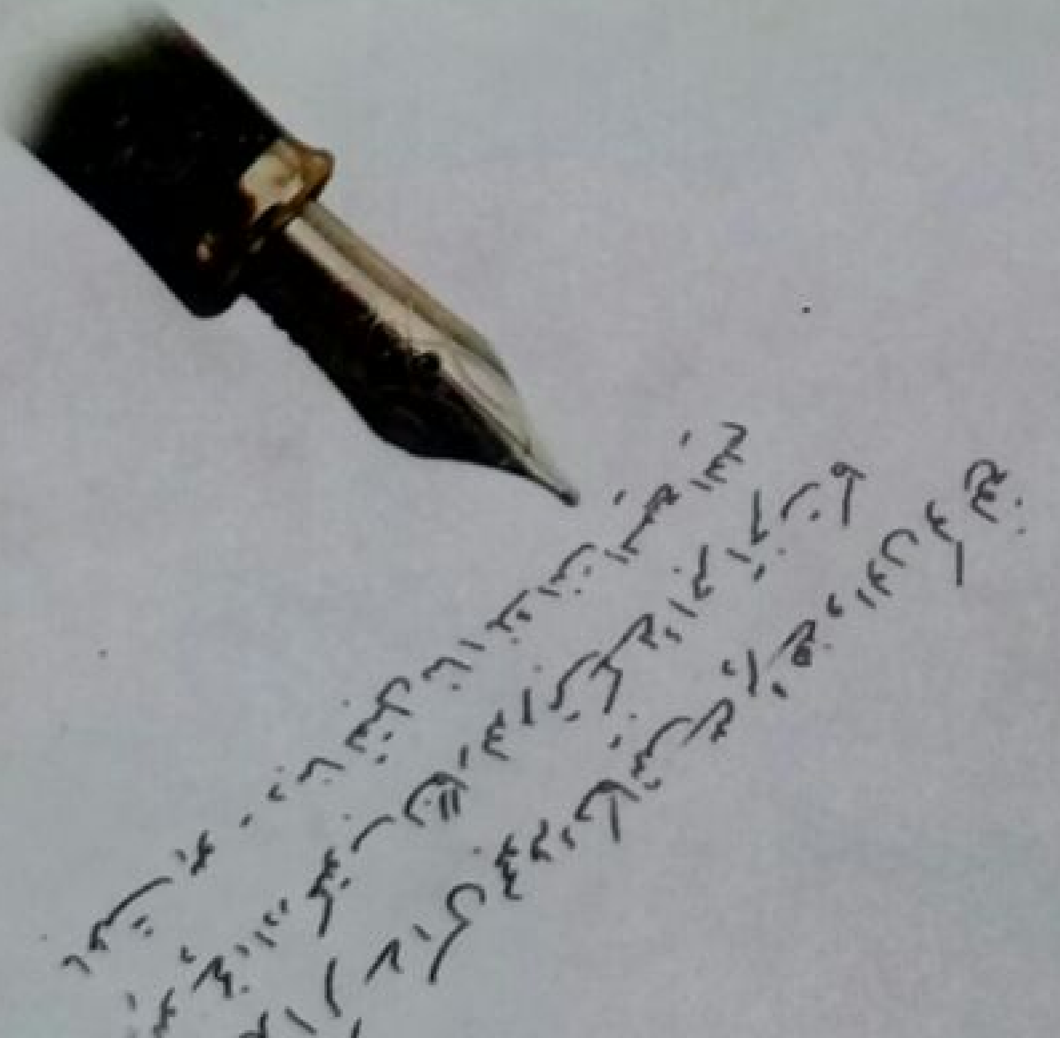

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور ضلع اعظم گڈھ یوپی

حدیثِ دوستاں

مولف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ، یوپی)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

پن کوڈ:276403 (موبائل:9235327576)

تفصیلات

نام کتاب............	حدیث دوستاں
مولف	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
مرتب	ضیاء الحق خیرآبادی
باہتمام	// // //
صفحات	730
قیمت	350/روپئے
سنہ طباعت............	فروری ۲۰۱۰ء

ای میل: zeyaulhaquekbd@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تعارف	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۹
پیش لفظ	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۱۴
تقریظ	حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی	۱۸
تاثرات	حضرت مولانا نثار احمد صاحب قاسمی	۲۱
مُقدّمۃ	حضرت مولانا قاری شبیر احمد صاحب	۲۳

☆☆☆☆☆

باب اول

﴿بزرگوں کے نام﴾

نمبر شمار	اسمائے گرامی مکتوب الیہم	صفحہ نمبر
۱	بنام حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب	۳۵
۲	بنام مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی	۶۱
۳	بنام قاری عبدالسلام صاحب مضطرؔ ہنسوری	۶۴
۴	بنام مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	۷۱

۵	بنام حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم	۷۶
☆	حضرت مہتمم صاحب کا جواب	۸۱
۶	بنام حاجی محمد ایوب صاحب مرحوم (کلکتہ)	۸۴
۷	بنام ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب	۹۴
۸	بنام مولانا عبدالمنان صاحب مظفر پوری	۱۰۰
۹	بنام والد محترم الحاج محمد شعیب صاحب کوثرؔ	۱۰۲
۱۰	بنام مولانا شمس الدین صاحب مبارکپوریؒ	۱۱۳
۱۱	بنام مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب قاسمیؒ (مالیگاؤں)	۱۲۱
۱۲	بنام مولانا حافظ قمر الدین صاحب جونپوری	۱۲۸
۱۳	بنام حاجی شمس الدین صاحبؒ (بمبئی)	۱۳۲

☆☆☆☆☆

باب دوم

دوستوں کے نام

نمبر شمار	اسمائے گرامی مکتوب الیہم	صفحہ نمبر
۱	بنام الحاج عبدالرحمٰن صاحب خیرآبادیؒ	۱۴۰
۲	بنام مولانا مفتی محمد راشد صاحب	۱۶۱
۳	بنام مولانا عبدالرب صاحب اعظمی	۱۶۷
۴	بنام مولانا ابواللیث صاحب خیرآبادی	۱۸۰

۵	بنام مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری	۱۸۵
٦	بنام مولانا ضیاء الدین صاحب خیر آبادی	۱۸۹
۷	بنام مولانا مفتی احمد الراشد صاحب	۱۹۸
۸	بنام انیس بھائی (الہ آباد)	۱۹۹
۹	بنام مولانا رضوان احمد صاحب بمہور	۲۰۵
۱۰	بنام حافظ محمد مسعود صاحب (مدینہ منورہ)	۲۱۹
۱۱	بنام مولانا انتخاب عالم صاحب (اعظم گڈھ)	۲۲۲
۱۲	بنام الحاج محفوظ الرحمٰن صاحب خیر آبادی	۲۲۷
۱۳	بنام الحاج اختر حسین صاحب (غازی پور)	۲۳۴
۱۴	بنام قاری نسیم الحق صاحب معروفی	۲۴۱

☆☆☆☆☆

باب سوم

تلامذہ اور عزیزوں کے نام

نمبر شمار	اسمائے گرامی مکتوب الیہم	صفحہ نمبر
۱	بنام مولانا رفیع الدین، مولانا منیر الدین و مولوی ولی محمد صاحبان	۲۴۴
۲	بنام مولانا وسیم احمد صاحب بنارسی	۲۵۲
۳	بنام مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب مدھوبنی	۲۹۱
۴	بنام مولانا مفتی عبد الشکور صاحب دربھنگوی	۳۰۵

۵	بنام مولانا مفتی محمد اسرائیل صاحب	۳۲۶
۶	بنام مولانا مفتی محمد انعام صاحب غازی پوری	۳۴۲
۷	بنام مولانا محمد صفی اللہ صاحب مدھوبنی	۳۵۱
۸	بنام مولانا مفتی محمد انعام الحق سیتامڑھی	۳۵۳
۹	بنام مولانا شرافت ابرار صاحب دیناجپوری	۳۵۶
۱۰	بنام مولانا مفتی سفیان احمد صاحب اعظمی	۳۶۱
۱۱	بنام مولانا مفتی منظور احمد صاحب	۳۶۵
۱۲	بنام مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی (مرتب کتاب)	۳۷۱
۱۳	بنام حافظ عبد القادر صاحب دربھنگوی	۳۹۲
۱۴	بنام مولوی عبد الرشید سمستی پوری	۴۰۸
۱۵	ایک عالم دین کے نام	۴۱۱
۱۶	بنام حاجی محمد بلال وحافظ عزیز الرحمٰن صاحبان	۴۱۴
۱۷	بنام مولانا مفتی عطاء اللہ صاحب کوپاگنجی	۴۱۹
۱۸	ایک عالم دین کے نام	۴۲۲
۱۹	بنام مولانا محبوب عالم فیض آبادی	۴۲۸
۲۰	بنام مولانا عبد اللہ خالد خیرآبادی	۴۵۳
۲۱	بنام مولانا ثناء اللہ جون پوری	۴۵۸
۲۲	بنام مولانا سراج احمد بستوی	۴۶۱
۲۳	بنام مولانا قاری عبد الستار صاحب بارہ بنکوی	۴۶۴
۲۴	بنام مولانا قمر الحسن مہراج گنجی	۴۶۸

۲۵	بنام مولانا سلمان احمد اعظمی	۴۷۰
۲۶	بنام مولانا محمد عابد اعظمی	۴۸۱
۲۷	بنام مولانا نعیم الظفر وافتخار سالک صاحبان	۴۸۶
۲۸	ایک عالم دین کے نام	۴۸۸
۲۹	ایک طالب علم کے نام	۴۹۱
۳۰	ایک طالب علم کے نام	۴۹۲
۳۱	ایک طالب علم کے نام	۴۹۶

☆☆☆☆☆

باب چہارم

علمی مباحث

نمبر شمار	اسمائے گرامی مکتوب الیہم	صفحہ نمبر
۱	بنام مولانا اختر امام عادل صاحب	۵۰۰
۲	بنام مولانا احمد سعید صاحب دربھنگوی	۵۸۴
۳	بنام مولانا مفتی نسیم احمد صاحبؒ	۵۸۹
۴	بنام مولانا مفتی عبدالرحمٰن ومولانا غلام رسول صاحبان	۶۲۸
۵	بنام مولانا گلاب حسین صاحب	۶۴۲
۶	بنام عبدالخالق صاحب مبارکپور	۶۴۶

☆☆☆☆☆

باب پنجم

متفرقات

نمبر شمار	اسمائے گرامی مکتوب الیہم	صفحہ نمبر
۱	ایک عالم دین کے نام	۶۷۶
۲	ایک عالم دین کے نام	۶۷۷
۳	ایک عالم دین کے نام	۶۸۲
۴	ایک عربی مدرسہ کے اساتذہ کے نام	۶۸۶
۵	ایک عالم دین کے نام	۶۹۶
۶	بنام راشد شاز (دہلی)	۷۰۶
۷	بنام سلمان فارسی (مالیگاؤں)	۷۱۹
۸	ایک اجلاس میں شریک نہ ہونے پر لکھا گیا مکتوب	۷۲۵
۹	ایک شاگرد کے نام	۷۲۹

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

خطوط نویسی اور مکتوب نگاری ایک قدیم صنف سخن ہے، اس کے ذریعہ پیغمبران خدا، اہل اللہ اور داعیانِ اسلام نے دعوت وتبلیغ اور دین حق کی ترویج واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ تاریخ کا قدیم ترین مطبوعہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے، جو ملکہ سبا کو لکھا گیا اور قرآن کریم کے انیسویں پارے میں سورہ نمل میں موجود ہے۔ خود جناب رسول اللہ ﷺ، خلفاء راشدین، صحابہ کرام، ائمہ دین واسلاف عظام کے سیکڑوں خطوط تاریخ وسیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس اللہ اسرارہم کے فارسی مکاتیب نے اصلاح وانقلاب میں جو اہم کردار ادا کیا وہ کسی بھی صاحب نظر پر مخفی نہیں ہے۔

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ بقول ڈاکٹر مختار الدین آرزو دو صدیوں پر محیط ہے، اس عرصہ میں بلا مبالغہ سیکڑوں مجموعۂ مکاتیب شائع ہو چکے ہیں، جنھیں بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا۔ ان میں مکاتیب شبلی، مکتوبات سلیمانی، مکتوبات شیخ الاسلام، مکاتیب حکیم الامت، مکتوبات ماجدی، غبارِ خاطر، خطوطِ ابوالکلام اور مکاتیب گیلانی وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہ مکاتیب، صاحب مکاتیب کی شخصیت وسیرت کا پرتو اور مزاج وطبیعت

کے عکاس ہوتے ہیں، جن میں مکتوب نگار بغیر کسی تکلف وتصنع کے اپنے وارداتِ قلب کو اپنے رفقاء، عزیزوں اور تلامذہ کے سامنے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ ''تصنیف وتالیف کے فکر واہتمام سے انھیں کوئی مناسبت نہیں ہوتی، نہ وہ سوچ بچار کر کے لکھے جاتے ہیں، نہ ان میں دخل عبارت آرائی کو ہوتا ہے، نہ ان پر نوبت نظر ثانی کی آتی ہے، یہ نجی خطوط سادہ زبان میں اور قلم برداشتہ لکھ دئے جاتے ہیں۔''

استاذی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ کے یہ خطوط بھی برجستہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، ان میں بیشتر ان کے تلامذہ کے نام ہیں، جن کا موضوع تعلیم وتربیت اور اصلاح نفوس ہے، جو حضرت مولانا کا خاص ذوق اور مشن ہے، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ کی اکثریت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم وتعلم اور خدمت دین میں لگی ہوئی ہے۔ حضرت کی اپنے تلامذہ ومتعلقین پر محبت وشفقت بے انتہا ہے، ان کی دینی ودنیوی صلاح وفلاح کے لئے ہمہ دم کوشاں رہتے ہیں، اور اس سلسلے میں جو کچھ مدد ہوسکتی ہے اس سے دریغ روا نہیں رکھتے، ان خطوط میں آپ جگہ جگہ اس محبت وشفقت اور ہمدردی وغمخواری کے نمونے دیکھ سکتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک مصلح ومربی کا صاف وشفاف دل ہے جو اپنے متعلقین کے لئے بے چین، مضطرب اور بے قرار رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ میرے یہ اہل تعلق کبھی جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہوں، ہمیشہ خالق ومالک سے جڑے رہے ہیں، اور اپنے مقصد حیات کو کبھی فراموش نہ کریں، اور اپنے خالق کی منشا ومرضی کے مطابق اپنی زندگی گزاریں، آپ اس میں گہرے تعلقات کی شیرینی اور محبت کی مٹھاس اور سچے مقصد کی لگن کو نمایاں طور پر محسوس کریں گے، بلکہ ان کا اصل محرک اور جوہر تو محبت ہی ہے، جو صاحب مکاتیب کی زندگی کا سب سے نمایاں عنصر ہے، اسی کا اثر ہے کہ آپ

کے تلامذہ سلسلۂ تعلیم کے اختتام کے بعد بھی آپ سے وہی ربط وتعلق رکھتے ہیں جو عہد طالب علمی میں رکھتے تھے، اور اپنی عملی زندگی میں ہر طرح کے مسائل میں رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، ان خطوط میں آپ دیکھیں گے کہ تربیت واصلاح کے ساتھ ساتھ فلسفۂ وکلام کی مشکل گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں، دعوت وتبلیغ کے موثر طریقوں کی جانب رہنمائی بھی کی گئی ہے، اشکالات واعتراضات کا تسلی بخش اور مدلل جواب بھی دیا گیا ہے، ذاتی کیفیات ومشکلات کا حل بھی بتایا گیا ہے، عصر حاضر کے فتنوں اور مدارس اسلامیہ میں پیدا شدہ حالات کے اسباب اور حل پر بھی کلام کیا گیا ہے، غرض کہ زندگی گزارنے کے رہنما اصول اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں آدمی صراط مستقیم پر گامزن رہے، اور اللہ ورسول کی محبت کا چراغ اس کے نہاں خانۂ دل میں روشن رہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ مکاتیب حضرت الاستاذ مدظلہ نے ایک مربی، سرپرست، استاذ اور دردمند بزرگ کی حیثیت سے لکھے ہیں ان کے سامنے ایک مشن ہے کہ اپنے تلامذہ ومتعلقین کے اندر خالص اسلاف کے رنگ میں دین کی خدمت کا ولولہ پیدا کریں اور انھیں بزرگان دین کے نقش قدم پر قائم رکھیں، اس کیلئے وہ نبوی اصول کو سامنے رکھ کر ذہن سازی وکردار سازی کیلئے زبان وقلم کو استعمال کر رہے ہیں۔

میں نے پہلے پہل اپنے والد مرحوم کے نام حضرت مولانا کے خطوط کو پڑھا، اس کا دل نے گہرا اثر قبول کیا، پھر آپ کی ڈائریوں میں درج اکثر خطوط میں نے پڑھ ڈالے، دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت سے مکاتبت کا سلسلہ استوار ہوا، اسی وقت سے یہ خیال دل میں تھا کہ آپ کے مکاتیب کو شائع ہونا چاہئے تاکہ دوسرے حضرات بھی ان قیمتی مضامین سے استفادہ کریں اور اس سے نفع حاصل کریں، چنانچہ ماہنامہ

ضیاء الاسلام کے نقش اول ''الاسلام'' کی ابتداء ہی سے ایک مستقل کالم ''حدیث دوستاں'' کا رکھا گیا اور اس کے تحت آپ کے مکاتیب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا، اور بیحد پسند کیا گیا۔

حضرت مولانا کے تلامذہ چونکہ آپ سے حد درجہ والہانہ تعلق رکھتے ہیں، اس لئے مجھے عام روش کے برخلاف ان خطوط کو اکٹھا کرنے میں کسی طرح کی کوئی دشواری اور مشقت سے دوچار نہیں ہونا پڑا، حضرت مولانا کے تلامذہ نے آپ کی ایک ایک تحریر کو سرمایہ گرانمایہ سمجھ کر سنبھال رکھا ہے، ایک مرتبہ طلب کرنے کے بعد انھوں نے اس کی اصل یا فوٹو اسٹیٹ میری پاس بھیج دی، اس طرح یہ مجموعہ اب منظر عام پر آرہا ہے، اس کے بیشتر خطوط ماہنامہ ضیاء الاسلام میں شائع ہو چکے ہیں، البتہ جو خطوط علمی مباحث پر مشتمل ہیں وہ پہلی مرتبہ اس مجموعہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کے لکھنے کی کل مدت چالیس سال ہے، جن میں سے بیشتر آج سے بیس سال پہلے گئے ہیں، جیسے جیسے مواصلاتی نظام کو ترقی اور عروج حاصل ہوتا گیا خطوط کا لکھنا کم ہوتا گیا، اور آج فون اور موبائل کی سہولیات نے تو اس مبارک سلسلہ کو تقریباً ختم ہی کر دیا ہے۔ اس لئے اب خطوط لکھنے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا ہے۔ تلامذہ کے علاوہ مکاتیب کی ایک معتد بہ تعداد اکابر اور رفقاء کے نام بھی ہے، کچھ ایسے لوگوں کے نام بھی خطوط ہیں جو حق کی صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں، انھوں نے حضرت کو مخاطب کیا، تو بہت وضاحت سے ان کے ساتھ دوٹوک گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب ان خطوط پر مشتمل ہے جو بزرگوں کے نام لکھے گئے، اس میں حضرت مولانا کا کمال ادب واحترام لائق ملاحظہ ہے، کہ انھوں نے کس طرح اپنے بزرگوں، اساتذہ اور اکابر کو خطاب کیا ہے۔ دوسرا

باب دوستوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب ان خطوط پر مشتمل ہے جو تلامذہ اور عزیزوں کو لکھے گئے ہیں۔ چوتھا علمی مباحث پر مشتمل ہے، یہ ان خطوط پر مشتمل ہے، جو مختلف اشکالات کے جواب میں لکھے گئے۔ پانچواں باب متفرق خطوط پر مشتمل ہے، اس میں زیادہ ایسے خطوط ہیں جن کے مکتوب الیہ کے نام بعض مصلحتوں کی بنا پر ظاہر نہیں کئے گئے ہیں، لیکن اس کے مضامین ایسے ہیں جو افادۂ عام کا پہلو لئے ہوئے ہیں اس لئے انھیں بغیر نام کے شائع کر دیا گیا ہے۔

اخیر میں حضرت اقدس مخدوم گرامی قدر مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم کا حد درجہ شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود ایک مبسوط تقریظ لکھ کر اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ فرمایا، حضرت مولانا نثار احمد صاحب قاسمی مدظلہ نے بھی اپنے کلمات بابرکات سے نواز کر ہمیں سر بلند فرمایا، ان کی تحریر بقامت کہتر بقیمت بہتر کا صحیح مصداق، اور ان کے قلبی تاثرات کی ترجمان ہے۔ حضرت مولانا کے رفیق حمیم و صدیق مخلص حضرت مولانا قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی مدظلہ نے اپنے مبسوط مقدمہ میں اپنی دیرینہ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ میرا دل ان بزرگوں اور کرم فرماؤں کے تئیں تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہے، دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ باری تعالیٰ انھیں اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے، اور اس مجموعے کو قبول عام سے نوازیں۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ
۱۶؍صفر ۱۴۳۱ھ مطابق یکم؍فروری ۲۰۱۰ء دوشنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

میں آغازِ تعلیم سے مطالعہ کا حریص ہوں، حروف شناسی جونہی سیکھی ویسے ہی مطالعہ کا سفر شروع ہوا، لیکن جس قدر میں مطالعہ کا حریص تھا لکھنے سے اتنا ہی بے نیاز تھا۔ بجز مجبوری کے کچھ نہیں لکھتا تھا۔ استاذ کا حکم ہوا، ساتھیوں نے فرمائش کی اور مجبور کیا، یا کوئی ذمہ داری سر پڑی تب تو قلم اٹھایا، ورنہ اس سے بے گانگی ہی رہی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد عربی تعلیم کے سات آٹھ سال گزرے، زیادہ تر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں، کچھ امروہہ میں، کچھ دیوبند میں! مگر مضامین تو درکنار خطوط لکھنے سے بھی دامن بچاتا رہا۔

تعلیم کے آخری برسوں میں ایک بہت ہی قابل قدر، ذہین وفطین اور عبقری شخصیت جناب حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی سے ملاقات ہوئی، تعارف ہوا اور دوستی ہوئی۔ قاری صاحب موصوف آنکھوں سے معذور ہیں، حق تعالیٰ نے آنکھوں کا نعم البدل حافظہ کی قوت اور ذہانت وذکاوت کی شکل میں عطا فرمایا! حافظہ بھی بے نظیر، اور ذہانت بھی بے مثال!

میری جب ملاقات ہوئی، تو وہ علم ومعلومات کا خزانہ دماغ میں اتار چکے تھے، اور اردو ادب وانشاء میں تو وہ دستگاہ انھیں حاصل تھی کہ کم از کم میری نظر میں ان کا

کوئی ہمسر نہ تھا، میں ان کے ساتھ لگا لپٹا رہا۔ انھیں کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ ذوقِ مطالعہ میں ہم دونوں مشترک تھے، وہ اکثر مجھ سے خطوط املا کراتے تھے، وہ خطوط کیا ہوتے؟ ادبِ عالیہ کے شہ پارے! مولانا آزاد کی کتاب ''غبارِ خاطر'' کے عکس جمیل! میں بہت متاثر ہوتا، پھر جب حالات نے مجھے امروہہ پہونچایا تو میں نے بھی انھیں کے طرز میں ان کے پاس خطوط لکھنے شروع کئے۔ یہ میری مکتوب نویسی کا آغاز تھا، یہ زمانہ ۱۹۶۹ء کا تھا! یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء تک قائم رہا۔ اس دوران انھوں نے بھی میرے نام بہت خطوط لکھے اور میں نے بھی لکھے! بہت طویل طویل، ایک سے بڑھ کر ایک ادب وانشاء کے شاہکار!

پھر جب ۱۹۷۴ء میں ہم دونوں مدرسہ دینیہ غازی پور میں اکٹھا ہوئے تو یہ سلسلہ بند ہوگیا، میں نے اپنے اور ان کے خطوط کا ایک قابل لحاظ مجموعہ اپنے مکرر مطالعہ کے لئے جمع کرلیا تھا، مگر اس کی بقا اللہ کو منظور نہ تھی، خدا جانے وہ کس کے ہاتھ لگا اور میں اسے ڈھونڈھتا ہی رہ گیا۔

مدرسی کے دور میں مجھے اپنے طالب علموں کو خطوط لکھنے کی نوبت آئی، ان کی محبت میں، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے میں نے بہت خطوط لکھے، مجھے کبھی تصور نہیں ہوا کہ یہ خطوط کبھی شائع بھی ہوسکتے ہیں اور نہ اس کا خیال ہوا کہ انھیں محفوظ کیا جائے، چند خطوط جو اہم معلوم ہوئے، انھیں میں نے اپنی کاپیوں میں نقل کرالیا۔ باقی سب کا حال یہ تھا کا لکھا اور ڈاک میں ڈال دیا، پھر جب فون اور موبائل کا عموم وشیوع ہوا تو خطوط کا سلسلہ بند ہوگیا، ۔ اب تو شاید کبھی کوئی خط لکھنے کی نوبت آتی ہو۔

میرے عزیز وحبیب مولانا حافظ ضیاء الحق سلّمہٗ کو میری تحریروں کو جمع کرنے، انھیں ترتیب دینے اور انھیں شائع کرنے کا بہت اہتمام ہے، اور آج انھیں کی کاوشوں

کی برکت ہے کہ میرے مصنف وانشاء پرداز ہونے کا گمان میرے دوستوں کو ہورہا ہے، انھوں نے اورتحریروں کے ساتھ میرے خطوط کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ میرے طالب علموں میں یہ خوبی ہے کہ فراغت کے بعد عموماً انھوں نے مجھ سے رابطہ منقطع نہیں کیا، ملتے ہیں، فون کرتے ہیں۔ عزیز موصوف نے رابطہ کرکے ان سے میرے خطوط حاصل کئے، کچھ میری کاپیوں میں تھے انھیں یکجا کیا اور ماہنامہ ضیاء الاسلام میں انھیں ''حدیث دوستاں'' کے عنوان سے مسلسل شائع کیا۔ جب ان کا ایک قابل لحاظ حصہ شائع ہوچکا تو ان مطبوعہ اور دوسرے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط کو ملا کر ایک کتاب بنانے کا انھوں نے عزم کیا۔ اس کے لئے انھوں نے بہت محنت وکاوش کی، اللہ انھیں جزائے خیر دے!

اس مجموعہ میں زیادہ تر خطوط طالب علموں کے نام ہیں، کچھ خطوط بزرگوں کے نام بھی ہیں۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں کے نام بھی متعدد خطوط لکھے ہیں۔ خاص طور سے حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی قدس سرہ، حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی نور اللہ مرقدہ، اور حضرت اقدس ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہٗ کے نام بکثرت خطوط لکھے، ان کے علاوہ اپنے ایک بوڑھے اور معمر دوست حاجی محمد ایوب صاحب کلکتہ والے کے نام بھی بہت سے خطوط لکھے، اگر یہ سب محفوظ ہوتے، تو آج انھیں شائع کرتے ہوئے مجھے مسرت ہوتی، لیکن جو کچھ ملا وہ صرف حضرت اقدس ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہٗ کے نام خطوط کا مجموعہ ملا، حضرت موصوف کے بھی بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب علیہ الرحمہ کے مکاتیب گرامی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔'' (ص:۱۶۸ تا ۱۸۲) میں شائع ہوچکے ہیں۔

جو کچھ نہیں ملا، اللہ جانے وہ کتنا ہے، جو ملا، وہ بھی میرے وہم وگمان سے بہت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائیں۔ آمین

مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ کا ارادہ ہوا کہ ہر مکتوب الیہ کا قدرے تعارف تحریر کردوں، یہ میرے لئے ایک مشکل کام تھا، اس لئے ٹلتا رہا، لیکن جب ٹالنے کی گنجائش نہ رہی، تو مجبوراً مختصر مختصر کچھ املا کراکے اور کچھ بطور خود لکھ دیا۔

یہ خطوط مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ شائع تو کررہے ہیں، اللہ جانے ان میں کتنی افادیت ہوگی، حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ پڑھنے والوں کو نفع پہونچے، اور مکتوب نگار اور مرتب کے لئے اجر آخرت کا باعث ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

اعجاز احمد اعظمی
یکم / ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ
۱۹ / نومبر ۲۰۰۹ء جمعرات

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس

فاضل گرامی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی متعنا اللہ بفیوضہ ومکارمہ کا مجموعۂ مکاتیب ’’حدیث دوستاں‘‘ کے نام سے شائع ہونے جارہا ہے۔ ان مکاتیب کا ایک بڑا حصہ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ سے شائع ہونے والے علمی ودینی ماہنامہ ضیاء الاسلام میں شائع ہو چکا ہے، ان کے علاوہ اس مجموعہ میں بہت سے غیر مطبوعہ مکاتیب بھی شامل ہیں۔ ترتیب وتبویب کی سعادت حضرت مولانا کے تلمیذ ارشد، مزاج شناس رفیق کار اور ہونہار عالم دین مولانا ضیاء الحق خیر آبادی کے حصہ میں آئی ہے جو خود بھی مطالعہ کے شوقین اور بہترین مضمون نگار ہیں، ضیاء الاسلام کی ادارت کا فریضہ بھی وہی انجام دے رہے ہیں۔ مجھے اس مجموعہ کی اشاعت کا انتظار تھا، اور اشاعت کی اطلاع ملنے سے بے حد مسرت ہوئی، ضیاء الاسلام کے شماروں میں میری نگاہیں سب سے پہلے اسی صفحہ کی تلاش میں رہتی ہیں جس پر ’’حدیث دوستاں‘‘ کا عنوانِ جلی رقم ہوتا ہے، بڑے ذوق شوق کے ساتھ ان صفحات کو پڑھتا ہوں اور اُن کے سحر میں گم ہوجاتا ہوں۔ جن دوستوں کو مولانا ان خطوط میں مخاطب بناتے ہیں ان میں اکثر مولانا کے وہ تلامذہ ومسترشدین ہوتے ہیں جو اپنے

جسم و قالب کے لحاظ سے اگر چہ مولانا سے جدا ہو چکے ہوتے ہیں مگر قلب ہمیشہ مولانا ہی سے وابستہ رہتا ہے، خواہ وہ مولانا کی خدمت سے رخصت ہو کر کسی مرکزی ادارہ میں تکمیل علوم کے مراحل طے کر رہے ہوں یا فارغ ہو کر کارگاہِ حیات میں اپنی ذمہ داریاں نباہنے سے نبرد آزما ہوں، ان کو قدم قدم پر علمی واصلاحی رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہو یا ذاتی اور گھریلو مسائل میں مشوروں کی ضرورت ہو یا کسی قسم کی ذہنی الجھن کا شکار ہوں وہ بلا تکلف اپنے مسائل مولانا کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اور مولانا پوری بشاشت اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ان مسائل کا حل فرماتے ہیں۔ خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب سراپا گوش بن کر مولانا کے سامنے بیٹھا ہے اور مولانا اپنے مخصوص انداز میں اس سے گفتگو فرما رہے ہیں، کبھی مسکرا رہے ہیں، کبھی ڈانٹ رہے ہیں اور کبھی محبت کے ساتھ دھول جما رہے ہیں، اور خط مکمل ہونے کے بعد چشم تصور یہ منظر دکھلاتی ہے کہ سائل مطمئن و مسرور ہو کر مولانا سے رخصتی مصافحہ کر رہا ہے۔

شائع شدہ خطوط کا قاری بھی خود کو اس محفل میں شریک محسوس کرتا ہے اور اس کے مسائل اور الجھنوں کا حل بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

حضرت مولانا کے خطاب میں سامعین کی محویت کا جو عالم ہوتا ہے وہی کیفیت ان کی تحریر میں قاری کے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ گفتگو بھی مدلل، مسلسل رواں دواں اور مربوط و دل نشیں ہوتی ہے، اور تحریر کی بھی وہی شان ہوتی ہے۔ مولانا اعجاز احمد صاحب کو مبدأ فیاض سے بہت کچھ عطا ہوا ہے ؂

مبدأ فیاض سے کیا کیا نہیں ان کو ملا

اپنی ذاتی صلاحیت کے ساتھ بہترین اساتذہ سے تحصیل علم کے مواقع بھی میسر آئے، اور نامور مصلحین اور اکابر کی طویل صحبت اور استفادہ کا بھی حظ وافر عطا ہوا ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص کامیاب مدرس، نامور خطیب و واعظ، پختہ کار اہل قلم اور بحر معرفت کا بہترین شناور بھی ہو، لیکن مولانا میں یہ ساری خوبیاں بیک وقت اس

طرح جلوہ فگن ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی کون سی شان دوسری شان پر غالب ہے۔

دوستوں کی اس فہرست کے ساتھ بعض اکابر اور ہم عصروں کے نام مکاتیب بھی مجموعہ میں شامل ہیں جو خاص حالات اور واقعات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، اور انتہائی متنوع اور مفید مضامین پر مشتمل ہیں۔ حدیث دوستاں کے عنوان سے بلا اختیار ذہن فارسی کے اس مشہور شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

فرق یہ ہے کہ یہاں معاملہ حدیث دیگراں کے بجائے حدیث دوستاں کا ہے۔ حضرت مولانا اپنے مخصوص قلندرانہ مزاج کی وجہ سے شاید خود ان خطوط کی اشاعت گوارا نہ فرماتے لیکن عزیز گرامی قدر حاجی بابو کی علم دوستی اور مولانا شناسی نے یہ مرحلہ بھی طے کرا دیا۔ حاجی بابو کا ہی بار بار اصرار ہوا کہ تو بھی اس کتاب کے لئے چند سطریں تحریر کر دے، بندہ اپنی کوتاہ قلمی کا عذر کرتا رہا مگر معذرت قبول نہ ہوئی اور کمزور کو دبنا ہی پڑا۔ یہ منتشر سطریں صرف نقاب کشائی کے لئے ہیں، اصل کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ؎ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

پڑھیئے اور لطف حاصل کیجئے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب شائع شدہ مجموعہ ہائے مکاتیب میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگی، قدر کے ہاتھوں لی جائے گی اور محبت کی نظروں سے پڑھی جائے گی، کہ اس کا اصل جوہر محبت ہی ہے۔ والسلام

ناکارہ ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ
جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ/ ۱۰؍جنوری ۲۰۱۰ء یکشنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاثرات

حضرت مولانا نثار احمد صاحب دامت برکاتہم

صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ بستی

جمالِ حال بود ترجمانِ استحقاق دلیلِ آب بود جگر تفتگی وتشنہ لبی

مکرم ومحترم مشفق گرامی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی **دامت برکاتہم** کی سرپرستی میں شیخوپور کے افق سے طلوع ہوکر مسلسل ضیاء بار وزرتاب رہنے والا موقر رسالہ ضیاء الاسلام ہے، خدا کرے اس کی نورانی کرنیں ہر کچے پکے مکان میں پہونچ کر دلوں کی دنیا روشن کرتی رہیں۔ آمین

اس کا ایک عنوان ’’حدیث دوستاں‘‘ نہ معلوم کتنے بے شمار دلوں کی صدا بھی ہے اور دوا بھی! یہ دراصل حضرت مولانا کے ان مکاتیب کا سلسلہ ہے جو مختلف اوقات میں بلحاظ فرق مراتب اصاغر واکابر، دوست واحباب، تلامیذ وطالبین کو لکھے گئے ہیں، خواہ کسی کی تحریر حال واستفسار کے جواب میں ہو یا ازراہِ تعلقِ خاطر خود حضرت نے اپنے ہی وارداتِ قلب کو مقتضائے حال دیکھ کر سپردِ قلم کیا ہو، بہر حال یہ ایک خزانہ ہے جس کی بہتوں کو ضرورت تھی، ایسا مطب ہے جس میں ہر بیمار دل کی شفا ہے۔ مکتوب

نگار صاحبِ اعجاز مسیحا ہیں، مکتوب الیہم کے احوال وکوائف واردات انگیز ہیں،

از دل خیزد بر دل ریزد

والا معاملہ ہے۔ تاثیر وتاثر کے اس قدرتی ماحول سے پڑھنے والا بھی محروم نہیں رہ سکتا، اور شخصیات کی وفیات پر جو مکاتیب ہیں وہ اپنا جواب آپ ہیں، مکتوب کیا ہے، قرآن ہے، حدیث ہے، فقہ وفتاویٰ ہیں، حکمت وموعظت ہے، شریعت وطریقت ہے، خواب وبیداری، موت وحیات، کامیاب وناکام زندگی، ہر ایک کی حقیقت واضح کردی ہے۔

رب کریم بے حد جزائے خیر عطا کرے مدیر ماہنامہ مولانا ضیاء الحق خیرآبادی کو کہ ان مکاتیب کو کتابی شکل دے کر ایک مخفی خزانہ کو شارع عام پر لاکر ہر بنی نوع ظلوم وجہول کے لئے عام کرنے کا عزم کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کتاب کو نافع عام وقبول دوام عطا کرے۔ آمین یارب العالمین

نثار احمد قاسمی
جامعہ اسلامیہ، بستی
۱۰؍صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۶؍جنوری ۲۰۱۰ء
سہ شنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَہ

حضرت مولانا قاری شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم

ناظم مدرسہ اسلامیہ، شکرپور، بھروارہ، ضلع دربھنگہ

عرف عام میں جسے خطوط نویسی اور مکتوب نگاری کہا جاتا ہے، فی الحقیقت وہ ایک طرح کی ملاقات اور آپسی گفتگو کا دوسرا نام ہے۔ بیانِ مدعا کی یہ صنف اور کہہ لیجئے کہ اظہارِ خیال کی یہ صورت اپنے اندر بڑے فوائد اور غیر معمولی منفعت رکھتی ہے، بعضے مرتبہ ایک مقرر اور خطیب اپنے مخاطب کو جن حقائق سے روشناس نہیں کرا پاتا، یا یوں کہہ لیجئے کہ جن مسائل کی تفہیم وتشریح اس کے لئے آسان نہیں ہوتی، ایک مکتوب نگار بآسانی مکتوب الیہ کو وہ سب کچھ خط کے دو ایک صفحات میں وضاحت سے سمجھا دیتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات اور پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے ہم کسی قابل ذکر شخصیت اور ممتاز صاحب علم ہستی کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ سوالات حل ہوسکیں اور مسائل کی گتھی سلجھ سکے، لیکن اظہار مافی الضمیر کرتے وقت کبھی زبان لڑکھڑاتی ہے اور کبھی پست ہمتی سدِ راہ بن جاتی ہے، دراصل یہ اس شخصیت کا رعب ہوتا ہے جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں، جبکہ خطوط کے واسطے سے مشکل سوالات اور حل طلب مسائل کو ہم پوری وضاحت اور خوش اُسلوبی سے بیان

کر دینے پر قادر ہوتے ہیں، شعر کے مصرع اول میں تصرف کے لئے شاعر سے معذرت خواہ ہوں۔

زبانِ خامہ تُو ہی ان سے میرا مدعا کہہ دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

کسی اچھے مکتوب نویس کا روئے سخن جب اپنے بزرگوں، عزیزوں، رفیقوں یا دیگر متعلقین کی جانب ہوتا ہے تو بُعدِ منزل کے باوجود وہ انھیں خود سے قریب پاتا ہے، مگر یہ نزدیکی بقدرِ تعلق ہوتی ہے، تعلق جس قدر خلوص ومحبت پر مبنی ہوگا، نزدیکی اسی قدر بڑھتی چلی جائے گی۔ ایسا نہیں ہوتا کہ خطوط نویس کی بزم صرف لفظ وبیان اور قرطاس وقلم کی بدولت بارونق ہوجاتی ہے، بلکہ اس کے تصور وتخیل کی مقناطیسی کشش بالآخر مخاطب کو بھی انجمن میں کھینچ لاتی ہے، بظاہر مکتوب الیہ یقیناً شریک بزم نہیں ہوتا، بایں ہمہ سیکڑوں بلکہ بعض مرتبہ ہزاروں میل کی دوری کے باوجود وہ اس انجمن سے علیٰحدہ بھی نہیں ہوتا، لکھنے والا اپنی چشم تصور سے مخاطب کو دیکھتا ہے اور بے تکلف اس سے ہم کلام ہوتا ہے، زبانِ دہن سے نہ سہی زبانِ قلم سے وہ اپنے تمام احساسات وواردات اور احوال وواقعات کبھی اجمال واختصار سے اور کبھی بسط وتفصیل سے بیان کرجاتا ہے۔

نہ پوچھ فکر وتخیل کی کارفرمائی　　　یہیں ہیں جیسے وہ مصروفِ جلوہ آرائی

خطوط نویسی کا آغاز کب اور کہاں ہوا، دنیا کے کس خطے میں پہلی بار اس کی افادیت واہمیت محسوس کی گئی، اور کن لوگوں کے ہاتھوں زبان وادب کی اس صنف کی یا یوں کہہ لیجئے کہ اس فن کو عروج وترقی حاصل ہوئی؟ تاریخ سے ان سوالوں کا جواب معلوم کرنا کچھ آسان نہیں، پھر مجھ جیسے بے بضاعت اور کم علم شخص کے لئے تو یہ کام اور بھی دشوار ہے۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق سب سے قدیم ترین خط جس کا سراغ

قرآن حکیم کے واسطے سے ملتا ہے، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے، یہ خط ملکہ سبا بلقیس کو ان کی جانب سے بھیجا گیا تھا، نامہ بری ہدہد نامی پرندے کے حصے میں آئی، اور اس طرح بآسانی ملکہ سبا تک پیغمبر خدا کا یہ مکتوب پہونچ گیا۔ خط مختصر ہونے کے باوجود نیاہت جامع، دوٹوک اور واضح ہے۔ غرض بلاغت کی تمام خوبیاں اس خط میں موجود ہیں۔ ''إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ '' خط حضرت سلیمان کی جانب سے ہے اور خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ میرے مقابلے میں غرور وسرکشی نہ کرو، اور مطیع وفرمانبردار بن کر حاضر ہوجاؤ۔ چنانچہ ملکہ حاضر ہوگئی۔ یہاں یہ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک طرف اللہ کے جلیل القدر پیمبر ہیں تو دوسری طرف وقت کے عظیم المرتبت حکمراں اور فرمانروا بھی۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اپنے خالق ومالک کی اطاعت گذار اور فرمانبردار بن کر آؤ، یا پھر حاکم وبادشاہ ہونے کی حیثیت سے میری اطاعت وماتحتی قبول کرو۔

تبلیغی ودعوتی مکاتیب کے سب سے زیادہ تابناک اور دلکش نمونے نبی آخر الزماں محمد عربی ﷺ کی سیرت واحادیث کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خطوط اس قدر بیش قیمت اور گراں قدر ہیں کہ بڑی سے بڑی حکومت وسلطنت بھی ان کی قیمت لگانے سے قاصر ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اسلوبِ بیان کی ندرت اور حقائق ومعانی کی وسعت غرض ہر پہلو اور ہر جہت سے یہ جواہر پارے اپنی مثال آپ ہیں، ان خطوط میں نہ اتنا اجمال واختصار ہے کہ کسی بات کا سمجھنا دشوار ہو اور نہ اس قدر بسط وتفصیل کہ خدانخواستہ طوالت کا گمان ہو، بہ الفاظ دیگر ان میں فصاحت وبلاغت کی جو شان ہے وہ کسی ادیب، کسی مصنف اور کسی انشاپرداز کے یہاں ہمیں نہیں مل سکتی۔ اس

مختصر تحریر میں علم وادب کے ان جواہر پاروں پر میرے لئے کچھ اور کہنا بیحد دشوار ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے
ورق تمام ہوئے اور مدح باقی ہے

مدینہ منورہ کے دس سالہ عہد میں روم وایران کے فرمانرواؤں اوران کے زیر اثر چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے سلاطین کے نام یہ خطوط بھیجے گئے تھے، عام لوگوں کی سہولت اور استفادے کی خاطر علماء ومحدثین نے یکجا کتابی صورت میں بھی انھیں مرتب کردیا ہے، دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کے میدانوں میں کام کرنے والے حضرات کے لئے اس مجموعۂ مکاتیب کا مطالعہ بے حد نفع بخش اور کارآمد ہے۔

آپ ﷺ کے خطوط کے بعد خلفاء راشدین کے مکتوبات میں اصحاب علم ونظر کو حقائق ومعارف اور بصیرت وآگہی کا سب سے زیادہ سامان مل سکتا ہے، یہ خطوط زیادہ تر اسلامی ریاست کے گورنروں، قضاۃ اور فوجی افسروں کے نام ہیں، انھیں خطوط کہنے کے بجائے نامہ ہائے ہدایت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خلافت راشدہ کے بعد ائمہ اور محدثین نے اپنے زمانے کے علماء، محققین اور سلاطین کے نام جو خطوط لکھے ہیں ا، ان کے مجموعے اس اہتمام سے مرتب نہیں ہوسکے جن کے وہ مستحق تھے، تاہم خال خال ہمیں اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔

علوم وفنون کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب وانشاء اور خطوط نگاری کے فن کو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جسے سلجوقیوں، سامانیوں اور غزنیوں کا عہد حکومت کہنا چاہئے بے انتہا ترقی ہوئی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان بادشاہوں کی مادری زبان فارسی تھی، جبکہ دفتری کاموں کے لئے عربی زبان رائج تھی، انھیں ایسے لائق مترجمین اور کامیاب انشاء پردازوں کی ضرورت تھی جو سرکاری خطوط اور شاہی فرامین کو ایک زبان سے دوسری زبان میں کمالِ احتیاط ودلکشی سے منتقل کرسکیں، اس ضرورت نے

ادب وانشاء اور خطوط نویسی کے فن کو غیر معمولی عروج وترقی سے ہمکنار کردیا اور جگہ جگہ مترجمین اور کامیاب منشیوں کے حلقے وجود میں آنے لگے، کچھ لوگوں نے کتابت وانشاء سے تعلق رکھنے والے افراد واشخاص کی تربیت ورہنمائی کے لئے چھوٹی بڑی کتابیں تالیف کرنی شروع کردیں، اور اس طرح بیک وقت دونوں گلشن علم وادب میں گویا ہمہ جہت بہار آگئی۔ خیر یہ تو بادشاہوں اور سلاطین کے زیر اثر پروان چڑھنے والے انشا پردازوں اور مکتوب نگاروں کا ذکر تھا۔

چوتھی صدی کے اواخر یا پانچویں صدی کے اوائل میں صوفیاء، مشائخ اور مصلحین کے طبقے پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہماری نگاہ امام غزالی کے خطوط کے مجموعے پر جاکر ٹھہر جاتی ہے۔ راہِ سلوک کے مسافروں اور طالبانِ حقیقت کے لئے یہ مجموعہ مشعلِ راہ اور رفیق سفر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی ایک ایک سطر سے امام صاحب کی ژرف نگاہی اور بے انتہا علم وآگہی کا اظہار ہوتا ہے۔

برصغیر ہندوپاک میں جن علماء، مشائخ اور صوفیاء محققین کے ملفوظات ومکاتیب کو غیر معمولی مقبولیت وپذیرائی حاصل ہوئی، ان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ سرفہرست ہیں۔

ترکستان سے برصغیر تک اور کابل سے برما تک کوئی صوبہ، کوئی شہر اور کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں ان حضرات کے خطوط احترام وعقیدت کے ہاتھوں نہ لئے جاتے ہوں اور محبت وعظمت کے ساتھ انھیں پڑھا نہ جاتا ہو، جن خوش نصیبوں کو براہ راست ان حضرات کی صحبت ومعیت میسر آگئی ان کی فیروز مندیوں کا تو پوچھنا ہی کیا، رہے وہ اصحاب جنھوں نے ان کی کتابوں اور مکتوبات سے استفادہ کیا اور فیضیاب ہوئے،

انھیں بھی راہِ سلوک وتصوف کے عام مسافروں پر خاصی فضیلت وبرتری حاصل ہے۔ یہ محض خطوط نہیں بلکہ راہِ طریقت کے راہ نوردوں کیلئے چراغِ راہ اور زادِ سفر ہیں، خدا جانے ان ابر پاروں کی بدولت کتنے ویرانے سبزہ زار بن گئے، کہاں کہاں اجڑے ہوئے گلشنوں میں بہار آ گئی اور کس قدر مردہ قلوب میں زندگی پیدا ہوگئی۔ اخلاق وعادات سنور گئے اور عقائد واعمال کی اصلاح ہوگئی۔

زہد وقناعت، توکل واستغناء، تسلیم ورضا کی خو، خدمت خلق کا جذبہ، فکر آخرت، محبت الٰہی اور اتباع سنت وشریعت کا شوق، جو بندۂ مومن کی لازمی صفات ہیں، فی الاصل متبعین سنت وشریعت کی صحبت سے ہی پیدا ہوسکتے ہیں، یا پھر ان کی کتابوں سے۔ نرے محققین ومصنفین کی تصنیفات وتحریرات سے علم وآگہی میں وسعت تو پیدا ہوسکتی ہے مگر عمل کا داعیہ بھی پیدا ہوجائے بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اصحاب معرفت اور علماء آخرت کے ان بیش بہا تالیفات اور مواعظ ومکتوبات سے میں اپنی کوتاہمتی کے باعث میں خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکا، لیکن میرے حلقۂ احباب میں بعض حضرات ایسے ہیں جنھوں نے اکابر کی کتابوں سے علمی وعملی ہر دولحاظ سے بڑے منافع حاصل کئے، بطور خاص میرے نہایت قریبی اور دیرینہ رفیق حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی اور احباب کے مقابلے میں اس چشمۂ صافی سے کہیں زیادہ سیراب اور بے انتہاء فیضیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کے مزاج ومذاق اور کردار وگفتار میں ہمیں بزرگانِ سلف کی زندگی کی جھلک ملتی ہے ؎

میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان سے پہلی بار میری ملاقات قیام دیوبند کے زمانے میں ہوئی تھی۔ ان دنوں دارالعلوم کی دینی وعلمی فضا مخصوص طرح کی شورش اور ہنگامہ آرائیوں سے مکدر تھی، ماحول میں ہر طرف وقار وسنجیدگی کا ایک طرح سے قحط تھا۔ ان ہی ایام میں ایک روز مولانا ابرار احمد صاحب (امام جامع مسجد دربھنگہ) کے کمرے میں مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی سے ملاقات ہوئی، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اثناء گفتگو میں مَیں نے عرض کیا کہ مولانا! دیوبند کا سفر ہم نے حصولِ علم کی خاطر کیا تھا، علم کے ساتھ ہماری ایک اور غرض اپنی تربیت واصلاح بھی تھی، مگر نہیں معلوم کیوں ہم یہاں پہونچ کر انتظامیہ کی اصلاح کے درپے ہوگئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا قافلہ جادۂ مستقیم سے بھٹک گیا ہے اور منزل بتدریج ہم سے دور ہوتی جارہی ہے، مجھے انتہائی مسرت ہوئی کہ موصوف نے میری معروضات خندہ پیشانی سے سنی اور بحث وگفتگو کے بجائے میرے خیالات سے موافقت فرمائی۔ میں اس صاف گوئی اور وسعت ذہنی سے بے حد متاثر ہوا، اور ان کی قدر ومنزلت میری نگاہوں میں روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ وہ جب تک دیوبند میں رہے شاید کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس میں دو ایک بار ہماری ملاقات نہ ہوئی ہو، دیوبند سے واپسی کے بعد مولانا جہاں بھی گئے اور جس حال میں بھی رہے بذریعۂ خطوط اس عاجز کی خبر گیری فرماتے رہے، خود میں نے بھی اپنی طبعی کسلمندی اور کوتاہ قلمی کے باوجود انھیں عریضہ ارسال کرنے میں تاخیر اور لیت ولعل سے کام نہیں لیا۔ موصوف کا اندازِ تخاطب اور طرزِ تحریر جس کی حلاوت وشیرینی سے عرصہ ہائے دراز تک لطف اندوز ہوتا رہا ہوں، آج بھی جب اس کی جانب ذہن جاتا ہے تو طبیعت میں ایک طرح کا نشاط وانبساط پیدا ہوجاتا ہے۔

ان خطوط میں خلوص تھا، محبت بے ریا تھی، شفقتوں کی عطر بیزی تھی، شرافت

نفس کا والہانہ اظہار تھا، علم پروری تھی، زبان وادب کے چٹخارے تھے، اوران سب سے بڑھ کر تعلق خاطر کی بیکراں نکہت وخوشبو تھی، جس سے مشامِ جاں معطر ہوجاتا تھا۔ بعض مسائل ومباحث کے پیچ وخم میں الجھ کر ذہنی وفکری اعتبار سے میں جس مقام پر جاچکا تھا، اس دوران موصوف کی شفقت ومحبت میری شریک حال نہ ہوتی تو خدا نخواستہ اس سے میری واپسی دشوار ہی نہیں دشوار تر تھی۔ یہاں پہونچ کر اپنے زمانے کے روحانی پیشوا، علم حدیث کے شناور، مظاہر علوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی شفقت وعنایت کا ذکر نہ کروں تو بڑی ناسپاسی ہوگی۔ عہد طالب علمی میں، ایک عرصہ تک میں مسئلۂ جبر واختیار اور فلسفۂ خیر وشر کی گتھیاں سلجھانے میں اپنی ذہنی توانائی اور زندگی کے قیمتی لمحات ضائع کرتا رہا، مگر اس ڈور کو عقل کی راہ سے سلجھانے کی میں نے جتنی جتنی کوشش کی، اسی قدر الجھتی چلی گئی۔ بالآخر بعض حضرات کے مشورے سے میں نے انھیں ایک مفصل عریضہ لکھ کر بھیجا، جس کا جواب مجھے چند ہی روز کے بعد دستیاب ہوگیا۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اس مختصر سے مکتوب میں ناچیز کو چند نصیحتیں فرمائی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ میں تمہارے لئے مخصوص اوقات میں دعاء کروں گا۔ چنانچہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد قلب میں اطمینان ویقین کی وہ خنکی محسوس ہونے لگی، جس نے شک وارتیاب کے اس کوچے میں بھٹکنے سے ہمیشہ کے لئے مجھے محفوظ کردیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب ودرجات بلند فرمائے۔

موصوف کی تحریک پر جب میں مغربی یوپی سے مدرسہ دینیہ غازی پور آیا تو ان کے خطوط کا یہ گلدستہ میرے ہمراہ تھا، اپنے لاابالی پن کے مدنظر بغرضِ حفاظت یہ خطوط مولانا کے حوالے کردئے، لیکن کسی وجہ سے یہ سرمایۂ علم وادب خود ان کے پاس بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر یہ محبت نامے ضائع نہ ہوتے تو اسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل

ہو کر یقیناً شائع ہو جاتے۔

مدرسہ دینیہ غازی پور میں ہم دونوں ایک عرصہ تک ساتھ ساتھ رہے، کم وبیش یہ زمانہ چھ برسوں پر محیط ہے، اس مدت میں موصوف کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ، اور یہ محسوس کیا کہ پہلے کے مقابلہ میں اب ان کی زندگی کے لیل ونہار یکسر بدل چکے ہیں، ظرافت وشوخی کی جگہ متانت وسنجیدگی نے لے لی ہے، اوران کی ہر نقل وحرکت میں ایک طرح کا سکون ووقار پیدا ہو چلا ہے، پہلے انھیں تاریخ وادب کے مطالعہ سے بے حد دلچسپی تھی، لیکن اب تفسیر وحدیث اور فقہ وتصوف سے شبانہ روز کا واسطہ ہے۔

کتاب الزہد والرقاق ، کتاب الاذکار ، حصن حصین ، مثنوی مولانا روم ، مکتوبات مجدد الف ثانی ، مکتوبات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ، تذکرۃ الرشید ، تذکرۃ الخلیل ، دُرُّ المعارف ، یہ وہ کتابیں ہیں جن سے موصوف نے خود بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا اور مجھ کو بھی یہ کتابیں پڑھ کر سنائیں ، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وصی اللہ الہ آبادی کی تحریرات وتالیفات کو اتنی بار پڑھا اور اس قدر ذوق وشوق سے پڑھا کہ وہ ان کے ترجمان بن گئے، اور بالآخر دوسرے اساتذہ کو بھی ان کتابوں کی قدر وقیمت اور افادیت واہمیت کا احساس ہونے لگا۔ بزرگانِ سلف اور اکابر کی ان تالیفات وتصنیفات نے جہاں مولانا کے ذہن ومزاج اور کردار وعمل پر گہرا اثر ڈالا وہیں ان سے پڑھنے والے طلباء بھی بالواسطہ ان کتابوں کے مضامین اور مندرجات سے فیضیاب ہوتے چلے گئے۔ تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت واصلاح کی فکر اور اس کا اہتمام جس قدر مولانا کے یہاں ہم نے دیکھا اپنے ہم نشینوں میں کہیں اس کی مثال نہیں مل سکی، مولانا اپنے شاگردوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں، اور ان کے دکھ درد کو خود اپنا درد سمجھتے ہیں۔ قلیل المعاش ہونے کے باوجود اپنے ہر ضرورت مند

اور نادار طالب علم کی نصرت واعانت کو گویا انھوں نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ سخاوت وایثار کی اس روش کی بنا پر اپنے شاگردوں میں انھیں غیر معمولی مقبولیت ومحبوبیت حاصل ہے، ہم لوگ سرزنش اور زجر وتوبیخ کے باوجود شاگردوں کی غلطیوں کی اصلاح نہیں کر پاتے، لیکن موصوف سے پڑھنے والے طلبہ کتنی ہی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محض اس بنا پر اجتناب کرتے ہیں کہ ہمارے اس طرز عمل سے مبادا استاذ محترم کو تکلیف نہ پہونچ جائے، استاذ وشاگرد کے درمیان جب مخلصانہ ربط وتعلق قائم ہوجاتا ہے تو تعلیم وتربیت کا کوئی مرحلہ دشوار نہیں رہ جاتا۔ غرض ایک اچھے استاذ اور کامیاب مربی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ ان کی شخصیت میں نمایاں ہیں۔

عام طور سے متوسطات کی کتابیں مکمل کر لینے کے بعد درس نظامی کے طلبہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور وغیرہ کا رخ کرتے ہیں، لیکن ان مدارس میں پڑھنے والے شاگردوں سے بھی موصوف کا ربط وتعلق برابر قائم رہتا ہے۔ بُعدِ مسافت کے باوجود وہ خود کو اپنے محبوب استاذ اور مربی ومشفق کے زیر تربیت ہی محسوس کرتے ہیں، درسگاہ کی تبدیلی اور مقام کا فرق اس تعلق پر مطلق اثر انداز نہیں ہوتے۔ خطوط کے ذریعے موصوف وقتاً فوقتاً اپنے جانے والے طلبہ کی خبر گیری فرماتے رہتے ہیں، اس التفات وتوجہ کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اپنے مقاصد سفر اور فریضے سے غافل وبے پرواہ نہیں ہوتے، بھیجے ہوئے ان خطوط میں اُنس ومحبت اور ہمدردی وبہی خواہی کی وہ حلاوت ولطافت ہوتی ہے جسے پڑھ کر مخاطب اپنے ہر رنج وغم اور دکھ درد کو بھول جاتا ہے، موصوف نے اپنے شاگردوں کے نام جو خطوط تحریر کئے ہیں انھیں مسافران علم کے لئے قیمتی سوغات اور چراغ راہ سمجھنا چاہئے۔

بزرگوں کے منتخب واقعات اور علمائے سلف کے حالات وہ اس طرح رقم

کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، زیرِ نظر مجموعہ میں کچھ خطوط وہ ہیں جو طلبہ کے سوالات اور استفسار کے جواب میں تحریر کئے گئے تھے۔ کچھ سوالات وہ ہیں جن کا تعلق علم کلام اور منطق کے پیچیدہ مسائل ومباحث سے ہے، اسی طرح بعض سوالات کا تعلق فقہ وحدیث کی مشکلات ومہمات سے ہے، موصوف نے طلبہ کے اشکالات کو جس وضاحت وخوبصورتی سے حل کیا ہے شاید وہ انھیں کا حصہ ہے۔

طہارتِ قلب ونظر، تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق واعمال، توکل وتفویض اور زہد وقناعت، یہ وہ عناوین اور موضوعات ہیں جن سے مولانا کا قلبی تعلق اور باطنی ربط ہے۔ ان عناوین پر وہ جب کبھی بولتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے، اسی طرح مذکورہ موضوعات پر جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو زیب قرطاس ہونے والی ہر سطر نگاہوں کی راہ سے قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے، اور وہ اپنے اندر اتباع سنت وشریعت کا داعیہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ مکتوبات کے اس مجموعے میں ایسے بہت سے خطوط مل جائیں گے جنھیں پڑھ کر ناظرین میری تائید وتصدیق کریں گے۔

ضیاء الاسلام کے صفحات میں حدیث دوستاں کے عنوان سے جو خطوط نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں، عوام ہی کے لئے نہیں علماء اور خواص کے لئے بھی ان میں بصیرت وآگہی اور اصلاح احوال کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے، میرے حلقۂ احباب میں بعض حضرات وہ بھی ہیں جو محض ان خطوط کی خاطر اس رسالہ کے خریدار ہیں، اللہ تعالیٰ اسے مزید مقبولیت ومحبوبیت عطا فرمائے۔ آمین

شبیر احمد دربھنگوی

۱۳/ صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۹/ جنوری ۲۰۱۰ء

☆☆☆☆☆

باب اول

بزرگوں کے نام

بنام حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہ

ناظرین کرام! درج ذیل مکاتیب استاذ محترم مدظلہٗ کے، اور ہم سب کے مخدوم وبزرگ حضرت اقدس ماسٹر محمد قاسم دامت برکاتہم کے نام ہیں۔ حضرت مدھوبنی ضلع کے ایک گاؤں کھور مدن پور کے رہنے والے ہیں، مدرسہ عربیہ اشرفیہ پوہدی بیلا ضلع دربھنگہ کے ناظم اور ذمہ دار ہیں۔ بزرگوں کے نام کے ساتھ ”ماسٹر“ کا لاحقہ عجیب سا لگتا ہے، مگر حضرت اقدس اسی لاحقہ کے ساتھ معروف ہیں، واقعی ایک اسکول میں پڑھاتے تھے، اب ریٹائر ہو چکے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے ایک برگزیدہ خلیفہ حضرت مولانا شاہ سراج احمد صاحب امروہوی نور اللہ مرقدہٗ کے نہایت بافیض اور صاحب کرامت مجازِ بیعت ہیں، بےنفسی وتواضع کے پیکر جمیل، خلوص وللٰہیت کے ایک دلکش مرقع، صورت دیکھئے تو اللہ یاد آئے، مجلس میں بیٹھئے تو سکون وطمانینت نچھاور ہو، دربھنگہ کے رہنے والے، بہار کے مسلّم بزرگ! بہت ہی مستجاب الدعا بزرگ!

ہمارے استاذ محترم مدظلہٗ کو ان سے دیرینہ تعلق ہے، باہمی مراسلت کا ایک طویل سلسلہ ہے، دونوں طرف کے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے، یہاں ہم استاذ محترم کے خطوط کا جو حضرت اقدس ماسٹر صاحب مدظلہٗ کے نام لکھے گئے ہیں، ایک مختصر سا انتخاب پیش کرتے ہیں۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

مخدوم مکرم! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

عنایت نامہ ملا، یادفرمائی سے مسرت ہوئی، لیکن حالات سے قلبی صدمہ ہوا، سیلاب چھٹی بار پھر آ گیا، اللہ کی پناہ، نہ جانے حق تعالیٰ کو کیا منظور ہے، مصائب پر مصائب! یقیناً یہ اللہ کی ناراضگی کے مظاہر ہیں۔ مصیبت جب آتی ہے تو عام آتی ہے، صالحین بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، ہمارے ملک کا کوئی خطہ مصائب سے خالی نہیں، نوعیت بدلی ہوئی ہے، مگر سب پریشان ہیں۔ ایمان کے بعد معصیت مصیبت کو جلد لاتی ہے، جو بالکل نہیں مانتے انھیں دخولِ نار تک مہلت ہے، اس لئے ان کے یہاں کسی قدر چین ہے، لیکن ایک مومن جس کو حق تعالیٰ دخولِ نار سے بچاتے ہیں، وہ فوراً سزا کی زد میں آجاتا ہے، گنہگاروں کے گناہ اس سے مٹتے ہیں، صالحین کے درجات بلند ہوتے ہیں، آخرت کی پکڑ سے حفاظت ہوتی ہے، ہے تو بڑا فائدہ! مگر مصائب کی تاب ہمارے اندر کہاں؟ حق تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۴؍ربیع الاول ۱۴۰۸ھ

☆☆☆☆☆

مخدومی ومکرمی حضرت ماسٹر صاحب! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

نوازش نامہ باصرہ نواز ہوا، بہت خوشی ہوئی اور تسلی ہوئی کہ جناب والا

میرے لئے نہایت الحاح وزاری سے بارگاہِ رب العزت میں دعا فرماتے ہیں، معلوم تو تھا کہ آپ برابر دعاؤں میں اس حقیر وغریب کو نوازتے ہیں، مگر اس تحریر سے بہت اطمینان حاصل ہوا، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت سہولت سے یہ قرض ادا کردیں گے۔ جب بزرگوں کی دعائیں اس بارگاہِ عالم پناہ میں پہونچیں گی تو کوئی معنی نہیں کہ قبولیت سے سرفراز نہ ہوں۔

جناب والا نے اپنے بارے میں جو کلماتِ انکسار تحریر فرمائے ہیں، وہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی کو دیکھتے ہوئے اور ان کی عظمت وبلندی پر نظر کرتے ہوئے بالکل حقیقت ہیں، بلکہ اس عتبۂ عالی کے مقابلہ میں اپنی حقیقی پستی ظاہر کرنے کے لئے شاید زبان ولغت میں کما حقہ کوئی لفظ بھی نہ ملے، لیکن یہ ان کی جلالت شان کے لحاظ سے ہے جن کے سامنے پیغمبر بھی اپنا وجود گم کردیتے ہیں، تاہم اپنی اسی نسبت کا استحضار جب کسی بندہ کو ہوجاتا ہے تو پھر اس کا اپنا پست وحقیر وجود ختم ہوکر وہ حق تعالیٰ کی نسبت عالی کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس وقت اس کی بلندی کا اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، یہی مقام غالباً بقاء باللہ کہلاتا ہے، اور یہی عبدیت کے خواص میں سے ہے۔ حق تعالیٰ کا جناب والا پر مخصوص کرم ہے، اللہ تعالیٰ اس رُوسیاہ کو آپ کی برکت سے اپنے کرم کا موردِ بنادے۔ **وماذلك علی اللّٰه بعزيز۔**

میری بڑی خواہش تھی کہ شب برأت کا مقدس وقت آپ کے سایہ میں گزارتا، تاکہ جو فیضان بارگاہِ غیب سے آپ کے اوپر آتا رہتا ہے، ممکن ہے راستہ کا یہ حقیر ٹھیکرا بھی اس سے کسی درجہ میں مستفید ہوجاتا، اسی لئے میں نے ۱۳؍شعبان کی روانگی طے کی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو یہ منظور نہیں ہے۔ بات یہ ہوئی کہ بارہ بنکی کے میرے نہایت عزیز دوست جنھوں نے ملفوظات کی کتابت کی ہے،

اچانک آئے اور اپنے یہاں ایک جلسہ کی دعوت لے کر آئے ، میں نے بہت معذرت کی مگر وہ نہ مانے ، ان کی خاطر سے ان کے یہاں ۱۶؍شعبان کو جانا منظور کرلیا کہ اس سے پہلے ان کے لئے بعض مجبوریوں کی وجہ سے گنجائش نہ تھی ، اب انشاء اللہ ۱۷؍شعبان بروز سنیچر بارہ بنکی ہی سے ویشالی اکسپریس سے انشاء اللہ روانہ ہوں گا ، اسی گاڑی سے ریزرویشن کے لئے کہا ہے۔

مکان کی رجسٹری بحمد اللہ ہوگئی ہے ، ہمارے دوستوں نے اس کے لئے بڑی محنت کی اور بہت تکلیفیں اُٹھائیں ، ان کے لئے خاص طور پر دعا فرمائیں ۔ حالانکہ سب غریب ہیں لیکن حوصلہ یہ ہے کہ مجھے قرض سے بے فکر کردیں ، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائیں ۔ اخیر میں پھر دعا کی درخواست کرتا ہوں ۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۹؍رجب ۱۴۱۲ھ

☆☆☆☆☆

مخدومی و معظمی حضرت ماسٹر صاحب! مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

یہاں بعافیت پہونچ آنے کی اطلاع ایک کارڈ سے کر چکا ہوں ، جمعہ کے روز عزیزی مولوی محمد ہاشم سلّمہٗ پہونچ آئے تھے ، میں اس وقت باہر تھا ، سنیچر کو واپس آیا ، تو انھوں نے درزیا(۱) کے حادثہ کی اطلاع دی ، ایسا لرزہ خیز حادثہ ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ اس وقت سے اب تک دل کو کسی طرح قرار نہیں ہے ، ہر وقت امنڈتا رہتا ہے ، یہ سب اہل محبت تھے ، ان کی فدائیت ومحبت کو سوچ سوچ کے اور

زیادہ بیقراری ہوتی ہے، بے اختیار جی چاہتا ہے کہ فوراً ان لوگوں تک پہونچوں اور جس طرح بن پڑے صبر وسکون کا سبب بنوں، مگر کیا کروں مجبوری ہے، اس وقت بھی جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں، دل بھرا چلا آرہا ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں۔ یہ آزمائش سخت ہے، مگر صبر کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ درد بھی انھیں کی بارگاہ سے ہے اور درماں بھی انھیں کی جناب سے ہے، میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جن سے تسلی دے سکوں، بس یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ جزع وفزع اور وحشت وبیقراری جو حد معصیت میں آتی ہو، اس سے اپنے فضل وکرم سے محفوظ رکھیں اور اس مصیبت پر اجر جزیل اور اس کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ میں جب بہت بیقرار ہوا اور کسی طرح صبر وسکون نہیں ہو رہا تھا تو بارگاہِ الٰہی کی جانب بتضرع وزاری متوجہ ہوا، پھر دل میں ایک بات آئی جس سے بے قراری کو قدرے سکون ہوا، وہ یہ کہ اس کا اجر آخرت میں ملے گا، اور ان شاء اللہ دنیا میں بھی بہتر حال نصیب ہوگا، اور بہت سے گناہوں کا کفارہ ہوگا، میرا دل نہایت ناقابل اعتبار ہے، اس میں آنے والی کسی بات کا کوئی وزن نہیں ہے، لیکن پھر بھی اتنا ہوا کہ بے چینی کی شورش میں خاصا سکون ہوگیا، اس وقت سے برابر یہی دعا کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہو۔

گاؤں والوں کو زیادہ سے زیادہ استغفار کی جانب متوجہ ہونا چاہئے اور انھیں یہ دعا پڑھنی چاہئے: إنا لله وإنا إليه راجعون، أَللّٰهُمَّ أُجُرْنِيْ فِيْ مَصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْراً مِّنْهَا۔ ان شاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہر ایک کو نقصان کا نعم البدل عطا فرمائیں گے۔

یہ دعا حضرت نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو تلقین فرمائی تھی، اور انھوں نے اپنے شوہر ابوسلمہ کے انتقال پر اسے پڑھا تو انھیں حضرت کی

زوجیت نصیب ہوئی۔

خصوصیت کے ساتھ ماسٹر محمد اسماعیل صاحب اور مولوی محمد یٰسین صاحب کے سلسلے میں زیادہ صدمہ ہورہا ہے، برابر دعا کررہا ہوں، بس وہ حضرات سنبھلے رہیں، اس حادثہ کی وجہ سے اللہ کے تعلق میں کوئی فرق نہ آنے پائے، خدا کی جناب میں کوئی حرفِ شکایت دل یا زبان پر نہ آئے تو ان شاءاللہ یہ مصیبت رحمت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

میں ہمہ وقت ان حضرات کیلئے دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ ہر طرح خیر وعافیت کا معاملہ فرماویں۔ جمعہ کے روز بھاگلپور جانا ہے، ایک صاحب آئے تھے، ایک مدرسہ کے جلسہ میں نہایت اصرار کے ساتھ مدعو کیا ہے، مجبوراً اقرار کرنا پڑا۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۹؍ رجب ۱۴۱۲ھ

(۱) درزیا، حضرت ماسٹر صاحب کے گاؤں کے قریب ایک گاؤں ہے، وہاں قیامت خیز آگ لگی تھی، چھپر کے مکانات سب جل گئے تھے۔

☆☆☆☆☆

مخدومی ومکرمی ! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

ابھی دو چار روز ہوئے ہیں جہانا گنج گیا تھا، وہاں سے سیوان گیا، سفر میں عزیزم حافظ آفتاب سلّمہٗ بھی ساتھ تھے، راستے میں بار بار آپ کا ذکر ہوتا رہا۔ مجھے تو یہ معلوم تھا کہ حافظ آفتاب سلّمہٗ کی ساس کا انتقال ہوگیا ہے، اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آپ کی ہمشیرہ تھیں، لیکن اس سے زیادہ کوئی تفصیل معلوم نہ تھی، حافظ آفتاب سلّمہٗ سے

بھی اس حادثہ کے بعد ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ آپ کا کوئی خط ملا جس سے تفصیلات کا علم ہوتا۔ حافظ آفتاب سلّمہٗ کی زبانی ساری باتیں معلوم ہوئیں کہ وہ آپ کی اکیلی ہمشیرہ تھیں، اور ان کی وفات کی وجہ سے جناب کی طبیعت بہت متاثر ہے، آپ کے تاثر کو سن کر میرا دل بھر آیا، آفتاب سلّمہٗ آپ کی باتیں کر رہے تھے اور میرا دل امنڈا چلا آتا تھا، طبیعت بیقرار تھی، آنکھیں چھلکنے کے لئے بے تاب تھیں، کسی طرح طبیعت کو قابو میں رکھا، میں نے سوچا اور آفتاب سلّمہٗ نے کہا بھی کہ آپ کے نام خط لکھ دوں۔ مجھے پہلے ہی لکھنا ہی چاہئے تھا مگر اتنی تاخیر ہوگئی، اس کی وجہ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں تو آپ کے تاثرات کو سن کر اتنا بے چین ہوا کہ جی چاہا کہ اسی سفر میں آپ کی خدمت میں حاضری دوں مگر موانع نے اجازت نہ دی، اب قلم اٹھایا ہے تو سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں؟ آپ سے تعزیت وتسلی کی کوئی بات کروں، یہ تو میرا منہ نہیں ہے، حق تعالیٰ کی شانِ رحمت کی معرفت آپ کو مجھ سے بدرجہا زائد حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربانی کس کس انداز میں فرماتے ہیں، یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ آپ نے دوا علاج کے سلسلے میں اسباب ظاہری کا مکمل انتظام فرمایا تھا مگر حق تعالیٰ کی مشیت غالب آکر رہی، اس کا راز بھی آپ پر منکشف ہے، یہ سب کچھ ہے، مگر دل درد سے بھرا چلا آتا ہے، اس کا کیا علاج ہے؟ یہ بھی آپ سے بہتر کون جانتا ہے؟ خدا تعالیٰ نے آپ کو کتنے دکھے دلوں کا غمخوار، کتنے کتنے مصیبت زدہ لوگوں کا مرکز امید بنایا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کے اوپر کوئی ناقابل برداشت درد ڈال دیں، پھر سوچتا ہوں کہ سورج کو چراغ کیسے دکھاؤں، بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ آپ کے غم کو اپنا غم بنا کر اپنی تسلی اور تعزیت کے لئے جو کچھ سمجھ میں آتا جائے کہتا چلا جاؤں، اس کے مخاطب آپ نہیں خود میں ہوں، کیونکہ میں نے بھی اپنی دو دو بہنیں کھوئی ہیں،

اوراس وقت کھوئی ہیں جبکہ عالم اسباب میں والد کے علاوہ ان دونوں سے زیادہ میرا کوئی غمخوار نہ تھا، میرے سگے بھائی بہنوں کا انھیں دونوں پر خاتمہ ہوگیا، پھر میں اکیلا رہ گیا، ایسے واقعات پر اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی ساری توجہ اپنی طرف دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے لئے عالم غیب سے تدبیریں نازل فرماتے رہتے ہیں اور یہ تدبیریں عموماً انسان کے مزاج وخواہش کے خلاف اور تکلیف دہ ہوتی ہیں، یہ تدابیر کبھی مال پر بجلی بن کر گرتی ہیں، کبھی اپنے گھر والوں اور عزیزوں کی جان کی آفت بنتی ہیں، کبھی بیوی ناموافق ہوتی ہے، کبھی اولاد نالائق ہوتی ہے، ایسے حالات میں آدمی خدا کا نیازمند ہوتا ہے تو سب سے دل توڑ کر اسی پروردگار کے دروازے پر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے، اب اس کا دل مضبوط ہوجاتا ہے، وہ سوچ لیتا ہے کہ یہ سب اشخاص واشیاء فانی ہیں، ان کے ساتھ ہر قسم کا تعلق بھی فانی ہے، باقی تو صرف خدا کی ذات ہے، اوراس کا تعلق ہے بس اسی سے لگنا لپٹنا چاہئے، آپ تو جانتے ہیں کہ حضرت سیدنا ابراہیم ادہم علیہ الرحمہ جب ساری دنیا پر لات مار کر خدا کے ہورہے تھے، اور ۱۴؍سال کی مدت میں ہر قدم پر دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے حق تعالیٰ کی تجلی گاہِ خاص یعنی کعبہ مقدسہ تک پہونچے تھے تو ان کے صاحبزادے شاہ محمود کو باپ کی اطلاع ملی، وہ اعیان وارکانِ سلطنت کو لے کر مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، صاحبزادے اس وقت بہت چھوٹے تھے جب ابراہیم بادشاہت سے جدا ہوکر خدا کے قدموں میں گرے تھے، اس لئے جانبین سے پہچاننے کا سوال ہی نہیں تھا، تاہم ابراہیم ادہم آتے جاتے بغور صاحبزادے کو دیکھا کرتے تھے، معتقدین ومریدین کو کسی قدر الجھن بھی ہوتی تھی کہ حضرت اس خوبصورت لڑکے کو کیوں گھورتے ہیں، لیکن کیا معلوم تھا بلکہ خود حضرت ابراہیم کو احساس نہ تھا کہ اپنا ہی خون ہے جواب مجسم

ہوکر محبوبِ دلنواز بنا ہوا ہے، صاحبزادے کو تلاش تھی ہی، انھوں نے بالآخر باپ کو پالیا، جب ہر ایک نے دوسرے کو پہچان لیا تو محبت کا شعلہ اتنے زور سے لپکا کہ دونوں ایک دوسرے سے بے اختیار لپٹ گئے، پھر جب جدا ہوئے تو صاحبزادے کی روح بھی جدا ہوچکی تھی، عجیب منظر تھا، یہ ملنا تھا یا بچھڑنے کی تمہید تھی، عارفین اس مسئلہ کوحل کرنے میں پریشان ہیں، سید العارفین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم کا دل بجز ایک پروردگار کی محبت کے ہر ایک تعلق سے خالی تھا، مگر جب بیٹے سے ملاقات ہوئی تو اچانک نہایت جوش وخروش سے اس کی محبت کا طوفان اٹھا، حق تعالیٰ کی غیرت کو یہ کب گوارا تھا کہ جو دل حبِّ الٰہی کا آشیانہ بن چکا ہے اس میں کوئی غیر اتنی قوت سے داخل ہو کہ اس میں بھی مقصودیت کی شان پیدا ہوجائے، بس یہ غیرتِ الٰہی تھی کہ بیٹا رُخصت ہوگیا، اور اس باپ کا دل پھر خالی ہوگیا، حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں، رحیم بھی ہیں، لیکن ان کی حکمت ورحمت کے انداز سمجھ میں نہیں آپاتے، اصحابِ معرفت حیران ہو ہو جاتے ہیں بلکہ اہل معرفت کے احوال کو دیکھ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حیرت باندازۂ معرفت بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ آدمی سراپا حیرت بن جاتا ہے۔

’’ مائیم وتحیر وخموشی، آفاق ہمہ در گفتگو یت ‘‘ کا منظر ہوتا ہے، آپ کے دل پر نہ جانے کیا کیا کیفیات گذرتی ہوں گی، دیکھنے والے اپنے پیمانے سے ناپتے ہوں گے، سونے کو اگر غلہ کے باٹ سے تولا جائے تو وزن کتنا ہلکا معلوم ہوگا، حق تعالیٰ مربی ہیں، وہ نہ جانے کیسے کیسے تربیت فرماتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے بہت تکلیفیں جھیلیں، مگر اتنا تاثر کبھی آپ پر نہ دیکھا گیا تھا جتنا ہمشیرہ کے انتقال پر! بیشک ایسا ہوسکتا ہے لیکن دنیا کیا جانے کہ اہل احساس کو کیا کچھ احساس ہوتا ہے، آپ کے

صوبہ کے ایک بہت ہی صاحب درد، دیندار ومتقی شاعر کا ایک شعر مجھے یاد آرہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ؎

میرے دل میں درد بھرا ہے اتنا ہی تم جانو ہو
دل میں درد بھرے ہیں کیسے درد بھرا دل جانے ہے

بالکل واقعہ ہے، تاہم ایک خدا کی یاد، اس کی جناب میں حضوری، اس کا نام اور اسی کے حضور گریہ وزاری، ہر ایک درد کا مداوا اور ہر ایک غم کا علاج ہے، وہی ایک پناہ گاہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں، وہی فریاد رس ہیں، ان کے ماسوا کسی کے بس میں کچھ نہیں، وہی قلوب کوکو قوت بخشتے ہیں، وہی صدمہ بھی دیتے ہیں، اور وہی برداشت بھی عنایت فرماتے ہیں، یہ سب ان کی شانیں ہیں، کون جانے کہ ان میں کیا کیا حکمتیں ہیں، بس وہی جانتے ہیں اور انھیں کا جاننا ہمیں کافی ہے، ہم تو بس آنکھ بند کرکے ان کے حکم پر چلتے رہیں، ان کے یہاں دھوکا نہیں ہے، اندیشہ نہیں ہے، خطرہ نہیں ہے، ہمارے آقا ومولیٰ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے رضا بالقضاء کا سبق اتنی تکرار سے پڑھایا ہے کہ ہر ایمان والے کا دل مضبوط ہوگیا ہے، اب اس میں ہر ایک تکلیف برداشت کرنے اور ہر مصیبت جھیلنے کی قوت پیدا ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایمان سے نوازا ہے، یہ ایمان بھی عجیب چیز ہے، کوئی بات کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، ایمان اسے آسان کردیتا ہے، کیونکہ یہ ایمان ہر آڑے وقت میں بندے کو خدا کے دروازے پر کھڑا کردیتا ہے، اور بندہ وہاں سے نئی قوت حاصل کرلیتا ہے، آپ سے کیا کہوں؟ آپ تو واقف ہیں، میں تو اپنے دل کی تسلی کے لئے آپ سے کہے چلا جارہا ہوں، حالانکہ جانتا ہوں کہ آپ کے پاس وقت بہت کم رہتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ درازنفسی داخل گستاخی ہے، مگر عنایت فرماتے ہیں اسی اعتماد پر لکھتا چلا گیا۔

میری کوئی حقیقت تو نہیں ہے، لیکن آپ کیلئے، آپ کے متعلقین کے لئے دعا کرتا ہوں اور اس بات کی بھی کہ مرحومہ ہمشیرہ صاحبہ کی حق تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۶؍رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

مخدومی و معظمی حضرت ماسٹر صاحب!

زید مجدکم وعافاکم اللہ من جمیع البلیات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

میرے خط ارسال کرنے کے کئی روز بعد آپ کا مکتوبِ گرامی موصول ہوا تھا، اس وقت بعض دوسری مشغولیات حارج تھیں، نیز یہ بھی خیال تھا کہ میرے خط کا جواب بھی آپ ضرور لکھیں گے، یہ جواب بھی آلے تو میں خط لکھوں، امید وانتظار کے مطابق بحمد اللہ دوسرا مکتوب بھی پرسوں ۹؍جمادی الاخریٰ کو مل گیا، لیکن خط جس قسم کے مضمون پر مشتمل تھا میں اسے پڑھ کر سکتے میں آگیا۔ آپ کے دردِ دل نے میرے دل پر اتنا اثر کیا کہ اس وقت سے اب تک محسوس ہوتا ہے جیسے بادل کی شکل میں غم میرے دل پر منڈلا رہا ہو، مجھے درد والم سے ایک طرح کا ناقابل بیان کیف حاصل ہوتا ہے، لیکن آپ کے احوال موجودہ کو سوچتا ہوں تو دل امنڈنے لگتا ہے، دل تو ہمہ وقت دعا میں مشغول ہے، زبان بھی بار بار دعائیں دہراتی رہتی ہے، کاش میری دعاؤں کو رسائی حاصل ہوتی، لیکن غور کرتا ہوں تو نہ دل میں کوئی لیاقت ہے، اور نہ زبان میں طہارت

ہے، ایسے دل اور ایسی زبان سے جو دعا نکلے گی، اس کی رفتار کیسی اور اس کی رسائی کہاں تک ہوگی، یہ محتاجِ بیان نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مانگنے سے باز نہیں آتا۔ بے لیاقت دل اور بے طہارت زبان سے جو کچھ بن پڑتا ہے عرض معروض کرتا ہوں، آپ نے مکتوبِ گرامی میں ایک شعر لکھا ہے،

درکفِ شیرِ نرے خونخوارۂ　　جز بہ تسلیم ورضا کو چارۂ

اس شعر کی معنویت کو جب آپ کی کیفیات قلبیہ پر ....جس کا کچھ اندازہ آپ کے مکتوب سے ہوتا ہے............ منطبق کرتا ہوں تو بے اختیار آپ کے مقام بلند اور مرتبۂ رفیع کا احساس ہونے لگتا ہے، اس قدر متواتر اور پیہم صدمات کا ورود اور پھر اس پر تسلیم ورضا کی ثبات قدمی، واقعہ یہ ہے کہ یہ خاصانِ خدا ہی کا حصہ ہے۔ دل کی رقت وگداختگی کا یہ عالم ہے کہ دوسروں کی بے چینی سے بیقرار ہونے لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود صبر واستقامت اور تسلیم ورضا کا شیوہ ہاتھ سے چھوٹتا نہیں، یہ حق تعالیٰ کا اتنا بڑا کرم اور انعام ہے کہ اس کا شکر ادا کرنا مشکل ہے، غالب کا مصرعہ ہے کہ:　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

جس کا جیسا ظرف ہوتا ہے، اسی کے بقدر اس کا امتحان ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ خود دانائے راز ہیں، میں طفل نادان کیا لکھوں؟ لیکن آپ کی کرم فرمائیوں نے جرأت بخشی ہے، اس لئے دل میں جو کچھ آتا چلا جارہا ہے لکھے جارہا ہوں۔

عزیزہ ذاکرہ سلمہا کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے ہیں، اس کی وجہ سے پریشانی کا ہونا قدرتی اور فطری امر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں، میرے گھر دو بار جڑواں بچے پیدا ہوئے، پہلی بار دو بچیاں پیدا ہوئیں، ان دونوں کا حال عجیب تھا، ان کا ہر کام ایک ساتھ ہوتا تھا، ایک ساتھ سوتیں، ایک ساتھ جاگتیں، ایک

روتی تو دوسری بھی رونے لگتی، ایک بیمار پڑتی تو دوسری بھی اسی مرض میں گرفتار ہو جاتی پھر دونوں ایک ساتھ ٹھیک ہو جاتیں، حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ بھی دونوں بیک وقت کرتیں، چھ ماہ تک بڑی دقت رہی، بیوی اپنے میکہ میں کسی طرح وقت گزارتی تھی، میری ابتدائی مدرسی کا زمانہ تھا، میرے ساتھ نہ تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو اٹھالیا، اور دوسری اس کے فراق کے صدمے سے ادھ موئی ہوگئی ڈیڑھ سال تک اس کی یہ کیفیت رہی کہ ہر دیکھنے والا بے اختیار یہی کہتا کہ بس چند دن کی مہمان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، ڈیڑھ سال کے بعد اس کو صحت ہونی شروع ہوئی، اور چند سالوں میں مکمل صحت یاب ہوگئی، اور اب بحمد اللہ اپنی ماں کی دست و بازو بنی ہوئی ہے۔ بہت مشکل پڑی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس طرح گزار دیا کہ اب یاد کرنے سے بھی اس وقت کی پریشانی یاد نہیں آتی۔ اس کے دو سال کے بعد دو بچے اکٹھا پیدا ہوئے، اہلیہ پر ایک گھبراہٹ مسلط ہوگئی کہ ان کی پرورش کیسے ہوگی، اور اتفاق ایسا کہ ان دونوں کی باری میں ماں کا پستان بھی خشک تھا، کمزوری کی وجہ سے بچوں کی نانی نے کہا کہ ایک بچے کو مجھے دیدو، جب اوپری دودھ سے پرورش کرنی ہے تو ایک کو میں پال لوں گی، ان کی کوئی چھوٹی اولاد نہیں ہے، اس لئے اور بھی خواہش تھی، مگر میں نے ماں کی ممتا کا جوش دیکھا کہ سب تکلیف جھیل لینا گوارا، مگر بچوں کو نگاہوں سے اوجھل کرنا گوارا نہیں ہوا۔ اس وقت میں بھی اور بچے بھی الہ آباد میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی پرورش آسان کردی۔ ان دونوں کا معاملہ پہلے والوں سے بالکل الگ تھا، ان دونوں کا ہر کام الگ الگ ہوتا تھا، ایک مرتبہ حضرت جامی صاحب مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ جب کبھی دونوں بچے ایک ساتھ روئیں تو مجھے اطلاع کریں، مگر شاید اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اب دونوں بحمد اللہ ۱۳؍۱۳؍ سال کے ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

سے دعا فرمائیں کہ ان کو عالم باعمل بنائیں۔

میری اس بے تکی داستان سے آپ کو کچھ فائدہ نہیں، مگر آپ کی تحریر مبارک سے مجھے آپ بیتی یاد آگئی اور بے اختیار نوکِ قلم پر آتی چلی گئی، آدمی کی نظر اپنے ہم جنس پر پڑتی ہے تو اسے تسلی کا سامان مل جاتا ہے، ممکن ہے عزیزہ سلمہا کو میری یہ داستان معلوم ہو تو اس کے دل کو تقویت و تسلی حاصل ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ بڑے کارساز ہیں، ہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس وقت میرا افلاس بھی عروج پر تھا، تنخواہ پوری کی پوری دونوں بچوں کے دودھ پر صرف ہو جاتی تھی، لیکن واہ رے حق تعالیٰ کی شانِ رحمت، اس کے فضل سے مقروض ہونے کی نوبت نہیں آئی، اور اگر کچھ ہوا بھی تو ہلکا پھلکا قرض۔

خط میرا لمبا ہوتا جارہا ہے، آپ کو اسے پڑھنے میں اپنے قیمتی اوقات کے بڑے حصے کو ضائع کرنا پڑے گا، مگر جانتا ہوں اور حسن ظن رکھتا ہوں کہ آپ کو اس تحریر سے خوشی ہوگی، اور میرا دل بھی اس وقت آمادۂ گفتگو ہے، اس لئے دل میں آئی ہوئی بات کاغذ پر منتقل کردینا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ کے مکتوبِ گرامی کا قلب پر اثر تو تھا ہی، کل بابری مسجد کے حادثہ نے اسے اور محزون و مغموم بنادیا ہے، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے میرا دل رنج و ملال اور حزن و غم سے ایک طرح کا کیف بلکہ گونہ لذت وحلاوت پاتا ہے، اس لئے گو کہ دل کی مثال اس وقت ایسی ہے جیسے کوئی حصۂ بدن زخموں سے چھلنی ہوگیا ہو، اور اس پر نمک چھڑک دیا گیا ہو، تاہم اس تلملاہٹ کو لذت سے محرومی نہیں ہے۔

آج عصر کی نماز سے پہلے یکایک آپ کی یاد بہت شدت کے ساتھ آئی، معاً میرے دل میں خیال آیا کہ کسی طرح آپ کا رنج و کرب راحت و آرام سے بدل جاتا،

یہ خیال آنا تھا کہ دل دعا کی کیفیت میں ڈوب گیا، نماز کے بعد کافی سکون محسوس ہوا، سوچا کہ لسان الغیب حافظ شیرازی سے دریافت کرنا چاہئے۔ نیک فالی شریعت میں ممنوع نہیں ہے، بس اس کو اس کی حد پر رہنا چاہئے، اعتقاد نہیں بننا چاہئے۔ میں نے اللہ سے دعا کی اور دیوان حافظ ہاتھ میں لے کر دعا کی یا اللہ! حضرت ماسٹر صاحب کے حق میں جو بات آپ کے علم میں مقدر ہے اسے اس کتاب میں ظاہر فرمادیں، پھر جو صفحہ کھولا تو اس کے ابتداء میں یہ تین شعر نکلے، آپ بھی سن لیجئے، مجھے تو بہت فرحت ہوئی، اور اللہ کی ذاتِ عالی سے امید باندھے ہوئے ہیں کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ پہلا شعر یہ ہے،

صبح امید بُد معتکف پردۂ غیب
گو بروں آئے کہ کارِ شبِ تار آخر شد

مطلب یہ ہے کہ صبح امید جو کہ پردۂ غیب میں گوشہ نشین تھی، اس سے کہو کہ اب باہر آئے کہ شب تاریک کا کام اب تمام ہوگیا ہے۔

دوسرا شعر بالکل آپ کے ذوق کے مطابق ہے۔

گرچہ آشفتگیٔ کارِ من از زلفِ تو بود
حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

اگرچہ میری پریشان حالی تیری زلف ہی سے تھی، لیکن بہرحال اس پیچیدگی کا حل بھی محبوب کے رخ روشن ہی سے ہوا۔

حافظ نے آشفتہ حالی کو زلف یار کا اثر بتایا۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ شان ہے جس سے آدمی کے احوال میں ابتری آتی ہے، زلف سیاہ ہوتی ہے اور الجھی بھی رہتی ہے، یہ ایک خاص شان الٰہی کی طرف اشارہ ہے، جسے شان جلال سے تعبیر کر سکتے

ہیں، اور اس پریشان حالی کا دور ہونا روئے محبوب کا اثر بتایا ہے، زلف جیسی سیاہ ہوتی ہے، چہرہ ویسا ہی روشن اور دمکتا ہوا ہوتا ہے، یہ محبوب کی شان جمال ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ زلف و رُخ میں اتصال ہے، پس شانِ جلالی کی وجہ سے اگر آشفتہ حالی ہے تو محبوب کی شان جمالی کی وجہ سے معاً خوش حالی آجاتی ہے، گویا زُلف محبوب نے مسئلہ میں جو پیچیدگی ڈالی تھی روئے نگار نے لگے ہاتھوں اسے کھول دیا، اور پیچیدگی دور کردی۔ سبحان اللہ!

تیسرا شعر ملاحظہ ہو۔

درشمار ارچہ نیارد کسے حافظ را   شکر کاں محنت بے حد و شمار آخر شد

یعنی اگر چہ کوئی شخص حافظ کو قابل شمار اور لائق اعتنا نہیں سمجھتا تھا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ یہ بے حد و بے شمار تکالیف اپنے خاتمہ کو پہونچ گئیں، اب ان میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔

یہ پوری غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہے۔ سب اشعار لکھنے لگوں تو بہت طوالت ہوگی، آپ کے ہاں شاید دیوان حافظ ہو، اس میں ملاحظہ فرمالیں۔

اللہ تعالیٰ نے بہت مناسب، برمحل اور تسلی بخش مضمون عطا فرمادیا، میں نے ان تینوں اشعار کو فال نیک سمجھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے کیا بعید ہے کہ وہ خاص حالات کے لئے بھی اور عام حالات کے لئے بھی اسے قبول فرمالیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۱؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۳ھ

☆☆☆☆☆

مخدومی و معظمی حضرت اقدس!   زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک خط ارسال خدمت کر چکا ہوں دو ہفتے قبل، شاید ملا ہو، اسکول کے کام سے فارغ (۱) ہونے کے بعد جناب والا کی مشغولیت بہت بڑھ گئی۔ مدرسہ (۲) پر بھی قیام کا زیادہ موقعہ نہیں ملتا اور گھر پر بھی پہونچنا تاخیر ہی سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات گرامی سے مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچائے۔ لیکن ایک بات عرض کرنے کو جی چاہتا ہے، گوکہ ہمت نہیں ہوتی، کیونکہ میرا منہ چھوٹا ہے اور بات میرے لحاظ سے بڑی ہے۔ اور بزرگوں کو مشورہ دینا بے ادبی ہے۔ مگر یہ مشورہ نہیں صرف دلی آرزو کا اظہار ہے کہ اب تو آپ کا قیام مستقل طور پر مدرسہ میں ہو، تاکہ مدرسہ کے انتظامات بھی درست رہیں اور فائدہ اٹھانے والوں کو بھی سہولت ہو کہ وہ آئیں تو مایوس ہو کر واپس نہ ہوں جو لوگ اپنے معمولی معمولی کاموں کیلئے آپ کو کھینچتے پھرتے ہیں، وہ درحقیقت آپ کے بڑے نفع سے لوگوں کو روک دیتے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو کسی بادشاہ نے ایک باغ ہدیہ کیا اور اس کا قبالہ بھیج دیا۔ آپ نے واپس فرما دیا، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت قبول فرمالیں، کبھی کبھی اس میں تشریف لے جایا کریں گے۔ فرمایا کہ نہیں، مخلوق میرے پاس دور دور سے آتی ہے، جب وہ یہاں آئیگی اور مجھے نہ پائیگی، لوگ کہیں گے کہ شیخ باغ میں تشریف لے گئے ہیں تو اس پر کیا گزرے گی۔ جناب والا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ذمہ داری عطا ہوئی ہے، اس کا انتظام کریں، بچوں کے پڑھانے کا کام موقوف ہوا، اب اصلاح و تربیت کا نظام جاری کریں۔ اس میدان میں بہت سناٹا ہے، یہ شعبہ خالی جا رہا ہے۔ اگر آپ توجہ فرمادیں تو ان شاء اللہ بہت کام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبول عام نصیب فرمایا ہے۔ آپ کی محبت دلوں میں اتری ہوئی ہے۔ آپ کے واسطے سے خلق

خدا اپنے خالق کے ساتھ مربوط ہوگی۔ تعویذات کا سلسلہ مدرسہ پر ہی جاری رکھیں۔ اس کے لئے سفر کی ضرورت نہیں۔ لوگ تو اپنی خودغرضی کی وجہ سے ہر وقت کھینچنے ہی کی فکر میں رہتے ہیں، سب حقائق آپ پر عیاں ہیں، میرا کچھ کہنا شوخ چشمی میں داخل ہے، مگر آپ کے الطاف وعنایات نے کچھ جری بنا دیا ہے، اسی بنا پر یہ گستاخی ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔ دعاؤں کی درخواست ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ

(۱) حضرت اقدس ماسٹر صاحب مدظلہ ایک سرکاری اسکول میں مدرس تھے، اب ریٹائر ہو چکے تھے، اس کا ذکر ہے۔ (۲) مدرسہ اشرفیہ عربیہ پوہدی بیلا ضلع دربھنگہ جس کے حضرت اقدس مہتمم ہیں۔

☆☆☆☆☆

مخدوم ومکرم ومحترم! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

مجھے انتظار تھا کہ جناب والا شاید عزیزم مولوی محمد ہاشم سلّمہٗ کے ہمراہ تشریف لائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ناسازیٔ طبع کی وجہ سے سفر نہ ہوسکا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔ اور آپ کے فیوض و برکات سے ہم لوگوں کو فیضیاب فرمائے۔ آج کل میری تحریری مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے، دل میں شوق تو یہی رہتا ہے کہ جو کام کروں۔ اللہ تعالیٰ کیلئے کروں، مگر نفس کا کچھ اعتبار نہیں، نہ جانے کہاں کہاں سے راہ مارتا ہے۔ پہلے ذکر کا بہت شوق تھا اور کرتا بھی تھا۔ اس سے طبیعت میں ایک خاص طرح کا گداز رہتا تھا۔ اب صرف شوق باقی ہے، کرنے کی نوبت مشغولیت

کی وجہ سے کم آتی ہے۔ یوں قلب کو بارگاہ الٰہی میں حاضر رکھنے کا اہتمام کرتا ہوں۔ مگر وہ بات کہ دل بھی اسی دربار میں ہو۔ زبان بھی، اور پورا جسم بھی، وہیں حاضر رہے۔ اب نصیب نہیں ہو پاتی تو عجیب حسرت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر تسلی ہوتی ہے کہ یہ مشغولیت میں نے نہ خود سے اوڑھی ہے، اور نہ میں نے اس کا کبھی تصور کیا تھا۔ میں تو محض ایک مدرس تھا، اور مدرسی میں خوب وقت ملتا تھا، ذکر کرنے کا، تلاوت کرنے کا، مگر اس کے بعد بزرگوں کی طرف سے وعظ وتقریر کی ذمہ داری ڈالی گئی، جس کو مجبوراً مجھے قبول کرنا پڑا، ورنہ میں بالکل سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے تقریر ووعظ سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ وعظ سے پہلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہر قسم کے علم سے بالکل کورا ہوں۔ اس لئے اور گھبراہٹ ہوتی ہے، اس مشغولیت نے بہت سارا وقت لیا۔ اس کے بعد اچانک تحریر وتصنیف کا مشغلہ میرے پیچھے لگ گیا اور اب اس میں اس طرح مبتلا ہوں کہ بیشتر اوقات اس میں گھر گئے ہیں، مگر اطمینان اس سے ہوتا ہے کہ اپنے بزرگ حضرات کی جن میں جناب والا بھی شامل ہیں سرپرستی حاصل ہے، اور یہ لوگ اس سے راضی ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ ان حضرات کے طفیل انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہوجائیگی۔ اس داستان سرائی کا مقصود یہ ہے کہ آپ کی گرانقدر توجہ مزید اپنے حال زار پر مبذول کراوں۔ یوں تو آپ کی دعاء عنایت اور توجہ برابر اس غریب اور مفلس کے حال پر رہتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ باوجود بالکل سروسامانی اور بے لیاقتی کے بعض کام ایسے ہوجاتے ہیں جو لوگوں کیلئے پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ یہ درحقیقت آپ جیسے بزرگوں کی نگاہ کرم کا طفیل ہے۔ اور جناب والا کے سلسلے میں برکات کا تو مجھے مشاہدہ ہے۔ اس خط کا مقصد حضرت والا کی مزید توجہ اور دعا کا حاصل کرنا ہے۔ آج کل اپنی علمی وعملی مفلسی وقلاشی کا

احساس شدید تر ہے، ہمیشہ ہی رہتا ہے مگر ان دنوں اس نے ایک عجیب سی بے کیفی کا کیف پیدا کر رکھا ہے۔ بس دعا کا خواستگار ہوں۔

نوٹ : میں نے ابھی حال ہی میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ کی سوانح حیات مرتب کی ہے۔ ان کے فرزند مولوی محی الدین لے گئے ہیں، وہ اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں(۱) ستمبر کے اخیر میں بمبئی گیا تھا۔ قاری ولی اللہ صاحب نے تالیفات مصلح الامۃ کے چاروں حصے دوبارہ طبع کرائے ہیں، میں نے انہیں توجہ دلائی کہ تالیفات حصہ پنجم بھی جامی صاحب کے منصوبے میں شامل تھی، انہوں نے اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ بحمد اللہ پانچواں حصہ میں نے مرتب کر دیا ہے۔ اس کی فہرست بنا رہا ہوں تاکہ مضامین کی تلاش میں سہولت ہو، فہرست کا کام ذرا مشکل ہے۔ لیکن شروع کر دیا ہے۔ دعا فرما دیں کہ آسان ہو جائے۔ قاری صاحب اسے شائع کریں گے(۲) بلکہ چھٹا حصہ بھی مرتب ہو گیا ہے، اس کے متعلق ابھی بات نہیں ہوئی ہے۔

(۱) سوانح کی یہ تحریر ''ذکر جامی'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (۲) تالیفات مصلح الامت کا حصہ پنجم مولانا قاری ولی اللہ صاحب نے اپنے مکتبہ اشرفیہ بمبئی سے شائع کیا ہے، چھٹا حصہ شائع نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

حضرت مخدومی و محترمی! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

جناب والا کا گرامی نامہ موصول ہوا، تقریب (۱) کے سادگی کے ساتھ انجام پانے، نیز اس میں خیر و برکت کے ظہور سے بہت قلبی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس نمونہ

کو عام کریں۔ حضرت پرتا پگڈھی علیہ الرحمہ کے متعلق تحریر آپ کو پسند آئی (۲) بہت اطمینان حاصل ہوا، آپ کی نگاہ قبول انشاء اللہ اس میں برکت وقبولیت پیدا کرے گی۔ آج کل محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی پر کچھ کام کر رہا ہوں۔ حضرت محدث کبیر نور اللہ مرقدہ اپنے علم وفضل، ذہانت وذکاوت میں اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے۔ ہم لوگوں نے زندگی میں انہیں بالکل نہیں پہچانا۔ انتقال کے بعد جب ان کی علمی تحریریں پڑھنی شروع کیں تو ایسا محسوس ہوا کہ متقدمین محدثین میں سے کوئی بزرگ اس دور میں آگئے تھے۔ ایک طویل مضمون حضرت مولانا پر لکھ چکا ہوں جو جامعہ اسلامیہ بنارس کے سہ ماہی رسالہ ترجمان الاسلام کے خاص نمبر میں شائع ہوگا۔ انشاء اللہ اس کی ایک کاپی بھیجوں گا۔ دارالعلوم دیوبند سے ایک رسالہ ''دارالعلوم'' نام کا نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر نے اس کا تصوف نمبر نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ مجھ سے مضمون کی فرمائش کی، میں نے اس کے لئے ایک مضمون صحیح تصوف کے تعارف کے لئے لکھا ہے۔ آج اسے بھیج رہا ہوں (۳) دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ ان تحریروں کو قبول فرمائیں اور میرے لئے بھی اور مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی نافع اور مفید بنائیں، قبول نہ ہو تو صرف کالی کالی سطریں کس کام کی مجھے اس موقعہ پر حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری قدس سرہ (۴) کا ایک قول یاد آتا ہے ان کے یہاں ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے، مفتی صاحب قبلہ مدرسہ کی لق ودق عمارتیں بنوارہے تھے اس کے علاوہ مسجد و مدرسہ کی بہت سی عمارتیں وجود میں آچکی تھیں۔ مولانا ندوی نے واپسی کے بعد حضرت مفتی صاحب کو اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ حضرت! سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی عمارت کا کیا حاصل؟ اس وقت مولانا ندوی دھڑا دھڑ کتابیں لکھ لکھ کر چھپوا

رہے تھے اور ان کو بزرگوں کے پاس بھی بھیجتے تھے اسی کی مناسبت سے حضرت مفتی صاحب نے لکھا کہ ہاں صاحب! حاصل تو نہ عمارت کا ہے نہ عبارت کا، واقعی اگر قبول نہ ہو تو کسی کا کچھ حاصل نہیں۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے کہ یہ عبارتیں قبول ہوں تا کہ وقت اور محنت ضائع نہ ہو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲/ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ

(۱) ایک ولیمہ کی تقریب کا ذکر ہے۔ (۲) مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد میں نے دو مضمون لکھے تھے جو مجلّہ المآثر کے ابتدائی دو شماروں میں شائع ہوئے تھے، انہیں حضرت ماسٹر صاحب مدظلہ نے بہت پسند فرمایا تھا، ملاحظہ ہو مجلّہ المآثر ج:۱ شمارہ:۱۔۲ (۳) یہ تحریر ماہنامہ دارالعلوم کے الاحسان نمبر میں شائع ہوئی ہے، اور اب کتابی شکل میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ (۴) خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ

☆☆☆☆☆

مخدومی و مکرمی حضرت اقدس ماسٹر صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

عزیزم مولوی محمد ہاشم سلّمہٗ بخیر و عافیت یہاں پہونچ گئے، بہت خوشی ہوئی اور مزید مسرت اس سے ہوئی کہ میرے خط نے آپ کی جناب میں حسن قبول پایا۔ حضرت! یہ تو صرف عبارت آرائی ہے جو میں نے سیکھ رکھی ہے، بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے، ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا چسکا لگا ہوا ہے۔ ادبی کتابوں کے مطالعہ نے عبارت آرائی کا فن سکھا دیا، بزرگوں کی کتابوں نے بزرگوں کے احوال و ملفوظات سے واقف کرایا، بس انہی دونوں کے سہارے سجی سجائی عبارتیں آپ بزرگوں کے سامنے پیش

کر دیتا ہوں، باقی میرے احوال اور میرے دل کا حال یہ ہے کہ ان عبارتوں اور معلومات سے محظوظ تو ہوتا ہے مگر ان کے کیف سے خالی ہے۔ چاہتا تو دل سے ہوں کہ جو کچھ لکھتا ہوں یا بولتا ہوں یہی قلب کا حال بن جائے۔ لیکن نہ جانے کب یہ دولت حاصل ہوگی، اور ہوگی بھی یا نہیں؟ آپ حضرات کی پسندیدگی، دعاؤں اور محبت وعنایت سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔ **لعل الله یرزقنی صلاحاً** ۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۴؍رجب ۱۴۱۳ھ

☆☆☆☆☆

سیدی ومخدومی! دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج اقدس!

ان دنوں جو خطوط جناب والا کے آرہے ہیں وہ دردوغم کے مضامین سے لبریز ہوتے ہیں، وہ دور آگیا ہے کہ اللہ والوں کو تنہائی کا احساس ستانے لگا ہے، بڑا غم اسی کا ہے کہ دل میں درد بھرتا ہے تو اس کو پہچاننے والا نہیں ملتا، کسی سے مل کر سرمایۂ تسلی حاصل ہوجائے، ایسا کوئی نہیں ملتا، ہر ایک اپنے خیال میں مست ہے، بلکہ گم ہے ایسے میں اللہ والوں کے دل کا حال کوئی کیا جانے۔ بس اس بھری دنیا میں بالکل تنہائی محسوس ہوتی ہے کوئی ہمدم ودمساز نہیں، کوئی مونس وغمخوار نہیں، غرض کی ماری دنیا اپنے غم کا مداوا اللہ والوں کے پاس تلاش کرلیتی ہے، مگر اللہ والوں کا سینہ جو سلگتا ہے اس کو کس نے جانا، کس نے تلاش کیا، دنیا مرتی ہے کہ مال نہیں ملتا، اللہ والے پریشان ہوتے ہیں کہ آدمی نہیں ملتا، جس کو آدمی بنانا چاہتے ہیں وہ بھی آدمیت نہیں چاہتا کچھ

اور چاہتا ہے، کوئی تو مخلص ہوتا! جو اللہ کیلئے کام کرتا، اخلاص اختیار کرتا اور وہی طریقہ اپنے کام کیلئے پسند کرتا جو اللہ کا پسندیدہ ہے، رسول کا فرمودہ ہے۔ اب تو مخلص ہی عنقا ہے، اور اگر جذبہ اخلاص کہیں ہے تو طریقہ عمل منحرف ہے، دنیا میں آخرت کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے، زمانہ نبوت کے بعد کی وجہ سے نور استعداد کم ہے، **قال اللہ قال الرسول** کی آواز بہت ہے، مگر اس کے کہنے والوں کا حال اور عمل کچھ اور ہے، اور قول بلا عمل اثر سے خالی ہے نورانیت سے تہی مایہ ہے، اللہ والوں کے قلب میں وہ نور بھی ہے، ان کے پاس وہ طریقہ عمل بھی ہے، اسے عطا کرنے اور بانٹنے کا جذبۂ بے تاب بھی ہے، مگر دیکھنے والے اسے اجنبی سمجھ کر گذر جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے کام کی یہ چیز نہیں ہے انہیں کچھ اور چاہئے۔

ایک طبیب نے دیکھا کہ لوگ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہیں، اس کی انہیں تکلیف بہت ہے، وہ کراہ رہے ہیں تلملا رہے ہیں چلا رہے ہیں، طبیب اس بیماری کی دوا جانتا ہے، اسے لوگوں پر شفقت بھی ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ اس بیماری سے نجات پائیں اس کے پاس اعلیٰ درجہ کی دوا بھی ہے، وہ ترس کھا کر لوگوں کے درمیان دوا لیکر بیٹھ جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے، اس بیماری کی دوا میرے پاس ہے، آؤ اور اسے سستے داموں میں لے جاؤ، دام نہ ہو تو مفت ہی لیجاؤ، وہ سوچتا ہے کہ لوگ بیماری سے پریشان ہیں، ٹوٹ پڑیں گے اور دوا لے جائیں گے، استعمال کریں گے اور شفا پائیں گے، لیکن اس کی حیرت اور افسوس کی انتہا نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اولاً تو لوگ دوا لینے آتے ہی نہیں، اور جو آتے بھی ہیں، تماشا دیکھنے آتے ہیں، اور تماشا کر کے چلے جاتے ہیں، یا دور ہی سے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھتے ہیں اور پھر کسی طرف بڑھ جاتے ہیں، طبیب کے صدمے کی انتہا نہیں رہتی، مگر بیماروں کے ٹولے نے نہ اس کو

پہچانا، نہ اس کے جذبۂ اندروں کو پہچانا اور نہ اس کی دوا کی قدر کی، وہ بڑا مایوس ہوتا ہے، اپنی دوکان اٹھا لینا چاہتا ہے، مگر پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہتا ہے کہ شاید کوئی بیمار آ جائے تو اسے صحت مل جائے۔

اس زمانے میں اللہ والوں کی یہی مثال ہے، یہ طبیب ہیں، دوائیں سب ان کے پاس ہیں، انسانیت بیمار ہے، مگر کسی کو قدر کرنے کی توفیق نہیں اور تو اور خود اپنے گھر والے بھی اعراض اور بے رخی برتتے ہیں، پھر یہ حضرات صدمے سے چور ہو جاتے ہیں۔

جناب والا کی شان مجھے باوجود اپنے نقص نظر کے یہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ کھانا پکا پکایا موجود ہے کوئی کھانے والا نہیں ملتا، بھوکا آدمی پتھر چبا رہا ہے، مگر عمدہ کھانے سامنے موجود ہوتے ہوئے ان سے اعراض کرتا ہے۔ پھر اللہ والے کیا کریں؟ مجبوراً اپنی دولت سمیٹے پڑے رہتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں کہ اس ناقدری کا وبال کہیں لوگوں پر نہ پڑ جائے، وہ دعائیں کرتے ہیں کہ پروردگار ایسا نہ ہو، مگر غیرت الٰہی کو جلال آتا ہے اور لوگ آزمائشوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔

لیکن اللہ والے خسارے میں ہیں؟ یہ کامیاب نہیں ہیں؟ نہیں ان کے خسارے میں ہونے کا سوال ہی نہیں، جتنا صدمہ بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایتیں دم بہ دم بڑھتی ہیں، دنیا ان کی قدر نہ کرے، آسمان کی مخلوق ان کی قدر کرتی ہے، آسمان و زمین کا خالق ان کی قدر کرتا ہے، زمین پر سناٹا ہے مگر آسمانوں میں ان کی گونج سنائی دیتی ہے، آدمی ان سے انحراف کرتا ہے، لیکن فرشتے مسلسل متوجہ ہیں، وہ دعائیں کرتے ہیں وہ ان کی محبت سے لبریز ہیں، جنت ان کا انتظار کرتی ہے۔ حور و غلماں منتظر ہیں، دنیا والے ناقدری کر کے اپنا نقصان کرتے ہیں، اللہ سے سچا تعلق رکھنے والا کبھی

خسارہ میں نہیں ہوسکتا، اسے سب چھوڑ دیں، اسے کوئی نہ پوچھے، لیکن جس کے پوچھنے کا اعتبار ہے وہ خوب قدر کرتا ہے۔ بس وہی کافی ہے **حسبنا اللہ و نعم الوکیل**۔

حضرت والا! آپ کے متعدد خطوط پڑھنے سے میرے دل میں جو مضمون آتا رہا اسے میں نے ناتمام الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اللہ والوں کے قلب کی ترجمانی مجھ سے کیا ہوسکتی ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا دل کس بلندی پر ہے اور اس میں کتنی وسعت ہے، کیسے کیسے بلند عزائم کے وہ حامل ہیں، میرا ادھورا اور ناتمام دماغ جو کچھ سوچ سکا، اسے میں نے لکھ تو دیا ہے لیکن اب سوچتا ہوں کہ یہ سب لکھنا داخل گستاخی تو نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ میری شوخی چشم کو معاف کرے، دعاؤں کی درخواست ہے اور جتنا بن پڑتا ہے میں بھی دعا کرتا ہوں، پچھلے کسی خط میں میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ دن قریب ہے کہ میرے بچوں کو اپنا اپنا گھر آباد کرنا ہوگا لیکن گھر تو ہے نہیں اور نہ گھر کا کوئی انتظام ہے، غیب میں سب کچھ ہے، اسکے شہود میں آجانے کی دعا فرمادیجئے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۰؍محرم ۱۴۲۲ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی

سہ ماہی مجلّہ المآثر مئو میں بعض غیر معقول اور ناہموار فرقوں کا احتساب ہوتا رہتا ہے۔ ان فرقوں کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے تناسب سے کبھی احتساب کا لہجہ سخت ہوتا ہے، کبھی نرم ہوتا ہے، اس پر ہماری جماعت کے بعض بزرگ کبھی کبھی ادارہ کو فہمائش کرتے ہیں، اور علی الاطلاق لہجہ نرم رکھنے کی ہدایت دیتے ہیں، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی دامت برکاتہم (مولانا موصوف مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کے فرزند اکبر ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، صاحب زبان وقلم، عرصہ تک ماہنامہ ''الفرقان'' کے مدیر رہے۔ پھر خرابی صحت کی وجہ سے لندن منتقل ہوگئے، اور اب وہیں مستقل قیام ہے) کے اس موضوع پر متعدد خطوط آئے۔ ان کے خطوط کے جواب میں ایک مفصل مکتوب انھیں لکھا گیا، اس کے بعد پھر ان کا تاکیدی خط آیا، اس کا جواب اس حقیر نے لکھا۔ اس کی نقل یہاں شائع کی جارہی ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

مخدوم مکرم ومحترم! زیدت معالیکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج گرامی!

جناب والا کا گرامی نامہ ملا۔ اسی طرح کے مضمون کا ایک گرامی نامہ غالبًا سال ڈیڑھ سال پہلے بھی ملا تھا، اس کا جواب اس خاکسار نے دیا تھا، مگر شاید وہ ملا نہیں، ورنہ اس مضمون کے اعادہ کی ضرورت نہ پیش آتی،

جو لوگ اسلامی تعلیمات واحکام کے خلاف ہرزہ سرائیاں کرتے ہیں یا ان میں بے جا تاویلات کا دروازہ کھولتے ہیں، ان کے جواب میں لب ولہجہ کی تیزی غیرت دینی کا تقاضہ ہے، انصاف پسند لوگوں سے اس انداز میں گفتگو کی جاسکتی ہے جس کی آپ تلقین کرتے ہیں، مگر جو لوگ ہمارے سامنے ہیں وہ انصاف سے خالی اور ظلم سے معمور ہیں۔ ان کے لئے وہی لب ولہجہ مناسب ہی نہیں ضروری ہے، جو الماٰثر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ یَاأَیُّهَا النَّبِیّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے) اور وَلَا تُجَادِلُوْا أَهْلَ الْکِتَابِ إِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ إِلَّاالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (اور تم اہل کتاب کے ساتھ مہذب طریقہ کے علاوہ مباحثہ مت کرو، مگر وہ جو ظالم ہوں) کی دلالت یہی ہے، اب رہی یہ بات کہ کون اس سے بدکتا ہے اور بھڑک کر بھاگتا ہے، تو وہ کوئی قابل اعتنا چیز نہیں (۱)، آخر آج دنیا کا ایک بڑا طبقہ جہاد اور جہادی تحریکات سے بدکتا ہے، بلکہ ایک طبقہ تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جہاد کی آیات قرآن سے خارج کر دی جائیں، تو کیا ان کے بدکنے کے خوف سے ایسا کیا جاسکتا ہے؟

محترم! خود قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کچھ لوگ اس سے ہدایت

کی راہ پاتے ہیں اور کچھ لوگ اسی سے گمراہی کا شکار ہوتے ہیں، یہ قصہ تو چلتا ہی رہے گا، کسی کے دور و نزدیک ہونے کے خوف اور اندیشے سے اتنی احتیاط لب و لہجے میں نہیں برتی جاسکتی، جو خوشامد کے دائرے میں آجائے۔

جس کا جی چاہے بدکے اور دور ہو، اور جس کا جی چاہے مانے اور قریب ہو، دین کی جڑ کھودنے والوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے جس کی آپ نے تلقین فرمائی ہے۔

ہاں کوئی بات علم و تحقیق کی کسوٹی پر غلط ثابت ہو، تو ہم بخوشی اس کا اعتراف کریں گے، اور اس سے رجوع کرلیں گے۔ لیکن اہل باطل کے ساتھ......خواہ کسی درجے کا بطلان ان میں ہو......وہی لہجہ اختیار کیا جائے گا۔ جس کو اب تک المآثر میں برتا گیا ہے۔ یہ معروضات آپ کے لئے گرانئ خاطر کا باعث تو ہوں گی۔ لیکن جو بات تھی وہ عرض کردی گئی۔ **واللہ الموفق للحق والصواب ۔**

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۹/ربیع الآخر ۱۴۲۴ھ

(۱) نرم لب و لہجے کے حق میں بڑی بات یہ کہی جاتی ہے کہ اس طرح کی باتوں اور تحریروں سے وہ طبقہ بدکتا اور بھاگتا ہے، جس کو اس کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اگر نرمی اور ملائمت سے بات کہی جائے، تو شاید وہ قریب آئے، یہ بات بظاہر تو بھلی معلوم ہوتی ہے، مگر تجربہ یہ ہے کہ یہ طبقہ نہ نرم لہجہ سے متاثر ہوتا، اور نہ ملائمت سے راضی ہوتا، تو ان کی فکر کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ ہاں وہ لوگ جو خالی الذہن ہیں، یا وہ جو طریق حق پر ہیں، انھیں مطمئن کرنا اور رکھنا ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

بنام قاری عبدالسلام صاحب مضطرؔ ہنسوری

ایک پاکباز اور پاک طینت بزرگ، اکابر بزرگوں کے صحبت یافتہ، شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمہ اور مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دست گرفتہ، جانِ پُرسوز اور دلِ بریاں کے مالک، ہنسور ضلع فیض آباد کے رہنے والے، صاحب نسبت اللہ والے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جون پوری علیہ الرحمہ سے اجازت وخلافت پائی۔ بہت متواضع اور منکسر المزاج، قسّامِ ازل نے ان کو عارفانہ اور عاشقانہ ذوق سے نوازا ہے، اشعار بھی خوب کہتے ہیں، بیت اللہ شریف اور دربارِ رسالت میں حاضری کی تڑپ ہمیشہ انھیں بے تاب کئے رہتی تھی، اور اس بے تابی میں ایسے ایسے پُر درد اور پُرسوز اشعار ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے کہ پڑھنے والا بھی بے قرار و بے تاب ہوجائے۔ ایک عرصہ تک وہ اس شورش و بے تابی میں فریاد کی لَے بلند کرتے رہے، پھر حق تعالیٰ نے انھیں حج بیت اللہ سے نوازا، میں نے انھیں مبارکباد دی، انھوں نے جواب میں ایک پُر درد خط لکھا۔ اس سے اللہ والوں کے باطنی احوال کی جھلک ملتی ہے، کہ وہ کس نظر سے اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ ان کا خط اور میرا جوابی مکتوب اکٹھا درج کیا جاتا ہے۔

مکتوب گرامی قاری عبدالسلام صاحب مدظلہ

مشفق ومحترم مولانا المکرّم! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہٗ

کرم نامہ ملا۔ دیارِ قدس میں پھر حاضری کے اسباب فراہم ہوجانا گویا حاضری کی اجازت مل جانا ہے(ا)اور دوبارہ کسی عمل کی توفیق ہوجانا پہلے کی قبولیت کی دلیل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مبارک فرمائیں اور باربار یہ سعادت نصیب فرمائیں۔

آں مخدوم ومحترم نے میرے سفرحجاز سے نہایت حسن ظن سے، بڑی توقعات کا اپنے مکتوبِ گرامی میں اظہار فرمایا ہے، خدا کی قسم وہاں میری جو کیفیات تھیں شرم کی وجہ سے ابتک کسی سے ذکر نہیں کیا ہے، آپ نے میری دکھتی رَگ کو چھیڑ دیا، آپ کو لکھتا ہوں مگر کہیں ذکر فرما کر مجھے رُسوا نہ کرنا بلکہ اللہ تعالیٰ سے میری مغفرت کی دعا کرنا۔ وہاں جو بے کیفی اس بے نصیب پرِ ہر اعمال میں طاری رہی، مجھے باربار یہ خیال ہوتا رہا کہ میں..........مردود تو نہیں ہوں؟ أستغفر اللّٰہ العظیم وأتوب الیہ

تفصیلاً لکھتے ہوئے شرماتا ہوں، منیٰ وعرفات کے ایام میں بالکل صفر، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسمانی طور پر یہاں ضرور ہوں مگر دل میرے ہمراہ نہیں ہے۔ اسے کہیں کھوکر یہاں آیا ہوں۔ یہی کیفیت روضۂ اقدس علیٰ صاحبہا الصلوٰة والسلام پر بھی رہی۔ اپنے اشعار سے بھی اجنبیت محسوس ہوتی تھی، تعجب ہوتا کہ یہ میرے اشعار ہیں؟ ایسا محسوس ہوا کہ یہ نعمت مجھے اتمامِ حجت کے طور پر استدراجاً نصیب ہوئی اور میری شقاوت وبدبختی یہاں آکر بھی دور نہ ہوئی آخرت میں میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے اس کا بڑا ڈر ہے۔ آپ سے دست بستہ گزارش ہے کہ میری نجات ومغفرت کی دعا فرمائیں اور رسوائی عذابِ آخرت سے چھٹکارا نصیب ہونے کی دعا فرمائیں۔ یہاں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور فضل خداوندی سے مقاماتِ اجابت میں پہونچیں تو ضرور عفوودرگزر کی دعا کرنا،

برکریماں کارہا دشوار نیست

کس منہ سے آرزو کریں اجروثواب کی　　یہ بھی بڑا کرم ہو بچیں گر سزا سے ہم
دعوے بہت تھے کیا ہوا کچھ بھی نہ بن پڑا؟　　پوچھیں گے گر ملیں گے دلِ مبتلا سے ہم

والسلام

---

(۱) میرے دوبارہ حج کے اسباب مہیا ہوگئے تھے، اس کی خبر دی تھی۔

☆☆☆☆☆

مخدومِ مکرّم! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

کل آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا، دل میں انتظار تھا کہ شاید آپ کچھ تحریر فرمائیں، لیکن چونکہ میں نے جواب کیلئے لفافہ نہ رکھا تھا اس لئے انتظار بس ضعیف ہی سا تھا، لیکن آپ نے کرم فرما کر بہت ممنون فرمایا، اس کے لئے بیحد شکر گزار ہوں۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

آپ نے اپنی جس قلبی کیفیت کا ذکر کیا ہے میں اندھا اس کو کیا سمجھ سکتا ہوں، مجھے تو کچھ بھی اِدراک نہیں ہے تاہم چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ جو بزرگوں کی صحبت اور ان کی تصانیف وملفوظات کے مطالعہ کی برکت سے حاصل ہو گئے ہیں جی چاہتا ہے کہ آپ کے حضور پیش کر دوں۔ اگر غلط ہوں، تو اسی کی توقع مجھ ظلوم وجھول سے ہے، اور اگر اتفاقاً درست نکل گئے تو فضل خداوندی اور دعاؤں کی برکت!

مخدومِ من! دوری ومہجوری عاشق کے اندر ایک شورش کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ محبّ اپنے محبوب سے جس قدر دور ہوتا ہے اور اس کے وصل کے اسباب جتنے مستور ہوتے ہیں۔ اسی قدر اس کا عشق شور انگیز ہوتا ہے۔ حالتِ فرقت میں روتا بھی

ہے، بلکتا بھی ہے، تڑپتا اور پھڑکتا بھی ہے، اور اس تڑپنے اور رونے بلبلانے میں وہ ایسا لطف ایسی لذت اور ایسی مستی وِرُبودگی پاتا ہے کہ اس کی لذت کے سامنے تمام لذتیں ہیچ ہوتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ نہ یہ دوری و مہجوری مطلوب ہے اور نہ یہ لطف و لذت مقصود ہے۔ اصل مقصود تو وصالِ محبوب ہے، آپ جب تک دیارِ قدس سے دور رہے عشق کا شورِ قیامت خیز اُٹھتا رہا اور حشر مچاتا رہا کبھی وہ وارفتگیٔ شوق کی صورت میں بے خود و سرمست بناتا تھا، کبھی وہ سوز و گداز کے ساتھ شعر بن بن کر نکلتا تھا، آپ کو بھی مست و بے خود بناتا تھا اور دوسروں کے سینوں میں بھی آگ لگاتا تھا لیکن جب آپ اس دیارِ پاک میں پہونچ گئے تو ایک طرح کا وصال نصیب ہوگیا، اب اس کے بعد شوق کی گرمی کہاں، فراق کی بے تابی کہاں؟ ایک طرح کا سکون پیدا ہوجانا لازمی تھا، یہ سکون کی حالت چونکہ یکایک پیدا ہوجاتی ہے اسلئے عاشق گھبرا جاتا ہے اور وہ خود کو خالی اور بے رنگ محسوس کرنے لگتا ہے حالانکہ یہی رنگ اصلی اور پختہ ہے، کاملین سلوک جب پختگی کی حالت میں پہونچتے ہیں تو ان پر یہی بے رنگی اور بے کیفی طاری ہوتی ہے، یہ مقامِ عبدیت ہے، یہ اصلاً ہر طرح کے ذوق وشوق اور کیف وکم سے خالی ہے۔ اس حالت کے حصول اور رسوخ کے بعد ذوق وشوق کی گرمی کم بلکہ معدوم ہوجاتی ہے اور کبھی پیدا بھی ہوتی ہے تو کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے اور محض عارضی ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو یہ دولت حاصل ہوئی، عبدیت کے مقام پر قدم جمانا مبارک! اللہ تعالیٰ اسے دوام بخشیں۔

میری ناقص سمجھ میں یہی بات آتی ہے، معلوم نہیں صحیح ہے یا نہیں؟ اس کو آپ سمجھیں۔ اسلئے کہ آپ منتہی ہیں۔ یہ نالائق ابھی مبتدی ہونے کی حیثیت میں بھی خود کو نہیں پاتا۔

ہے تو بالکل بے موقع بات! لیکن دل نہیں مانتا کہ میں نے اپنے حج کی جو رُوداد قلمبند کی ہے اس کا وہ حصہ آپ کو نہ سناؤں جو حج کے بعد کی کیفیات سے متعلق ہے، لکھنے کو تو لکھ چکا ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ اس میں حقیقت سے زیادہ کہیں صنّاعی نہ ہو! اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں، آپ بھی سن لیں، ممکن ہے مجھ رُوسیاہ کیلئے چند دعائیہ کلمات ادا ہو جائیں۔ لکھا ہے:

’’حج کے تمام ارکان ادا ہو گئے۔ حاجی کا نام اب ہم پر بھی چسپاں ہو گیا، لیکن کیا واقعۃً ہم ’’حاجی‘‘ ہو گئے، کیا ہم نے صحیح معنوں میں حج کیا؟ کیا حدیث میں جو بشارت آئی ہے کہ **من حج فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدته أمهٗ** (جس نے حج کیا اللہ کے واسطے اور اس میں نہ بے حیائی کا کوئی کام کیا اور نہ نافرمانی کی، وہ ایسا ہو گیا جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو) کیا اس ارشاد میں ہمارا بھی کچھ حصہ ثابت ہوا؟ لوگ کہتے ہیں کہ حج کے بعد جس کی دینی حالت میں ترقی ہو، خدا کا خوف اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے، اس کا حج قبول ہو گیا۔ گھر واپس ہونے کے بعد تو خیر جو حال ہو، بروقت کیا کچھ اپنے احوال میں تبدیلی ہوئی؟ کیا دل اپنی خواہشات وشہوات سے دستبردار ہوا؟ کیا اس میں کچھ بھی دینی لگن اور جذبہ بیدار ہوا؟ یہ اور ایسے سوالات تھے جو مسلسل دل کی گہرائیوں سے اُٹھتے تھے اور کم از کم میں ان کے جواب سے بالکل عاجز تھا۔ رہ رہ کر سوچتا تھا تو اعمال ومناسک کا ڈھانچہ تو یاد آتا تھا، مگر اس کی روح جس کی شُدبُد کچھ کتابوں کے مطالعہ اور کچھ بزرگوں کے احوال کے دیکھنے سے حاصل ہوئی تھی، اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا، جو کچھ کسی مقام پر آنسو بہے ان پر ریاکاری یا کم از کم مجمع سے تاثر کا شبہ ہونے لگا۔ ہر کام خلوص سے خالی، ہر عمل یادِ الٰہی سے عاری اور ہر حرکت پر معصیت کا رنگ طاری! کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا

کہ میں نے حج کیا ہے یا حاجیوں کی روکھی پھیکی نقالی کی ہے؟ میں نے کارِ ثواب کیا ہے یا پاپ کی گٹھری اپنی پُشت پر لادی ہے؟ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ جو شخص عرفات سے بھی خود کو محروم سمجھ کر آ گیا اس سے زیادہ عاصی اور محروم کوئی دوسرا نہیں، یہ سن کر میں کانپ گیا میرا احساسِ محرومی بڑھ گیا۔ میں دوستوں میں چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، مگر میری تنہائیاں بڑی کربناک ہوگئی تھیں، مجھے بارہا احساس ہوتا تھا کہ میں نے کوئی گستاخی کی ہے، میرا ہر عمل میرے منھ پر مار دیا گیا، میرا سفر میرے حق میں ایک فردِ جرم کا اضافہ ہے، مسجد حرام میں حاضر ہوتا تو کعبۂ مقدسہ کی مواجہت سے شدید شرمندگی طاری ہوتی، میں منھ چھپانے کی کوشش کرتا، مگر کعبہ سے منھ چھپایا جا سکتا ہے ربِ کعبہ سے نہیں، مجبوراً ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے طواف کر لیتا۔ کعبہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی، اس احساس کی شدت میں میری زبان گُنگ ہو جاتی نہ کوئی دعا منھ سے نکلتی اور نہ کوئی حرفِ آرزو شرمندۂ لب ہوتا۔ بس یونہی چکر لگا لیتا، اب وقت بھی گزر چکا تھا تلافی کی کوئی صورت نہ تھی ۔ میرے دوست حاجی عبد الرحمٰن صاحب خیر آبادی کبھی کبھی شیخ ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ کا واقعہ یاد دلا کر کچھ سوالات اپنے غایتِ حسن ظن کی وجہ سے مجھ سے کرتے مگر میں شرمندہ ہو کر چپ رہ جاتا۔ اول تو وہ بات بہت بڑے کی ہے، دوسرے اپنا حال بالکل دگرگوں ہے، جس چیز کا مجھے تصور تک نہیں ہو سکتا اس کا جواب میں کیونکر دیتا۔ انتھیٰ

یہ واقعہ حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ نے فضائلِ حج میں نقل کیا ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیں میں اپنا حال پہلے ہی لکھ چکا تھا اور اس کی کسک اپنے دل میں برابر محسوس کرتا تھا۔ اور کوئی تاویل و توجیہ مجھ سے بن نہیں پاتی تھی ۔ یہ درد کبھی بڑھ جاتا تو میں پریشان ہو جاتا، کبھی ذہول ہو جاتا تو بے کیفی چھائی رہتی، آپ کا خط جب پڑھا تو ایک

نور سا جگمگا اُٹھا، خود بخود اوپر کا مضمون ذہن و دماغ میں گردش کرنے لگا، اس وقت تک اپنی جانب التفات نہ تھا، مگر جب اقتباس نقل کرلیا، تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ بات میرے لئے بھی سرمایۂ تسکین ہے، اس وقت طبیعت پر ایک بشاشت ہے، حق تعالیٰ آپ کو ہشاش بشاش رکھے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، کہ اس بشاشت کا سبب آپ ہی ہیں، اور اس نامۂ سیاہ کو بھی!

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز درخواست ہے کہ وہ ان سطور کو قبول فرما کر میرے لئے وجہِ سعادت بنادیں اور جناب والا کیلئے بشارت! آمین، والسلام

اعجاز احمد اعظمی شیخوپور

۲۳؍ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

مکتوب بنام مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

علم وتحقیق، مطالعہ وتصنیف اور ژرف نگاہی ونکتہ رسی میں دورِ حاضر کی ایک معتبر شخصیت! کاندھلہ کے قدیم علمی خانوادے کے ایک خلف صالح! ایک زبردست علمی ذخیرۂ کتب کے سرمایہ دار بھی! اس کے قدرداں بھی! اس سے کماحقہ استفادہ کرنے والے بھی! اور اس کا نفع تالیف وتصنیف کے ذریعے عام کرنے والے بھی! مولانا موصوف علم وتحقیق کے جس مقامِ بلند پر کھڑے ہیں، وہاں کم لوگوں کی رسائی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی نہایت منکسر المزاج، متواضع اور دوسرے اصحاب تحقیق وتصنیف کی قدر کرنے والے ہیں۔

یہ حقیر اور بے مایہ تو ان کے سامنے کچھ نہیں ہے، مگر ان کی عالی ظرفی ہے کہ بہت نوازتے ہیں اور اس کی معروضات کو بہت عزت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ”قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار وباقیات ومتعلقات“ ازراہِ کرم عنایت فرمائی، اور اس پر تبصرہ کرنے کا حکم دیا تھا، اسی سلسلے میں یہ خط لکھا گیا۔

مخدوم مکرم ومحترم! **زید مجدکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شرمندہ ہوں کہ ایفائے وعدہ میں تاخیر ہوئی۔ کسی کام کا تو میں ہوں نہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے مختلف کاموں میں، اور اس سے زیادہ مختلف آدمیوں میں اتنا گھرا رہتا ہوں کہ علم ومطالعہ کے دربار میں ہمیشہ شرمندگی ہی ہاتھ آتی ہے، پڑھنا چاہتا ہوں اور بہت شوق ہے پڑھنے کا، مگر نہیں پڑھ پاتا۔ ہاں لکھنے میں بہت کاہل اور کوتاہ ہوں۔ معمولی معمولی بہانے لکھنے کی راہ میں حائل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی یہی حال رہا، کتاب کا زیادہ تر حصہ تو ریل ہی میں پڑھ لیا تھا، مگر لکھنے کے خیال سے طبیعت راہِ فرار ڈھونڈھنے لگی تھی، تا آنکہ آپ کا مکتوب گرامی شرف صدور لایا۔ اب کچھ غیرت نے مہمیز لگائی، ارادہ ہوا کہ جلد جواب لکھوں، ابھی اسی خیال میں تھا کہ مولوی ضیاء الحق سلّمہٗ نے بتایا کہ خط کی رسید بھیج دی ہے۔ اب کاہلی کو سہارا مل گیا، تاخیر پر تاخیر ہوتی گئی، کتاب کا مفصل تعارف لکھ دیا ہے، اس کی فوٹو کاپی فی الحال آپ کے یہاں بھیج رہا ہوں، اگر اس میں کوئی بات قابل اصلاح ہو تو مطلع فرمائیں۔ گو کہ مضمون کتابت کے لئے جاچکا ہے، مگر ابھی وقت ہے۔ تعارف لکھ لینے کے بعد دوبارہ کتاب حرفاً حرفاً پڑھی۔ ایسی قیمتی کتاب میں کتابت کی سہی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ اکثر جگہ تصحیح کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کے ساتھ کچھ اور بھی تصرفات کی جرأت اس **قلیل البضاعة** نے آپ کے حسن اخلاق اور حسن تحقیق پر اعتماد کرکے کر ڈالی ہے، انھیں بھی ملاحظہ فرمالیں، قبول ہوں، تو دعاؤں سے نوازیئے، نا قابل قبول ہوں، تو میں ایسا ہی ہوں کہ کوئی عمل قبول نہ ہو۔

(۱) کہیں کہیں فارسی عبارت کے ترجموں میں شبہ ہوا، تو میں نے کہیں

تو کتاب ہی پر اور کہیں علیٰحدہ پرچہ پر اپنی دانست میں جو صحیح ترجمہ ہوسکتا تھا، لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمالیں۔

(۲) کہیں کہیں آپ کی لکھی ہوئی تحریر مجھے خلافِ محاورۂ اردو معلوم ہوئی، کہیں فصاحت میں کمی معلوم ہوئی تو متبادل عبارت لکھ دی ہے، شاید قبول ہو، ایک لفظ متعدد جگہوں پر آیا ہے، مگر اس پر نشان نہیں لگا سکا ہوں، یہاں عرض کرتا ہوں۔ ’’سرانجام فرمانا‘‘ کئی جگہوں پر اس کے افعال استعمال ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ’’انجام‘‘ یا ’’سرانجام‘‘ کے ساتھ ’’فرمانا‘‘ کا لفظ اردو محاورہ میں استعمال نہیں ہے۔ ’’انجام دینا‘‘ کہا جاتا ہے، اور ’’سرانجام پانا‘‘ بولا جاتا ہے۔ ویسے آپ کی جو تحقیق ہو، میں اس میدان کا کبھی مبتدی تھا، اب تو وہ بھی نہیں ہوں۔

(۳) زیادہ تر کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی ہے۔

(۴) بعض تحقیقات پر بھی شبہ ہے، متعلقہ جگہ پر نشان لگا دیا ہے۔

میں یہ عرض کردوں کہ جو کچھ میں نے جسارت کی ہے، آپ کی محبت میں کی ہے، آپ کی ملاقات سے میرے دل پر محبت کا ایک نقش قائم ہوگیا۔ اور تحقیق کے میدان میں تو آپ کو فردِ فرید مانتا ہوں۔ البتہ افسوس اور رنج وحسرت کے اظہار کے لہجے میں نرمی چاہتا ہوں۔ بجز پیغمبر علیہ السلام کی ذات اور ان کی تعلیمات کے کسی اور کی زندگی اور تعلیم کی حفاظت کا نہ وعدہ ہے، اور نہ ضرورت! ہر ایک کی کچھ باتیں قابل قبول ہوتی ہیں، اور کچھ قابل حذف! صرف سرکار رسالت مآب علیہ السلام کی ذات اور بات اس سے مستثنیٰ ہے، حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنا اپنا دور پورا کرچکے، اب ان کی طرف منسوب باتیں بھی جب تک نبی آخرالزماں ﷺ کے دربار سے سند تصدیق نہ پالیں، معتبر نہیں ہوسکتیں، اس لئے بجز آپ ﷺ کی ذات اور آپ کی

زندگی کے کسی اور کی زندگی کا ہر ہر جز نہ محفوظ ہو سکتا نہ زیر بحث لایا جا سکتا، اور نہ اس کی ضرورت ہے، اس لئے جو کچھ نہیں ملا، وہ چنداں قابل افسوس نہیں، ہاں جو کچھ موجود ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ قابل انتفاع بنانا چاہئے۔ ویسے حضرت نانوتویؒ کے علوم اتنے غامض اور دقیق ہیں کہ ان کی تسہیل و تلخیص بھی آسان نہیں ہے، یہ علوم صرف عقول عالیہ کے لئے مفید ہیں۔ ایک بار میں نے بہت محنت کی، اور ''تصفیۃ العقائد'' کے ایک بڑے حصہ کی تسہیل کی، مگر اس پر مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ اس لئے چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ بہت کوشش اور محنت سے ''قبلہ نما'' اول سے آخر تک بہت غور کر کے پڑھی، ایمان تو تازہ ہوا۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اسے عام لوگوں کے سامنے کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے، عام لوگوں سے مراد اہل علم کا عام طبقہ ہے، میں تو اس عام طبقہ میں بھی شمار ہونے کے لائق نہیں ہوں۔ لیکن اللہ سے مدد مانگ کر پوری پڑھ ڈالی تھی، بہت سے اجزاء تو سمجھ میں آئے ہی نہیں، اور جو کچھ سمجھ میں آیا، اسے محفوظ نہیں رکھ سکا، اس کے بعد ''مصابیح التراویح'' پڑھی، اور یہ کتاب ایک بار نہیں متعدد بار پڑھی، بہت حد تک قابو میں بھی آ گئی، مگر اخیر کی بعض بحثیں بالکل نہیں سمجھ میں آئیں۔ ایک مدت تک دعا کرتا رہا، پھر از سر نو محنت کی، اللہ تعالیٰ نے یاوری فرمائی۔ یہ علوم اتنی گہرائی میں اترے ہوئے ہیں، یا اتنی بلندی پر ہیں، کہ میں سوچتا رہا کہ دل بھی قبول کرتا ہے، عقل بھی تسلیم کرتی ہے، لیکن ہے تو انسانی دماغ کی کاوش! معلوم نہیں عند اللہ ان علوم کا کیا حال ہے؟ ایک روز اسی حال کے غلبہ میں آنکھ لگ گئی تو ایک غیبی آواز سنائی دی کہ ''جو کچھ مولانا نے لکھا ہے، سب من عند اللہ ہے'' اس صدائے غیبی سے بہت انشراح ہوا تھا۔ میں تو ابتداء ہی سے حضرت مولانا کا نہایت درجہ معتقد ہوں۔ مگر علوم ہی کچھ ایسے ہیں، جن کا حضرت مولانا سے پہلے امت میں شاید کسی نے اظہار نہیں کیا ہے، نہ

حضرت مجدد صاحب نے اور نہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے!

میرے اس طولِ کلام کا حاصل یہ ہے کہ حضرت کے علوم سے مناسبت پیدا کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ اس کا کوئی طریقہ آپ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا کی نگاہ میں احکام اسلام کی تمام لِمّیَاتُ روشن ہیں۔ اور مولانا سیدھے انھیں لِمّیَاتُ پر پہونچتے ہیں، وہ حکمت پر کلام نہیں کرتے، لِم پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور لِمّیَاتُ کی فہم اسی شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جس کو عالم غیب سے خاصی مناسبت ہو۔ مولانا تو اسی عالم کے معلوم ہوتے ہیں اور باقی اکثر لوگ اس مناسبت سے خالی ہیں۔ اس لئے عام طور پر ذہن کی رسائی وہاں تک ہوتی ہی نہیں، جہاں سے مولانا گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے متعدد شواہد مولانا کی زندگی کے واقعات میں ملتے ہیں۔ بہر حال جتنا کچھ آپ نے جمع کر دیا ہے، ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول عطا فرمائے۔ آمین

آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ خط لمبا ہوگیا۔ پڑھنے میں بھی وقت لگے گا، زحمت بھی ہوگی۔ لیکن

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

....

☆☆☆☆☆

بنام حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے امتحان داخلہ کے سلسلے میں یہ خط مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ کو لکھا گیا، یہ مکتوب اور حضرت مہتمم صاحب کا جواب دونوں پیش کئے جارہے ہیں۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

مخدومنا المکرّم حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند! زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی

یہ حقیر بندہ، دارالعلوم دیوبند کا ادنیٰ منتسب، بہت عرصہ سے جناب والا کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا، لیکن اتنا چھوٹا منہ رکھتا ہے کہ جناب والا کے شایانِ شان اس سے کوئی بات ادا ہو، اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن اس سال خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند کے امتحانِ داخلہ کے نتائج کچھ ایسے سامنے آئے کہ باوجود کسی لیاقت اور استحقاق کے نہ ہونے کے کچھ عرض ومعروض کرنے کی ہمت ہو چلی تھی، اسی دوران رسالہ دارالعلوم دیوبند کا تازہ شمارہ موصول

ہوا۔ اس کے حرفِ آغاز نے مزید تحریک پیدا کی، اور ہمت دلائی، اس لئے چند باتیں خدمت میں عرض کرنے کی جرأت کررہا ہوں، یہ کسی معاند کی عیب چینی یا کسی ناتجربہ کار کی اٹکل پچو باتیں نہیں ہیں، اور نہ کسی مدعی کی لاف وگزاف ہے، کہ اسے ناقابل اعتنا سمجھا جائے۔ اس لئے بجا طور پر مجھے امید ہے کہ ان معروضات پر ضرور غور فرمائیں گے۔

یہ حقیر تقریباً ۲۵؍سال سے علم دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، اور تدریس سے وابستہ ہے، اور ہر سال بلاانقطاع طلبہ کو تیار کر کے درجۂ ہفتم کیلئے بھیجتا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے پڑھائے ہوئے طلبہ تقریباً نوے، پچانوے فیصد دارالعلوم سے کامیاب ہوکر نکلے ہیں، اور یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ ان میں تقریباً اسی تناسب سے علم دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنے تجربہ کے بعد اگر میں کچھ عرض کروں، تو انشاء اللہ بات بیجا نہ ہوگی۔

(۱)............سب سے پہلے مجھے امتحانِ داخلہ کے بارے کچھ عرض کرنا ہے، دارالعلوم دیوبند میں پہلے امتحان داخلہ تقریری ہوا کرتا تھا، بعد میں اسے موقوف کر کے امتحانِ داخلہ تحریری کردیا گیا، اور یہ خیال کیا گیا کہ امتحان تقریری کی صورت میں، بعض خرابیاں جو داخلہ کے سلسلے میں راہ پاجاتی تھیں، ان کا اس سے انسداد ہوجائے گا، اور بہت کچھ انسداد ہوا بھی، اس سلسلے میں دارالعلوم میں بہت سے احتیاطی اقدامات کئے گئے تاہم کچھ نہ کچھ کمی کوتاہی کا رہ جانا فطری امر ہے۔ لیکن امتحان کے نتائج جب سامنے آتے ہیں، تو بعض چیزیں بہت زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں، اور اس سال اس کا احساس زیادہ شدت سے ہوا۔ ہم لوگ کئی کئی سال تک طلبہ کو پڑھا کر بھیجتے ہیں۔ ان کی استعداد سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، سالہاسال کے امتحانات کے ریکارڈ

ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کے توقعات خلاف جب ان کے نتائج آتے ہیں، تو اچنبھا ہوتا ہے، کہ ایک طالب علم کو ہم جانتے ہیں کہ پڑھنے میں اچھا ہے، امتحان کا پرچہ بھی اچھا لکھتا ہے، لیکن نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ فیل ہے، یا تقابل میں گر گیا، اور بعض دوسرے، جن کو محض ان کے شوق کی بنا پر دارالعلوم بھیج دیا جاتا ہے، وہ داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اگر اس طرح کے واقعات استثنائی ہوں، تو زیادہ قابلِ التفات نہیں ہوتے، لیکن جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو خیال ہوتا ہے کہ امتحان کے نظام میں کچھ خلل ضرور ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے۔

اس سال کی بات عرض کروں کہ میرے مدرسہ سے ۱۵ ر طالب علم دارالعلوم میں ہفتم کے امتحانِ داخلہ میں شریک ہوئے، جن میں چار کی استعداد عمدہ ہے، اور پانچ کی استعداد کمزور ہے، اور باقی متوسط ہیں۔ جن کی استعداد کمزور ہے ان میں سے چار کا داخلہ دارالعلوم میں ہوگیا۔ اور شاید چاروں کا امدادی داخلہ ہے۔ چار جیدالاستعداد طلبہ میں ایک کا امدادی داخلہ ہوا، دو کا غیر امدادی، اور ایک کا ہوا ہی نہیں، بعد میں کسی استاذ کی سفارش سے ہوا۔ متوسط طلبہ میں تین کا داخلہ نہیں ہوا، باقی کا کچھ کا امدادی اور کچھ کا غیر امدادی ہوگیا۔ یہ تو میرے مدرسہ کا حال ہے، قریب پاس کے دوسرے مدارس مثلاً مدرسہ منبع العلوم خیر آباد، اور مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا کہ جن طالب علموں کے داخلہ کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ان کا داخلہ ہوگیا، اور اچھے طلبہ رہ گئے، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہفتم میں داخلہ کیلئے ایک ایسے مدرسہ سے اس سال کثیر تعداد میں طلبہ گئے، جہاں جلالین شریف نہیں پڑھائی جاتی ہے، اور یوں بھی وہاں کا معیار تعلیم کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، اس کے باوجود وہاں کے طلبہ کی کامیابی کا تناسب غالباً ہر جگہ سے زائد تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ،

جو طلبہ با قاعدہ ہر کتاب پڑھ کر گئے۔ انھوں نے محنت بھی خوب کی، میں جانتا ہوں کہ دارالعلوم جانے والے طلبہ رمضان کس طرح محنت میں گزارتے ہیں۔ خود میرے پاس محنت کرنے والوں کی ایک جماعت پورے ماہِ مبارک میں مقیم رہتی ہے۔ مگر یہ تو رہ جائیں، اور جنھوں نے جلالین شریف پڑھی نہیں اور پڑھی تو چند پاروں سے آگے نہیں بڑھے۔ وہ کامیاب ہو جائیں۔

اس صورت حال سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ کمی ضرور ہے، اس سال خصوصیت سے مجھے دو باتوں کا احتمال ہو رہا ہے جن کے اہتمام میں کمی ہوئی ہے، یا اہتمام کے باوجود اس پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ اول یہ کہ امتحان ہال میں شریکِ امتحان طلبہ کی نگرانی اچھی طرح نہیں ہوئی۔ نگرانی میں تساہل کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کمزور طلبہ جن کا سہارا نقل بازی ہوتی ہے، وہ تو اپنا فن آزماتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں اور دوسرے طلبہ جو نقل سے احتراز کرتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں، دوسری بات غالباً یہ ہوئی ہے کہ...... اور اسی کا اندیشہ مجھے زیادہ ہے..... امتحان کی کاپیاں با قاعدہ غور سے پڑھی نہیں گئیں، آج کل اساتذۂ دارالعلوم نے خوش خطی کو زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جو طالب علم خوشخط رہے ہیں۔ خواہ ان کا جواب کسی لائق رہا ہو، کامیاب ہو گئے۔ اور جن کا خط کمزور رہا۔ وہ ناکام ہو گئے۔ پھر یہ کہ کاپیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ شاید آغازِ کار میں ذرا اہتمام سے دیکھ لیتے ہوں۔ اس کے بعد سرسری طور پر نمبر لگا دیا جاتا ہو۔ ہم لوگوں میں کام کرنے کا نہیں کام ٹالنے کا مزاج بنتا جا رہا ہے۔ مجھ کو احساس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں باتیں امتحان کے نظام کو متاثر کر رہی ہیں۔

(۲)............ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہے کہ امتحان کے نتائج اور تقابل کے سلسلے میں الگ الگ صوبوں کے الگ الگ قانون ہیں۔ کسی صوبہ کے طالبعلموں کو

تقابل میں شامل کیا جاتا ہے، کسی صوبے کے طلبہ بغیر تقابل کے لے لئے جاتے ہیں۔ کسی جگہ کے لئے ریز رویشن ہے اور کسی جگہ کے لئے نہیں ہے۔ کہیں کے طلبہ کم نمبر کے باوجود لے لئے جاتے ہیں۔ اور کہیں کے طلبہ زیادہ نمبر کے باوجود رہ جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا کرنے میں کچھ مجبوری ہو، مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے، اس امتیازی سلوک کا انجام یہ ہوگا کہ جن مقامات کو آسانی دی گئی ہے وہاں کے بچے کبھی محنت وکاوش نہیں کریں گے، اور محنت کرنے والے دارالعلوم کے داخلے سے محروم رہیں گے تو ان کا دل دکھے گا۔ دارالعلوم میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے طلبہ پر جو گزرتی ہے، اس سے جناب والا خوب واقف ہوں گے۔ یہ دونوں باتیں دارالعلوم کے حق میں سخت مضر ہیں۔ میرے خیال میں کوٹہ، ریز رویشن اور امتیازی سلوک ختم کر کے تمام طلبہ کو ایک ضابطہ کے تحت رکھا جائے، تاکہ ہر جگہ کے طلبہ محنت کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

(۳) تیسری بات، دارالعلوم میں طلبہ کی تعطیلات کا مسئلہ خاصا قابل توجہ ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، دارالعلوم میں دورانِ تعلیم سوائے عیدالاضحیٰ کے اور کوئی بڑی تعطیل نہیں ہے، لیکن طلبہ ہیں کہ عیدالاضحیٰ پر تو خیر گھر آتے ہی ہیں، اس کے علاوہ ششماہی امتحان اور دوسرے ہنگامی مواقع پر اس طرح دارالعلوم سے باہر آجاتے ہیں جیسے کوئی بڑی تعطیل ہوگئی ہو۔ گزشتہ سال اساتذۂ دارالعلوم بمبئی کے اجلاس میں چلے گئے، تو طلبہ نے اپنے گھروں کا رُخ کرلیا۔ اور عیدالاضحیٰ کی تعطیل کا یہ حال ہے کہ ابھی ذی قعدہ کی رمق باقی رہتی ہے کہ طلبہ اپنے گھروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ایک اچھا خاصا وقفہ گزار کر مدرسہ پہونچتے ہیں، جبکہ مدرسہ میں تعلیم ۶/۵ ذی الحجہ تک ہوتی رہتی ہے، پھر جب یہ طلبہ چھٹی کا اعلان کرتے ہوئے، اپنے سابق مدرسوں میں

پہونچتے ہیں، تو وہاں بھی تعطیل کی فضا پیدا کر دیتے ہیں، اس کے نتیجے میں تعلیم میں کمزوری آجاتی ہے۔ یہ صورت حال علم کیلئے جتنی مضر ہے محتاجِ بیان نہیں، تعطیلات پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے، تعطیل کی کثرت سے محنت ومشقت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اور علم کی ناقدری ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم ہورہی ہے، اور طلبہ میرٹھ، دلی اور سہارن پور کا سفر کررہے ہیں، کہیں جلسہ یا مشاعرہ ہے وہاں بھاگے جارہے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض ناگہانی حادثات ہوچکے ہیں اور اس طرح پڑھنے پڑھانے کا ماحول بالکل نہیں بن پاتا، وہ طلبہ جو ہم لوگوں کی نگرانی میں خاصی محنت کر چکے ہوتے ہیں، دارالعلوم میں پہونچ کر ان کا دل اچاٹ سا ہوجاتا ہے، اس ماحول کی اصلاح ضروری ہے۔ گو یہ عمل خاصا دقت طلب ہے لیکن اس کو کرنا ضروری ہے، اس کیلئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے، آپ حضرات وہاں کے ماحول کے لحاظ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں تاہم ضرورت ہوگی تو مناسب مشورے دئے جاسکتے ہیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی
۸؍ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆

حضرت مہتمم صاحب کا جواب

مکرمی محترمی زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے!

گرامی نامہ نظر نواز ہوا، خوشی ہوئی کہ آپ نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند

سے تعلق کی بنا پر اہم امور کی طرف توجہ دلائی، جن میں بعض وہ ہیں جن کا ذمہ دارانِ دارالعلوم دیوبند کو خود بھی احساس ہو رہا ہے، اور ان کے سدِ باب کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

امتحانِ داخلہ کے بارے میں نا اہل طلبہ کی کامیابی و اہل کی ناکامی کی وجوہ کی طرف توجہ دلائی ہے، طلبہ داخلہ کے لئے تین ہزار سے زائد آئے، مسجدِ جدید کے تہ خانہ اور بالائی منزل کے کچھ حصہ میں امتحان کا نظم کیا گیا تھا، پوری مسجد میں نظم نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ پنجوقتہ نماز ہوتی ہے (کثیر تعداد میں نمازی ہوتے ہیں) اس لئے سیٹوں میں زیادہ فاصلہ نہیں دیا جاسکا، اور نگرانی بھی اتنے بڑے مجمع کی پورے طور سے نہ ہوسکی۔

دوسرے یہ کہ پرچہ بینی کے سلسلے میں اساتذہ کرام سے کثیر تعداد میں پرچوں کی بنا پر کماحقہٗ پرچہ بینی میں تساہل ہوا ہو، بہر حال ان امور کے سدِ باب کی طرف آئندہ پوری توجہ دی جائے گی۔ کوڈ سسٹم ہونے کی بنا پر کسی حد تک نظم قابو میں آیا ہے اور جو خامیاں ہیں، ان کو بھی دور کرنے کی آئندہ سال کوشش کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بعض صوبہ جات میں رزرویشن اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان صوبہ جات میں دینی تعلیم کی طرف رجحان کم ہے، کم تعداد میں طلبہ آتے ہیں، اس لئے وہاں کے طلبہ کو رعایت دی جاتی ہے، اسی طرح تقابلی نمبرات کا معاملہ ہے، بعض مقامات اس سے مستثنیٰ قرار دئے گئے ہیں، مگر یہ مسئلہ انتظامیہ کے زیر غور ہے کہ کہ اب اس رعایت کو ختم ہونا چاہئے۔

تعطیل عیدالاضحیٰ کے موقع پر طلبہ کے قبل از وقت جانے اور بعد از وقت آنے پر پابندی عائد کی جاتی ہے، مگر طلبہ کے پاس پیسے ہیں، کنشیشن فارم معینہ تاریخ سے

دئے جاتے ہیں، کچھ طلبہ اس سے قبل پورے ٹکٹ پر چلے جاتے ہیں اور تاخیر سے آتے ہیں، اس مرتبہ اعلان لگا دیا تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد آنے والوں کے کھانے بند کر دئے جائیں گے، اور سیٹ کاٹ دی جائے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ تقریباً سبھی طلبہ مقررہ تاریخ پر آ گئے، چند ہی باقی رہے ہوں گے، دفتر اہتمام کو مطبخ میں کھانا لینے والوں کی روزانہ رپورٹ سے اندازہ ہوتا رہتا ہے، تین ہزار طلبہ کی تعداد ہے سب پر نظر رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

آپ نے ازراہِ تعلق جن خامیوں کے ازالے کی طرف توجہ دلائی ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں، اور آپ کے گرامی نامہ کو جناب ناظم صاحب تعلیمات کے پاس بھیج رہا ہوں، کہ وہ ان خامیوں کے ازالے کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں، امید ہے کہ آئندہ بھی مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے، دعا گو ہوں، اور دعاؤں کا طالب، دعوات صالحہ میں یاد فرماتے رہیں،

والسلام

مرغوب الرحمٰن عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

بنام حاجی محمد ایوب صاحب مرحوم (کلکتہ)

۱۹۸۲ء میں مَیں پہلی مرتبہ کلکتہ گیا۔ وہاں مجھے اسّی پچاسی برس کے ایک بوڑھے بزرگ ملے، بہت دیندار اور نمازی! چندسال پہلے ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا، مگر ان کی یاد، ان کی محبت اور ان کی جدائی کا صدمہ ابھی اس طرح تازہ تھا کہ کل کی بات معلوم ہوتی تھی۔ شاید اسی لئے مرنے کا بہت شوق تھا کہ دوبارہ ملاقات ہوگی اور دائمی ہوگی۔ مجھ سے بڑی مناسبت ہوئی، مسلسل مراسلت جاری رہی۔ اولاد کی نالائقی سے پریشان رہتے ہیں، محبت بھرا شکایتی خط موصول ہوا تھا، اسی کا جواب لکھا گیا۔ ان کا تذکرہ میری کتاب ”کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔“ میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ (ص:۶۷تا۹۳) اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاجی مخدوم ومحترم!   عافاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ عشق وتعلق کچھ بے باک اور کچھ گستاخ ہوتا ہی ہے۔ آپ کی ''تحریرِ پریشاں'' اسی جذب وشوق کی علامت ہے، جس کی قندیل آپ کے قلب وجگر میں فروزاں ہے۔ یہ ایسا جذب ہے جس پر خدا کو بھی پیار آتا ہوگا، بچوں جیسی ضد، عورتوں جیسی ہٹ، بوڑھوں جیسی تکرار، آخر خدا کو بھی اپنے بندوں پر پیار آتا ہی ہے، جانتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی روٹھے، کتنا ہی بگڑے، کچھ ہی کہے، کتنا ہی بھاگے، ان کا در چھوڑ کر، ان کی چوکھٹ سے ہٹ کر اور کہیں جانے کا سوال ہی نہیں۔ وہیں رہنا ہے، وہیں مرنا ہے، اور وہیں سر دیئے پڑے رہنا ہے، بھلا پھر اسی جگہ شور مچائے، چیخے، چلائے تو کیا مضائقہ ہے، آپ روتے رہئے، وہ ہنستے رہیں۔ اگر یہی ہوتا رہے تو کیا حرج ہے؟ ہمارا رونا اگر کسی کو مسکرانے پر مجبور کردے تو ہم اور روئیں گے، کسی کا کیا؟ ان کا ایک تبسم ہمارے تمام آنسوؤں کی بیش قرار قیمت ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ صبر کہاں سے لاؤں؟ میں کہتا ہوں صبر آپ کو لانے کی کیا ضرورت؟ وہ تو آپ کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، اس کی مجال کیا کہ آپ سے جدا ہوجائے۔ ایک اور بزرگ آپ ہی کے ہمنام پہلے بھی گزرے ہیں، پہلے بڑے خوش حال اور صاحب جمال وکمال تھے، پھر جب صبر نے ان کا پیچھا کیا تو پروردگار کو بھی کہہ دینا پڑا: **إنا وجدناه صابراً نعم العبد إنهٗ أواب**۔ ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔ بڑا اچھا بندہ تھا، وہ ہمیں سے کہتا تھا جو کچھ اس پر پڑتی تھی۔ آخر انھیں کے نام پر آپ کا نام جو رکھا گیا تو کچھ

مناسبت بھی ہونی چاہئے یا نہیں۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **إن الله لايضيع أجر المحسنين** ۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی اجر دیتے ہیں، کیا روزی کا ملنا، اہل محبت کا میسر آنا، نماز روزہ کی توفیق ہوتے رہنا، ان کا نام زبان سے لیتے رہنا، یہ کچھ کم انعامات ہیں۔ اور یہ بھی تو ہے کہ اگر بھلائیوں کا کچھ اجر مل جاتا ہے تو برائیوں کی بھی کچھ کچھ سزا مل جاتی ہے، اسی سے توازن برقرار رہتا ہے، اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے تو یہ اثر ہے ان گناہوں کا جن میں کچھ کو تو ہمارا حافظہ یاد رکھتا ہے، اور بہت کچھ اس زود فراموش کو فراموش ہوجاتا ہے۔ پھر کیا حرج ہے؟ کچھ اس کا ظہور ہو اور کچھ اس کی نمود ہو، آخر دنیا نام ہی ہے رنج وراحت، خوشی وغم، مصیبت ونعمت، ذلت وعزت، فقر وغنا، ضعف وقوت اور حیات وممات کا، اس سے کہاں مفر؟ ہاں انتظار کیجئے اس وقت اور اس جگہ کا جہاں راحت ہوگی رنج نہیں، خوشی ہوگی غم نہیں، نعمت ہوگی مصیبت نہیں، عزت ہوگی ذلت نہیں، غنا ہوگا فقر نہیں، قوت ہوگی ضعف نہیں، حیات ہوگی ممات نہیں۔ وہ نعمتیں جو دوسری جگہ کے لئے ہیں آپ یہیں انھیں کھینچ بلانا چاہتے ہیں، بھلا کیونکر ممکن ہے؟

پھر غور تو کیجئے، اگر آپ کا عشق گستاخ وبے باک ہے تو اس کا حسن بھی تو بے پروا اور چالاک ہے، اگر اس حسن مطلق نے آپ کے عشق بے باک کے آگے سپر ڈال دی تو وہ حسن کس کام کا، اور پھر سوچئے کہ اس حادثہ پر عشق کو کس درجہ ندامت وشرمندگی ہوگی، اس کے بعد تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گا۔ آخر جو خدا ہے اسی کو آپ خدائی کے درجہ سے اتار کر بندگی کی جانب کیوں لانا چاہتے ہیں، بتایئے! اگر وہ آپ کی اطاعت کو اپنے لئے ضروری کرلیں تو کون خدا رہا اور کون بندہ؟ آپ کو اور ہم کو جو شکایت ہے وہ یہی تو ہے کہ ہم جو جاہل ہیں، آگے کی کچھ خبر نہیں رکھتے، پیچھے کو

بھلائے بیٹھے ہیں...... ہم جو اول و آخر جاہل ہیں...... اس ’’ہم‘‘ کی اطاعت وہ کرے جو آگے کی بھی خبر رکھتا ہے اور پچھلا نامۂ اعمال بھی اس کے حفاظت خانہ میں محفوظ ہے، وہی جو اول و آخر عالم ہے، ایسا عالم جس کے اندر جہل و ناواقفی کا نام و نشان نہیں، یعنی کہ علم تابع ہو جائے جہل کے، قوت سپر ڈال دے ضعف کے سامنے، طاقت شکست کھا جائے کمزوری سے، سوچیے اگر حکمت و مصلحت نے ناعاقبت اندیشی سے ہار مان لی تو وہ کیسی حکمت و مصلحت ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ دعاء کا اثر دنیا میں کیوں نہیں ہوتا، میں پوچھتا ہوں کہ کب نہیں ہوتا اور کہاں نہیں ہوتا، ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ آپ کو بھی تجربہ ہے اور مجھے بھی تجربہ ہے۔ بچے نے ابا سے ایک پیسہ مانگا، ابا نے اس کو اشرفی دیدی، بچہ ضد کرتا ہے کہ ابا نے میری مانگ ٹھکرادی۔ ارے ٹھکرائی کہاں؟ تمہاری نادانی میں کس درجہ دانائی کا اضافہ کردیا۔ یونہی سوچیے کہ آپ اپنی سوچ مانگ رہے ہیں اور وہ آپ کی مصلحت دے رہے ہیں، آج آپ کا مانگا ہوا مطالبہ مل جائے، اور کل آپ اسے بھول بیٹھیں، کون ضمانت لے سکتا ہے، نہیں دیتے جو کچھ آپ مانگ رہے ہیں تاکہ کل آپ مزید مانگیں، روئیں، گڑگڑائیں اور آنسو بہائیں۔ دیدیتے تو آپ یہ نعمتیں کہاں سے لاتے، ہاں دیا اور بہت کچھ دیا۔ اپنی یاد دی، اپنے سے دعا کرنا دیا، رونا دیا، آنسو دیا، اور نہ جانے کیا کیا دیا؟ شکر کیجیے، بہت کچھ اسی دنیا میں دیا، اور یہ چیزیں دی ہیں جو خود مزدوری اور اُجرت بھی ہیں اور خود عمل اور کوشش بھی، کہ پھر ان پر دوبارہ سہ بارہ اور تسلسل کے ساتھ ملنے اور ملتے رہنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

آپ نے سمجھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، دیکھئے آپ نے ایک عمل کیا اور اس کی اجرت مل گئی، ایسی اجرت جو محض اجرت ہے، پیسہ لیا اور گھر چل دئے، جس کا کام کیا

اس سے کوئی مطلب نہیں رہا۔ ایک تو یہ ہوا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے ایک کام کیا، کام کرانے والے نے یہ کہا کہ تم اچھے آدمی ہو، تم ہمارے گھر ہی رہو، یہ قرب ونزدیکی بھی اجرت ہے لیکن کیسی اجرت؟ کیا اس ایک اجرت سے بے شمار اجرتیں وجود میں نہیں آ جائیں گی؟ پھر ہمارا مالک وخالق جس سے ہمیں دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبت وتعلق ہے، جس کے جذبۂ عشق نے ہمیں پوری زندگی کی مصیبت جھیلنے پر آمادہ کر رکھا ہے، جس کی ایک نگاہِ رضا وخوشنودی کے لئے ہم دوجہاں کی قربانی بڑی مسرت کے ساتھ دے سکتے ہیں، وہی ہمارا محبوب ومعبود ہے، وہی ہمارا منظور ومسجود ہے، وہی ہمارا خدا ہے، ہم اس سے ایک بات کہتے ہیں، ایک چیز مانگتے ہیں، اس لئے مانگتے ہیں کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ وہ چیز ہمارے حق میں مفید ہے یا مضر، پھر وہی محبوب ہم سے کہتا ہے کہ ہٹو میاں کیا مانگتے ہو، ہماری ڈیوڑھی پر پڑے رہو، دھوپ کھاؤ، سردی گرمی جھیلو، تکلیف اٹھاؤ، لیکن ہمارے دامنِ قُرب سے چمٹے رہو۔ خدا کی قسم کتنی بڑی دولت ہے، نگاہِ اِلتفات تو ہوئی، ہماری مانگی ہوئی چیز پر خاک ہو، ہمیں تو دوسرا ہی سرا ہاتھ آ گیا۔ ان بزرگ کا قصہ آپ نے سنا ہے نا کہ پہاڑی میں راستہ گم ہو گیا تھا، سردی نے پریشان کر رکھا تھا۔ نگاہیں گرمیٔ آتش تلاش کر رہی تھیں۔ وادیٔ طور سے ایک چمک دکھائی دی، لپکے ہوئے گئے کہ آگ لائیں، لیکن وہاں گرمیٔ آتش کے بجائے گرمی محبت مل گئی، پھر کیا ان کو شکایت ہوئی کہ مجھے آگ نہیں دی گئی۔ انسان خدا سے اپنی حاجت کا سوال کرتا ہے، خدا کی جانب سے اسے مزید عجز ونیاز کا تحفہ مل جاتا ہے۔ ہائے! کوئی اس دولت سرمدی کی قدر کیا جانے، ان سوختہ سامانوں سے پوچھئے، جنھیں اس کی لذت سے آشنائی بخشی گئی ہے۔ ایک گرم گرم آنسو جو نگاہِ عجز ونیاز سے ڈھلک پڑے، ان تمام دولتوں سے بڑھ کر ہے جنھیں انسان اپنی نادانی سے دولت

سمجھتا ہے۔ بہنے دیجئے، ہرگز نہ پونچھئے، یہاں تک کہ انھیں کا دست شفقت آگے آئے اور آنسو بھی پونچھے اور معذرت بھی کرے، ہا! کتنا مزہ آئے گا، اس وقت جب وہ خود بندوں سے معذرت کریں گے کہ معاف کرنا بھئی میں نے تمہاری مانگی ہوئی چیز نہ دی، تو تمہیں تکلیف ہوئی، اب لے لو جو کچھ لینا ہو، بھلا کہاں اس کا سرور، اور کہاں لذتِ فانی کی عارضی خوشی۔

بس صاحب! کاغذ ختم ہوگیا، پھر کبھی باتیں ہوں گی۔ آپ کی آنکھیں دُکھ جائیں گی۔ میرے لئے بھی ایک آدھ آنسو گرا دیجئے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۳/ ذوقعدہ ۱۴۰۴ھ

شوکت منزل، میاں پورہ، غازی پور

☆☆☆☆☆

مخدومی ومکرمی جناب الحاج محمد ایوب صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں، شاید مل گیا ہوگا، اس کے بعد آپ کے دو خط ملے، کل ابوذر کو زمانیہ بھیجا تھا کہ جا کر آپ کا خط اور روپیہ لائے، کل وہیں روک لیا گیا، آج آیا، تو آپ کا خط لایا۔ روپیہ اب بھی نہیں مل سکا، اشتیاق حسین ہی لے کر شاید آئیں گے۔

آپ جس رنج وکرب کی داستان لکھتے ہیں اس سے کلیجہ شق ہوتا ہے، دل چاہتا ہے کہ آپ کا غم بانٹ لوں، کاش کہ یہ چیز بانٹنے کی ہوتی؟ لیکن آپ سے کیا

عرض کروں؟ درد وغم بظاہر تو سخت اور ناگوار چیز ہے، مگر آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ نعمت ہر کسی کو نہیں ملتی، خاص خاص خوش نصیبوں کا نصیب ہوتا ہے کہ یہ متاع، گرانمایہ انھیں نصیب ہوتی ہے، درد وغم وہ جذبۂ لطیف ہے جو عشق ومحبت کے سوز نہاں سے پیدا ہوتا ہے، جہاں محبت ہوگی، درد ہوگا۔ جہاں عشق ہوگا، غم ہوگا۔ غم ہی سے زندگی ہے، غم نہیں تو سب کچھ بے معنی اور بے سود ہے، آپ نے سنا ہے؟

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

غم واندوہ میں جب انسان تڑپتا ہے، تو یہ تڑپنا بھی عجب پُر لطف ہوتا ہے؎

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

آپ خیال کیجئے، حضرت بلال سوختہ دل (رضی اللہ عنہ) سے جب پوچھا گیا، اور اس وقت پوچھا گیا، جب ہر طرح کی نعمتیں انھیں میسر تھیں، کلفت ومشقت کی بدلیاں چھٹ چکیں تھیں۔ راحت وآرام کی فراوانی تھی۔ پوچھنے والے نے اس وقت پوچھا، جب بلال دنیا میں ہر طرح مطمئن تھے کہ حضرت! آپ کا یہ دور زیادہ فرحت بخش ہے، جب غم کا کانٹا نکل چکا ہے، یا وہ دور بہتر تھا جس کا لمحہ لمحہ اذیت ناک تھا۔ جب لونڈوں کے ہاتھ میں پتھر ہوتا، اور آپ کے جسم نیم برہنہ پر مشق ستم ہوتی، اوپر سے سورج چمکتا ہوتا، نیچے آگ دہکتی ہوتی۔ گلے میں رسی کا پھندا ہوتا، اور مکہ کی گلیاں آپ کے گرم خون سے سیراب ہوتیں۔ آپ بتایئے وہ وقت کیسا تھا اور یہ وقت کیسا ہے؟ ایک آہِ سرد بھری اور فرمایا، اس وقت کی لذت کیا ہو چھتے ہو؟ جب بدن زخموں سے چور ہوتا، جسم کے ہر ہر حصے پر خون کی نالیاں رواں ہوتیں، درد کی کسک اٹھتی، زخموں میں ٹیس ہوتی، جراحتیں سوزشِ نہاں سے بے چین کرتیں، ظاہری

سہارے مستور ہوتے، اس وقت جس دردوسوز کے ساتھ نام پاک ’’ أحــد أحــد ‘‘ زبان دل سے ادا ہوتا، اس کی حلاوت اور اس کا لطف کچھ نہ پوچھو۔ آج اس لذت کا تصور مشکل ہے، اور دل میں حسرت ہوتی ہے اے کاش.....................

کسی نے آپ ہی کے ہم نام بزرگ حضرت ایوب علیہ السلام سے بھی اسی قسم کا سوال کیا تھا، ارشاد فرمایا کہ ہر صبح وشام محبوب حقیقی کی جانب سے مزاج پُرسی ہوتی تھی۔ اس لذت کے آگے کلفت ومحنت کا ذکر؟ دل میں جوش محبت ہو پھر کیا کہنا؟

آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا　　ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا

ہائے! کیا عرض کروں؟ محبت کی معرفت ذرا مشکل ہے، ورنہ لطف وکرم کی وہ فراوانی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے،

اللہ اگر توفیق نہ دے اللہ کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

غم کی بھٹی جتنی سلگتی جائے گی، دل کی طہارت بڑھتی جائے گی۔ آپ سر جھکا دیجئے ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دیکھتے رہئے، کس کس طرح وہ الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں، ان کی ہر نگاہ، نگاہِ کرم ہے، ہر التفات، التفاتِ عنایت ہے، وہ اگر کسی کو موافق بنادیں تو انعام وبخشش ہے، کسی کو مخالف بنادیں تو توجہٴ خاص کی نشانی ہے، کہ ہر طرف سے کاٹ کر اپنے دروازہ پر رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سچ بتائیے! ان دنوں جبکہ ایک بے چارگی اور مجبوری کے عالم میں ان کا نامِ پاک زبان پر رواں ہوتا ہے، اس میں لذت وحلاوت کی جو کیفیت محسوس ہوتی ہے، دوسرے احوال میں کبھی محسوس ہوئی۔ آپ کی پریشانی سے

میں ضرور پریشان ہوتا ہوں، لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں کچھ الٹا قلب لایا ہوں، جس سے سارا عالم راحت وآرام محسوس کرتا ہے، مجھے اس سے وحشت ہوتی ہے، اور جس کو لوگ رنج وغم سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے میرے قلب وجگر کو زندگی حاصل ہوتی ہے، آنکھیں جب خشک ہوتی ہیں، تو زندگی بھی دھواں دھواں ہو جاتی ہے اور محبت جب دل میں چٹکیاں لیتی ہے، تو آنکھیں برسنا شروع کر دیتی ہیں، پھر سبزۂ حیات لہلہانے لگتا ہے، جس کی زندگی غم واندوہ سے خالی دیکھتا ہوں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ زندہ بھی ہے یا موت کی گہرائیوں میں فنا ہو چکا ہے، اور جسے تڑپتا، روتا اور فریاد کرتا پاتا ہوں، سمجھ جاتا ہوں کہ پہلو میں کچھ ہے، جو چین لینے نہیں دیتا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں تو مصیبت میں ہوں، اور یہ کیا کیا لکھے جا رہا ہے۔ سنئے! یہ مصیبت نہیں ہے، محبوب کی چھیڑ چھاڑ ہے، اور چھیڑ چھاڑ عاشق دیوانہ ہی سے کی جاتی ہے، آپ تو دیوانے ہیں؟ کس کے؟ آہ! اس کے دیوانے ہیں، جس کے لئے دیوانہ ہونا، زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہے، جب دوسری دنیا میں آنکھ کھلے گی، تو آپ دیکھیں گے یہ ساری کلفتیں میزانِ عمل پر گراں تر تلیں گی۔ ایک کا ہزاروں بھاؤ رہے گا۔

اس سے پہلے خط میں میں نے ایک بات لکھی تھی کہ جن محترمہ جب تک جلد جلد آتی رہیں گی، منزل دور رہے گی، اور جب عرصہ تک ان کا آنا موقوف ہوگا، تو منزل قریب ہوگی۔ آپ نے آخری خط میں یہی خبر دی ہے کہ انھوں نے آنا بند کر رکھا ہے، لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ابھی جانے کا قصد مت کیجئے۔ میرا ارادہ جلد ہی آپ کی زیارت کرنے کا ہے، کم از کم ایک بار اور ملاقات ہو لے، پھر رُخصت ہوئیے گا۔ آپ کی نگاہِ محبت ایک بار اور میرے اوپر پڑنی چاہئے۔ مجھے آپ سے میراث میں محبت ہی لینی ہے۔ آپ کچھ تو مجھے دیں گے، میں اسی جذبہ کا بھوکا ہوں۔

اور آپ کے یہاں اس متاعِ گرانمایہ کی فراوانی ہے، للہ مجھے کچھ دے کر جایئے گا، اب یہ جنس دنیا میں نایاب ہوتی جارہی ہے۔ ایک بار اور آپ کی ملاقات کا آرزومند ہوں۔ آپ جلدی نہ کیجئے، آنے والی اپنے وقت پر آئے گی۔

نہ گھبرا اے دل..............................

یہ بندۂ گنہگار، نالائق ونافرمان، آپ کے لئے ہر روز دعا کرتا ہے، اور خوب جی لگا کر کرتا ہے، آپ بےفکر رہیں۔ ہاں آپ بھی دعا کرتے رہئے گا، اس نالائق کے لئے بھی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۴؍ربیع الاول ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بنام ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ صاحب

ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب اس دور میں متاعِ دردوغم، سرورِ عشق ومحبت، جذبۂ خلوص و بے نفسی اور انسانیت وشرافت کی ایک روشن علامت ہیں۔ بہار کا یہ مظلوم انسان جس نے ابتداء جوانی میں فسادیوں، رہزنوں اور قاتلوں کے ہاتھوں اپنے پورے خاندان، اپنی پوری بستی بلکہ ایک خطے کے خطے کو برباد ہوتے دیکھا۔ دردوغم کی اَنی دل میں اتری اور ٹوٹ کر رہ گئی، اس درد کی کسک کو انھوں نے شعروادب کا پیکر عطا کرکے دنیا والوں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کیا، خاموش مگر نہایت گہری سوچ والے، یکسو مگر کام کی ہر چیز پر وسیع نگاہ رکھنے والے، ان کی کتاب ’’جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی‘‘ سے تعارف ہوا، وہی ذریعۂ ملاقات بنی، ان کی غزلوں کے مجموعہ ’’وہ جوشاعری کا سبب ہوا‘‘ نے ان کے دل کی ترجمانی کی، بس وہ اپنے اس شعر کے ہو بہو مصداق ہیں ؎

کیسے کیسے دکھ نہیں جھیلے، کیا کیا چوٹ نہ کھائے
پھر بھی پیار نہ چھوٹا ہم سے عادت بری بلائے

دنیا کا اپنے انداز کا نرالا البیلا انسان، نہایت دیندار، بہت ہی پُرسوز، ان کا البیلا پن، ان کا جذبۂ بیداری اور ان کا سوزِ دروں، جب الفاظ کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے تو ادب وانشاء کا ایک نیا اُسلوب جنت نگاہ بنتا ہے۔ ان کے خطوط کبھی میرے نام اور زیادہ تر عزیزی مولوی حافظ ضیاء الحق سلّمہٗ کے نام آتے رہتے ہیں، ایک مرتبہ ان کا خط عزیز موصوف کے پاس آیا، جس میں عصر حاضر کے دانشوروں کی طرف سے ناقدری کا شکوہ تھا، میں نے وہ خط ان سے لے لیا اور درج ذیل جواب لکھا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

محترم ومکرم! اللّٰہ عافاکم وبارک فی عمرکم

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

آپ کا کرم نامہ عزیزم مولوی ضیاء الحق سلّمہٗ کے نام آیا، انھوں نے ملاحظہ کیلئے مجھے بھی دیا، اس خط نے میرے دل میں درد کی ایک دنیا جگادی۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا، کوئی رابطہ نہ پیدا کرسکا۔ بقرعید کے بعد ایک روز تھوڑی دیر کے لئے پھلواری شریف، کربلا میں حاضری ہوئی تھی، آپ کے بارے میں معلوم کیا، کسی نے بتایا کہ آپ نے مکان بدل لیا ہے، کسی طرح ٹیلیفون سے رابطہ ہوا، تو اطلاع ملی کہ آپ موجود نہیں ہیں، حسرتِ دید تھی، وہ دل ہی میں رہ گئی، اب آپ کا یہ خط پڑھ رہا ہوں، اور دل کے ٹکڑے اڑنے کا تماشہ دیکھ رہا ہوں، یا خود تماشا بن رہا ہوں۔

”دیوانے دو۔۔۔۔۔“ اور ”دفتر گم گشتہ“ (۱) موصول ہوئی تھی، چند مجلسوں میں پوری پڑھ لی، اور محبت وانس کے اتھاہ سمندر میں ڈوب ڈوب گیا، جب ذرا کنارہ میسر آیا، تو خیال ہوا کہ اس پر کچھ لکھوں، مگر محبت ہی کا فرشتہ ہے جس نے مجھے گویا اُڑن کھٹولے پر بیٹھا رکھا ہے، صبح کہیں، شام کہیں، دن کہیں، رات کہیں، اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ فرصت خیال ہی نہ رہی، نہ قرطاس وقلم کی محفل جمی، اور اب تو اس کا خیال بھی دل سے محو ہو رہا تھا کہ اچانک آپ کے خط نے تازیانہ لگایا۔ تبصرہ کیا لکھوں، اس کی صلاحیت کہاں سے لاؤں، قلم کی زبان سے آپ سے گفتگو ہی کرلوں، محبت کا چراغ آپ نے روشن کیا ہے، اس سے اپنے خانۂ دل میں روشنی کرلوں۔

آپ نے محبت اور درد کی صدا لگائی۔ آپ نے اسے اپنی غزلوں میں، نظموں میں، نثری تحریروں میں عام کیا ہے، کوئی اسے زبان سے مانے یا نہ مانے، مگر دل پر

ایک چوٹ سی لگتی ہے، ایسی چوٹ جس میں لذت بھی ہے، حلاوت بھی ہے، ایسی چوٹ کہ اس سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے، یہ زخم کبھی نہ بھرے، یہ چوٹ کبھی نہ اچھی ہو، یہی جی چاہتا ہے، آپ کی یہ صدا دلوں میں جگہ بنا رہی ہے، پڑھنے والے پڑھتے ہیں، اور پڑھ کر دیوانہ ہوتے ہیں، اور دیوانہ ہوتے رہیں گے۔ محبت خدا کے پاس سے چلی ہے، بڑی پاکیزہ، بڑی دل آویز، بڑی روشن، پھر یہ خاص خاص دلوں کو اپنا نشیمن بناتی ہے، پھر وہاں سے نکل نکل کر بارش کی طرح برستی ہے، اور سب اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ظرف کے بقدر فیضیاب ہوتے ہیں، آپ فراموش ہو جائیں، کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ممکن نہیں ہے، عشق و محبت کا سرمایہ دار مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، دلوں میں زندہ رہتا ہے، یادوں میں زندہ رہتا ہے، حق تعالیٰ نے آپ کو یہ دولت دے کر لازوال بنا دیا ہے، موتی تو موتی ہے، اس کی آب وتاب ہر حال میں باقی رہتی ہے، اس کی قدر وہی کرے گا، جو اس کی پہچان رکھتا ہے، اور اگر ناقدروں نے اس کی قدر نہیں کی تو، قصور موتی کا نہیں ناقدروں کی کورنگاہی کا ہے۔ پیغمبروں کا ان کی قوموں نے انکار کیا، تو اس سے پیغمبروں کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں آئی، قوموں نے اپنی آبرو کھوئی، پیغمبر اپنی محنت کا صلہ اس بارگاہ سے پاتا ہے، جس کے لئے اس نے اپنی جان کھپائی تھی، وہ تو ابتداء ہی میں اعلان کر دیتا ہے: إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللهِ، ”میری قدردانی اللہ کے حوالے ہے“ دنیا میں کیا ہے؟ یہاں جو کچھ ہے، وہ درد ہے، دکھ ہے، چوٹ ہے، تڑپ ہے، زخم ہے، ایک زخم بھر نہیں چکتا کہ دوسرا لگ جاتا ہے، ساری زندگی چوٹ کو سہلاتے اور زخم پر ناکام مرہم رکھتے گذر جاتی ہے، پھر دنیا کی یہ ناکامیاں، نامرادیاں، ناکارگیاں، جب بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائیں گی، تو انھیں ٹھیک عکس کر دیا جائے گا، اتنا بڑھایا جائے گا کہ یہ زخم خوردہ انسان، یہ ناکام آدمی

بول اٹھے گا کہ پروردگار! یہ تو اس سے بہت زیادہ ہے، جو میں سوچ سکتا تھا، وہاں سے ارشاد ہوگا، ابھی کیا؟ بس چاہتے جاؤ، مانگتے جاؤ، انسان کا حوصلہ تمام ہوجائے گا، تب ندا آئے گی: وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ، ابھی تو ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔

آپ نے سچ کہا، اور صحیح محسوس کیا کہ پہلے جو محبت دکھائی دے رہی تھی، اب وہ حسد و نفاق میں بدل گئی ہے، بالکل بجا! محبت کے لئے کچھ مخصوص دل ہوتے ہیں، (۲) اور حسد ہر دل کو اپنا آشیانہ بنانے کی فکر میں رہتا ہے، اور عموماً وہ کامیاب رہتا ہے، محبت غیور ہے، وہ حسد و نفاق کو آتا ہوا دیکھتی ہے تو رُخصت ہوجاتی ہے، حسد بے حیا ہے، وہ ہر جگہ گھستا ہے، آپ نے جس قوم کا تذکرہ کیا ہے، اس کا تمام تر رشتہ حسد اور خودغرضی ہی سے ہے، وہ نام محبت کا ضرور لیتی ہے، لیکن کلام میں رنگ بھرنے کے لئے! برتنے کے لئے نہیں، برتنا جگر کاوی کا عمل ہے، بات بنانی آسان ہے۔ وہاں تمام جلوہ گری حسد اور نفاق کی ہے، اور اس میں وہ معذور ہے، اس نے محبت کا نام سنا ہے اسے سیکھا نہیں ہے، اس لئے اس کی زندگی اندر سے تاریک ہوتی ہے، چراغ باہر جل رہا ہے، اندر روشنی نہیں ہے۔

لیکن ہمارا رشتہ ان ہستیوں سے ہے، جن کی نگاہ بجز ربّ کائنات کے کسی پر پڑی ہی نہیں، مخلوق پر اگر نظر ڈالی تو ترحم و تلطف کی نظر ڈالی، فقر و احتیاج کی نہیں، وہ دے کر خوش ہوتے ہیں، لینے کا جذبہ نہیں رکھتے، شہرت ان کے قدموں کو چھونا چاہتی ہے، وہ اسے ٹھکرا دیتے ہیں۔

خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مکے کی گلیوں میں، حرم شریف کے صحن میں، ایک دیوانے کو تلاش کر رہے تھے، انھیں اس سے ملنے کا اشتیاق تھا، انھوں نے زبانِ نبوت سے اس کی تعریف سنی

تھی ، بالآخر وہ دیوانہ مل گیا ، وہ اپنی سرمستی میں طواف کر رہا تھا ، طواف کر چکا تو امیر المومنین نے اس کا راستہ روکا ، دیوانہ نکلا جا رہا تھا ، مگر امیر المومنین کی جلالت قدر نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا ، تعارف ہوا ، دعا کی درخواست ہوئی ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائش کی ، اویس ! کچھ نصیحت کرو ، عرض کیا ، آپ صحابیٔ رسول ! میں آپ کے پاؤں کی دھول ! میں کیا نصیحت کروں ، فرمایا نہیں کچھ تو کہو ، دیوانہ تو دیوانہ مگر بات کی ہشیاری کی ، حضرت ! آپ خدا کو جانتے ہیں ؟ ہاں کیوں نہیں ، اپنی بساط بھر جانتا پہچانتا ہوں ، دیوانہ بولا پھر آپ خدا کے علاوہ کسی اور کو نہ جانیں تو اچھا ہے ، حضرت عمر پر سکتہ سا طاری ہونے لگا ۔ اور حضرت ! اللہ تعالیٰ آپ کو جانتے ہیں ؟ ہاں کیوں نہیں ، انھیں ذرے ذرے کی خبر ہے ، دیوانہ پھر بولا ، تو اگر آپ کو خدائے تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہ جانے تو اچھا ہے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے ، اور دیوانہ اپنی شوریدگی میں کسی طرف نکل گیا ۔

میرے سامنے ایک شخصیت ہے ، بچپن اس کا محبت کی معصوم فضاؤں میں گذرا ۔ جوانی آئی تو گردشِ زمانہ نے سخت ٹھوکر لگائی ، مگر سنبھالنے والا اسے سنبھالے رہا ۔ اب اس کا بڑھاپا ہے ، آفتابِ عمر لب بام آ گیا ہے ، اب کوئی دم ہے کہ کانوں میں يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ إِرْجِعِیْ إِلٰی رَبِّکِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (اے نفس مطمئنہ ! اب اپنے رب کے حضور لوٹ چل ، اس حال میں لوٹ چل کہ تو بھی راضی اور وہ بھی راضی) کی صدائے دلنواز گونجنے والی ہے ، اور وہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ (میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا) کی رہنمائی میں انھیں لوگوں کے جھرمٹ میں جا پہونچے گی ، جس کی یاد میں اس نے آنسو دریا دریا بہائے ہیں ، زندگی تڑپ تڑپ کر بسر کی ہے ، اور سب کے ساتھ مل کر وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (میری جنت داخل ہو جا) کا روح پرور نغمہ سنتے ہوئے جنت میں جا داخل ہوگی ، جہاں ناقدری کی شکایت نہ ہوگی !

ایسی شخصیت کو بھلا یہاں کے ناقدروں سے کیا شکوہ؟

اس نے سب کے ساتھ پیار کیا ہے اور کئے جا رہا ہے، اس نے دشمن کو گلے لگایا ہے، اس نے کانٹوں کو پھول سمجھ کر اٹھایا ہے، اس نے زخموں سے بھی پیار کیا ہے، اور زخم دینے والے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیا ہے، آخر اسی نے تو کہا ہے۔ ؎

کیسے کیسے دکھ نہیں جھیلے کیا کیا چوٹ نہ کھائے
پھر بھی پیار نہ چھوٹا ہم سے، عادت بری بلائے

دیکھئے! میں بھی دیوانہ ہوا جا رہا ہوں، کیا کیا لکھتا چلا گیا، لقمان کو حکمت سکھانے ایک طفل مکتب چلا ہے، بس خاموش آگے حدِ ادب! لیکن کیا کروں، آپ کے نامۂ محبت نے دل کی رگوں پر نشتر لگایا، تو میں نے بھی لہو کو آزاد چھوڑ دیا کہ بہہ لے جتنا بہہ سکے، اب اسے آپ جانیں کہ یہ لہو رائیگاں گیا یا کچھ رنگ لائے گا۔ **والسلام**

دعاؤں کا ملتجی
اعجاز احمد اعظمی

۲۸/ربیع الآخر ۱۴۲۱ھ مطابق ۳۱/جولائی ۲۰۰۰ء یکشنبہ

(۱) دیوانے دو۔۔۔ڈاکٹر صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے بہار کے گورنر جگناتھ کوشل کو لکھے۔ ''دفتر گم گشتہ'' ڈاکٹر صاحب کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس کا عنوان ہے ''بہار میں اردو شاعری کارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ (مرتب)

(۲) اس جملے کو پڑھ کر بے ساختہ مخمور سعیدی کا یہ شعر یاد آ گیا، (مرتب) ؎

محبت کیلئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

☆☆☆☆☆

بنام مولانا عبدالمنان صاحب مظفر پوری مدظلہ

دارالعلوم دیوبند کے نہایت نیک نام، ذی استعداد، صوفی صافی طالب علم! ۱۹۶۸ء میں مَیں دارالعلوم دیوبند پہونچا تو یہ دورہ سے فارغ ہوکر مولانا وحیدالزماں صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ ادب عربی وانشاء کی صف نہائی میں شامل تھے، اسی وقت سے میرا اُن سے گہرا رابطہ ہوا۔ ایک سال کے بعد دارالعلوم حسینیہ، چلّہ امروہہ میں استاذ بن کر تشریف لے گئے، اس خاکسار کو وہیں ان سے باقاعدہ تلمذ حاصل ہوا۔ اب اپنے ضلع سیتامڑھی میں ایک عربی مدرسہ کے بانی اور مہتمم ہیں، نیز حضرت مولانا ابرارالحق صاحب علیہ الرحمہ کے خلیفہ ہیں۔ اس مجموعہ میں تاریخ کے اعتبار سے سب سے پہلا خط یہی ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

اس خط سے اس وقت کے اُسلوبِ کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس وقت کے خطوط تقریباً سب کے سب ضائع ہوگئے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استاذی المحترم! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خاکسار آپ کی دعواتِ صالحہ کے طفیل بخیر وعافیت ہے، آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا، بیتی ہوئی گھڑیوں کی یادیں لوحِ ذہن پر ابھر آئیں، طبیعت بے چین ہوگئی،

کاش وہ لمحات پھر میسر آسکیں۔

آپ کے پُرخلوص مبارکباد نے شرف بخشا، شکریہ، آپ نے دعا کا حکم دیا، آپ میری دعا کی قبولیت کے لئے دعا فرمائیں۔

میرے مخدوم! زندگی کے دوعشرے گذر چکے، کس طرح گذرے، کاش میں بھول سکتا، کاش رب العزت معاف فرمادیتا، اور اپنی مہربانی سے بقیہ کو شریعت کے اصول پر ڈھال دیتا، ورنہ ماحول کی ظلمت ناکی، نفس امارہ کی سرکشی، طبیعت کی کمزوری، یقین کا ضعف، دورِ نبوت کا بعد، بدعات کا شیوع، سنن کا اندراس، علوم کا انحطاط، غرض چند در چند اسباب انسان کو قعر ضلالت میں پھینکنے والے مجتمع ہیں۔ وہ بڑا صاحب ہمت ہے، جو ان حالات میں بھی مردانہ وار رسول مقبول ﷺ کی تابعداری کے لئے کوشاں ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اس فاقد الہمت ضعیف وناتواں کے لئے دعاء فرمائیں، اور یہی عرض حضرۃ الاستاذ مولانا سید عبدالحی دام ظلہٗ کی خدمت میں پیش کردیں، **لعل اللہ یرزقنی صلاحاً**، اور نیازمندانہ سلام بھی، حضرۃ الاستاد کے منصب اہتمام پر آجانے کی اطلاع استاذ محترم مولانا افضال الحق صاحب زید مجدھم کی زبانی مل چکی تھی، نہ جانے صدارت کس کی ہے؟

باقی سب خیریت ہے، ایک ماہ ہوا، بڑی ہمشیرہ راہی ملک بقاء ہوئی، اس کے لئے دعاء مغفرت فرمائیں، دوسری سخت علیل ہے، اس کے لئے دعاء صحت۔

نیازمند
اعجاز احمد اعظمی
۲۹؍ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ

☆☆☆☆☆

بنام
والد محترم الحاج محمد شعیب صاحب کوثر اعظمی علیہ الرحمہ

والد محترم علیہ الرحمہ کے نام خط لکھنے کا کم اتفاق ہوا۔ مدرسہ دینیہ غازی پور کے زمانۂ تدریس میں والد مرحوم کو ایک موذی دشمن کے ساتھ ابتلاء پیش آیا۔ اس نے عرصہ تک انھیں بہت ستایا، والد صاحب کا مزاج خاموشی اور درگزر کا تھا، انھوں نے بہت صبر کیا، کبھی کبھی جب ایذا حد سے گزر جاتی تو مجھے مختصر لفظوں میں اطلاع فرماتے اور تسلی دعا کا حکم دیتے۔ اسی طرح کے خطوط کے جواب میں میرے یہ تین خط ہیں، ان کے کاغذات میں دستیاب ہوئے، ان تینوں کا موضوع ایک ہی ہے۔

(اعجاز احمد اعظمی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جنابِ والد صاحب قبلہ! **دام برکاتہم**

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی

گرامی نامہ ملا، حالات سے بہت رنج ہوا۔ گھر آئے واقعی بہت دن ہو گئے، کئی مرتبہ شدید تقاضا بھی پیدا ہوا، مگر امتحان کی مصروفیات اور بعض دوسرے مشاغل حارج ہوتے رہے، اب امتحان ختم ہو رہا ہے، سنیچر تک مصروفیات ہیں۔ الہ آباد سے حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہ نے امتحان کے سلسلے میں طلب فرمایا ہے، نیز یہ کہ وہ ۲۰؍ شعبان سے قبل ہی بمبئی غالباً تشریف لے جانے والے ہیں، اس بنا پر یہاں سے فارغ ہو کر دو ایک روز کے لئے الہ آباد جانے کا خیال ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک ہفتہ کی اور تاخیر ہو، میں الہ آباد حاضر ہو کر حضرت سے سارے حالات کہہ کر دعا کی درخواست کروں گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہم لوگوں کی خدا کی جانب سے آزمائش ہے، ہر زمانے میں خداوند کریم کا یہ دستور رہا ہے کہ جو بندے اپنی زندگی اللہ ورسول کی اطاعت وفرمانبرداری میں گزارنے کا عہد باندھتے ہیں ان کی جانچ اور پرکھ مختلف مصائب اور بلاؤں میں مبتلا کر کے فرماتے ہیں، کہ پختگی کا ذریعہ اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہے۔ نیز ان مصائب کی بھٹی میں انسان کے معاصی وذنوب کو جلانا بھی مقصود ہوتا ہے جن کی موجودگی میں خدا سے ملے تو عذابِ آخرت کا مستحق ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندہ ان سب سے پاک وصاف ہو کر خدا کے پاس پہونچے، نیز حدیث میں آتا ہے کہ بعض بندے اپنی عبادت وریاضت سے اس مقام ومرتبہ تک نہیں پہونچ

پاتے جہاں تک پہونچانا خدا کو منظور ہوتا ہے، تو ان پر بلاؤں کا اور مصائب کا نزول ہوتا ہے۔ بندہ ان پر صبر کرتا ہے اور درجہ علیا تک پہونچ جاتا ہے۔ بہرکیف یہ حالات جہاں ایک طرف بہت صبر آزما ہوتے ہیں وہیں رحمت الٰہی کو بہت کھینچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ حالات سب گزر ہی جاتے ہیں، صبر اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، یہ سب امور چندروزہ ہیں، صرف زندگی تک۔ اللہ کے بندے سخت سخت آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے ہیں، بالآخر کامیابی انھیں کی ہوئی ہے۔

میں آپ سے کیا عرض کروں، حدیث میں ہے کہ جس بندے کی جانب اللہ کی نظر رحمت ہوتی ہے اس پر مصائب کی یورش ہوجاتی ہے، شاید اللہ تعالیٰ چاہتے ہوں کہ نعمتوں میں پڑ کر ہماری جانب ویسی توجہ نہیں رکھ سکے گا جیسی وہ چاہتے ہیں۔ مصائب ہر وقت انسان کو خدا کی جانب متوجہ رکھتے ہیں۔ حالات وواقعات سے متاثر ہونا، تکلیف کا محسوس کرنا تو انسان کی فطرت ہے، مگر ہر حال میں صابر شاکر رہنا اور اللہ کی ہر تقدیر پر راضی رہنا خدا کا حکم ہے۔ انسان کیا کرے مجبور ہے، صبر وتسلیم کے سوا چارہ نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کی جانب سے ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ وقت ہی پر کام ہوگا، ہمارا کام ہے پکارے جانا، ہم جلدی چاہتے ہیں، اللہ کے یہاں مہلت ہے، توقف ہے۔ وہ معاملات ہم سے بہتر جانتے ہیں، مجھے اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ اس معاملہ کا آخری انجام ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ میں کیا اور میری دعا کیا، مگر برابر مصروفِ دعا ہوں۔ اللہ میری اور آپ کی دعائیں قبول فرمائے۔ آمین

والسلام

اعجاز احمد اعظمی　　۱۰؍شعبان ۱۳۹۷ھ

☆☆☆☆☆

قبلہ محترم جناب والد صاحب! دام مجدھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ بخیریت ہوں۔ جب سے بارش ہوئی ہے طبیعت گھر کی جانب بہت زیادہ متوجہ رہتی ہے کہ معلوم نہیں وہاں کی صورت حال کیا ہے؟ برابر اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ہر طرح عافیت حاصل رہے، تاہم یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ ایک امتحان اور آزمائش ہے، اور یہاں کے امتحان کی آخری میعاد وہ دن ہے جبکہ آدمی اس دارِ فانی سے کوچ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ یہاں تو آدمی کشاکش میں رہتا ہی ہے، آخرت کا آرام اور وہاں کا عیش یہاں کی تکلیف ومصیبت کے بقدر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُولٰئِکَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

(ہم تم کو کسی قدر خوف، بھوک اور جان ومال اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو، جن کا حال یہ ہے کہ جب انھیں مصیبت لاحق ہوتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں (وہ جو چاہیں تصرف کرسکتے ہیں) اور ہم انھیں کی جانب لوٹنے والے ہیں (پھر ان پر یہ انعام ہے کہ) ان کے رب کی طرف سے خاص خاص رحمتیں ہیں اور عام رحمت بھی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ امر تک) رسائی ہوگئی ہے۔

اس میں سب سے پہلے خوف کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد دشمنوں کا خوف ہے جو آدمی کی نیند اُڑا دیتا ہے، اور غالباً یہی آزمائش سب سے سخت ہے کہ اس میں آدمی کئی طرح سے تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی وقت اطمینان میسر نہیں

آتا، ہروقت طبیعت میں اسی کی ادھیڑ بُن لگی رہتی ہے، دوسرے دشمن پر غصہ کی وجہ سے ہروقت طبیعت میں آگ بھری رہتی ہے جس کا کرب ظاہر ہے، تیسرے جان و مال کا جو نقصان ہوتا ہے اس کی تکلیف مستقل سوہانِ روح رہتی ہے، چوتھے وقت کی بربادی ہے، اور اسی طرح سے بہت سے ضروری کاموں کا رہ جانا، اور فضول بلکہ کبھی کبھی معصیت تک کے کاموں میں مبتلا ہو جانا، بس چاروں طرف سے مصیبت ہی جمع ہو جاتی ہے۔

اسی بناء پر اگر آدمی اس مصیبت میں ثابت قدم رہے اور شریعت پر جما رہے تو اجر بھی سب سے زیادہ ہے، جب تک اس میں معصیت نہ شامل ہو جائے آخرت کے اعتبار سے بلکہ دنیا کے لحاظ سے بھی رحمت ہی رحمت ہے۔ حدیث میں دعا ہے: **لَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا** (مناجات مقبول منزل دوم) یعنی اے اللہ! ہمارے دین میں مصیبت نہ بھیجو۔

حضرت شیخ الہندؒ کو جب انگریزوں نے گرفتار کیا تو فرمایا کہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے، خدا کا شکر ہے کہ ایک مصیبت میں گرفتار ہوں نہ کہ کسی معصیت میں۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ قوت و ہمت عطا فرمائی ہے جو خاص خاص لوگوں کو عطا ہوئی ہے، آپ کی تکلیف دیکھتا ہوں اور پھر صبر استقلال دیکھتا ہوں تو بے اختیار فرطِ جذبات سے آفریں نکلتی ہے کہ ایک شخص مستقل ایذا دہی کے لئے مقرر ہے۔

حضرت شیخ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ”**التحدیث بالنعمة**“ میں لکھا ہے کہ:

ومما أنعم الله به علیَّ أن أقام لی عدواً یوذینی ویمزق فی عرضی لیکون لی أسوة بالانبیاء والاولیاء، قال رسول الله ﷺ أشد

الناس بلاء الانبياء ثم العلماء ثم الصالحون۔

منجملہ ان انعامات کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرمائے ہیں ایک یہ ہے کہ میرے لئے ایک دشمن کھڑا کر دیا جو مجھ کو ایذا پہونچاتا رہتا ہے اور میری عزت پارہ پارہ کرتا رہتا ہے، تاکہ انبیاء و اولیاء کا اتباع اور ان کی اقتداء مجھے اس باب میں حاصل ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر علماء کی، پھر صالحین کی۔

تالیفاتِ مصلح الامت پڑھتے ہوئے ایک جگہ یہ عبارت نظر سے گذری، جی میں آیا کہ آپ کو تحریر کر دوں، کہ بعینہٖ یہی حال آپ کے سامنے بھی ہے، حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ اس پر فرماتے ہیں:

> ’’اس سے معلوم ہوا کہ مخالفین کا ہونا، مخالفت کیا جانا اور اس پر صبر کرنا، یہ سب بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت اور ان کا اُسوہ ہے، اور جن لوگوں کے ساتھ یہ معاملات پیش آئیں وہ خوش ہوں کہ الحمد للہ ان کو تَـاَسِّیُ (اور اقتداء) انبیاء علیہم السلام کی حاصل ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ چیزیں خدا کی طرف سے بطور امتحان پیش آتی ہیں، اور اسی سے ان کو نمبر اور مرتبہ ملتا ہے اور وقتی و عارضی ہوتی ہیں، چنانچہ یہ وقت گذر جاتا ہے اور یہ حضرات کامیاب ہو جاتے ہیں اور تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، مگر اس کو سمجھنا اور جھیل لینا یہ بھی اللہ کے فضل ہی سے ہوتا ہے۔‘‘

سبحان اللہ! کیا عمدہ تسلی بخش مضمون ہے، تاہم اس کے ساتھ عافیت کی دعاء بھی مسنون ہے، حضور اقدس ﷺ نے عافیت کی دعا ان لفظوں میں مانگی ہے: اَللّٰھُمَّ

إِنِّيُ أَسُأَلُکَ الُعَفُوَ وَالُعَافِيَةَ فِيُ دِيُنِي وَدُنُيَايَ وَأَهُلِيُ وَمَالِي (مناجات مقبول منزل سوم) اے اللہ! میں اپنے دین، دنیا، اہل اور مال میں معافی اور امن کا سوال کرتا ہوں۔ میں دل سے یہی دعا کرتا ہوں اور روز کرتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی ارشاد ہے: أَسُأَلُ اللهَ الُعَافِيَةَ فِيُ الدُّنُيَا وَالُآخِرَةِ۔ میں اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی دعاء اس قدر پسند نہیں جتنی عافیت کی دعاء، انسان بہرحال انسان ہے، رنج وغم سے متاثر ہوتا ہی ہے، یہ تو اس کے لئے لازم ہے، اسی لئے صبر کی تلقین کے ساتھ اللہ رب العزت نے فریادوزاری کا بھی حکم دیا ہے اور دونوں ہی سے ترقیٔ درجات ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں یہ دعاء آئی ہے: یاأرحم الراحمین إلیٰ من تکلنی إلیٰ عدوٍ یتجهمنی أم إلیٰ قریبٍ ملکته أمری إن لم تکن ساخطاً علیّ فلاأبالی غیر أن عافیتک أوسع لی۔ (مناجات مقبول منزل سوم) اے ارحم الراحمین! آپ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں، کسی دشمن کے جو مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے یا کسی عزیز وقریب کے جس کو آپ نے میرے معاملے کا مالک بنادیا ہے۔ اگر آپ کی مجھ پر ناراضگی نہ ہو تو مجھے کوئی فکر نہیں، تاہم آپ کی عافیت بہت وسیع ہے۔

یہ دعا آپ نے اس وقت کی ہے جبکہ طائف میں آپ کو سخت تکلیف پہونچائی گئی تھی۔ دیکھئے اس میں اولاً تو عزیمت ہے کہ اگر آپ ناراض نہیں تو پھر مجھے کسی تکلیف کی پرواہ نہیں ہے، مگر پھر اپنے ضعف اور اللہ کی قدرت پر نظر کرکے عافیت کی درخواست بھی پیش کردی۔

بہرکیف اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو اُمور پیش آتے ہیں ان میں خیر ہی خیر ہے، خواہ اس کو ہم نہ سمجھ سکیں، حسن عاقبت تو ان شاء اللہ عقبیٰ میں نظر آئے گی۔

ایک کارڈ دریافتِ احوال کے لئے لکھنے بیٹھا تھا، لکھنا شروع کیا تھا کہ یہ مضامین ذہن میں آ گئے، سوچا کہ لکھ ہی دوں، شاید کچھ موجب تسلی ہوں۔

۱۵/ شعبان تک یہاں امتحان ختم ہو رہا ہے، اس کے بعد انشاء اللہ گھر آؤں گا، رمضان شریف میں بعض مصلحتوں کی بناء پر الہ آباد ہی رہنے کی ضرورت ہے، اب جو اللہ کو منظور ہو، دعاؤں کا طالب ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یکم/ شعبان ۱۳۹۸ھ

☆☆☆☆☆

حضرت والدی المحترم! دام مجدھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک خط لکھ چکا ہوں، ملا ہوگا، آج آپ کا خط ملا۔ حالات کی اطلاع سے شدید صدمہ ہوا، بہت دیر تک اکیلا کمرہ میں پڑا فریاد و فغاں کرتا رہا۔ میرا ارادہ گھر آنے کا تھا، مگر وسائل اجازت نہیں دیتے اس لئے مجبور ہوں۔ میں برابر آپ کے حق میں دعاء کیا کرتا ہوں، کبھی غافل نہیں ہوتا۔ لیکن موجودہ مکتوب سے جو آپ کی حالت دریافت ہوئی اس سے سخت پریشان ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ رنج پیہم کے جو دھچکے آپ کو لگ رہے ہیں اس کو جھیل لینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ضرور کوئی لغزش ایسی ہے جس کو ہم نہیں جانتے مگر وہ دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن رہی ہے۔

والدی المحترم! یہ بات بلاشبہ درست ہے کہ ہم لوگ خطاؤں اور گناہوں کے پیکر ہیں۔ اگر ہم اللہ کے نیک بندوں کی زندگیوں سے اپنی زندگی کا مقابلہ کریں تو

ذرہ وآفتاب کی نسبت بھی نہیں ہے، لیکن بحکم حدیث مظلوم تو اگر کافر بھی ہو تب بھی اس کی دعا رد نہیں ہوتی، اور اس کا بدترین کفر بھی مقبولیت کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ وہ سیدھی عرشِ الٰہی کو جا چھوتی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اجابت دعاء کی راہ میں نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ تردد، بس بات صرف اتنی سی ہے کہ ہر کام کا اللہ کے نزدیک ایک وقت مقرر ہے، جس کو وہی جانتا ہے، اس وقت وہ کام یقیناً ہوگا، اس سے پہلے نہیں ہوگا۔ ارشاد ہے: وَلِکُلِّ اُمَّةٍ أَجَلٍ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَایَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَایَسْتَقْدِمُوْنَ۔ ہر جماعت کیلئے ایک مدت مقرر ہے، اس سے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

دعائیں سب ان کے حضور باریاب ہوتی ہیں، وہ سمیع وعلیم ہیں، رحیم وکریم ہیں۔ فرماتے ہیں: وَإِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَإِنِّیْ قَرِیْبٌ أُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ اور جب میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (کہدو) کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کو منظور کرتا ہوں جب وہ پکارتے ہیں۔

وہ علیم وقدیر ہیں، سمیع وبصیر ہیں، رحیم وکریم ہیں، مگر حکیم وحلیم بھی ہیں۔ ان کی حکمت کا شاید یہی تقاضا ہو کہ حالات چندے ناموافق رہیں، امداد واعانت میں قدرے تاخیر ہو، اور اس میں مصلحت یہ ہو کہ خشیت وانابت، تضرع وزاری، عجز و بیچارگی اور فریاد وفغاں کی جو مقدار ان کے نزدیک مطلوب ہوتی ہے کبھی اس میں کمی رہ جاتی ہے۔ شاید اس طرح اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کٹھن اوقات اور شدید حالات کی یہ بھٹی ایسی ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف گناہوں اور معصیتوں کے انبار جل کر راکھ سیاہ ہو جاتے ہیں، وہیں گریہ وزاری، تضرع وفریاد اور نالۂ وفغاں کی وہ دولت بے بہا بھی حاصل ہو جاتی ہے جو اللہ کو بے حد محبوب

ہے، اور اس سے مقبولیت کے بے انتہا درجات سے آدمی سرفراز ہوجاتا ہے، لیکن کیا کیجئے کہ یہ عظیم دولت راحت و آرام اور مسرت وخوشی کے ایام میں میسر نہیں آتی، اس لئے بلاؤں کا نزول وہجوم ہوتا ہے، کہ انسان اس سے محروم نہ رہ جائے۔ ایک صحابی سے حضور ﷺ نے خود ارشاد فرمایا جنھوں نے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے کہ: میاں! پھر تو مصائب کے لئے تیار ہوجاؤ، کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت رکھے گا اس کی جانب مصائب کا سیلاب اس طرح آئے گا جیسے نشیبی زمین میں پانی کی تیز رَو! نیز احادیث و آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن مقبول کی دعاؤں کی قبولیت میں اس لئے تاخیر ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل کو اس کا رونا اور آنسو بہانا بہت محبوب ہے۔ آنکھ جب اللہ کی محبت اور خوف سے آنسو بہانے سے بخل کرتی ہے تو دوسرے حالات پیدا کر کے آنسوؤں کا بند کھولتے ہیں، پھر انھیں اپنے فضل وکرم سے اشک محبت اور گریۂ خوف کے عوض قبول کر لیتے ہیں۔ اللہ اللہ کیسی مہربانی ہے، ورنہ تو معلوم ہے کہ اللہ کی محبت وخوف سے رونے اور مصائب دنیا کے ہجوم سے آنسو بہانے میں زمین وآسمان کا فرق ہے، لیکن کل ہم دیکھ لیں گے کہ جہاں اشکہائے محبت اور سرشکہائے شوق کو خونِ شہداء کے برابر قبولیت حاصل ہورہی ہے وہیں مصیبت زدہ اور ظلم وستم رسیدہ لوگوں کے گریہ ہائے پیہم کی بھی وہی قیمت لگ رہی ہے، اور مسلسل نوازش و رحمت کی بارش ہورہی ہے، سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا ٹھکانا ہے فضل خداوندی کا۔

اے خدا قربانِ احسانت شوم   ایں چہ احسانست قربانت شوم [

آپ اپنے قلب کو مضبوط رکھیں، اور یقین رکھیں کہ جو فیصلہ ہوگا ہمارے حق میں بہتر ہوگا، بالکل ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص اپنی شقاوت و بدبختی پر مہریں لگائے جارہا ہے، یہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہے جو اس کو کھا جائے گی۔ آپ عبادات و

نوافل جس قدر ادا کرتے ہیں، کرتے رہئے، مگر اپنے اوپر زیادہ بار نہ ڈالئے، صحت وقوت کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولات واوراد مقرر کیجئے۔ اللہ کے یہاں کثرتِ عبادت پر اتنی نظر نہیں جتنی شکستگیٔ قلب پر۔ وہ الحمد للہ آپ کو حاصل ہے، جی چاہے تو چلتے پھرتے اور جب موقع ملے یہ دعا کثرت سے پڑھتے رہئے۔ حضور ﷺ نے دفع غم کے لئے اس کو تعلیم فرمایا ہے:

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۔

میں برابر دعا کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا ان شاء اللہ۔ حضرت کے آنے میں تو تاخیر ہے، ان کو بھی دعاء کیلئے لکھ رہا ہوں۔ ۲۳؍نومبر کی تاریخ میں کیا ہوا، تحریر فرمائیے گا، تشویش بہت ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۳؍محرم ۱۴۰۰ھ

☆☆☆☆☆

بنام
مولانا شمس الدین صاحب مبارکپوری علیہ الرحمہ

استاذ محترم جناب مولانا شمس الدین صاحب مبارکپوری کے بڑے صاحبزادے جناب مولانا فخر الدین صاحب مسجد حرام مکہ مکرمہ سے جمعہ کی نماز پڑھ کر آرہے تھے کہ اچانک کار کے ایکسیڈنٹ میں جان بحق تسلیم ہوگئے، ۲۷؍ ربیع الآخر ۱۴۰۳ھ کو یہ حادثہ پیش آیا۔ اس سے تین چار سال قبل ان کے چھوٹے بھائی مولوی مبارز الدین صاحب ٹرین کے نیچے آکر شہید ہوچکے تھے، مولانا پر ان پیہم صدمات کا جو اثر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے، اس سے متاثر ہوکر یہ خط لکھا گیا ہے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

استاذنا المحترم ! **عافاکم اللہ ورزقکم صبراً جمیلاً وأجراً جزیلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ادھر دو ہفتہ قبل بہار کے ایک سفر پر تھا، دو تین دن ہوئے واپسی ہوئی ہے۔ آج مولانا عبد الرب صاحب کی زبانی مولوی فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کے حادثے کی اطلاع ہوئی، بس کیا عرض کروں، دل ودماغ پر کیا بیت گئی، بالکل مبہوت ہوکر رہ گیا، آپ کے بڑھاپے میں دو جوان اولاد کا صدمہ اللہ اللہ آپ کے دل پر کیا کچھ گزر رہی ہوگی بجز خدا کے کون جان سکتا ہے، چاہتا ہوں کہ چند کلمات تسلی وتعزیت کے لکھوں، لیکن عقل جواب دے رہی ہے۔ آپ میرے

بڑے ہیں، آپ سے کیا عرض کروں، تاہم آپ کے صدمہ کو سوچتا ہوں تو دل بے تاب ہوجاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کمال اللہ تعالیٰ نے مومن ہی عطا فرمایا ہے کہ سخت سے سخت صدمات کو سہہ لے جاتا ہے، اس کا ایمان بالغیب ہی اسے سنبھالتا ہے، مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ جس ذاتِ قدسی نے امانت دی تھی اسی نے یہ امانت واپس لی ہے اور کل کو ہم خود وہیں پہونچنے والے ہیں۔ اللہ عزوجل کے پاس جو نعمتیں اور راحتیں ہیں وہ دنیا کی نعمتوں اور راحتوں سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہیں، مومن کا یہی یقین اس کے لئے ہر مصیبت کو سہل بنا دیتا ہے، دنیا کی ہر شے خواہ کتنی ہی محبوب ہو فانی ہے اور محبوبِ مطلق ہر حال میں باقی ہے۔ مومن کا دل خواہ کہیں سے ٹوٹے اپنے پروردگار سے جڑا رہتا ہے اور وہیں سے وہ صبر وہدایت کی غذا پاتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

مَاأَصَابَ مِنْ مُصِيْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللهِ يَهْدِ قَلْبَهُ۔

مصیبت خواہ کوئی ہو بغیر اللہ کی اجازت کے نہیں آتی، اور جس کے قلب میں ایمان کا رشتہ اُستوار ہوتا ہے، اس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

إن الله تبارک وتعالیٰ قال یاعیسیٰ إنی باعث من بعدک أمة إذا أصابهم مایحبّون حمدوا اللهَ وإن أصابهم مایکرهون احتسبوا وصبروا ولاحلمَ ولاعقلَ فقال یاربِّ! کیف یکون هذا لهم ولاحلم ولاعقل قال أعطیهم من حلمی وعلمی۔ (مشکوٰۃ شریف)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے بعد ایک ایسی امت پیدا کروں گا جنھیں کوئی مرغوب اور پسندیدہ چیز ہاتھ آئے گی تو اللہ

کی حمد وثنا کریں گے، اور کسی تکلیف دہ اور پریشان کن بات کا سامنا ہوگا تو نیت اچھی رکھیں گے اور صبر کریں گے، حالانکہ نہ ان میں قوت برداشت ہوگی نہ عقل۔ حضرت عیسیٰ نے عرض کیا کہ جب ان میں نہ قوت برداشت ہوگی اور نہ عقل تو پھر یہ انھیں کیونکر حاصل ہوگی؟ فرمایا کہ انھیں اپنے حلم اور علم سے بخشش عطا کروں گا۔

سُبْحَانَ اللہ! کیا رحمت ہے پروردگار کی، ہم حلم اور عقل دونوں سے خالی تھے تو رب کریم نے خاص اپنے حلم اور علم کی بخشش سے نوازا، یہی وہ بات ہے جو مومن کے قلب کو مضبوط رکھتی ہے اور اسے مغلوب نہیں ہونے دیتی۔ اب آپ کی بات کیا عرض کروں؟ کہ اس بخشش ونوال کا کتنا حصہ ملا ہے، کون جان سکتا ہے، پے در پے ایسے سنگین صدمات کی برداشت بلاشبہ عنایت ربّانی کا خاص مظہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

یقول الله تبارک وتعالیٰ: ابن آدم إن صبرت واحتسبت عند الصدمه الاولیٰ لم أرض لک ثواباً دون الجنة۔ (مشکوٰۃ شریف)	اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم! اگر تو نے صدمہ پڑتے ہی صبر کرلیا اور اجر کی امید باندھ لی تو یہ سمجھ لو کہ میں جنت سے کم ثواب دینے پر ہرگز راضی نہ ہوں گا۔

اللہ، اللہ ایک صبر واحتساب پر رب کریم کی جانب سے یہ عنایت بجز جنت کے وہ خود کسی اور ثواب پر راضی نہیں، بے شک یہی شانِ رحمت ہے اس پروردگار کی جس کی رحمتوں کے وسیع وعریض سائے میں ہم ساری نعمتیں پا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **[وھو الصادق المصدوق نومن بکل ما أتیٰ به وقاله]**

إذا مات ولد العبد قال الله لملائکته قبضتم ولد عبدی؟

فیقولون: نعم، فیقول: قبضتم ثمرة فؤاده؟ فیقولون: نعم، فیقول: ماذا قال عبدی؟ فیقولون: حَمِدَکَ واسترجع فیقول الله ابنوا لعبدی بیتاً فی الجنة وسمّوه بیت الحمد۔ (مشکوٰۃ شریف)

جب بندے کی اولاد مر جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کی اولاد کی روح قبض کر لی، وہ عرض کرتے ہیں، جی ہاں! پروردگار پھر فرماتے ہیں کہ کیا تم نے اس کے ثمرۂ قلب کو چھین لیا، وہ عرض کرتے ہیں ہاں خدایا! پھر فرماتے ہیں کہ تب میرے بندے اور غلام نے کیا کہا، وہ عرض کرتے ہیں کہ پروردگار! اس نے آپ کی حمد بیان کی اور إنا اللہ پڑھ کر رہ گیا۔ رب تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کیلئے جنت میں ایک گھر بنا دو، اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔

سُبْحَانَ الله، کتنا لگاؤ اور تعلق ہے اپنے بندوں کے ساتھ! وہ سب کچھ جانتے ہیں، وہ علیم وخبیر ہیں، لیکن کیسا بار بار پوچھ رہے ہیں، کتنا خیال ہے انھیں بندوں کا کہ اس کے دل کو ٹھیس پہونچی ہے، دیکھیں وہ کیا کہتا ہے، اور فرشتوں نے اپنی گواہی پیش کر دی کہ ہم نے اسے حمد کرتے اور إنا اللہ پڑھتے ہی سنا ہے تو انھیں سے ارشاد ہوتا ہے کہ اچھا تو اس کے عوض میں جنت میں ایک خاص گھر بنا دو اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھ دو، یہ محبت ہے، عنایت ہے، نوازش ہے۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

اس حقیر ونا کارہ کو تو آپ ہی حضرات کے صدقے میں کچھ حروف شناسی آئی ہے، آپ مجھ سے بدرجہا بہتر جانتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پارۂ دل، نورِ نظر، لختِ جگر حضرت سیّدنا ابراہیم ؓ کا دم ٹوٹ رہا تھا اور آپ کی چشمہائے مبارک سے آنسو رواں تھے، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کے عرض کرنے پر آپ ﷺ نے فرمایا:

إن العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول إلّا مایرضیٰ ربنا وإنا

بفراقک یاابراهیم لمحزونون۔ (مشکوٰۃ شریف)

آنکھ سے آنسو جاری ہے، قلب غمزدہ ہے اور ہم کوئی بات بجز اپنے پروردگار کی رضامندی کے نہیں کہتے، اے ابراہیم بلاشبہ تمہارے فراق سے ہمیں بہت صدمہ ہے۔

اور آپ ہی نے اپنی صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا کو کہلا بھیجا تھا کہ:

إن لله مـاأخـذ ولـه ماأعطىٰ	جو کچھ خدا نے لیا اور جو کچھ دیا سب اسی کی
وكـل عـنـده بأجلٍ مسمّىٰ	ملکیت ہے، ہر چیز کی اس کے پاس ایک
فـلتـصبـر ولتـحتسب۔	میعاد مقرر ہے، بس صبر کرنا چاہئے اور اجر
(مشکوٰۃ شریف)	کی امید رکھنی چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پناہ گاہ اللہ وتبارک وتعالیٰ ہی ہیں **لاملجأ ولا منجأ من الله إلا إليه**، ہر حال میں پشت پناہ وہی ہیں، مومن کو دنیا میں جس سے محبت ہوتی ہے اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے اور جس سے رشتہ ٹوٹتا ہے اللہ ہی کے لئے ٹوٹتا ہے، سب تعلقات سے پہلے اللہ کا تعلق ہے، ہر تعلق فنا ہوجائے گا اور خدا کا تعلق باقی رہے گا، وہ کچھ لیتے ہیں تو بہت کچھ دیتے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مامن مسلمٍ تصيبه مصيبة فيقول ماأمره الله به "إنالله وإنا إليه راجعون، أَللّٰهُمَّ اُجُرْنِىْ فِىْ مَصِيْبَتِىْ وَاخْلُفْ لِىْ خَيْراً مِّنْهَا" إلا أخلف الله له خيراً منها فلما مات ابوسلمة قلت اىّ المسلمين خير من أبى سلمة؟ اول بيت هاجر إلىٰ رسول الله ﷺ ثم إنى قلتها فأخلف الله لى رسول الله ﷺ۔ (مشکوٰۃ شریف)

جب کسی مسلمان کو کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس پر اللہ کے حکم کے مطابق إنا لله

پڑھتا ہے، پھر یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اس مصیبت میں مجھے اجر عطا فرمایئے، اور اس کا نعم البدل عطا فرمایئے، تو اس پر اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر نعمت عطا فرماتے ہیں، پس جب میرے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوگیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ ابوسلمہ سے بہتر کون مسلمان ہوگا جو مجھے ملے گا، یہی پہلا گھرانا تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کی جانب ہجرت کی تھی، تاہم میں نے یہ دعا کرلی، واقعی اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا اور ابوسلمہ سے بدرجہا بہتر شوہر مجھے نصیب ہوئے یعنی خود جناب رسالتمآب ﷺ۔

استاذی المحترم ! میں کیا عرض کروں، اور میرا منہ کیا ہے کہ کچھ عرض کرسکوں، تاہم اتنی بات ضرور گوش گزار کرنی چاہتا ہوں کہ ان مصائب و بلایا میں خداوند عالم کی کیا کیا حکمتیں پنہاں ہیں، کون جان سکتا ہے؟ امورِ غیب کے سب سے بڑے راز داں ﷺ سے پوچھا گیا کہ:

أَیُّ الناسِ أشدُّ بلاءً قال: الانبیاء ثم الامثل فالامثل یبتلی الرجل علیٰ حسب دینه فان کان فی دینه صلباً اشتد بلاء ہ وإن کان فی دینه رقةً ھون علیه فمازال کذٰلک حتیٰ یمشی علی الارض ماله ذنب۔

سب سے بڑھ کر بلاؤں کا ورود کن لوگوں پر ہوتا ہے؟ ارشاد فرمایا: انبیاء پر (علیہم الصلوٰۃ والسلام) پھر ان لوگوں پر جو انبیاء کے بعد افضل ہیں اور پھر درجہ بدرجہ، آپ نے فرمایا کہ آدمی کا ابتلاء اس کی دینداری کے بقدر ہوتا ہے، اگر اسے پختہ دینداری حاصل ہوتی ہے تو اس پر بلائیں بھی سخت ٹوٹتی ہیں اور اگر اس کے دین میں صلابت نہیں ہوتی تو اس کا معاملہ نرم ہوتا ہے، پھر ان بلاؤں اور مصائب کی وجہ سے بندے کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ ہر گناہ کے بار سے ہلکا ہوکر زمین کے اوپر چلتا پھرتا ہے۔

کیا عرض کروں جب شدتِ بلاء کو ایمان کی پختگی کا معیار قرار دے رہے ہیں تو پھر یہ شدائد و مصائب کس بات کی بشارت لا رہے ہیں، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں، اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث اور گوش گزار کردوں۔

قال رسول الله ﷺ إن العبد إذا سبقت له من الله منزلة لم يبلغها بعمله ابتلاه الله فی جسده أو فی ماله أو فی ولده ثم صبره علیٰ ذٰلک حتیٰ یبلغه المنزلة التی سبقت له من الله۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بندے کے لئے کوئی مخصوص درجہ اللہ کے علم میں مقدر ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے عمل اور عبادت کے ذریعہ وہاں تک پہونچنے سے قاصر رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش اس کے جسم وجان میں یا اس کے مال میں یا اس کی اولاد میں آجاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے صبر کی توفیق بخشتے ہیں، بالآخر وہ اس درجہ کو پالیتا ہے جو خدا کے علم میں مقدر ہو چکا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ آپ کا ابتلاء تو تینوں امور میں ہے، پھر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کس مقام ومرتبہ پر آپ کو پہونچایا جا رہا ہے، سبحان اللہ، گوکہ عافیت وراحت خدا کا بہت بڑا انعام ہے لیکن اس کا ان مصائب وآلام سے کیا مقابلہ؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اور بالکل سچ ہے:

یود اهل العافیة حین یعطیٰ اهل البلاء الثواب لو أن جلودهم کانت قرضت فی الدنیا بالمقاریض۔	اہل عافیت قیامت کے دن جب اہل بلاء کی بخشش وعنایت کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ اے کاش دنیا میں ہماری بھی کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں۔

دنیا میں مصیبت کی تمنا درست نہیں ہے لیکن اضطراری مصائب پر جب انعام واکرام کی بارش دیکھیں گے تو یہی تمنا ہوگی کہ کاش ہم پر بھی مصائب کے یہ پہاڑ ٹوٹے ہوتے کہ آج ہم بھی نوازے جاتے، کہاں تک عرض کروں، داستان طویل ہے، خدا کی رحمت بے پایاں ہے، اس کی تھاہ کون پا سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے دونوں صاحبزادوں کو شہادت کی دولت سے نوازا، اور شہادت

بھی دو جہت سے۔ حدیث نبوی ہے کہ **موتُ غربةٍ شهادةٌ**، بے وطنی اور مسافرت کی موت شہادت ہے، دونوں کو یہ شہادت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إن الرجل إذا مات بغير مولده قيس له من مولده إلىٰ منقطع اثره في الجنة ۔ جب انسان کی موت گھر سے دور ہوتی ہے تو گھر سے لے کر اس جگہ تک کی زمین ناپ لی جاتی ہے اور اس کی شایانِ شان جنت کا اجر عطا ہوتا ہے۔

نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **صاحبُ الهدمِ شهيدٌ** ، دب کر مر جانے والا شہید ہے۔ دونوں بھائیوں میں شہادت کی دونوں جہتیں جمع ہیں، اللہ کی کریم ذات سے امید ہے کہ وہ اپنی بیکسی کی موت کا صلہ پا کر خوش ہو چکے ہوں گے، رہ گیا بچوں کا معاملہ، تو خدا ہی ہم سب کا حامی و ناصر ہے، وہی رزاق و کفیل ہے۔ **وهو علىٰ كل شئ قدير**

میری گفتگو بہت دراز ہو گئی، مگر جی نہ مانا اس لئے لکھتا چلا گیا، اللہ تعالیٰ کے حضور صمیم قلب سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دو مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، نیز آپ اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل بخشے، اولاد کی تربیت و پرداخت کو سہل سے سہل تر کر دے۔ **آمین یارب العالمین**

جناب والا سے درخواست ہے کہ اس ناکارہ کے حق میں دعاء خیر فرمائیں۔

والسّلام
اندوہ گیں و شریک غم
اعجاز احمد اعظمی
مدرسہ دینیہ، شوکت منزل، میاں پورہ، غازی پور
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب قاسمی علیہ الرحمہ

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب قاسمی علیہ الرحمہ مالیگاؤں کی مشہور درسگاہ بیت العلوم کے شیخ الحدیث تھے، وہ ہر سال ختم بخاری کے موقع پر ملک کے کسی مشہور عالم کو مدعو کرتے تھے، جو آخری حدیث پڑھا کر بخاری شریف ختم کراتے تھے، ایک سال (شعبان ۱۴۱۵ھ) انھوں نے استاذ محترم مدظلہٗ کو دعوت دی، اسی وقت انھوں نے ایک خط لکھا کہ:

اس موقع پر ایک مرحلہ عوام وخواص کے سامنے مہمان کے تعارف کا ہوتا ہے، اور یہی بات پل صراط پر چلنے کے مماثل ہے، عوام کا اصرار اور علماء مخلصین کا انکار! تاہم کچھ ضروری باتیں آپ تحریر فرما دیں تاکہ تعارف میں آسانی ہو۔ کن کن مدرسوں میں تعلیم حاصل کی؟ کن اداروں میں خدمات انجام دیں؟ سن فراغت؟ حدیث کی کون کون سی کتابیں زیر درس ہیں؟ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً سے استفادہ کی نوعیت، ان سے محبت کے واقعات، اگر کوئی تصنیف ہو یا ارادہ ہو، یا مسودہ تیار ہو تو تحریر فرمائیں۔

یہ ذاتی معلومات صرف میری حد تک رہیں گی، امید کہ اس مشکل مرحلہ کے لئے ضرور رہنمائی فرمائیں گے۔”

درجِ ذیل خط مولانا موصوف کی اسی تحریر کے جواب میں لکھا گیا، اس میں استاذ محترم کے قلم سے ان کا اجمالی تعارف آ گیا ہے، یہ خط آج سے ۱۳/سال قبل لکھا گیا، اس کے بعد کی بعض قابل ذکر چیزوں کا اضافہ خاکسار مرتب کے قلم سے ہے۔

(ضیاء الحق خیرآبادی)

محترم ومکرم!   زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

آپ کا نوازش نامہ ملا اور میں شش وپنج میں پڑ گیا، جانتا تھا کہ رسوائی ہوگی، لیکن اس عنوان سے ہوگی، اس کا خیال نہ تھا۔ اب آپ کے سوالات پڑھتا ہوں اور اپنے آپ سے جواب پوچھتا ہوں، تو بجز سناٹے کے کوئی چیز محسوس نہیں ہوتی، ایک کنکر سے پوچھئے کہ تمہارا حسب نسب کیا ہے؟ تو وہ بے چارہ کیا بتائے گا؟ میں نے کیا پڑھا ہے، کیا پڑھایا ہے؟ کیا لکھا ہے اور کتنا لکھا ہے؟ اس کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، کچھ پڑھا ہو تو بتاؤں، کچھ پڑھایا ہو تو لکھوں؟ بہت دیر سے سوچ رہا ہوں، اندر سے صرف یہ جواب آرہا ہے، کہ اب سے معذرت کردو اور خاموش بیٹھ جاؤ، لیکن نہ جانے کس جھونک میں، میں نے اپنے کو ابتلاء میں ڈال دیا ہے، اب معذرت کرنے کا بھی یارا نہیں ہے، اس لئے مجبوراً ہی سہی، کچھ نہ کچھ سنا ڈالوں، بے ترتیب ہے، ترتیب آپ دے لیں گے۔

ایک شخص دیہات میں پیدا ہوا، تقدیر نے اسے مبارکپور جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں پہونچا دیا، وہاں چند سال تک رہا، محنت سے کوئی واسطہ نہ رہا، لہو ولعب میں مشغول رہا۔ وہاں سے اٹھا تو دیوبند پہونچ گیا، وہاں کچھ حالات ایسے ہوئے کہ مشیت خداوندی نے اسے امروہہ پہونچا دیا، امروہہ میں دارالعلوم حسینیہ، محلّہ چلہ میں دورۂ حدیث حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب اعظمی قاسمی مدظلہٗ سے پڑھا، ۱۳۹۰ھ میں رسمی فراغت ہوئی۔ پھر چند ماہ گھر رہ کر قرآن حفظ کیا، کچھ دنوں مسافرانہ امروہہ میں رہ کر تدریس کا آغاز کیا۔ چند ماہ میسور شہر میں امامت اور خطابت کی

خدمت انجام دی، پھر جامعہ اسلامیہ بنارس میں ایک سال رہا۔ مدرسہ دینیہ غازی پور میں ۹؍سال گزارے۔ چار سال الہ آباد وصیۃ العلوم میں، اور چار سال ریاض العلوم گورینی، جون پور میں پورے کئے، اور اب پانچ سال سے شیخوپور میں ہے۔ علاوہ دورۂ حدیث کے درسِ نظامی کی تمام کتابیں پڑھائی ہیں، دورۂ حدیث کی کتابوں میں مسلم شریف اور نسائی شریف پڑھانے کا شرف حاصل ہوا ہے، مشکوٰۃ شریف بھی پڑھا چکا ہے، لکھنے کا ذوق نہ پہلے تھا، نہ اب ہے، کوئی مجبوری ہوتی ہے، کسی کا حکم ہوتا ہے، تو قلم کو حرکت ہوتی ہے، چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے لکھے، اہمیت کسی کی نہیں، لیکن غیر اہم اور معمولی کاموں کی پوچھ ہو ہی گئی تو کیوں نہ سب کے نام لکھ دوں۔

(۱) ’’قربانی کیجئے، قربانی دیجئے‘‘ قربانی کے موضوع پر ایک مکالماتی مختصر سا رسالہ ہے، میری سب سے پہلی تحریر یہی شائع ہوئی۔

(۲) ’’مودودی صاحب اپنے افکار ونظریات کی روشنی میں‘‘ (حصہ اول، دوم) حضرت محدث بنوری علیہ الرحمہ کی ’’الاستاذ المودودی‘‘ کا ترجمہ، مفصل مقدمہ کے ساتھ۔ (اس کا جدید ایڈیشن زیر طبع ہے)

(۳) ’’**المد التعظیمی لاسم الجلالة**‘‘ اذان میں لفظ اللہ پر مد کرنے کی تحقیق۔

(۴) تکبر اور اس کا انجام (اس کا جدید ایڈیشن حال میں فرید بکڈ پو سے شائع ہو چکا ہے)

(۵) ’’اخلاق العلماء‘‘ شیخ محمد بن حسین الآجری کی کتاب کا ترجمہ (اس کا جدید ایڈیشن حال میں فرید بکڈ پو دہلی سے شائع ہو چکا ہے)

(۷) دستور الطلبہ (اب یہ رسالہ مؤلف کی زیر طبع کتاب ’’مدارس اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں‘‘ کا جزو بن کر شائع ہو رہا ہے)

(۸) ’’حیات مصلح الامت‘‘ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی مفصل سوانح عمری۔ (اس کا بھی دوسرا ایڈیشن حال ہی میں فرید بکڈ پو سے شائع ہوا ہے)

(۹) ''سراج الامت'' حضرت مولانا سراج احمد امروہوی خلیفۂ حضرت تھانوی کے حالات۔ (یہ کتاب حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہ نے اپنے ادارہ سے شائع کی ہے)

(۱۰) ''درد ودرماں'' حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے ان مضامین کا انتخاب اوران کی ترتیب جومصائب وغیرہ کے اسباب اوران کے حل پر مشتمل ہے۔

(۱۱) ''محبت الٰہی اورنفس'' حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی چند مجالس کا مجموعہ، اوران پر عناوین کی ترتیب۔

(۱۲) ''مسئلۂ ایصالِ ثواب اورایک ذہنی طغیان کا احتساب'' ایک سرپھرے نے ایصالِ ثواب کی مشروعیت کا انکار کیا، اوراس کی آڑ میں تمام محدثین علماء کو غیر معتبر ٹھہرایا، اس کا تعاقب۔

(۱۳) ''برکاتِ زمزم'' ایک مختصر سے عربی رسالہ کا ترجمہ۔

(۱۴) ''سفرنامۂ حج'' (غیرمطبوعہ) یہ سفرنامہ ۱۹۹۷ء میں کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے شائع ہوا تھا، جو ۱۶۰؍صفحات پر مشتمل تھا، اب اس کا دوسرا ایڈیشن فرید بکڈپو سے شائع ہو چکا ہے، جو 360 صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۵) ''فقہی اختلافات میں نقطۂ اعتدال'' (غیرمطبوعہ) اس کا مسودہ گم ہوگیا۔

(۱۶) ''احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے طویل سلسلۂ مضامین کی کتابی ترتیب (زیرطبع) اس کتاب کے متعدد ایڈیشن ہندوپاک سے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۷) ''تسہیل المیبذی'' میبذی کی قسم ثانی کے فن اول کی شرح (زیرطبع) اس کتاب کے بھی متعدد ایڈیشن ہندوپاک سے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۸) ’’ذکر جامیؒ‘‘ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے کاتب خاص مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ کے حالات (زیر طبع) یہ کتاب الہ آباد سے شائع ہو چکی ہے۔ ابھی اس کا جدید ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا ہے۔

(۱۹) تحفۂ بہار (یا سفرنامۂ بہار) یہ ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲۰) تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کی شرعی حیثیت

(۲۱) ’’نقد بر حقیقت رجم‘‘ عنایت اللہ سبحانی (سابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج) نے رجم کے سلسلے میں اجماع امت کو ٹھکرایا ہے، اس کا تعاقب۔ یہ مضمون ماہنامہ دار العلوم دیوبند میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔

(مؤلف کی شائع شدہ کتب ورسائل کی فہرست کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ضیاء الحق خیر آبادی)

مدرسی کے ساتھ اگر وعظ وتقریر اور اسفار کا دورہ بھی کسی پر پڑا ہو، تو وہ کیا لکھے گا، تاہم بعض اوقات کچھ مضامین بھی مختلف رسالوں کے لئے لکھے گئے، ایک نظر ان پر ڈال لیجئے۔

(۱) نوٹوں کی شرعی حیثیت۔ (دوماہی ندائے فضلاء، مبارکپور)

(۲) خواب کی شرعی حیثیت، دو قسطوں میں (دوماہی ندائے فضلاء، مبارکپور)

(یہ مضمون الگ سے رسالہ کی شکل میں فرید بکڈپو سے شائع ہو چکا ہے)

(۳) تصوف ایک تعارف (ماہنامہ دار العلوم دیوبند، الاحسان نمبر)

(یہ مضمون مؤلف کی کتاب ’’تصوف ایک تعارف! میں شائع ہو چکا ہے۔ ناشر: فرید بکڈپو دہلی)

(۴) علم اور علماء اور نصاب تعلیم (ماہنامہ دار العلوم دیوبند)

(۵) حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری (ماہنامہ دار العلوم دیوبند)

(۶) شرح مسند احمد پر محدث اعظمی کے استدراکات (ترجمان الاسلام، بنارس، محدث

اعظمی نمبر)

(۷) گاؤں میں نماز، جمعہ (بحث ونظر، پٹنہ)

(۸) دارالحرب میں ربوٰ کی شرعی حیثیت (مجلّہ فقہ اسلامی)

(۹) مسئلۂ زکوٰۃ (مجلّہ فقہ اسلامی)

(۱۰) قاضی یا شرعی پنچایت (ماہنامہ ریاض الجنۃ، گورینی)

(۱۱) نمونے کے انسان، متعدد قسطیں (ماہنامہ ریاض الجنۃ، گورینی)

(۱۲) **ألم يشهد ابوبكر وعمر رضى الله عنهما جنازة النبى ﷺ**

(عربی) صوت الاسلام، غازی پور۔

اس وقت اسی قدر یاد آرہے ہیں، ممکن ہے دوایک اور ہوں، پھر ۱۴۱۳ھ سے ’’المآثر‘‘ کا اجراء ہوا، تو اس میں مسلسل مضامین لکھنے کی نوبت آرہی ہے، اس کی بھی فہرست ملاحظہ ہو۔

(۱) مسند حمیدی (تعارف کتب محققہ حضرت محدث اعظمیؒ)

(۲) کتاب الزہد والرقائق

(۳) المطالب العالیہ

(۴) کشف الاستار

(۵) استدراکات علمیہ (شرح مسند احمد پر استدراکات کا بقیہ)

(۶) الالبانی شذوذہ وأخطاءہ (محدث اعظمی کے عربی رسالہ کا ترجمہ وتلخیص)

(۷) نسخۂ آدمیت (تذکرہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی)

(۸) قربت میں تری ہم نے جو لطف اٹھائے ہیں (〃 〃 〃)

(۹) حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی

(۱۰) مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوری

(۱۱) مکاتیب محبت (مکتوبات حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی)

(۱۲) مولوی کمال الدین مرحوم

(۱۳) حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری

(۱۴) حاجی محمد ایوب صاحب کلکتوی

(۱۵) کتابت حدیث کے اصول وقواعد

(۱۶) نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم

پھر ہر شمارہ میں حرفِ آغاز لکھنے کا سلسلہ جاری ہے، یہ تو لکھنے کا قصہ ہوا۔ اب رہی بات یہ کہ حضرت محدث اعظمی قدس سرہٗ سے استفادہ کی کیا صورت رہی ہے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں اپنی بے مائیگی اور احساسِ کمتری کی وجہ سے کبھی حضرت سے قریب ہونے کی ہمت نہیں کرسکا، البتہ ان کی وفات سے دو سال قبل کچھ نزدیک ہوگیا تھا، مگر مجھے علم سے مناسبت کیا کہ استفادہ کی نوبت آتی، البتہ حضرت کی وفات کے بعد المآثر کے اجراء اور اس سے پہلے مولانا اسیر ادروی صاحب کے حکم سے حضرت پر لکھنے کی ضرورت ہوئی تو حضرت کی کتابیں پڑھنی شروع کیں، پھر اسی کا اثر ہے کہ المآثر سے نسبت ہوئی، اور ابوالمآثر کے ساتھ منسوب کر کے قدرے لوگوں میں تعارف ہوا، بس یہ بے مزہ داستان ختم ہوئی، دیکھئے داستانِ حیات کب ختم ہوتی ہے۔

دعاء کی درخواست ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۴/رجب ۱۴۱۵ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا حافظ قمر الدین صاحب جونپوری

ضلع جون پور کے ایک گاؤں نوناری کے رہنے والے، محبت ومحبوبیت کے پیکر، مہمان نوازی میں اشرافِ عرب کے نمونہ، سخاوت کے ابر کرم، بے تکلف دوست بھی اور بہت ہی محترم بزرگ بھی۔ استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کے حوالہ سے انھوں نے تعلق اور دوستی کی بنیاد رکھی، وہ ان کے ہم عصر اور ساتھی، میں ان کا ایک ادنیٰ سا شاگرد، مگر محبت نے جب سر ابھارا، اور اس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتریں تو بزرگی اور خوردی کا امتیاز اس نے مٹا ڈالا۔ وہ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور اِدھر بھی دل کیا ہے؟ دیوانہ ہے، محبت کی خوشبو پا کر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

مولانا پر دل کا دورہ پڑا، یہ خط اس سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

محترمی ومکرمی! عافاکم اللّٰہ ممایوذیک

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ

پرسوں مولوی کلیم الدین صاحب سلّمہٗ کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ ہم لوگ تو اپنی کہی ہوئی بات کے مطابق ۱۵؍جون کے بعد سے آپ کا انتظار کررہے تھے، جب دیر ہوئی، تو دل کو یہ کہہ کر بہلالیا کہ مہمان کثرت سے آرہے اور جارہے ہیں، شاید اس وجہ سے موقع نہیں ملا، لیکن کیا معلوم تھا کہ آپ کی مہمان نوازی کی صلائے عام عالم امراض وعلل تک جاپہونچے گی۔ لوگ تو آپ کے سفرۂ طعام سے استفادہ کررہے تھے، ان صاحب کو کیا سوجھی کہ مائدہ قلب وجگر پر دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ دردِ دل (عشق ومحبت) کی آپ کے یہاں کون سی کمی تھی کہ تمام دنیاداروں، سرمایہ داروں، بےکیف وبےحلاوت اور خودغرض ونفس پرور لوگوں کو چھوڑ کر آپ کے خانۂ جسم میں گھس آیا، اور دل کے دروازے پر دستک دے ڈالی، اسے تو وہاں جانا چاہئے تھا جہاں اصلی وحقیقی دردِ دل کی کمی تھی، وہاں جاتا، جگہ خالی ملتی، بیٹھتا، اور ان خالی خولی جسموں کو لے کر اٹھتا۔ آپ کا دل تو معمور تھا، آباد تھا، یہاں تو مستی تھی، خدامستی تھی، دل کا گوشہ گوشہ بھرا پُرا تھا۔

کیا صرف زیارت کرنے آیا تھا، شاید اسے خیال آیا ہو کہ یہ کون سا گھر ہے جہاں دنیا کی دنیا چلی آرہی ہے، جہاں برات ہی برات ہے، عاشقوں کا جمگھٹا ہے، محبوبوں کا مجمع ہے، اہل دل کا ہجوم ہے، سوچا ہوگا کہ میں بھی دیکھ آؤں!

اچھا! آیا تھا تو دیکھ کر فوراً چلا جاتا! مگر آپ کو کب گوارا تھا کہ کوئی مہمان آئے اور یوں ہی دیکھ کر چلا جائے، اس کی ضیافت کرنی ہے۔ مہمان آیا ہے تو اب مولوی ظفر (صاحبزادے) بھی مشغول ہوں، حسام (بھائی) بھی انتظام میں لگ جائیں، سب

لگ گئے۔ مہمان دم بھر ٹھہر گیا، مگر اس کا دم بھر ٹھہرنا قیامت تھا، خیر اب اس کا قصور معاف! پھر نہ آئے، ایسے مہمان سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میزبان کو لے جانے پر اصرار نہ کرے۔

جا...... اے درد...... اب نہ آنا، بہت سے دروازے ہیں کہیں بھی چلا جا۔ دنیاداروں کے یہاں تیری دعوت عام ہے، دینداروں کے یہاں تیرا کام نہیں ہے۔

خیر تو خود سے آتا نہیں کسی کے بھیجنے سے آتا اور اسی کے بلانے سے واپس جاتا ہے، تو تو کسی کا قاصد ہے، کبھی لے جانے کیلئے آتا ہے اور لے کر چلا جاتا ہے، دنیا دیکھتی رہ جاتی ہے، اور کبھی تنبیہ کے لئے آتا ہے کہ دیکھ انسان تیری مستی آنِ واحد میں ختم ہوسکتی ہے، اس لئے اب خبردار ہو جا، اب سے غفلت دور کرلے، دل غفلت کا محل نہیں ہے، یہ ذکر و محبت کا مقام ہے، اگر اس میں غفلت رہے گی تو دیکھ جیسے اس وقت آ کر میں نے صرف چونکایا ہے، آئندہ چونکاؤں گا نہیں، دوسری ہی دنیا میں آنکھ کھلے گی۔

اور کبھی اس لئے آتا ہے کہ اہل محبت اور اہل تعلق کو چونکائے کہ اے لوگو! جس کو تم اپنے درمیان پاتے ہو، اسے برتتے اور اس سے استفادہ کرتے ہو، اس کے کرم اور فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے پاس ہے، ہماری دسترس میں ہے، جب چاہیں گے حوض سے پانی بھرلیں گے، یاد رکھو کہ یہ دولت مستعجل ہے، بےفکر نہ رہو، جو استفادہ کرسکتے ہو، ظاہری نہیں باطنی، مادی نہیں روحانی، جسمانی نہیں قلبی، استفادہ کرلو، اس ایک چراغ سے اپنے چراغوں میں روشنی حاصل کرلو ورنہ یہ قندیل اٹھ جائے گی، تو تمہارے دئے کہاں سے روشنی پائیں گے؟

اے درد! تو آیا، تیرے آنے کو مبارک کہوں یا نامبارک؟ تو محبوب حقیقی کے

اذن سے آیا ہے اس لئے میں نامبارک نہیں کہہ سکتا، ہاں تیرا آنا مبارک ہوا کہ تو نے ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے اور دل کو دعاؤں سے لبریز کر دیا، زبان پر ہمدردی کے بول آئے، دعاؤں کے کلمات آئے، ہاتھ خدا کے سامنے پھیلے، زندگی اور عافیت کی بھیک مانگی گئی، تو نے تکلیف تو پہونچائی مگر یہ تکلیف نہ جانے کتنے دردوں کا مداوا بنی، اللہ جانے کتنے سیئات کا کفارہ بنی، کتنے درجات کا سبب بنی۔

اے اللہ ہم بندے ہیں محتاج ہیں، زندگی آپ نے دی ہے، صحت آپ نے دی ہے، عافیت آپ نے بخشی ہے، کمالات آپ نے عنایت فرمائے ہیں، محبت آپ کا عطیہ ہے، دعائیں بھی، دوائیں بھی سب آپ کے دربار سے ہیں، ہم دعائیں کریں اور آپ ٹھکرا دیں نہ ہماری بندگی اس کی متحمل ہے، نہ آپ کی خدائی کو یہ گوارا ہے، بس پروردگار ہم مانگیں اور آپ ہماری جھولی بھر دیں، اور مولیٰ آپ جانتے ہیں کہ ہم کیا مانگ رہے ہیں اور آپ کو کیا دینا ہے؟

بس کرو میاں صاحب! ہم اچھے ہو کر گھر آ گئے، خدا نے دعا قبول کر لی، میاں ظفر نے بہت محنت کی، دل سوزی کی، خدمت کا حق ادا کیا، میاں حسام بہت بیقرار رہے، اپنی جیسی کر لی، اللہ نے عافیت بخشی، اب گھر پہ ہوں، پھر وہی ہاء وہو ہے، پھر وہی ناؤ ونوش ہے، آؤ تو تم بھی دیکھ لو۔

جی، آنے کی تو بیقراری ہے، مگر کچھ مجبوری بھی ہے، اس لئے آدھا آیا ہوں، سلام کر رہا ہوں، دیکھئے جواب کب سننے میں آتا ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۸؍صفر ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

بنام حاجی شمس الدین صاحبؒ

بہت مالدار، بہت دیندار، شکل وشباہت سے کسی بڑے عالم دین کا گمان ہوتا، اور یہ اثر تھا ان کی گہری دینداری اور علماء ومشائخ کی قدردانی کا۔ ضلع اعظم گڈھ کے موضع بمہور کے رہنے والے، زندگی بمبئی میں گزاری، بہت ہی فیاض اور صاحب خیر تاجر، جمعیۃ علماء صوبہ مہاراشٹر کے صدر نشیں، دینی اور دنیوی خوبیوں کے جامع، استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحبؒ کے واسطہ سے ان سے تعارف ہوا، اور دم اخیر تک انھوں نے اس تعارف وتعلق کو برقرار رکھا۔ ۲۰۰۸ء میں ان کا وصال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔

یہ خط ان کو ان کی بیکری کی بربادی کی تعزیت میں لکھا گیا، ۱۹۹۲ء کے فساد میں حاجی صاحب کی بیکری فسادیوں نے تباہ کردی تھی۔

محترم جناب حاجی شمس الدین صاحب!

زید مجدکم وعافاکم اللہ من جمیع الآفات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمدٍ واٰلہٖ و صحبہٖ أجمعین ،،

بمبئی کے فسادات اور ہنگامہ کے دوران آپ کی خیریت وعافیت کے بارے میں تشویش رہتی تھی، معلوم ہوا کہ پہلوی بیکری کو فسادیوں نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے، زبان سے بے اختیار إنا للہ وإنا إلیہ راجعون نکلا اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس حادثہ میں صبر جمیل، اجر جزیل نیز نعم البدل سے نوازے۔ آمین

محترم! آپ تو خود ماشاء اللہ بزرگوں اور مشائخ کے صحبت یافتہ ہیں، دل میں ایمان راسخ اور محبت الٰہی کی چنگاری رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ دنیا کا کوئی پتّہ اور کوئی ذرہ بدونِ اذنِ خداوندی کے حرکت نہیں کرسکتا، اور جب سب کچھ انھیں پروردگارِ مہربان کی طرف سے ہے تو اس میں ظاہراً سخت نقصان ہونے کے باوجود باطناً کوئی عمدہ نعمت مخفی ہوگی، اس حکمت کی بنا پر آپ کا دل صبر وشکر سے لبریز ہوگا میرے جیسے معمولی شخص کے کلمات وحروف کی آپ کو ضرورت نہیں، تاہم محبت وتعلق کا حق ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کبھی معمولی شخص کی بات میں بھی کچھ تاثیر رکھ دیتے ہیں، اس لئے دلی تقاضا ہے کہ آپ کی خدمت میں کچھ تحریر کروں۔

محترمی! کسی بندۂ مومن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ نہ انہونی ہے اور نہ اتفاقیہ، یہ ایسی بات ہے جس کی خبر بہت پہلے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دے چکے ہیں،

ارشاد ہے: ولنبلو نکم تا واولئک ھم المھتدون، **ترجمہ**: اور ہم تم کو ضرور ہی آزمائیں گے کچھ فاقہ میں، کچھ خوف میں، کچھ مال وجان اور پھلوں کی کمی میں، اور صبر کرنے والوں کو بشارت سنادو جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ بول اٹھتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، یہی لوگ ایسے ہیں کہ ان پر ان کے رب کی جانب سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس آیت کریمہ نے ہمیں یہ خبر دی کہ جان ومال کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے بندے کے صبر وضبط اور تسلیم ورضا کا امتحان ہو، اور مولا کو حق ہے کہ بندے کا امتحان لے، اور امتحان اسی کا ہوتا ہے جس کو کچھ درجات اور کوئی سند عطا کرنی ہوتی ہے، انبیاء کا امتحان ہوا، اولیاء وصالحین کا امتحان ہوا، صحابۂ کرام کا امتحان ہوا، ان حضرات کا ایسا ایسا امتحان ہوا کہ آج ہم لوگ محض سن کر گھبرا جاتے ہیں، پتہ پانی ہوجاتا ہے، ان حضرات نے جان پر کھیل کر، آبرو لٹا کر، مال ودولت کی قربانی دے کر یہ امتحان دیئے ہیں، ہم نے انھیں کی پیروی کا دم بھرا ہے، انھیں کی اقتداء میں نیت باندھی ہے، انھیں کی راہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے تو ضرور ہے کہ تھوڑا بہت ان کا رنگ جھلکے تاکہ جس صبر واستقامت کی وہ حضرات بنیادیں قائم کرگئے ہیں ان کی تعمیر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی آزمائش آپ پر ڈال دی، مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ اس کی برداشت کا حوصلہ بھی دیا ہے، خدا پر یقین واعتماد کی جو شمع آپ کے دل میں روشن ہے اس نے تاریکی کو تاریکی کب باقی رکھا ہوگا؟

ایک بزرگ تھے حضرت شیخ صدرالدین عارف، اللہ والے بھی تھے اور بہت بڑے تاجر اور صاحب ثروت بھی تھے، ان کے تجارتی تعلقات باہر ملکوں سے بھی تھے، ایک مرتبہ سمندری راستے سے ان کا مال باہر سے آرہا تھا، جہاز قریب آگیا تھا کہ سمندر

میں طغیانی آ گئی، معلوم ہوا کہ جہاز پانی میں غرق ہوگیا، ہزاروں لاکھوں کا مال تھا، کسی نے آ کر انھیں جہاز کی بربادی کی خبر دی، انھوں نے بہت اطمینان سے کہا الحمدللہ، حاضرین کو تعجب ہوا کہ یہ موقع **الحمد للہ** کا نہ تھا، إنا للہ کا تھا مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان سے سوال کرتا، بزرگوں کے قلب کو عام لوگوں کے قلوب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا، پھر جب طغیانی فرو ہوئی تو دیکھا گیا کہ جہاز بعافیت کنارے آ لگا، دوبارہ انھیں جہاز کی خیریت وعافیت کی خبر سنائی گئی تو پھر فرمایا کہ الحمدللہ، اب ایک شخص سے نہ رہا گیا، اس نے پوچھ لیا کہ حضرت جب جہاز ڈوبا تھا اس وقت بھی آپ نے **الحمد للہ** ہی پڑھا تھا، حالانکہ موقع إنا للہ کا تھا؟ فرمایا کہ میاں! میں نے **الحمد للہ** جہاز کے ڈوبنے یا اس کی عافیت پر نہیں پڑھا، یہاں ایک دوسری بات ہے، لوگ سراپا اشتیاق ہوگئے کہ وہ دوسری بات کیا ہوسکتی ہے، فرمایا کہ مال کا ضائع ہونا، جہاز کا ڈوب جانا ایک بڑی مصیبت ہے، اور ایسی مصیبت کے وقت انسان حواس باختہ ہوجاتا ہے، صبر ورضا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے اور حق تعالیٰ سے ربط ٹوٹنے لگتا ہے، میں نے اس مصیبت کے وقت میں اپنے دل کے بارے میں غور کیا کہ اس کا تعلق خدا تعالیٰ سے کمزور تو نہیں ہورہا ہے، بحمد اللہ مجھے محسوس ہوا کہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہی سابقہ ربط باقی ہے، کسی طرح کی جزع فزع، بے صبری، ناراضگی دل میں نہیں ہے، میں نے اُستواریٔ دل اور استقامت قلب پر الحمدللہ کہی، پھر جب مال مایوسی کے بعد سلامت مل گیا تو یہ وقت خوشی میں آپے سے باہر ہوجانے کا تھا، حد سے زیادہ خوشی میں انسان کا قلب خدا سے غافل ہوجاتا ہے، اس وقت بھی میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہ بحمداللہ اپنی سابقہ حالت پر موجود تھا، تو اس پر میں نے الحمدللہ کہا، میرا یہ شکر ادا کرنا، اس کی حمد وثنا کرنی نہ مال کے ضائع ہونے پر ہے اور نہ اس کے مل جانے پر، بلکہ دل کی

استقامت اور تعلق مع اللہ پر ہے۔ سبحان اللہ! کیا حال تھا ان حضرات کا، ہر طرح کے نمونے یہ حضرات اپنی زندگی میں دکھلا گئے ہیں، ہم پچھلوں کے لئے کہیں اندھیرا نہیں ہے، ہمارے بزرگوں نے اپنے بعد والوں کے لئے اتنی شمعیں جلا دی ہیں کہ نشانِ راہ بالکل روشن ہیں۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ مصیبت میں آدمیوں پر احوال تین طرح کے طاری ہوتے ہیں، بعض آدمی اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی کوئی انعام تصور کرتے ہیں، اور اس پر دل سے راضی رہتے ہیں، اور بعض اسے مصیبت ہی سمجھتے ہیں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لئے دل کو تھامے رہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں، اور بعض لوگ گھبرا جاتے ہیں، اور اس پر طرح طرح کے شکایات دل میں لاتے اور زبان سے دہراتے رہتے ہیں، بے صبری کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اس لحاظ سے مصیبت کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں: پہلی قسم کے لوگوں کے لئے مصیبت ترقیٔ درجات کے لئے آتی ہے، اور دوسری قسم کے لئے کفارہ بن کر آتی ہے، یہ دونوں سراسر خیر ہیں، اور تیسری قسم کے لوگوں کے لئے عذابِ الٰہی ہے۔

مومن جو دل میں راسخ ایمان رکھتا ہے، اس کی مصیبت پہلے دونوں میں سے کسی ایک کے لئے یا دونوں کے لئے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے نہ جانے کتنے انجانے اور جانے بوجھے گناہوں کا کفارہ اس مصیبت کو بنا دیا ہوگا، اور خدا معلوم کتنے درجات بلند ہوئے ہوں گے، خدا سے ہمیشہ رحمت اور خیر کی توقع ہے۔

حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف میں ایک روایت ہے، حضرت ام سلمہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ جب

مسلمان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے اور وہ وہی بات کہتا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے یعنی إنا للہ و إنا إلیه راجعون اور پھر کہتا ہے أَللّٰھُمَّ اُجُرْنِیُ فِیُ مَصِیُبَتِیُ وَاخُلُفُ لِیُ خَیُراً مِّنُهَا (اے اللہ مجھے اس مصیبت میں اجر و ثواب عطا فرمائیے اور اس سے بہتر چیز مجھے دیجئے) تو اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں، فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوا تو میں سوچنے لگی کہ ابوسلمہ سے بہتر شوہر مجھے کہاں ملے گا، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانب ہجرت کی، تاہم میں نے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی دعا پڑھ لی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں مجھے رسول اللہ ﷺ جیسا شوہر عنایت فرمایا۔

یہ دعا بہت مجرب ہے، سب سے پہلے تو ام المومنین نے اس کا تجربہ کیا، پھر ان کے بعد سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے اس کا تجربہ کیا، اللہ تعالیٰ کی ذات سے یقین کامل ہے کہ آپ کو بھی نعم البدل عنایت فرمائیں گے۔

لیجئے میں نے تو وعظ شروع کر دیا، مگر کیا کروں، لکھنے بیٹھا تو طبیعت نہیں مانی، لکھتا ہی چلا گیا، اہل محبت سے گفتگو طویل کرنے کو جی چاہا کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ باوجود عدیم الفرصتی کے آپ اس کو پڑھ کر اکتاہٹ نہیں محسوس کریں گے۔

اہل بمبئی پر بالخصوص مسلمانوں پر جو قیامت گذر گئی، اس سے طبیعت پر اثر ہے، برابر دعا جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو ہمارے لئے تازیانۂ عبرت بنا دیں، ہم لوگ اجتماعی طور پر بہت گہری نیند سو رہے ہیں، برائیاں، بداخلاقیاں، خودغرضیاں غیر مسلموں میں نہیں، مسلمانوں میں اتنی زیادہ پھیل گئی ہیں کہ اس پر اگر آسمان سے سنگباری ہونے لگے تو محل حیرت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے، آپ کا دل اس وقت دکھا ہوا ہے، دکھے ہوئے دل کی دعا خوب مقبول ہوتی ہے، اس کا کچھ

حصہ اِدھر بھی ہو جائے تو کیا کہنا، مولانا مستقیم احسن صاحب سے ملاقات ہو اور یاد رہے تو سلام کہہ دیجئے، اگر وقت عزیز میں سے تھوڑا سا لمحہ نکال کر خط کے پہونچنے کی اطلاع کر دیں تو مہربانی ہوگی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲؍شعبان ۱۴۱۳ھ

☆☆☆☆☆

باب دوم

دوستوں کے نام

بنام الحاج عبدالرحمٰن صاحب خیرآبادی علیہ الرحمہ

درج ذیل خطوط والدمحترم الحاج عبدالرحمٰن صاحب خیرآبادی علیہ الرحمہ کے نام لکھے گئے ، والد صاحبؒ حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ کے حد درجہ قدرداں اور نہایت مخلص دوست تھے، ان دونوں کے باہمی روابط اور تعلقات کا اندازہ اس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ نے والد صاحب کے انتقال پر لکھا تھا، اور یہ ماہنامہ ''الاسلام'' کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مضمون ''کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔'' میں شائع ہوا۔ (دیکھئے ص: ۴۲۴ تا ۴۴۰)

والد صاحب نے حضرت مولانا کے تمام خطوط کو نہایت حفاظت سے رکھا تھا، اس کے لئے انھوں نے ایک کاپی بنائی تھی جس میں تاریخی ترتیب سے تمام خطوط درج ہیں۔ یہ خط مئو کے ہولناک فساد (۱۹۸۴ء) کے بعد لکھا گیا، اس فساد کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مسلسل ۳۸۸ گھنٹے یعنی ۱۶/دن سے زائد کرفیو لگا رہا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

الحاج المحترم ! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی عنایت کا شکریہ کیا ادا کروں، حق تعالیٰ ہی جزاء عطا کرنے والے ہیں، ارادہ تھا کہ آپ کے اس خط کا فوراً جواب تحریر کروں گا، لیکن کچھ تاخیر ہو ہی گئی، کیونکہ آپ کے خط نے دل کے زخموں کو کریدا ہے، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں جب میں بہت چھوٹا تھا، لیکن تمیز وشعور پیدا ہو چلا تھا، جبل پور میں فساد ہوا تھا، گاؤں میں اس وقت ایک اخبار ''سیاست'' آیا کرتا تھا، لوگ وہاں کی تفصیلات سناتے تھے، میرا دل اس سے اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ کئی دن تک میں اچھی نیند سے محروم ہو گیا تھا۔

اس کے بعد علم وعقل کی نگاہوں نے ماضی کے خونیں اور ہولناک فسادات کا بھی مشاہدہ کیا اور جو فسادات سامنے گذرتے رہے، انھیں بھی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا رہا، جب کہیں خونریزی اور درندگی کا ننگا ناچ ہوتا ہے، میرا دل تڑپنے لگتا ہے، جلوتوں میں ہنستا بولتا اور مسکراتا ہوں، لیکن خلوتیں بڑی کربناک اور تکلیف دہ ہو جاتی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام زخم میرے ہی دل وجگر پر لگ رہے ہیں، روتا ہوں، کراہتا ہوں، آنسو بہاتا ہوں، تڑپتا ہوں، کڑھتا ہوں، خدا کو لپٹتا ہوں، لیکن تسکین وتسلی نہیں ہوتی، آپ نے فسادات کے متعلق اور مظلومین کے بارے میں دعاء کا حکم دیا ہے، میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے سینے سے کتنا دھواں اور آنکھوں سے کتنا پانی نکلا ہے، جن کے اسلاف نے عرصۂ دراز تک اسی ملک پر شان وشوکت کے ساتھ حکمرانی کی، آج ان کے اخلاف کی حالت یہ ہے کہ اپنی حفاظت سے بھی بے بس اور مجبور ہیں، جو درندے منہ کھول کر ہماری ہڈیاں نوچتے ہیں، ہماری پونجی لوٹتے کھسوٹتے ہیں، جن کے مونھوں کو ہمارے خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے، جن کا پیٹ صرف ہمارے بدن کی بوٹیوں سے

بھرتا ہے، جب وہی درندے اچھی طرح ہماری ہڈیاں توڑ چکتے ہیں، ہماری کھالیں ادھیڑ لیتے ہیں اور شکم بھر کر ڈکاریں لینے کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں تو ہم اپنی عرضیاں، اپنی درخواستیں لے لے کر ان کے پاس دوڑتے ہیں اور پھر وہ فریبانہ ہمارے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور جلے ہوئے کو بجھانے کے لئے ہاتھوں میں دوا اور پانی لے کر آتے ہیں، اور ہم پر احسان کرتے ہیں۔ کتنا دردناک منظر ہے۔

مسلمان جو کہ دنیا کی ہدایت و رہنمائی کا ذمہ دار بنایا گیا تھا، آج وہ خود دوسروں کی راہ تک رہا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے، جگر خون ہوتا ہے، ایسی بے بسی کہ نہ جان کا ٹھکانا، نہ مال کی حفاظت، نہ آبرو کا بچاؤ، آخر آدمی کہاں جائے اور کیا کرے، جہاں کہیں فساد ہوتا ہے، وہاں کا حال تو مت پوچھئے، جہاں تک اس کی خبر پھیلتی ہے، منہ نکالنا دشوار ہو جاتا ہے، جیسے مسلمان کوئی مجرم ہے جسے اس ملک کی پشت پر زندہ رہنا جائز نہیں، فساد کہاں ہو رہا ہے اور نگاہیں کہاں گرم ہو رہی ہیں، اور پھر ہر جگہ آگ لگنے کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں، میں فساد کے دوران اپنے علاقہ میں آنا چاہتا تھا، مگر دل کی افسردگی نے کہیں ہلنے نہ دیا، یہ افسردگی صرف اس بنا پر نہیں تھی کہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہو گیا ہے، ان کی آبرو بے وقعت ہو گئی ہے، اور ان کے اموال مالِ غنیمت بن چکے ہیں، بلکہ ایک صدمہ اور اس سے بڑھ کر ہے، اور وہ ایسا صدمہ اور غم ہے جو ہڈیوں میں آگ بن کر گھسا ہوا ہے، کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں، اور نہ کہوں تو بھی چین نہیں ملتا، ایک ایسی کشمکش، ایک ایسا تحیر، ایک ایسی انتشاری کیفیت ہے کہ نہ یارائے گفتار اور نہ طاقت خموشی! کبھی بولتا ہوں، کبھی چپ رہتا ہوں، کبھی جی چاہتا ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر قریہ قریہ گھوموں اور لوگوں کو پکارتا پھروں، اور کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ مجذوب کی بڑ کون سنے گا؟ چپ چاپ گوشۂ عافیت میں سر دیئے پڑے رہو۔

سنئے کہ وہ بات کیا ہے؟ وہ بات محض اتنی ہے کہ ''ہم سچے **مومن نہ رہے**'' بظاہر کتنا چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن سوچئے! اسی ایک جملہ میں درد کی پوری داستان سمٹی ہوئی ہے، ہماری حالت یہ ہے کہ اگر ہم سے صحیح اور سچی خالص ایمان کی بات کہی جائے تو بری لگے اور اگر اس میں بہت کچھ الا بلا ملا کر سنایا جائے تو بصدق دل سنیں، اللہ کی اطاعت اور رسول کی فرمانبرداری سے زیادہ مشکل ہمارے لئے کوئی چیز نہیں، جتنی زیادہ مار پڑتی ہے اتنی ہی زیادہ ہماری غفلت بڑھتی ہے، ہنگامہ وفساد کے مواقع پر بعض جگہوں پر مساجد ضرور آباد ہونے لگتی ہیں، لیکن اس آبادی کی عمر کتنی ہوتی ہے، اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اسی موقع پر فائدہ چاہنے والے فائدے کے حصول کی کیسی کیسی راہیں نکال لیتے ہیں، کسی کا گھر جلتا ہے، اور کوئی اس آگ پر اپنی ہانڈی چڑھا کر خوش ہوتا ہے کہ بلا سے کسی کا گھر جلا مفت میں ہمارا کھانا تو پک گیا، آپ مجھ سے زیادہ حالات سے واقف ہیں، میں تو فقیرِ گوشہ نشین صرف کلیات سے علم وواقفیت کا تعلق رکھتا ہوں، آپ تو میدان میں ہیں، تمام جزئیات آپ کی نگاہوں کے سامنے سے گذرتی ہیں، بتایئے کسی کا گلا کاٹا گیا اور کوئی گوشت کا لوتھڑا اس کے تن بے جان سے کاٹ کر لے جا رہا ہے کہ اپنا پیٹ بھروں گا۔

کون ہے جو محض اللہ کے واسطے اپنے نفس کی خواہشات سے دستبرداری اختیار کرتا ہے، پھر دیکھئے کہ ہم معاصی میں، اور صرف معاصی میں نہیں بلکہ شرک وبدعت میں کس درجہ مبتلاء ہیں، گناہوں کا ناچ تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے، شرک وبدعت کا منظر کسی بھی سچی یا جھوٹی مزار پر دیکھا جا سکتا ہے، اور یہ سب کون کرتا ہے؟ وہی جس کا دعویٰ ہے کہ اس کا ایمان خدا پر ہے اور اس کا دامن رسول اللہ ﷺ کے دامن اقدس سے بندھا ہوا ہے، سوچئے رُخ کدھر ہے، رفتار کس طرف ہے، اور منہ کے بول کیا ہیں؟

مسلمانوں کا قصہ کافروں کے مثل نہیں ہے، وہ اوّل سے باغی ہیں، ان کی سزا متعین ہے، ممکن ہے دنیا میں ان پر مصائب وبلایا کا نزول نہ ہو، لیکن مسلمان اول سے طاعت گزار ہے، یہ اگر منہ موڑے گا تو ضرور طمانچہ پڑے گا، لیکن وائے بر ما کہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ طمانچے پر طمانچے کیوں پڑ رہے ہیں، ایک طمانچہ لگا، ذرا تلملائے اور سہلایا اور کام ختم!

کاش سب مل کر اپنے پروردگار کو خوش کریں، عبادات سے، اخلاق سے، ذکر سے، تلاوت سے، دعا سے، آپس کے احسان سے، ہمدردئ خلائق سے، لیکن **کم حسراتٍ فی بطون المقابر**، کتنی حسرتیں ہیں جو قبر کے شکم میں جا پہونچیں، اختلاف اور لڑائی جھگڑا ہمارے لئے سب سے آسان کام ہے، اخلاقِ حمیدہ سے کوسوں دور، چار گھر کا دیہات ہو وہاں بھی لڑائی دنگا، وسعت ظرف، حوصلہ مندی، اپنے اوپر مشقت جھیل لینا، ایثار کرنا، دوسرے کی نعمتوں سے خوش ہونا، یہ سب مفقود! عداوت، حسد، بغض، تنگ نظری، پست حوصلگی، مفاد پرستی، خودغرضی، یہ سب موجود! کہاں یہ صفاتِ خبیثہ اور کہاں رحمت خداوندی، اللہ پاک ہے، پاک ہی کو پسند کرتا ہے، ناپاکی سے بری اور بیزار ہے، ہم نے پاکی اور ناپاکی کو مخلوط کر کے ایک نیا مزاج بنالیا ہے، محض نجاست ہو تو اسے کوئی نہیں دھوتا، سوکھنے کے بعد اس کو محض جلا دیا جاتا ہے، لیکن پاک چیز ناپاک ہو جائے تو اسے رگڑ رگڑ کر، پتھر پر پٹک پٹک کر، ڈنڈے سے مار مار کر، پانی میں کھولا کھولا کر، تیز سے تیز صابن لگا لگا کر نجاست سے علیٰحدہ کیا جاتا ہے، ایمان ویقین ایک پاک اور مقدس چیز ہے، اس سے انسان بالکل پاک ہو جاتا ہے، پھر گناہوں کی نجاست اس کو نجس کر ڈالتی ہے، اگر اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ نجاستِ محض بن کر رہ جائے گا، دیکھئے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ **بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَاَحَاطَتْ بِہٖ خِطِیْئَتُہٗ اُولٰئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ** ﴾ جو برائی کی کمائی کرتا ہے اوراس کی خطائیں اسے اچھی طرح گھیر لیتی ہیں تو یہی شخص جہنم کا آدمی ہے، اس میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

نجاست میں اگر پاک چیز فنا ہوجائے تو آخر اسے کیا کہا جائے گا، کاش ہم سبق لیتے، ورنہ خدانخواستہ کہیں وہ حالت نہ ہوجائے جس کی خبر ایک حدیث میں یوں دی گئی ہے: **یاتی علی الناس زمانٌ یدعو الرجل للعامة فیقول اللہ تعالیٰ أدع لخاصتک أستجب وأما العامة فلا، فانی علیھم غضبان۔**

ایک دور ایسا بھی آنے والا ہے کہ ایک شخص عامۃ الناس کے حق میں دعا کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ محض اپنی ذات کے لئے دعا کرو، قبول کروں گا، عوام کے لئے تمہاری دعا قبول نہ ہوگی، میں ان سے ناراض ہوں۔

ہماری عادتِ فراموشی اور غفلت میں انہماک کہیں اس درجہ تک ہم کو پہونچا نہ دے، **نعوذ باللہ من شرور أنفسنا**، یہ درد سب سے بڑھ کر ہے، مدرسے قائم ہیں، وعظ ہورہے ہیں، کتابیں لکھی پڑھی جارہی ہیں، مسجدوں میں کتابیں سننے اور سنانے کا اہتمام ہے، لیکن مرض ہے کہ زوروں پر ہے، دوا وہاں نہیں پہونچ رہی ہے جہاں مرض ہے، اس لئے علاج نہیں ہورہا ہے، **فإلی اللہ المشتکیٰ۔**

خط بڑا طویل ہوگیا، خدا کرے آپ بدمزہ نہ ہوگئے ہوں، ابھی دل ودماغ میں خیالات کا ہیجان ہے، لیکن ایک طالب علم سر پر سوار ہے، اور آپ کی بدمزگی کا بھی احتمال ہے، اس لئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں، میرے لئے بھی دعاء فرمائیں کہ اپنی شامت اعمال کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۷/صفر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

محترم ومکرم جناب حاجی صاحب! زیدمجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

آپ شیریں ہیں، آپ کا تحفہ شیریں! اور میں جیسا ہوں، ویسا ہی تحفہ ارسال کرر ہا ہوں۔ (۱) خدا کرے آپ ترش رُو نہ ہوں، لیکن یہ نہ پڑھئے گا کہ

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

نشہ اتارنے والی ترشی یہ نہیں ہے، وہ اہل اللہ کے پاس ملتی ہے۔

ایک سادھو اپنی کٹیا میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے اپنے چیلے سے کہا کہ بیٹا بھنگ لاؤ، پینے کا وقت ہو گیا ہے، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، چیلے نے کہا کہ گرو جی تھیلا خالی ہے، پہلے سے خیال نہیں ہوا۔ گرو نے پکار کر کہا، کہیں سے لاؤ، مجھے ابھی چاہئے، جلد کہیں سے لاؤ، چیلا بھاگا ہوا جنگل میں گیا، دور ایک کٹیا نظر آئی، اس میں ایک دھیما چراغ جل رہا تھا۔ یہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ کی کٹیا تھی، چیلے نے ہانک لگائی کہ یہاں بھانگ ملے گی، حضرت بولے یہاں بھانگ نہیں ملتی ولایت ملتی ہے، اس نے کہا وہی دیدو، فرمایا نیچے ایک ندی ہے وہاں نہا کر آؤ، وہ نہا کر آیا، حضرت نے کلمہ پڑھا کر ایسی توجہ دی کہ وہ بیخود ہو گیا، اپنے گرو کے پاس اسی نشہ میں مخمور چلا گیا، گرو نے دیکھتے ہی للکارا، ارے نالائق میں نے تو تجھے لانے کے لئے بھیجا تھا، تو تو پی کر آرہا ہے، اس نے کہا گرو جی چلو تمہیں بھی پلا دوں، لے گیا اور اسے بھی وہی چیز پلا دی۔

سبحان اللہ! یہ ہے وہ ترشی جو نشۂ دنیا اتار کر دوسرا نشہ چڑھا دیتی ہے، کاش ہمیں بھی کوئی ایسا ہی کٹیا باسی مل جاتا۔

بہر کیف! میں کہاں بہک گیا، مولانا عبدالرب صاحب کی زبانی آپ کی پریشانی کا علم ہوا، آج کل روزانہ ایک مخصوص وقت پر آپ کے لئے بارگاہِ حق میں دست بدعاء ہوتا ہوں، معلوم نہیں ادھر کا فیصلہ کیا ہے، ہم آپ ان شاء اللہ سو جان سے راضی ہیں، مقصود ان کی رضا ہے، باقی سب ہیچ ہے۔

ما ہیچ نداریم، غم ہیچ نداریم ۔۔۔ دستار نداریم، غم پیچ نداریم

لیکن افسوس میں تو دستار میں پھنسا ہوا ہوں، پھر غم پیچ سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نجات بخشے۔

سبق روک کر بہت جلدی جلدی یہ سطریں تحریر کی ہیں، فروگذاشت ہوگئی تو معاف فرماویں۔ شاید جمعرات کو گھر کی جانب حاضری ہو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۷؍ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ

(۱) والد صاحب نے حضرت مولانا کے پاس گاجر کا حلوہ بھیجا تھا، چند دنوں کے بعد حضرت مولانا نے والد صاحب کے پاس سورن کا اچار بھیجا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

☆☆☆☆☆

بخدمت گرامی قدر جناب حاجی عبدالرحمٰن صاحب! زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادھر عرصہ سے آپ کی کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی، دل لگا رہتا ہے، یوں تو حق تعالیٰ جس حال میں رکھیں کرم ہی کرم ہے، انسان اصل کے اعتبار سے کیا ہے؟

عدم محض اور لاشئ فقط، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نورِ وجود سے منور فرمایا، موجود ہو گیا، بقا صرف اللہ کی ذات وصفات کو ہے، انسان کی نہ ذات باقی، نہ صفات باقی، نہ احوال باقی، سب متغیر، سب فانی، ہر روز ایک نیا حال، ہر دن ایک نیا مقام، دل کبھی اِدھر کبھی اُدھر، ہاں اگر کوئی اپنی صفات کو، اپنی ذات کو، اپنے ارادوں اور خواہشات کو بارگاہِ عالی میں قربان کر دے، ان کی مرضیات کا تابع ہو جائے، اپنی آرزوؤں میں گرفتار نہ رہے، تمناؤں کی قید سے آزاد ہو جائے، پھر اس کی حالت میں تلون باقی نہیں رہتا، استقامت پیدا ہو جاتی ہے، جسے حضراتِ صوفیہ کی اصطلاح میں "تمکین" کہتے ہیں، اب اگر کچھ تغیر ہوتا ہے تو یہ کہ دنیا کی تنگنائے سے نکل کر عالم غیب کی فضاؤں میں پرواز کرتا رہتا ہے، دنیا کی کوئی زنجیر اس کے پاؤں میں نہیں رہ جاتی، انسان کو حق تعالیٰ نے اپنے اوصاف وکمالات کا مظہر بنایا ہے، اس آئینہ میں اگر انھیں کے اوصاف وکمالات کا مسلسل ظہور ہوتا رہے تو بلاشبہ آئینہ کے لئے معراجِ کمال ہے، لیکن یہ تو اس پر طرح طرح کی کالک لیپ پوت کر اس کو خراب کر دیتا ہے، اس کو صیقل کرتے رہنا چاہئے، ہر وقت اس کی فکر رہنی چاہئے، اپنے نفس اور قلب کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اس پر کوئی زنگ نہ لگنے پائے، اگر لگ جائے تو اسے جلد سے جلد توبہ کے پانی سے دھل دھلا کر پاک وصاف کر دینا چاہئے، ورنہ گناہوں کا زنگ اگر قلب پر لگا رہ جاتا ہے تو وہ قلبی صلاحیتوں کو کھانا شروع کر دیتا ہے، اور پھر اس میں مزید معاصی کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے، اور آہستہ آہستہ وہ قلب، قلب نہیں رہ جاتا، صرف زنگ بن کر رہ جاتا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، ان کے اعمال ان کے قلوب پر زنگ بن گئے۔

یہ حالت بڑی مایوس کن ہوتی ہے، ایک حدیث بھی سنئے!

عن أبی هریرة ﷺعن رسول الله ﷺ قال : إن العبد إذا أخطأ خطیئةً نکتت فی قلبه نکتةً سوداء فإذا هو نزع واستغفرو تاب صقل قلبه وإن عاد زید فیها حتیٰ یعلو قلبه وهو الران الذی ذکر الله ''کَلَّا بَلْ رَانَ عَلیٰ قُلُوْبِهِمْ مَّاکَانُوْا یَکْسِبُوْنَ'' ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ بندہ جب کوئی غلطی کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، پھر جب وہ اس غلطی سے باز آجاتا ہے، اور حق تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے، اور اگر دوبارہ سہ بارہ کرتا ہے تو وہ نقطہ بڑھتا چلا جاتا ہے، اور نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ سارا قلب اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے، یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ''کَلَّا بَلْ رَانَ عَلیٰ قُلُوْبِهِمْ مَّاکَانُوْا یَکْسِبُوْنَ'' میں فرمایا ہے۔

اصل مصیبت یہی ہے، اس سے بہت ڈرنا چاہئے، حدیث شریف میں ہے کہ **إن الله طیب لا یقبل إلا الطیب**، اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور بجز پاک چیز کے اور کچھ قبول نہیں فرماتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ نظر گاہِ حق قلب اور محض قلب ہے، اگر وہ زنگ خوردہ ہوجائے تو کس کام کا، گناہ خواہ کوئی ہو، جان میں ہو، مال میں ہو، حقوق اللہ کی قبیل سے ہو، حقوق العباد کی قبیل سے ہو، اس تاثیر میں سب مشترک ہیں، ہاں تاثیر کے درجات میں کمی بیشی ہے، لیکن کپڑوں کا ڈھیر جلانے کے لئے دہکتا ہوا شعلہ اور ٹمٹماتی ہوئی دیاسلائی دونوں خطرناک ہیں، حق تعالیٰ بے نیاز ہیں، ان پر کسی کا زور اور دباؤ نہیں ہے، ان کی بے نیازی اور قدرت کاملہ کو اگر انسان اپنی نگاہ میں رکھے تو ذرے جیسا گناہ بھی پہاڑ محسوس ہوگا، حق تعالیٰ کی ذاتِ عالی غیب الغیب ہے، اس لئے انسان جری رہتا ہے، اگر اس کے اوپر ذرا سی تجلی اتر جائے تو دنیا اور متاعِ دنیا جس کے

واسطے وہ گناہ کرتا رہتا ہے، اس سے دل قطعاً سرد ہو جائے، ایک تجلی آپ کو دکھاؤں۔

عن أبى ذر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: إنى أرىٰ مالا ترون وأسمع مالا تسمعون أطت السماء وحق لها أن تأط مافيها موضع أربع اصابع إلا وملك واضع جبهته لله ساجداً والله لو تعلمون مأعلم لضحكتم قليلاً ولبكيتم كثيراً وما تلذذتم بالنساء على الفرش ولخرجتم إلى الصعدات تجأرون إلى الله. لوددت أنى كنت شجرة تعضد (ترمذى شريف)

فرماتے ہیں کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، تم نہیں دیکھتے، اور میں جو کچھ سنتا ہوں تم نہیں سنتے، آسمان چر چرا اٹھا، اور اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ چر چرا اٹھے۔ اس میں چار انگل جگہ بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی فرشتہ حق تعالیٰ کی جناب میں اپنا ماتھا ٹیکے ہوئے نہ ہو، خدا کی قسم اگر وہ باتیں تم لوگ جان لیتے جو میں جانتا ہوں، تو بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے، اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے، اور گھروں سے نکل کر جنگلوں کی راہ لیتے، اور اللہ کے حضور فریاد کرتے کہ کاش میں کوئی درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

یہ تجلی ہی تھی، رسول اللہ ﷺ کا ظرف تھا جو برداشت فرماتے تھے، ان کا حوصلہ بہت عظیم تھا، آپ نے اس اجمال میں سب کچھ بتا دیا، کاش ہم لوگوں کو کچھ سمجھ ہوتی، غفلت نے ہم لوگوں کے دلوں پر موٹے موٹے پردے ڈال رکھے ہیں، اس لئے عالم غیب کی تجلیات سے بالکل محروم ہیں، بزرگوں کی صحبت، ذکرِ الٰہی کی کثرت، تلاوتِ قرآن کریم کا اہتمام، اور موت کا استحضار دل کے لئے بہترین صیقل ہے، پھر آدمی کے لئے یہ عالم شہود عالم غیب بن جاتا ہے، اور عالم غیب کی جانب دل کی

آنکھیں کھل جاتی ہیں، اور وہی اس کے لئے شہود بن جاتا ہے، کاش اس کا کچھ حصہ ہم لوگوں کو نصیب ہو جاتا۔

مدرسہ میں الحمدللہ سب خیریت ہے، مولوی عبدالرب صاحب کا خط چندروز ہوئے آیا تھا، بہت خوش ہیں، آج شاید وہ مکہ مکرمہ میں ہوں گے، عمرہ کے لئے جانے کو لکھا تھا، کل میں نے انھیں خط لکھا ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بخدمت گرامی قدر جناب حاجی صاحب! زیدمجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

آپ اپنا حال لکھتے ہوئے ڈرتے ہیں، شرماتے ہیں، کیا بتاؤں کہ اس کیفیت کے اظہار سے مجھے کس قدر ندامت ہوتی ہے، آپ نے میری عرض سنی، میری دلجوئی کی، کیا میں اتنا گیا گذرا ہوں کہ آپ کی باتیں نہ سن سکوں، تاہم آپ کے اجمال نے گوشِ دل میں بہت کچھ کہہ دیا، گو تفصیل سے باخبر نہیں ہوں، لیکن حالات سے بالکل بے خبر بھی نہیں ہوں، اور سچ پوچھئے تو یہ تنہا ایک آپ ہی کی داستان نہیں ہے، ایک عالم کا عالم اسی خلجان میں مبتلا ہے، ؎

وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

حالات کا مدوجزر کس پر نہیں آتا، انقلاباتِ روزگار کا شکار کون نہیں بنتا، ابھی رنج ہے ابھی خوشی ہے، ابھی بیماری ہے ابھی صحت ہے، رنج وراحت قدم بقدم ہیں،

ابھی اچھی طرح ہنسنے نہیں پاتے کہ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، ابھی پوری طرح لذتِ گریہ سے آشنا نہیں ہو پاتے کہ مسرت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، حالات کو ایک حالت پر قرار کب ہے؟ اللہ اللہ! آپ نے دنیا بھی کیا بنائی، نہ غم و اندوہ ہی کامل، نہ جی بھر کر فرحت و شادمانی ہی حاصل! بس ہر چیز ناتمام، ہر نقش ادھورا، ہر حال نامعتبر، دنیا کی ہر کہانی نامکمل، حد تو یہ ہے کہ خود انسان کی داستانِ غم کیسی ہے؟ ایک شاعر بے چارہ کہتا ہے۔ شعر

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

سچ ہے، دنیا ایک نقش ناتمام ہی ہے، حکایت نامعتبر ہی ہے، خود ہستی نامکمل ہے، تو اس کے متعلقات میں کمال کدھر سے ہو، تکمیل کا محل دوسرا ہے، کمال کا مقام کوئی اور ہے، اعتبار کہیں اور کے لئے ہے، ثبات و قرار ابھی نہیں، کسی دوسرے وقت پر موقوف ہے، خوشی اور مکمل خوشی، راحت اور ابدی راحت، مسرت اور ہمیشہ کی مسرت کیا دنیا اس کی استعداد رکھتی ہے، کیا یہ عالم آب و گل اتنی صلاحیت کا مالک ہے کہ طویل راحت اور سرمدی خوشی کو برداشت کر لے، نہیں اور ہرگز نہیں، اس کا محل کوئی اور ہے، سنئے تو سہی! اس کے بارے میں سب سچوں کے سچے نے کیا کہا ہے

إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنىٰ أُوْلٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِىْ مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُوْنَ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (سورۃ الانبیاء)

بلاشبہ جن کے واسطے ہماری بارگاہ سے بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ لوگ اس (غم کدہ) سے دور رکھے جائیں گے، ان کو اس بڑی ہولناک گھبراہٹ کا غم نہ ہوگا، اور فرشتے

ان کے استقبال میں آگے بڑھ کرملیں گے، یہ ہے وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

جی ہاں! جب غم کی آندھیاں پریشان کرتی تھیں، جب دل پر حالات وحوادث کی چوٹیں لگتی تھیں، جب جگر میں سوزش وتپش کی آگ بھڑکتی تھی، جب قلب مضطرب اور دماغ بدحواس ہوتا تھا تو اندر ہی اندر کوئی تسلی دیتا تھا کہ مت گھبراؤ، موسم بدلنے والا ہے، جگر کی آگ گل وگلزار ہونے والی ہے، قلب کا اضطراب اور دماغ کی بدحواسی سرور وتازگی سے بدلنے والی ہے، تو اس وقت خوب سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر اب دیکھ لو، اب نہ کہنا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں ہوا، جو تسلی دی گئی تھی، وہ جھوٹی ثابت ہوئی، لیکن کیا کہیے کہ یہ دل ایک عجیب جوہر ہے، اسے نہ خوشی میں قرار اور نہ غم میں ثبات، کیا کہوں اسے جوہر عجیب شاید غلط کہہ گیا، یہ تو ایک روگ ہے۔ آسی مرحوم نے کہا اور خوب کہا، شعر

دل ملا مجھ کو ازل میں تو کسی نے نہ کہا
روگ ہے یہ اسے چھاتی سے لگاتے کیوں ہو؟

اصل میں سارا روگ اسی دل کا ہے، یہ سینے میں جاگزیں ہوا، پھر جو قیامت گذرنی گذر گئی، یہ آیا تو تنہا نہیں آیا، محبت، عشق، سوز، گداز، انتظار، رنج، اندوہ، خلش، ملال، خوشی، مسرت، فرحت، راحت، غرض فوج کی فوج اس کے ساتھ لگی چلی آئی، اب ساری زندگی ان مہمانوں کی میزبانی کرتے رہیے، جب تک زندگی ہے، جب تک یہ ہیں، جہاں موت آئی کہ غم واندوہ کی فوج رُخصت، ہائے غالب مرحوم کیا بات کہہ گیا، ؎

قیدِ حیات وبندغم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس ہنگامہ زار دنیا میں اگر کوئی جائے پناہ ہے، کوئی گوشۂ عافیت ہے، کوئی خلوت گاہِ راحت ہے، کوئی مجلس اُنس وشوق ہے، تو وہ محض یادِ محبوب ہے، زبان اس محبوبِ حقیقی کا نام لیتی رہے، انگلیاں اس کے شمار پر چلتی رہیں، دل اس کی محبت سے لبریز ہو، آنکھیں اس کے عشق میں ڈبڈبا رہی ہوں، جگر اس کے فراق میں جل رہا ہو، دماغ اس کے وصل کی تدبیریں سوچ رہا ہو، اس کی یاد بدن میں حرارت پیدا کر رہی ہو، اور اس کا درد آگ بن کر نخلِ ہستی کو پھونک رہا ہو، زندگی خواہ راحت سے لبریز ہو یا جراحت سے معمور! ادھر سے تکلیف ہو یا آرام، پاس رکھیں یا دور، رُلائیں یا ہنسائیں، ہمارا حال تو کچھ اور ہی ہونا چاہئے، کاش ایسا ہوتا۔

محبوب کی ہر ادا محبوب ہے، وہ کالی زُلفیں ہوں یا روشن چہرہ، دونوں ہی جان لیوا ہیں، دونوں میں ایک لذت ہے، مصیبت کی اندھیری رات ہو یا خوشی کا دمکتا ہوا دن، شامِ غم ہو یا صبح مسرت دونوں دل رُبا ہیں، الگ الگ شانیں ہیں، تجلی ایک ہے، لطف ایک ہے، حلاوت ایک ہے، ذوق صحیح ہو تو شیرینی بھی باعث لذت کام ودہن ہے، اور تلخی بھی لطف ذائقۂ وزبان! آپ ہی کے ہمنام مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ نے بڑی اچھی بات کہی ہے

بادوروزہ زندگی جامیؔ نہ شد سیر غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی یافتم

دودن کی زندگی میں جامی آپ کے غم سے آسودہ نہ ہوسکا، کیا خوب ہوتا کہ مجھے عمر جاودانی ملی ہوتی۔

کیا کیا لکھوں، بے ربط باتیں ہیں، آپ اکتا جائیں گے، دیوانہ ہوں، ’’دیوانہ راہوئے بس است‘‘ کے مصداق قلم اٹھا تو کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا کیا لکھے جا رہا ہوں، جلدی میں ہوں، نظر ثانی کی بھی فرصت نہیں، لیکن ایک بار پڑھ کر لفافہ میں

بند کروں گا، نہ جانے کیا کیا لکھا ہوگا، خدا کرے گرانئ خاطر کا سبب نہ ہو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۳؍رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بخدمت گرامی قدر جناب حاجی صاحب! زید مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

کل سے برابر طبیعت میں تقاضا ہے کہ آپ کے پاس کچھ لکھوں، کیا لکھوں یہ مبہم ہے، اور ابھی تک مبہم ہے، کوئی خاص بات ذہن میں نہیں ہے، جو لکھی جاسکے، تاہم تقاضا ہے، اور اسی تقاضے سے مجبور ہوکر بغیر اس کی فکر کئے کہ کیا لکھنا ہے قلم اٹھالیا ہے، آپ نے خیرآباد میں کہا تھا کہ میرے رُقعہ کا جواب نہیں ملا، شاید اس کا اثر خفی ہو۔

محترما! دنیا میں حق تعالیٰ راحت کے جن اسباب سے نوازتے ہیں، ان میں سب سے بڑا ذریعہ مال اور اولاد کو سمجھا جاتا ہے، عام خیال یہی ہے، اس لئے ہر شخص اسی تگ ودو میں مبتلا رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اور بہتر سے بہتر اولاد حاصل کرے۔ مال بذاتِ خود کسی کے نزدیک مقصود ومطلوب نہیں ہوتا، چونکہ یہ قیاماً للناس ہے، زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اس لئے کوشش کی جاتی ہے کہ وافر مقدار میں مال کا ذخیرہ جمع کرلیا جائے تاکہ کسی وقت تنگی اور پریشانی نہ ہو، یہی صورتحال اولاد کی بھی ہے، ہرکس ناکس کے دل میں یہی بات بیٹھی ہوئی ہے، زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے! تحصیل مال کی یہ ابتدائی غرض وغایت ہے، پھر اس میں

حسب استعداد ترقی ہوتی رہتی ہے، لیکن بنیادی سبب یہی ہے کہ وہ اسباب راحت کا ”فرد اکبر“ ہے، لیکن خیال کیجئے کہ کیا یہ واقعہ ہے، کیا ہر وہ شخص جو مال فراواں رکھتا ہے، راحت وآرام سے بھی بہرہ یاب ہے، کیا کسی دولت مند پر پریشانی وناسازگاری کا سایہ نہیں پڑتا؟ اور کیا غریب ومفلوک الحال ہمہ وقت مضطرب وبدحواس ہی رہتا ہے، دنیا کا تجربہ بتاتا ہے ایسا نہیں ہے، نہ جانے کتنے دولت مند ایسے ہیں، جو چین وآرام کا نام نہیں جانتے، اور نہ جانے کتنے غریب وبے نوا ایسے ہیں جو ہمیشہ خوش وخرم رہتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ آدمیوں نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ غلط مفروضہ اور بے بنیاد خیال ہے، ہم نے انبیاء کا علم پڑھا، تجربہ کاروں کی باتیں سنیں، تاریخ کے اسباق پڑھے، خود اپنے احوال پر غائرانہ نظر ڈالی، تو جو سب سے بڑا اسببِ راحت ملا جس کے بعد کوئی پریشانی نہیں، جس کے ہوتے ہوئے کوئی غم نہیں، جس سے دل کو انتہائی تقویت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر توکل کرنے کا سلیقہ آجائے، توکل کے معنی ہیں، کسی کو اپنا وکیل بنالینا، تو جو رب المشرق والمغرب ہو، جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہ ہو، اس کو اگر کسی نے اپنا وکیل بنالیا: رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلاً، تو اس سے بڑھ کر سبب راحت کیا ہوگا، توکل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے، بیشک توکل میں ایک درجہ ایسا بھی آتا ہے، جہاں بہت سے اسباب متروک ہوجاتے ہیں، لیکن اس کا تعلق غلبۂ حال سے ہے، صرف عقیدہ اور علم سے نہیں ہے، اس کا کوئی شخص مکلّف نہیں ہے، اور جب وہ حال پیدا ہوگا تو بغیر کسی مزاحمت کے خود بخود اسباب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، توکل جو ہم لوگوں کے لئے قابل حصول ہے، وہ یہ ہے کہ اعتماد صرف اللہ پر ہو، دل کا تعلق خدا کے علاوہ کسی اور سے نہ ہو، مال ودولت، کسب

واکتساب سب میں حسب ضرورت اشتغال ہو، مگر دل کا رابطہ خدا سے ہو، اگر یہ بات حاصل ہوجائے تو کافی ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً خود کو یادِ الٰہی کا پابند بنایا جائے، لساناً بھی اور قلباً بھی، ثانیاً یہ کہ ہر کام کی ابتداء اور انتہاء میں ضرور، اور درمیان میں بطور اختیار کے اس مضمون کا استحضار کیا جائے کہ ’’تدبیر‘‘ ہم نے کرلی، اس کا نتیجہ خدا کے اختیار میں ہے، اگر نتیجہ اچھا نکلا تو سبحان اللہ، اور اگر ہمارے حسب منشا نہ نکلا تو وہی بہتر ہے، جو خدا کو منظور ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بہتر کوئی اور چیز عطا فرمائیں گے، اس مضمون کا بتکرار استحضار کیا جائے، تو توکل حاصل ہونے میں دیر نہیں لگے گی، غرض یہ ہے کہ قلب کا لگاؤ صرف خدا کے ساتھ ہو، اس کا آرزومند رہنا چاہئے، اس کی کوشش کرنی چاہئے، آپ کہیں گے کہ یہ بچوں کی طرح سبق پڑھانے لگے، کیا کروں، جب مضمون کچھ نہ تھا اور لکھنا ضرور تھا تو جو کچھ ذہن میں آتا گیا لکھتا گیا، آپ نے پڑھ بھی لیا، خدا کرے کچھ مفید ہو، دعا کرتا ہوں، اور دعا کا خواہاں ہو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۷؍جمادی الاخریٰ ۱۴۱۰ھ

☆☆☆☆☆

(**نـــوٹ**) اس خط کا محرک یہ ہے کہ ۱۹۸۸ء میں حاجی عبدالرحمٰن صاحب خیرآبادی کے ساتھ میں نے بھی حج کا فارم بھرا تھا، جو باوجود کدوکاوش کے منظور نہ ہوسکا تھا، دوسرے سال دوبارہ فارم بھرنا تھا، ۱۱؍جنوری تک فارم کے جمع ہونے کا وقت تھا، میں ۲۶؍دسمبر کو مولانا عبدالرب کے ساتھ الہ آباد اور باندہ کے سفر پر چلا گیا، پھر ان کے اصرار پر بمبئی چلا گیا۔ اور ادھر کا دھیان نہ رہا، واپسی ۷؍جنوری کو ہوئی، حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے مایوس ہوکر ۷؍جنوری ہی کو فارم بھر دیا اور مجھے اطلاع نہ ہوسکی، مدرسہ آنے کے بعد مجھے اس کی اطلاع ملی تو میری جو کچھ کیفیت ہوئی، درج ذیل خط اس کا ترجمان ہے، (اعجاز احمد اعظمی)

محترم ومکرم جناب حاجی صاحب! زید مجدھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

کل شام کو ابرار احمد سلّمہٗ نے ایک خبر سنائی، یہ خبر تھی یا بجلی جو قلب وجگر پر گری اور

آگ اس گھر میں ایسی لگی کہ جو تھا جل گیا

میں آوارہ گردی اور کوچہ نوردی میں مبتلا تھا، اور یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا۔ آپ نے حج کا فارم بھر دیا اور اب وقت بھی باقی نہ رہا۔ اسی وقت سے دل کا عجیب حال ہے، ایک بے نام سی کیفیت دل پر دھواں بن کر چھائی ہوئی ہے، وہ کیفیت کیا ہے؟ ہائے کیا بتاؤں؟ نہ رنج وغم ہے، نہ حسرت وافسوس ہے، نہ پریشانی وبدحواسی ہے، نہ گریۂ وبکا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا نام دوں؟ کس عنوان سے تعبیر کروں؟ بس یوں کہہ سکتا ہوں کہ ایک تحیر کا سا عالم ہے، دل میں ہلکا ہلکا نا قابل برداشت سا درد ہو رہا ہے، جس میں لذت وحلاوت بھی ہے، شوق وبے تابی بھی ہے، حسرت واندوہ بھی ہے، نا قابل فہم سی حیرت بھی، اور غم کے ساتھ آمیز ایک خوشی بھی ہے، اور نہ جانے کیا کیا ہے ؂

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

جیسے کوئی صحرا وبیابان میں اچانک لٹ گیا ہو، اس کے بدن پر پہننے کے کپڑے تک نہ باقی ہوں، اور اس پر ایک تحیر کا عالم چھا گیا ہو۔ سوچتا ہوں کہ یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کچھ نہیں ہوا۔ صرف ایک بات ہوئی۔ ؂

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

(میں چلا کہ پاؤں سے کانٹا نکالوں، اتنے میں کجاوہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، میں ایک لمحہ کیلئے غافل ہوا، اور سوسال کی راہ دور ہوگئی)

میری ایک بے معنی رہ نوردی ایک پُر مغز اور با معنی سفر سے مانع بن گئی، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میرا نام بھی شیدائیوں، تمنائیوں اور آرزومندوں کے دفتر میں لکھا گیا ہوتا، لیکن میں کوچہ وصحرا کی خاک چھانتا رہا، اور خوش بختوں کا گروہ امید وشوق کا سہرا باندھ کر تیار ہوگیا۔ حق تعالیٰ کو شاید یہی منظور ہے کہ بامرادوں کی جماعت میں نامراد گھسنے نہ پائے، کہیں اس کی نامرادی دوسروں کے لئے باعث محرومی نہ بن جائے۔

اچھا ہی ہوا، میرا کیا منہ تھا کہ میں نے حاضریٔ آستانہ کا حوصلہ کرلیا تھا۔ کہاں وہ خاکِ پاک جو فرشتوں کے لئے سرمۂ نگاہ ہے، اور کہاں یہ وجودِ ناپاک، جو سرے سے بے ننگ ونام ہے، میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ میرا حوصلہ بیجا ہے، میری آرزو بے سود ہے، میری سعی رائیگاں ہے، جانتا تھا کہ استحقاق کیا چیز ہے؟ شائبۂ اہلیت بھی نہیں ہے، پر سوچا کرتا تھا کہ وہ ذاتِ پاک نااہلوں کو بھی نواز دیتی ہے، مگر اب کھلا کہ یہ نااہلی بحدے رسیدہ کہ اس نے بخشش وعطا کے دروازے تک بند کردیئے ہیں، اچھا ہوا کہ یہیں روک دیا گیا، خدانخواستہ اگر وہاں پہونچ جاتا اور پھر الٹا واپس کردیا جاتا تو ذلت ورُسوائی کی ناقابل محومہر لگ جاتی۔ میں راضی ہوں، دل سے راضی ہوں، محبوب تعالیٰ کی جو مرضی ہو! بندہ ہوں کیا دم مارسکتا ہوں۔ انھوں نے نہ چاہا، پہلے باوجود کوشش کے کچھ نہ ہوا، اب سعی وجہد کا موقع ہی نہ دیا، بس سلادیا، اور قافلہ کو گزاردیا۔ اب آنکھیں مل رہا ہوں اور گردِ کارواں دیکھ رہا ہوں، بہتر ہے، ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

شوق ناتمام تھا، حوصلہ برائے نام تھا، جذب ناقص تھا، ہمت ادھوری تھی، پھر سرفروشوں اور جاں سپاروں کی بزمِ ناز میں کہاں گنجائش ہوتی، اور ہو بھی جاتی تو ناکام

ونامراد لوٹنا پڑتا۔ اس لئے اچھا ہوا کہ باہر ہی رکھا گیا۔ اب شاید تازیانہ لگے، شوق کو مہمیز ہو، حوصلہ چوٹ کھا کر لہرائے، جذب میں گیرائی پیدا ہو، شاید ایسا ہو، شاید اس لئے کہ اپنی طبع آرام پسند پر نظر پڑتی ہے تو سب آرزوئیں شکست کھاجاتی ہیں، یہ ایک بے جان اور مردہ طبیعت ہے، جو شوق ومحبت سے بے پروا، حوصلہ وہمت سے خالی، آرزو وتمنا سے بے نیاز اور سعی وجہد سے یکسر برکنار ہے، اس سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ جو کچھ پڑ جائے اسے بھگت لینے کی عادی ہے، لیکن ماضی سے سبق حاصل کرے اور مستقبل پر نگاہ جمائے، اس کا یارا اسے نہیں، بس جہاں ہے وہاں ہے، نہ پیچھے مڑ کر دیکھے، نہ آگے جست لگائے، ایسی کاہل اور بے مزہ طبیعت کے ساتھ زندگی کا سفر کوئی کیسے قطع کرے، بس یونہی پڑا رہے، اور مر جائے، یہی اس کی قسمت ہے۔

خیر جانے دیجئے، یہ حکایت خونچکاں اور شکایت بیکراں کہاں تک کہئے، یہ بھی ایک دفتر بے معنی ہے، جسے حافظ شیرازی نے ”غرق مے ناب اولیٰ“ کہا ہے، لیکن مے ناب کہاں میسر؟ اسے چھوڑیئے، اور یہ بتایئے کہ کیا ارادہ ہے، تیر کر جایئے گا، یا اُڑ کر پہونچئے گا۔ اب میں خلوص دل سے دعا کروں گا، اب آپ کا یہ ارادہ میری غرض کے شائبہ سے پاک ہے، ان شاء اللہ آپ ضرور جائیں گے، اور ہم کو بھی یاد رکھیں گے۔ (۱)

فقط والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

---

(۱) پھر اللہ کا فضل ہوا، درد وغم کی یہ فریاد عرشِ الٰہی تک پہونچ گئی، اور نامۂ منظوری لے کر آئی، چنانچہ اسی سال حرمین شریفین کی پہلی حاضری مقدر ہوئی، اور میسر آئی۔ اس کی تفصیل ”بطواف کعبہ رفتم“ میں پڑھئے۔

☆☆☆☆☆

بنام مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی

میرے مخدوم اور مخدوم زادے استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحبؒ کے بلند مرتبہ صاحبزادے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور وہیں خدمت تدریس پر فائز ہیں۔ بہترین مدرس، عمدہ خطیب اور جید حافظ قرآن ہیں۔ ابتداءً جامعہ حسینیہ لال دروازہ جون پور میں درس دیا۔ وہاں سے دیوبند تشریف لے گئے۔ میری جب کبھی حاضری دارالعلوم دیوبند میں ہوتی ہے اور عموماً سال میں ایک مرتبہ تو ہو ہی جاتی ہے، وہاں میرے مستقل میزبان یہی ہیں۔ ان سے مل کر اور ان کا مہمان بن کر دلی مسرت حاصل ہوتی ہے، اور مرحوم استاذ محترم کی یادوں کا چراغ دل میں روشن ہو جاتا ہے۔

(اعجاز احمد اعظمی)

عزیزم! **جعلنی اللہ وإیاکم کما یحب ویرضیٰ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا ایک جوابی خط ایک ہفتہ قبل ملا، اسی وقت میں نے اس کا جواب لکھا تھا، اس سے پہلے والے خط میں، میں نے ذکر کے مسئلے کو چھیڑا تھا، اس خط میں تم نے اس کا تذکرہ کیا ہے، میرے لئے سرمایۂ حیات یہی بات ہے، قلبی خوشی ہوئی، حق تعالیٰ استقامت اور ہمت وحوصلہ عنایت فرمائیں۔

عزیزِ من! انسان کی خلقت کا مقصد بجز یادِ الٰہی اور معرفت خداوندی کے کچھ نہیں، اگر کسی کو یہ دولت نہ ملی تو اسے کچھ نہیں ملا، زندگی وبال اور وقت ضائع! کیا بتاؤں یہ کیسا قیمتی سرمایہ ہے، اگر بڑی سے بڑی قربانی دے کر یہ دولت بیدار حاصل ہوجائے تو سودا سستا ہے۔ ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **ولا تکن من الغافلین** ، اس سے معلوم ہوا کہ غفلت حرام ہے، پھر ظاہر ہے کہ اس کی ضد فرض ہوگی، چنانچہ **أذکروا اللہ ذکراً کثیراً** ارشاد ہے۔ اب ہم لوگوں کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ قلوب میں غفلت کتنی بھری ہوئی ہے، اگر کوئی گناہ نہ ہو تو یہ خود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے سامنے سب ہیچ! یہی وہ بلا ہے جس کی بنیاد پر دوسرے گناہ سر اٹھاتے ہیں، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے گناہ کے گناہ ہونے کا احساس بھی مٹ جاتا ہے۔ کتنی معصیتیں انسان دن رات کرتا رہتا ہے، اور اسے خیال بھی نہیں گذرتا کہ کن نجاستوں میں ملوث ہے، کتنی خطرناک مصیبت ہے یہ! یہی غفلت نفاق کی بنیاد ہے، معاصی کی بنیاد ہے، سوچو اس کا ازالہ

کتنے اہتمام اور کتنی فکر کے ساتھ کرنا چاہئے ، آدمی اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اس کو جذرِ قلب سے اکھاڑ نہ پھینکے، اور جانتے ہو کہ یہ بیماری دل کی ہے، اعضاء و جوارح کی نہیں، پھر یہ سمجھ لو کہ جہاں بیماری ہو دوا بھی وہیں پہونچنی چاہئے ، غفلت کا علاج ذکر اور محض ذکر ہے، اس لئے ذکر کے اندر دل کی شمولیت ضروری ہے، اس کے لئے یکسوئی ، خلوت ، تشویش پیدا کرنے والی چیزوں سے دوری ضروری ہے، تھوڑی دیر بیٹھو مگر یکسو ہو کر بیٹھو ، چاہئے تو یہ کہ ضروری مشغولیتوں سے فارغ تمام اوقات کو ذکر سے معمور کیا جائے ، مگر ہم لوگوں میں اتنا حوصلہ کہاں؟ لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ بالکل ہی حوصلہ کھو بیٹھیں ، حق تعالیٰ کو **معالی الھمم** پسند ہیں، ہمیشہ ہمت بلند رکھنی چاہئے ، حق تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔

بس بھائی ! تم کو نصیحت کرنا میرے لئے داخل گستاخی ہے، لیکن کیا کروں ، طبیعت نہیں مانتی ، امید ہے کہ مجھے معاف کرو گے، مولانا قمر الدین صاحب اگر ہوں تو ان سے ضرور سلام کہہ دو، ان کی ملاقات سے مجھے فرحت اور مسرت ہوئی ، خوب باغ و بہار آدمی ہیں ، اور صاحب دل بھی ، ان سے پھر آرزوئے ملاقات ہے، دیکھئے کب خدا ملاتا ہے، ان کی صحبت مختصر رہی ، مگر دل پر ایک نقش بٹھا گئی ، اکثر ان کی یاد آتی رہتی ہے، اگر نہ ہوں تو جب آئیں سلام کہہ دینا۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۷ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

برادرِ عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیر ہوں ، مجھے تمہارے خط کا انتظار بہت شدت سے تھا، انتظار کی عمر

اب پوری ہوئی، تم نے جواب کے سلسلے میں جو کچھ غور کیا اور اس کی وجہ سے جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی، یہ بات عمدہ نہیں ہے، یہ بات بہت اچھی ہے کہ قلب و دماغ کے دریچے اس کی قبولیت کے لئے کھل جائیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے دریچے کھلیں گے کیونکر؟ کسی بات کے بتکرار سننے سے! صرف ایک بار کی بارش زراعت کے لئے مفید نہیں ہوتی، بلکہ بار بار کی بارش زمین کو بہت حد تک نم کر دیتی ہے، پھر اس میں روئیدگی کی صلاحیت بے پناہ ہوجاتی ہے، میں نے تمہیں گدگدایا ہے، تاکہ اندرونی جوش جو تمہارے قلب میں دبا ہوا ہے، ابھرے۔ تم اس کے اسباب مہیا کرتے رہو، بار بار ایک بات مختلف عنوانوں سے سامنے آئے گی، تو انشاء اللہ بہت مفید ثابت ہوگی، دیکھو سیدنا عمر فاروقؓ نے جب جمع قرآن کی تحریک کی تو حضرت ابوبکرؓ اس کیلئے تیار نہ تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے اتنا اصرار کیا کہ حضرت خلیفۂ اول کو شرحِ صدر ہوگیا، پھر ان دونوں نے حضرت زید بن ثابتؓ پر اصرار کیا یہاں تک کہ انھیں بھی شرحِ صدر ہوگیا، جس طرح کتابوں کو یاد کرنے کے لئے تکرار مفید ہے، ویسے ہی اس کے لئے بھی تکرار مفید ہے، تم خط کو کسی انتظار میں موقوف نہ رکھو، میں الٹا سیدھا کچھ لکھتا ہی رہوں گا، اس میں کچھ کام کی بات بھی انشاء اللہ آجائے گی۔ کل تمہارا خط ملا، اسی وقت سے مجھ پر ایک وجد کی کیفیت ہے، تم نے حجابات کے نہ ہٹنے کی شکایت کی ہے، میرے عزیز! یہ حجابات اچانک نہیں ہٹیں گے، بڑے دبیز حجابات ہیں، آہستہ آہستہ کمزور ہوتے ہوتے ختم ہوں گے، کام میں لگے رہنا شرط ہے، عمر عزیز اگر اس فکر اور اس تڑپ میں گذرے کہ رضائے خداوندی کی متاعِ گرانمایہ حاصل ہو تو ہرگز ضائع نہیں ہے، اس طلب اور تڑپ کا پیدا ہونا ہی اصل ہے۔ جس بازار کی تمہیں تلاش ہے، وہ مفقود نہیں ہے، ہاں کمیاب ضرور ہے، تم تو ماشاء اللہ اس بازار میں پہونچ چکے ہو، لیکن صرف

پہونچنا کافی نہیں ہے، کچھ پونجی بھی درکار ہے، ورنہ خالی ہاتھ بازار میں جانا کیا مفید ہوگا، اور معلوم ہے کہ پونجی کیا ہے؟ اپنے شیخ کے ساتھ خلوص وعقیدت اور ان پر کامل اعتماد، ان کی بتلائی ہوئی تعلیم کا اہتمام والتزام، بس یہ دو باتیں حاصل ہوں تو عشق ومحبت اور معرفت وخدارسی ضرور حاصل ہوکر رہے گی، انشاء اللہ، الحمدللہ کہ تمہیں خلوص وعقیدت اور اعتماد کی دولت گرانمایہ حاصل ہے، البتہ دوسرے امر کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے، اس کے لئے رابطۂ ظاہری بھی رکھنا ضروری ہے۔ خط وکتابت، احوال کی اطلاع کرتے رہنا بنیادی بات ہے، اور کبھی کبھی خدمت میں حاضری از بس ضروری ہے، سلوک کی بنیادی ضرورت رابطہ شیخ ہے، اس پر تمام مشائخ کا اتفاق ہے، اور صدیوں کا تجربہ اس پر شاہد ہے، ذکر واذکار میں یکسوئی کی جو کیفیت میں نے سابق خط میں لکھی ہے وہ کافی ہے، یعنی تمام مشاغل ضروریہ میں ایک ضروری مشغلہ اس کو بھی بنا کر اس کے لئے ایک وقت خاص کرلو اور اس وقت میں بجز اس کام کے اور کوئی دوسرا کام نہ ہو، اور اس وقت کی تخصیص اس طرح سے ہو کہ تم سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جان لے کہ تمہارا فلاں وقت یادِ الٰہی کے لئے مخصوص ہے، تاکہ کوئی شخص اس میں دخل اندازی نہ کرے، اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کا اعلان کرو، بس اتنا ہے کہ تمہاری جانب سے اسوقت کا اتنا اہتمام ہو کہ کسی پر یہ بات مخفی نہ رہ جائے، یہ ریاکاری نہیں انتظام ہے، جس کے بغیر کسی کام کی گاڑی نہیں چل سکتی، اس کے ساتھ ہی سحر خیزی کی عادت ڈالو، اخیر رات کی چند رکعتیں نصیب ہوجائیں تو زہے نصیب، خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ بے محبت کی زندگی کھردری زندگی ہے اور اس کا کچھ حاصل نہیں۔

میرا ارادہ اس ہفتہ جونپور آنے کا مصمم تھا، مگر اسی ہفتہ میں ہولی ہے، اس لئے مجبوراً ارادہ ملتوی کردیا۔ تمہارے یہاں مدرسہ کب تک کھلا رہے گا، یہاں تو یکم/

شعبان سے تعطیل ہو رہی ہے، اگر موقع ملا تو تعطیل میں جونپور آؤں گا۔

مولانا قمر الدین صاحب کی خدمت میں میرا سلامِ شوق عرض کر دو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۱؍رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا عبدالرب صاحب اعظمی

غازی پور مدرسہ دینیہ کے آغاز تدریس میں مولانا عبدالرب اعظمی سے تعارف ہوا، محبت ہوئی اور بڑھی، اور پھر اتنی بڑھی کہ محسوس ہونے لگا کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اس وقت مولانا کسی مدرسے میں نہ تھے، کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، جہانا گنج ضلع اعظم گڈھ کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم جامعہ مفتاح العلوم مئو میں حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم دیو بند گئے، اور وہاں کے ممتاز طلبہ میں شمار کئے گئے۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تجارت کا مشغلہ رہا، پھر میرے کہنے پر مدرسوں کا رُخ کیا۔ مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد، اور اس کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور میں کامیاب مدرسی کی۔ اپنے والد مولانا محمد اقبال صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد ۱۹۸۵ء میں جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج اعظم گڈھ کے ناظم منتخب کئے گئے، اور اب جہانا گنج اور اس کے اطراف میں مطلق ''ناظم صاحب'' مولانا ہی ہیں۔ تدریس کا مشغلہ انتظام میں آنے کے بعد کم رہا۔ اعظم گڈھ کی جمعیۃ علماء کے کلیدی ذمہ داروں میں ہیں، لیکن میرا تعلق اور میری محبت ان اوصاف ومناصب سے قطع نظر ذاتی اور قلبی ہے۔

ان کے فرزند اکبر عبید اللہ مرحوم ایک حادثے میں جاں بحق ہوگیا۔ اس کا اثر ان پر جو تھا وہ تو تھا ہی! میرے دل کو بھی وہ چوٹ لگی تھی اور وہ صدمہ ہوا تھا کہ اس کا اظہار مشکل ہے، یہ خطوط اسی موقعہ کے ہیں۔

برادرِ مکرم! **عافاکم اللہ ورزقکم صبراً جمیلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

دل پر ایک نا قابل بیان بوجھ اب تک محسوس کر رہا ہوں، ایک تحیر کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، ایسی کیفیت ہے، جیسے سب کچھ بھول گیا ہوں، بجز اللہ کے، اور عبید اللہ کے، اور عبد الرب کے کچھ یاد ہی نہیں آتا، میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ کے حضور عبید اللہ پہونچ کر مسکرا رہا ہے، وہاں کی مہربانیاں، عنایتیں دیکھ کر اپنا وہ زخم بھول گیا ہے، میں تصور کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہیں رب کا بندہ بھی کھڑا ہے، اس کے دل کی آنکھوں سے آنسو نہیں، خون کے آنسو رواں ہیں، مگر جسم کی آنکھوں پر اور زبان پر شریعت کا پہرہ بیٹھا رکھا ہے، اللہ خونِ دل کی جوئے رواں کو بھی دیکھ رہے ہیں، اور قلب ونگاہ پر شریعت کے پہرے کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ مجھ کو ایسا لگتا ہے کہ وہ عبید اللہ سے بھی خوش ہیں کیونکہ اس کا دل بہت سلیم تھا، وہ نہایت مطیع اور فرمانبردار تھا، اس کی زبان میں اتنی نرمی اور حلاوت تھی کہ کانوں میں شہد وشکر گھولتا تھا، یہ دونوں باتیں کتنی پاکیزہ ہیں احادیث سے اس کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ اور عبد الرب سے بھی خوش ہیں، کیونکہ اگر چہ جگر خون ہو رہا ہے، لیکن اللہ کی مشیئت اور فیصلے پر سو جان سے راضی ہے۔ **العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول إلا ما یرضیٰ ربنا وإنا بفراقک یا إبراھیم لمحزونون۔**

رب کے اس بندے کا حال عجیب ہے، آزمائشوں میں گھرا ہوا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک آزمائش! اور یہ آخری آزمائش تو سب سے بڑھ کر نکلی، صدموں کا اثر دل پر پڑنا لازمہ ہے، بشریت کا لازمہ ہے، مگر ایمان کا تقاضا، اللہ سے محبت کا تقاضا

سب سے بڑھ کر ہے، محبوب بیٹے کی جدائی ناقابل برداشت ہے، مگر کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے، اور مومن کی کوئی چیز اس سے جدا ہو کر ضائع نہیں ہوتی، وہ خدا کی ضمانت میں پہونچ جاتی ہے، دنیا کے تغیرات سے پاک ہو جاتی ہے، اس میں ترقی کا عمل تو جاری رہتا ہے، لیکن تنزل وضیاع سے محفوظ ہو جاتی ہے، پھر ایک دن آئے گا کہ ہم بھی وہیں پہونچ جائیں گے، جہاں وہ محبوب شے محفوظ ہے، پھر ایسی ملاقات ہوگی، جس کو داغِ جدائی کا صدمہ نہیں سہنا پڑے گا۔ یہ عقیدہ، یہ حال اور خیال مومن کو ہر حال میں سنبھالے رہتا ہے، وہ خدا کی رضا کی بشارت پا کر مصائب میں بھی مسکراتا ہے۔

رات میں قاری شبیر احمد صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دے رہا تھا، اور دل تھا کہ امنڈا چلا آتا تھا، بڑی مشکلوں سے دل پر قابو پا کر انھیں اطلاع دے سکا، وہ بھی سنتے ہی پریشان ہو گئے، بقرعید کے دوسرے روز آنے کو کہہ رہے تھے، جہاں جہاں تک یہ خبر جاتی ہے، درد کا ایک سیلاب امنڈا ہوا محسوس ہوتا ہے، لیکن پروردگار! آپ راضی ہوں تو سب آسان ہے، مگر مولیٰ! آپ کی جانب سے عافیت کی رداء سایہ فگن ہو جائے، تو اسی کی امید ہے، اور اسی کی آرزو ہے، **إن لم تكن ساخطاً عليّ فلا أبالي غير أن عافيتك أوسع لي۔**

عبید اللہ کی ماں اور بھائی بہنوں پر بھی بہت اثر ہوگا، ان سب کو صبر کی تلقین کیجئے، کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالیں، جس سے عبید اللہ کو فرشتوں کے سامنے محجوب ہونا پڑے۔ فرزند عزیز اپنا وقت پورا کر کے گیا ہے، ہم کو معلوم نہ تھا کہ اتنے ہی وقت کے لئے آیا تھا، اب معلوم ہوا، دل امنڈے تو آنسو بہا لیں، مگر زبان سے بجز **إنا لله وإنا إليه راجعون** کے اور کچھ نہ کہیں، یا کہیں تو وہ بات کہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہو۔

میرا دل بھی نڈھال ہے، قلم بھی نڈھال ہو رہا ہے، آپ سے بات کرنے کا تقاضا ہو رہا تھا تو عالم تصور میں ہم کلام ہوا، پھر جی میں آیا کہ دل کا بوجھ صفحۂ کاغذ پر اتار دوں۔ کج مج طریقے پر کچھ تو اتار دیا، مگر ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے، اب قلم تھرتھرا رہا ہے، اسے مہلت دیتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ بعد میں کچھ اور لکھوں، دل ہر وقت دعا میں مشغول ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۷/ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ

☆☆☆☆☆

برادرِ مکرم! عافاکم اللہ ورزقکم صبراً جمیلاً وآتاکم أجراً جزیلاً

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاته

مزاجِ گرامی!

ابھی کچھ دیر پہلے کچھ منتشر سطریں لکھ چکا ہوں، پھر طبیعت کا تقاضا ہو رہا ہے کہ کچھ اور لکھوں، میری طبیعت خود بے چین ہے، اپنے کو بھی تسلی دینی ہے، اور آپ کو بھی سنانا ہے، جی چاہتا ہے کہ وہ ذاتِ گرامی جو محبوبِ ربِ کائنات ہے جس کے صدقے میں ہم کو ایمان ملا ہے، اللہ ملا ہے، جس پر ہمارا سب کچھ قربان! یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ، انھیں کے دربار میں حاضری دی جائے اور جو کچھ وہ فرماتے ہیں، اسے دل کے کان سے سنا جائے، ان کے ارشادات مداوائے زخم دل ہیں، ان سے بڑا ہمدرد وغمخوار اس کائناتِ انسانی میں کوئی نہیں، ان کو دیکھ لینے، ان کو سن لینے کے بعد ہر غم ہلکا ہے، آیئے چلیں انھیں کی خدمت میں باادب حاضری دیں، باوضو ہولیں، نگاہیں نیچی کرلیں، پوری توجہ دلی سے حاضر دربار ہوں۔

آپ ﷺ کی مجلس شریف منعقد ہے، آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہیں، دیکھئے فرمارہے ہیں:

> ’’مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے ساتھ جو بھی پیش آئے خیر ہی خیر ہے، یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے، اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، اور یہ بات اس کے حق میں خیر ہے، اگر تکلیف پہونچتی ہے تو صبر کرتا ہے، اور یہ بات بھی اس کے حق میں خیر ہے۔ (**مسلم من حدیث صہیب**)
>
> جو شخص کوشش کر کے صبر کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمادیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو صبر سے بہتر اور اس سے بڑا عطیہ کوئی اور نہیں ملتا۔ (بخاری و**مسلم عن ابی سعید الخدری**)
>
> اور سنئے! آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:
>
> اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ میں تمہارے بعد ایک امت کو پیدا کروں گا، جس کا حال یہ ہوگا کہ ان کو جب عمدہ حال میسر ہوگا تو اللہ کی حمد کریں گے، اور جب ناگوار بات پیش آئے گی تو ثواب کی امید رکھیں گے، اور صبر کریں گے، حالانکہ انھیں نہ علم ہوگا نہ حلم ہوگا، عرض کیا پروردگار! تب یہ بات کیونکر ہوگی، فرمایا: میں اپنے علم اور حلم کا حصہ انھیں بخشوں گا۔ (مسند احمد **عن ابی الدرداء**)

جتنی بڑی مصیبت اتنا ہی بڑا ثواب، حق تعالیٰ کی مہربانیوں کے انداز عجب دلنواز ہیں، ابتداءً دل خراش معلوم ہوتی ہے، مگر حقیقت اس کی دلنوازی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ جو ترجمانِ غیب ہیں، بشارت سنارہے ہیں:

> جتنی بڑی بلا ہوگی، اسی کے بقدر بڑی جزا ہوگی، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو محبوب رکھتے ہیں، تو انھیں کسی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں، جو اس پر راضی ہوتا ہے، اس کے لئے اللہ کی رضامندی ہے اور جو ناراض ہوتا ہے، اس کے لئے ناراضگی ہی ملتی ہے۔ (ترمذی عن انسؓ)

ایک صحابی رسول اللہ ﷺ سے کچھ پوچھ رہے ہیں، پوچھنے والے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران ہیں، وہ پوچھ رہے ہیں کہ یا رسول اللہ! وہ کون ہیں، جن پر بلائیں شدید ہوتی ہیں؟ آپ جواب میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ:

> سب سے شدید بلائیں، جن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں، وہ انبیاء ہیں، پھر جو جس قدر ان کی مشابہت اور متابعت اختیار کرتا ہے، آدمی کی آزمائش اس کی دینداری کے بقدر ہوتی ہے، یہ بلائیں اس کے اوپر مسلط رہتی ہیں، پھر اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے، اور گناہ کا کوئی شمہ اس پر باقی نہیں رہتا۔ (ترمذی شریف)

اولاد کے مرنے کی مصیبت شدید ترین مصیبت ہے، یہ ایک ایسی آگ ہے، جو دل میں جلتی ہے، اور ایسا شعلہ ہے جس کی لپک جگر میں محسوس ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر صبر کا ثواب بے حد وحساب ہے، اور قیامت کے دن میزان عمل میں اس کی تول بہت بھاری ہے، سنئے! رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

> سبحان اللہ! پانچ چیزیں میزانِ عمل میں کس قدر بھاری ہیں، الا الہ الا اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، اور نیک بیٹا، جو وفات پا جاتا ہے، اور آدمی اس پر ثواب کی امید رکھتا ہے۔ (ابن حبان عن ابی سلمیٰ)

جی چاہتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا جائے کہ آدمی تو بڑا کمزور ہوتا

ہے، صدموں کی تاب ذرا مشکل سے لاتا ہے، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ صدمہ کے وقت آدمی اللہ کو یاد کرے اور دعا کرے، تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی تسلی کردیں، اور اس کا نعم البدل مل جائے، مگر ہم گنہگاروں کی ہمت اتنی کہاں کہ سوال کریں، تب ہماری اور تمام مومنین کی اماں جان حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہماری مدد کی، انھوں نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ:

> جب کسی مومن کو کوئی مصیبت پہونچتی ہے، اور اس پر وہ وہی بات کہتا ہے، جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، یعنی **إِنَّـا للّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أَللّٰهُمَّ أُجُرْنِيْ فِيْ مَصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْراً مِّنْهَا**، تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر نعمت عطا فرماتے ہیں۔
>
> اماں جان فرماتی ہیں کہ دیکھ میرے بیٹے!
>
> جب میرے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوا تو میں سوچنے لگی کہ حضرت ابوسلمہ سے بہتر کون مسلمان ہوگا، یہ پہلے آدمی تھے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہجرت کی، تاہم میں نے حضور ﷺ کی بتائی ہوئی دعا پڑھ لی، تو اللہ تعالیٰ نے ابوسلمہ کے عوض میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت وزوجیت کی سعادت بخشی۔ (مسلم شریف)

سبحان اللہ! کیا نعمت ہے، آخرت کا اجر وثواب تو بے انتہا ہے، خود دنیا میں صبر کرنے والا محروم نہیں ہوتا، دل وجان سے دعا پڑھ لے، تو اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمادیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات میں بڑی تسلی ہے، ان کے وعدے سچے ہیں، برحق ہیں، یہ خدائی وعدے ہیں، ہمارے لئے ان ارشادات میں بڑی رہنمائی

ہے، مصیبت کے بادل تو ہر ایک پر چھاتے ہیں لیکن کسی پر رحمت بن کر برستے ہیں، اور کسی پر عذاب بن جاتے ہین، جس نے صبر کیا، اللہ کے فیصلے پر وہ دل سے راضی رہا، اس کے لئے رحمت ہی رحمت ہے، اور جس نے بے صبری کی، اللہ کی شکایت کی، اس کے لئے مسئلہ ہے۔

ابھی اور لکھنا چاہتا ہوں، مگر جہانا گنج کا ایک شخص میرے پاس بیٹھا ہے، اسی کے ہاتھ بھیجنا چاہتا ہوں، اور وہ سواریوں کی دقت کی وجہ سے جلد جانا چاہتا ہے، اس لئے فی الحال یہ سطریں بند کرتا ہوں، ابھی دل کی خلش باقی ہے، پھر کسی مجلس میں کچھ اور لکھوں گا، خدا کرے زخم کا کچھ مرہم بنے، دعائیں ہر دم ہیں، دل سے زبان سے، آپ کیلئے، گھر والوں کیلئے، مرحوم فرزند عزیز کیلئے۔ خدا تعالیٰ قبول فرمائیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۸/ ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ

☆☆☆☆☆

برادرِ مکرم! **عافاکم اللہ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

جگر میں ٹھنڈک تو بحمد اللہ پڑ چکی ہے لیکن تصور باقی ہے، عالم خیال میں اکثر گم رہتا ہوں، اللہ کی مشیت پر راضی ہوں، انھوں نے جتنی عمر لکھی تھی، اس میں ایک لمحہ بھی کم نہیں ہوا، ہاں یہ سوچ کر درد کا طوفان اُٹھتا ہے کہ حادثہ ہوا، چوٹ لگی، تکلیف ہوئی، اس کو سوچ کر تکلیف ہوتی ہے، عالم خیال میں یکایک ملاقات ہوگئی، مسکرا رہا تھا، میں نے اس کی تکلیف کا ذکر کیا، تو کہنے لگا، بڑے ابا! مجھے تو تکلیف کا احساس ہی نہیں

ہوا، میں گرا، یہ تو مجھے محسوس ہوا، پھر کچھ خبر نہیں، یہاں تک کہ بدن سے جان نکلی، اس کا بھی مجھے پتہ نہیں، البتہ جب روح نکل گئی، اس نے جسم چھوڑ دیا تو فرشتوں میں اپنی مظلومیت کا چرچا سنا، خون سے لت پت اپنے جسم کی خبر ملی، پھر ابا اور امی اور آپ لوگوں کی پریشانی کا علم ہوا، میں تو خوش تھا کہ اچھی جگہ آ گیا ہوں، میری مظلومیت، میرا بہتا خون، میرے سر اور چہرے کی چوٹ، میرے ہاتھوں کا ٹوٹنا بہت کام آیا، پچھلے سب گناہ اس حالت زار کے سیلاب میں بہہ گئے، میں تو بالکل صاف ہو گیا ہوں۔

میں نے کہا ہاں جی! تم صحیح کہہ رہے ہو، حدیث میں ایک مضمون آیا ہے کہ شہید کو سکراتِ موت کی تکلیف نہیں ہوتی، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی نے کاٹ لیا ہے، تم بھی تو آخر شہید ہوا اور شہید کے لئے جب یہ وعدہ ہے تو تم پر کیوں نہ پورا ہوگا۔

کہنے لگا: بڑے ابا! ابا کو، امی کو، اور میرے سب بھائی بہنوں کو میرے گم ہونے سے بہت دکھ ہے، اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کیا ہے، تو سب کو تسلی ہو جاتی۔

میں نے کہا، غزوۂ احد کے شہداء کو جب اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں سے نوازا تھا، تو وہ کہنے لگے تھے کہ جو بھائی ہمارے دنیا میں رہ گئے ہیں، ان تک کوئی ہماری خبر پہونچا دیتا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں تاکہ وہ جنت سے بے رغبت نہ ہوں، ؛ اور جنگ میں ہمت نہ ہاریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہاری خبر پہونچاتا ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَلَا تَحُسَبَنَّ الَّذِیُنَ قُتِلُوُا فِیُ سَبِیُلِ اللّٰہِ اَمُوَاتاً بَل اَحُیَاءٌ عِنُدَ رَبِّھِمُ یُرُزَقُوُنَ فَرِحِیُنَ بِمَا آتَاھُمُ اللّٰہُ مِنُ فَضُلِہٖ وَ یَسُتَبُشِرُوُنَ بِالَّذِیُنَ لَمُ یَلُحَقُوُا بِھِمُ مِّنُ خَلُفِھِمُ اَنُ لَّا خَوُفٌ عَلَیُھِمُ وَلَا ھُمُ یَحُزَنُوُنَ یَسُتَبُشِرُوُنَ

بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضۡلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ مت گمان کرو، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو رزق بھی ملتا ہے اور وہ خوش ہیں، اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی (اور جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں، اسی طرح) جو لوگ (ابھی دنیا میں زندہ ہیں) ان کے پاس نہیں پہونچے ہیں، بلکہ پیچھے رہ گئے ہیں، ان کی بھی اس حالت پر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف نہیں ہے، اور وہ نہ مغموم ہوں گے، وہ خوش ہوتے ہیں، اللہ کی نعمت اور فضل سے، اور اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

میں نے کہا یہ بشارت اصل میں تو ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، مگر جو موت تم کو حاصل ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مطابق یہ بھی شہادت کے حکم میں داخل ہے، اس لئے آدمی چھوٹتا ہے تو غم تو ہوتا ہی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ تسلی کا سب سامان کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔

ہاں بڑے ابا! یہ بات تو ہے، اور بڑے ابا، آپ کو تو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے، جب میں آپ کے پاس پہونچتا تھا، یا کہیں راستے میں ملاقات ہو جاتی تھی تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا تھا، آپ کی باتوں سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی، آپ میرے لئے کتنی دعا کرتے تھے، میں بیمار تھا تو آپ بے چین تھے، آپ کی یہ محبت میرے لئے یہاں سرمایۂ سکون ہے، اب جو میں اچانک آپ کی دنیا سے اس دنیا میں آ گیا تو آپ کو بھی کتنا صدمہ ہوا ہوگا؟

بیٹا! صدمہ کی بات کرتے ہو، اللہ تعالیٰ نے ایمان بخشا ہے، آخرت کا یقین بخشا ہے، قرآن وحدیث کا علم عطا فرمایا ہے، اس لئے صبر وقرار آ گیا ہے، ورنہ مجھ کو تو

ایسا معلوم ہوا کہ میری بھی جان نکل جائے گی، مجھے تو کئی طرح صدمہ پہونچا ہے: ایک صدمہ تو تمہارے زخمی ہونے کا، دوسرا صدمہ تمہارے مرنے کا، اور اس سے بڑھ کر یہ صدمہ کہ تمہارے ابا پر کیا گذر رہی ہوگی، تم جانتے ہو کہ تمہارے ابا سے مجھے کتنا تعلق ہے، ان کی تکلیف مجھے اپنی تکلیف محسوس ہوتی ہے، بلکہ اپنی تکلیف سہہ جانے کا حوصلہ اپنے اندر پاتا ہوں، مگر تمہارے ابا کی تکلیف پر میرا حوصلہ شکست کھانے لگتا ہے، جب وہ تمہارے جسد خاکی کو بنارس سے لے کر جہانا گنج پہونچے ہیں، تو میں اس وقت مدرسے میں تھا، جیسے ہی سنا، میں کوٹھی کی طرف روانہ ہوا، مگر میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ سینے کی ہڈیوں میں درد ہوگیا، پورا جسم سنسنا رہا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ابا کو بڑا صبر وحوصلہ دیا، مجھے دیکھ کر ابل تو ضرور پڑے، مگر ساتھ ہی سکون بھی ہوگیا۔ بے نظیر صبر کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

عورتوں کا حال تو پورے طور سے مجھے معلوم نہیں ہوا، وہ شاید زیادہ ہی رو رہی تھیں، خیر وہ تو کمزور دل کی ہوتی ہی ہیں، اب وہ بھی صبر ونماز اور تلاوت میں لگ گئی ہیں۔

بڑے ابا! شہادت کا درجہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ تو ہے ہی، میں نے دیکھا کہ صبر کا درجہ بھی بہت اونچا ہے، اور وہ بھی صدمہ کے عین وقت پر! اس کا تو کوئی حد وحساب نہیں ہے۔ اِس دنیا (عالم آخرت) میں اس کا بہت چرچا رہتا ہے، صبر کا حساب ہرناپ تول سے آگے ہوتا ہے۔

بیٹا! یہ بات تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو، ہم ابھی اس غیب کے پیچھے ہیں، لیکن ہم کو قرآن وحدیث کے فرمان پر قطعی یقین ہے، اور تم تو مشاہدہ کررہے ہو، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی ہے کہ: ’’اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ‘‘ صبر کرنے والوں کا اجر بے حساب ہے۔

صبر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے تین نعمتوں کا وعدہ قرآن میں فرمایا ہے، یہ بات کسی اور چیز اور عمل کو حاصل نہیں ہے، فرماتے ہیں: أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے رب کی جانب سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہ لوگ ہدایت یاب ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت اپنے بچے کے مرنے پر رو پیٹ رہی تھی، رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ اللہ سے ڈرا اور صبر کر، اس نے کہا کہ آپ کو میری مصیبت کی کیا پروا؟ آپ یہ سن کر وہاں سے چلے گئے، اسے بتایا گیا کہ یہ اللہ کے رسول تھے (ﷺ) یہ سن کر اس کی وہ حالت ہوئی، جیسے مر ہی جائے گی، تیزی سے آپ کے دروازے پر آئی، وہاں کوئی دربان وغیرہ نہ تھا، اس نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو پہچانا نہیں، آپ نے فرمایا صبر تو شروع صدمہ میں ہی ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

آپ کی منشا یہ تھی، کہ مصیبت پر خواہ وہ کتنی ہی شدید ہو، آخر کار صبر تو آ ہی جاتا ہے، لیکن صبر وہی قابل تعریف ہے، جو مصیبت کی تیزی اور شدت کے وقت میں ہو، کیونکہ گھبراہٹ چاہے جتنی بڑی ہو، اس سے ایک وقت گذرنے کے بعد تسکین ہو ہی جاتی ہے۔

بڑے ابا! مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے مقام صبر سے بہت آسان گزار دیا، اور ان کی مہربانیاں دم بدم دیکھ رہا ہوں، میرے گھر والوں کو بھی بتا دیجئے کہ صبر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور وہ کیونکر حاصل ہوتا ہے۔

بیٹا صبر کے معنی روکنا ہے، صبر کا مدار تین باتوں پر ہے، اللہ کے فیصلے پر ناگواری اور ناراضگی سے اپنے نفس کو روکنا، ناروا اور غلط باتوں کے بولنے سے اپنی

زبان کو روکنا، اور باقی اعضاءِ بدن کو گناہ کے کام سے روکنا، مثلاً رُخساروں پر طمانچہ مارنا، ران پیٹنا، سیاہی لیپنا، جب ان باتوں کو مصیبت کے وقت انسان عمل میں لاتا ہے، تو اسے صبر کی فضیلت حاصل ہوتی ہے، جسے حدیث میں ’’نصف ایمان‘‘ فرمایا ہے، پھر اس کی مصیبت ایک عظیم نعمت سے بدل جاتی ہے، اس کی بلا ایک زبردست بخشش اور انعام بن جاتی ہے، اور جو چیز اس کی ناپسندیدہ تھی، وہ مرغوب اور پسندیدہ بن جاتی ہے، یہ بات ہے تو مشکل، مگر اللہ تعالیٰ آسان فرمادیتے ہیں۔

اتنی بات ہوئی اور اس کا چہرہ اوجھل ہوگیا، اور میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری میں ڈوب گیا، **فللّٰہ الحمد والمنة وھو علیٰ کل شئ قدیر۔**

اعجاز احمد اعظمی

۱۰؍ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ یوم الاضحیة

☆☆☆☆☆

بنام مولانا ابواللیث صاحب خیرآبادی

مولانا ابواللیث صاحب خیرآبادی، ہمارے مولانا کے بچپن کے دوستوں میں ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کئی سال تک مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں استاذ رہے، پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم رہے، پھر جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور اب وہ ملیشیا کی بین الاقوامی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مشہور محدث حضرت ہناد بن السری رحؒ کی کتاب الزھد کی تحقیق وتعلیق کی خدمت انجام دی اور یہ کتاب بڑے آب وتاب کے ساتھ حکومت قطر نے شائع کی، مولانا ابواللیث صاحب نے اس کا ایک نسخہ استاذ محترم کے پاس بطور ہدیہ کے بھیجا، اس کی تمہید اور مقدمہ میں مولانا ابواللیث صاحب نے ایک آدھ صفحہ تصوف کے متعلق بھی لکھا تھا، یہ مکتوب بطور تشکر کے لکھا گیا، اور تصوف کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا تھا، اس میں اس کی شکایت بھی ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

برادر گرامی قدر وفاضل محقق! **بارک اللہ فی حیاتکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی

چند ماہ قبل برادر مکرم مولانا فضل حق صاحب نے بشارت سنائی کہ ’’الزھد‘‘ کا ایک نسخہ آپ نے اس نیاز مند کے لئے مختص کیا ہے، اسی وقت دل نے خوشی سے بے تاب ہوکر بہت سی دعائیں آپ کو دے ڈالیں، اور یہ حکم بھی سنا دیا کہ شکریہ کا پیشگی خط ابھی ارسال کردو، چنانچہ مولانا فضل حق صاحب سے آپ کا پتہ بھی حاصل کرلیا کہ مدرسہ پہونچ کر اپنی مسرت کی خبر اور آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ تو آپ تک پہنچا ہی دوں، لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ یہ ارادہ مشاغل میں رل گیا، پھر اچانک ایک دن معلوم ہوا، کہ کتاب خیرآباد آچکی ہے، طبیعت پھر لہرائی، پرانی خوشی بدرجہا بڑھ کر لوٹی، قلم نے بے قراری دکھائی، کہ اب تو چل پڑوں، مگر آپ کا پتہ نہ مل سکا، مجبور ہوکر صبر کیا، پھر ایسا ہوا کہ ایک روز مولانا فضل حق صاحب نے بنفس نفیس کرم فرمایا، کتاب لے کر تشریف لائے، صورت ہی دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی، کتنی خوبصورت جلد ہے اور کتنی حسین طباعت ہے، لیکن اس میں کیا ندرت ہے؟ یہ تو ایک عام بات ہے، نظر جہاں جم کر رہ گئی وہ ایک مختصر سی باریک قلم کی عبارت ہے، مگر اس کے پیچھے ایک محشر خیال ہے، ’’**تحقیق، محمد ابو اللیث الخیر آبادی**‘‘ نہ جانے اس مختصر سی عبارت میں کتنی جاذبیت اور حسن ہے کہ میں دیر تک اسے دیکھتا رہ گیا، پھر ایک شعر ذہن کے افق پر ایسا ابھرا کہ میں اسی میں کھوکر رہ گیا، ؎

ما ومجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

آپ نہ جانے کیا کیا کر چکے اور ہم تیلی کے بیل جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں، آپ نے کتنا خوب یہ کام کیا، حدیث نبوی کی خدمت کی، محنت ایسی کی کہ ہم جیسے کاہل اور کام چور اس کے تصور سے گھبرائیں، اور تحقیق ایسی کہ اکابر محققین کی صف میں جگہ پائے، بہت پسند آیا یہ کام، رشک بھی آیا، اور غصہ بھی آیا آپ پر نہیں اپنے پر، پھر تمہید کا وہ حصہ جو آپ نے ''الزھد'' کے متعلق لکھا ہے اتنا تو اسی وقت پڑھ لیا، پھر مصروفیات۔۔۔ اگر یہ تعبیر صحیح ہے۔۔۔ میں کھو گیا، آج فرصت نکال کر پوری تمہید پڑھ ڈالی، ماشاء اللہ، سبحان اللہ زبان و دل سے نکلتا رہا، جو کچھ آپ نے اس میں جمع کر دیا ہے، تعریف و توصیف سے بے نیاز ہے، لیکن زہد کی تعریف و تعارف لکھتے لکھتے نہ جانے کیوں آپ نجدی اور غیر مقلدی زبان بولنے لگے، آخر تصوف نے کیا قصور کیا تھا، جو اس پر آپ برس پڑے، کاش یہ حصہ آپ کے قلم سے نہ ہوتا، تصوف بے چارہ یونہی کچھ اپنوں اور کچھ آج کل کے خود ساختہ محدثین کے ہاتھوں مظلوم بنا ہوا ہے، آپ کچھ دفاع کرتے، کچھ اس کے آنسو پوچھتے، یہ کیا کیا کہ چلتے چلاتے آپ نے بھی ایک ہاتھ جما دیا، ہمارے بہت سے اکابر ہیں، متقدمین میں بھی اور متأخرین میں بھی جن کی ولایت، ثقاہت، عظمت اور امامت مسلم ہے، ان کا راس المال ہی تصوف ہے، تصوف کو مطعون کرنا درحقیقت ان اکابر کو مطعون کرنا ہے، جو ہم لوگوں کے لئے قطعاً زیبا نہیں ہے، اور برا مال کہاں نہیں ہوتا ایسا کون سا فن اور کام ہے جس میں ناقابل اعتبار افراد کی بھیڑ نہیں لگی ہے، لیکن اس سے فن کی عظمت پر حرف نہیں آتا، آخر فن حدیث میں ساقط الاعتبار افراد کی ایک لمبی قطار نہیں ہے، لیکن ان افراد کو چھانٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے، فن کو مطعون نہیں کیا جاتا، اب تصوف ہی کا کیا قصور ہے کہ اس میں جاہل اور بدعتی افراد آ گئے، تو وہ سرے سے گردن زدنی قرار دیا گیا،

تصوف کا منتہاء اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو آپ نے زہد کی تعریف اور تعارف میں لکھا ہے۔ باقی جن چیزوں کو آپ نے تصوف قرار دے کر اسے مطعون کیا ہے، کیا وہ سب تصوف کے اجزاء ولوازم ہیں؟ کاش آپ اس پر غور کرتے، ان میں بعض تو سرے سے تصوف سے متعلق ہی نہیں ہیں، بعض وسائل ومقدمات ہیں، جن کو تصوف کا نام دینا غلط ہے، اس وقت مجھے ان امور پر تفصیل سے گفتگو نہیں کرنی ہے، ورنہ عرض کرتا کہ جن لوگوں نے تصوف کو بدنام کیا ہے وہ اس سے کتنے ناآشنا ہیں، اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اگر آپ نے وہ سب نہ کہا ہوتا جو لکھا ہے، بلکہ آپ یہ لکھتے کہ ”جو کچھ ہم نے زہد کے سلسلے میں کہا یہی اصل تصوف ہے، اور جو کچھ تصوف کے نام پر تعطل پھیلایا جا رہا ہے، یا بدعات وخرافات کی اشاعت کی جا رہی ہے، اس سے تصوف کا دامن پاک ہے اگر آپ نے یہ تعبیر اختیار کی ہوتی تو بات کتنی صحیح ہوتی۔

پھر مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ فن حدیث کے کسی مسئلہ پر آپ کو حوالہ دینا ہوا تو آپ نے ائمہ محدثین کی روایتیں نقل کیں، اور قاعدہ ودستور بھی یہی ہے کہ کوئی بھی فن ہو اس کے سلسلے میں اس کے ائمہ ماہرین ہی کی بات معتبر ہوتی ہے، اور انھیں کو حوالہ میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن آہ غریب تصوف! اس کی تفصیل جاننے کی ضرورت ہوئی تو آپ حاشیہ میں کن کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے ہیں؟ ایک صاحب تو سرے سے مسلمان ہی نہیں ہیں، دوسرے خدا معلوم کیا ہیں؟ اور تیسرے صاحب (ابن جوزیؒ) تو اپنے تشدد میں خود محدثین کے درمیان نیک نام ہیں، انھوں نے محدثین اور فقہاء پر کون سا کرم کیا ہے جو تصوف غریب ان کی دستبرد سے بچ جاتا، اگر ان کی یہ کتاب (تلبیس ابلیس) صوفیہ کے حق میں قابل اعتبار ہے تو بسم اللہ محدثین اور فقہاء کو بھی اسی قابل اعتبار معیار پر پرکھ کر دیکھئے، کتنے آدمی اور کون سا فن

کارآمد بچتا ہے، ......آپ تو اکابر دیوبند کے احوال سے واقف ہیں، تصوف ان حضرات کا طرۂ افتخار ہے......آپ کے قلم سے یہ تحریر بالکل بے زیب معلوم ہوتی ہے، اب میں کیا عرض کروں درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، میں نے تو ابھی ہندوستان کے باہر قدم نہیں رکھا ہے، لیکن اپنے ملک میں اس گروہ کو خوب دیکھتا ہوں، جو مسلک حق پر رہ کر تصوف کا بھی ذوق آشنا ہے، اور ان بہادروں سے بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے، جو اس سے دامن چھڑا کر الفاظِ حدیث کا جھنڈا اٹھائے ہوئے غوغا مچاتے رہتے ہیں، کس قدر فرق ہے دونوں کی طبیعتوں میں، میں یہ نہیں کہتا کہ پہلا گروہ معصوم و برگزیدہ ہے، صرف دونوں کے درمیان نسبت کی بات کر رہا ہوں، آپ خود بھی واقف ہیں، اب میں کیا کہوں۔

عوام کو تصوف سے برگشتہ کر کے اور علماء کو تصوف کے خلاف صف آراء بنا کر ان لوگوں نے دین کی کوئی اچھی خدمت نہیں کی ہے، مجھے کسی طرح یہ یقین نہیں آتا کہ تمہید کی یہ چند سطریں آپ ہی کی ہیں، کہیں ایسا تو نہیں؟

؎ زبان میری ہے بات ان کی   کا قصہ ہو،

آپ برا نہ مانیں، باتیں تو بہت ہیں، مگر آپ کے ملال طبع کے خیال سے عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تاہم آخر میں پھر عرض ہے کہ آپ کے مضمون میں کچھ کمی نہ رہ جاتی اگر آپ یہ ایک صفحہ نہ لکھے ہوتے، ملال خاطر کا اگر باعث بنا ہوں تو معافی کا خواستگار ہوں،   فقط والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۲؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا مفتی جمیل احمد نذیری

بہت سی علمی اور دینی کتابوں کے مصنف، مبارکپور کے مضافات میں نوادہ کے رہنے والے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم منتخب کئے گئے۔ یہ مدرسہ میرے لئے بمنزلہ مادرِ علم کے ہے، وہ بہت نازک حالات میں ناظم منتخب کئے گئے تھے، اسی موقع پر انھیں یہ خطوط لکھے گئے تھے۔

محترمی! وفقکم اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

عنایت نامہ ملا، نظامت کا منصب جس نیت اور ارادہ سے آپ نے قبول کیا ہے بہت عمدہ ہے، اس ارادہ پر انشاء اللہ حق تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوگی، واقعی مدرسہ کے حالات تکلیف دہ حد تک خراب ہو چکے تھے، میں ابتداءً تو یہ منصب آپ کیلئے پسند نہیں کرتا تھا مگر اب جب کہ گردن میں یہ قلادہ پہنا دیا گیا ہے تو اس کا حق بھی تا مقدور ادا کرنا ہے، اب امید ہے کہ حالات سدھریں گے، لیکن یہ یاد رکھیں کہ ابتداء میں مختلف جہتوں سے آپ کی آزمائش ہوگی، مخالفتیں بھی ہوں گی، غیر بھی ناک چڑھائیں گے، اپنے بھی منہ بگاڑیں گے، بہت سے لوگ الٹے سیدھے مشورے بھی دیں گے، ان مشوروں میں ہمدردی کم اور مطلب برآری کا جذبہ زیادہ ہوگا، کبھی کبھی طبیعت کو بہت ضیق ہوگی، بالخصوص ان حالات میں جبکہ آپ نے بگڑے ہوئے وقت میں باگ ڈور سنبھالی ہے، یہ میرا منہ تو نہیں ہے کہ آپ کو کچھ نصیحت کروں، لیکن الدین

النصیحة کے تحت دل سے آپ کا خیر خواہ ہوں اور چاہتا ہوں کہ مدرسہ کا بھی بھلا ہو، اور آپ کی شخصیت بھی زیادہ مستحکم اور مفید ہو، اس کیلئے صرف اتنی گزارش کروں گا کہ اہتمام کا منصب خواہ جن صلاحیتوں اور کاموں کا تقاضا کرتا ہو، لیکن ان سب میں اہم ترین تقاضا ٹھنڈے دل ودماغ کا ہے، ساری عقل کی عقل یہ ہے کہ آدمی زمین کی طرح تحمل پیدا کرلے، جذبات کو برطرف کرنا بنیادی ضرورت ہے، اشتعال، غصہ، جلد بازی کے تحت نہ کوئی اقدام ہونا چاہئے، نہ کوئی فیصلہ، آپ کے سامنے قدم قدم پر ایسے حالات آئیں گے جن سے طبیعت کو کبیدگی، جھنجھلاہٹ اور الجھن ہوگی، لیکن کامیابی اور سرخروئی کا گُر یہ ہے کہ اس سے صاف بچ نکلا جائے۔

ایک بات اور کہوں کہ خواہ طلبہ ہوں یا اساتذہ، عوام ہوں، یا خواص، کسی سے ان کی عقل وفہم سے زائد کسی بات کا مطالبہ آپ کی جانب سے نہ ہو تو ان شاء اللہ وہ ہمیشہ آپ سے مطمئن رہیں گے، میرا مطلب یہ ہے کہ جس بات کا آپ ان سے مطالبہ کریں اس میں اس کا اہتمام ہو کہ اس مطالبہ کو وہ خود سمجھ جائیں۔ اس طرح وہ زیادہ دلجمعی سے آپ کی اطاعت کرسکیں گے، اور اگر وہ آپ کا مطالبہ نہ سمجھ سکیں تو یقیناً مخالفت کریں گے، یہ بہت کام کی بات ہے، اس کو نباہنا ہے تو بہت مشکل! مگر اللہ کی مدد ہو تو آسان بھی ہے۔ اور بھی باتیں ذہن میں ہیں، لیکن آپ کی عدیم الفرصتی کے خیال سے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں، ان شاء اللہ آپ کیلئے بھی اور مدرسہ کیلئے بھی روزانہ دعا کروں گا۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

برادر محترم! **وفقکم اللہ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا گرامی نامہ ملا، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے میری کج مج باتوں کو پسند کیا، اوراس کا حوصلہ دیا کہ اور کچھ عرض کروں، حق تعالیٰ آپ کے ذریعے مدرسہ کے گزرے ہوئے دن واپس لائے، اور ہماری آنکھیں ٹھنڈی کرے۔

ذمہ داری کا خواہ کوئی منصب ہو، جہاں اس کا ابتدائی اثر یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کومخالفت سوجھتی ہے یا کم ازکم شکوک وشبہات کے کانٹے ان کے دلوں میں چبھتے ہیں، وہیں اس کے ساتھ ایک مصیبت خوشامدی لوگوں کی بھی چلی آتی ہے، اول الذکر گروہ سے نمٹنا آسان ہوتا ہے، کیونکہ وہ کھلا ہوا دشمن ہے، لیکن دوسرے گروہ کا عمل چونکہ نفس اور طبیعت کے موافق بلکہ عین پسند کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے اس سے بچ نکلنا خاصے حوصلے کامحتاج ہے، اس مصیبت سے بچنے کیلئے اولاً انھیں پہچاننا ثانیاً اپنی طبیعت پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے، مخالفین سے خطرہ کم اوران سے زیادہ ہوتا ہے، یہ بری چیز کوخوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں، اور آدمی دھوکہ کھا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آدمی خدا پر بھروسہ کر کے ایک کام کر ڈالے وہ یہ کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اور خود کو اس کا پابند کرلے کہ دوسروں کی حکایات وشکایات نقل نہ کیا کریں، تاکہ سب کی طرف سے دل صاف رہے، سب سے بڑی مصیبت حکایات وشکایات ہی کی ہے، اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اور کسی کسی سے کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ الگ ہوتا ہے، آدمی اللہ واسطے اس کا دروازہ بند کرلے، تو پھر حق تعالیٰ کی نصرت من حیث لایحتسب آنے لگتی ہے، آپ کی ذمہ داریاں چونکہ وسیع ہیں مدرسہ، اساتذہ اور طلبہ سے لے کر پوری قوم تک کا آپ سے تعلق ہوگا، اس لئے آپ کو اس

امر کی زیادہ ضرورت ہے، اگر آپ کی مجلس کی یہ خصوصیت ہو جائے کہ کسی کی غیبت وشکایت وہاں نہیں ہوتی تو بہت جلد اعتماد پیدا ہو جائے گا، پھر مخالفین بھی منہ بند کر لیں گے، آپ لوگوں کے اعتراضات کا جواب کام سے دیں، زبان سے نہ دیں، اس میں ابتداءً دشواری تو ضرور ہوگی، مگر پھر بعد میں جب اعتماد پورا ہو جائے گا تو کام اسی قدر آسان ہو جائے گا، اور آپ یہ خیال نہ کریں کہ جب نقل وحکایت کا دروازہ بند ہو جائے گا تو حالات کا علم کیسے ہوگا؟ کیونکہ حالات کے علم کا بیشتر حصہ فضول ہوتا ہے وہ نہ ہو تو بہتر ہے، اس سے کوئی نفع نہیں، لیکن جتنے حالات کا علم ضروری ہوگا، ان شاء اللہ اتنا ہمیشہ آپ کو حاصل رہے گا۔ مجھے اس کا تجربہ ہے، اس طریقۂ عمل سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ فضا میں کسی طرح کی کشیدگی نہ ہوگی، اور اگر کچھ ہوئی بھی تو اس کا رفع کرنا آسان ہوگا۔ البتہ اس کے ساتھ یہ بھی کر لیجئے کہ کچھ عقلمند اور مخلص لوگوں کو اپنے دل میں منتخب کر لیں، وہ ایسے ہوں کہ آپ ان پر اعتماد کر سکیں، ان سے ضروری امور میں مشورہ لیا کریں، لیکن اس طور پر کہ نہ انھیں اس کا احساس ہو اور نہ دوسرے کو کہ یہ لوگ آپ کے بہت زیادہ معتمد ہیں، بس کام چلاتے رہیں۔ یہ بڑی مصیبت ہے کہ اگر کسی کا معتمد ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو دوسرے اسے چمچہ کہہ کر برباد کرتے ہیں، اور وہ خود اپنے کو ناک کا بال سمجھ لیتا ہے اور قیامت بن جاتا ہے، آپ کیلئے اشارہ کافی ہے، پھر آئندہ دوسری مجلس میں کچھ عرض کروں گا، ان شاء اللہ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا ضیاء الدین صاحب خیرآبادی

ایک صاحب قلم اور صاحب خطاب و بیان، دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل، اس خاکسار سے بہت محبت رکھنے والے، خیرآباد ضلع مئو کے رہنے والے، ایک طویل عرصہ تک وہیں مدرسہ منبع العلوم میں استاذ رہے، اور طلبہ کو پڑھانے کے ساتھ ان کی تقریری اور تحریری تربیت کرتے رہے۔ پھر جامعہ حسینیہ لال دروازہ جون پور تشریف لے گئے، وہاں سہ ماہی ''شیرازِ ہند'' جاری کیا۔ اس قت مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ خط ان کے ایک مکتوب کے جواب میں لکھا گیا ہے، انھوں نے مدارس اسلامیہ میں پائی جانے والی خرابیوں پر ان کی اصلاح کے لئے ایک مضمون لکھا تھا، ان کا یہ مضمون ؎ نوارا تلخ تر می زن۔۔۔ کا مصداق تھا۔ انھوں نے مذکورہ مضمون ازراہ حسن ظن اس خاکسار کے پاس بھیجا۔ میں نے اسے پڑھ کر کچھ تنقیدی معروضات پیش کئے۔ اس کے جواب میں انھوں نے ممنونیت کا خط لکھا۔ اور اربابِ انتظام مدارس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس پر کچھ کلام کیا، کچھ اور باتیں بھی تحریر کیں۔ اس سلسلے میں یہ خط لکھا گیا۔

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مجھے یقین تھا کہ میری گزارشوں پر آپ کو ناگواری قطعاً نہ ہوگی، اسی لئے بے تکلف لکھتا گیا۔ اور بے تکلف پیش بھی کر دیا۔ آپ ماشاء اللہ میری توقع سے بڑھ کر نکلے کہ نہ صرف یہ کہ ناگواری نہیں ہوئی، بلکہ آپ نے خوشی کا اظہار کیا۔ **کثر اللہ أمثالکم وبارک فی علومکم**

مدارس کے ارباب انتظام کی دو حیثیت ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ وہ امین ہوں، جو اغنیاء سے زکوٰۃ کی رقم بطور امانت لے کر اسے فقراء پر خرچ کریں۔ اس صورت میں ودیعت کے احکام اس رقم پر جاری ہوں گے۔ مثلاً جو رقم مدرسوں کے ذمہ داروں کے قبضے میں آئی ہے، وہ بدستور صاحب اموال کی ملکیت میں رہے گی۔ امین صرف اس کا نائب ہوتا ہے، پھر جب تک وہ رقم خرچ نہ ہوگی۔ یعنی فقراء کی ملکیت میں نہیں جائے گی، زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، چاہے سال چھ مہینے گزر جائیں، اسی طرح اگر فقراء کی ملکیت سے پہلے صاحب مال۔۔۔ مر گیا تو اس میں وراثت کا قانون بھی جاری ہوگا۔ پھر یہ کہ وہ رقم چونکہ امانت کی ہے، اس لئے اسے بجنسہٖ محفوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ ورنہ خیانت لازم ہوگی۔ اور اگر وہ بغیر کسی تعدی کے ہلاک ہوگئی، تو جب امین پر ضمان نہ ہوگا، تو زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی، صاحب مال کو پھر سے زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی۔ وغیرہ

دوسری حیثیت یہ ہے کہ ذمہ داران مدارس کو طلبہ کا وکیل قرار دیا جائے، کہ ان کی طرف سے یہ حضرات زکوٰۃ کے مال پر قابض ہوں۔ یہ قبضہ درحقیقت مؤکل کا ہوگا، اس لئے تملیک اسی وقت متحقق ہو جائے گی، صاحب مال کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب یہ ذمہ داری ان وکیلوں پر ہے کہ اپنے مؤکلوں پر اسے خرچ کریں، اگر اس کے خلاف

کریں گے، یعنی اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کریں گے، یا ایسی جگہ خرچ کریں، جس کا طلبہ سے تعلق نہ ہو یا اسراف کریں، تو یہ ان کا جرم ہوگا،

یہاں ایک سوال ہوگا کہ مؤکل معلوم نہیں کون کون ہیں؟ اور انھوں نے کب وکیل بنایا؟ حکومت کو تو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے، جو جو حکومت کے دائرے میں آتا جائے گا، اس کی وکالت امیر المومنین کو حاصل ہوتی جائے گی۔ یہاں نہ تو حکومت جیسی ولایت ہے، اور نہ طلبہ نے وکیل بنایا ہے؟ یہ اشکال واقعی قابل غور ہے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک سوال کیا تھا کہ ”مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے، اگر یہ وقف ہے تو بقاء عین کے ساتھ انتفاع کہاں ہے؟ اور اگر یہ ملکِ معطی ہے تو اس کے مرجانے کے بعد ورثہ کی جانب واپسی واجب ہے، (امداد الفتاویٰ ج:۶، ص:۲۶۲)

اس کے جواب میں مولانا نے لکھا کہ:

”عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں ہے، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہٰذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں“ (ج:۶، ص:۲۶۳)

اس پر حضرت تھانویؒ نے اشکال فرمایا کہ:

”عمال بیت المال منصوب من السلطان ہیں، اور سلطان کو ولایت عامہ ہے، اس لئے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے، اور مقیس میں ولایت عامہ نہیں ہے، اس لئے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا؟ کیونکہ نہ توکیل صریح ہے، نہ دلالۃً ہے، اور مقیس علیہ میں دلالۃً ہے کہ وہ سب اس کے زیر اطاعت ہیں، اور وہ واجب الاطاعت ہے۔ (ج:۶، ص:۲۶۴)

حضرت سہارن پوری نے اس کا جواب لکھا کہ:

’’بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں، ایک حکومت، جس کا ثمرہ تنفیذِ حدود و قصاص ہے۔ دوسرا انتظام حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا، امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے، جو بابِ انتظام سے ہے، لہٰذا مالی انتظام مدارس جو برضائے ملاک وطلبہ ابقائے دین کے لئے کیا گیا ہے، بالا ولیٰ معتبر ہوگا، اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کے لئے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا، جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہو سکے۔ (ج:۶، ص:۲۶۶)

مولانا کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ اربابِ انتظام طلبہ کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہت سے دوسرے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

تو جس طرح یہ کہا گیا ہے ـــ کہ سلطان کو ولایت عامہ حاصل ہے، اور دلالۃً وہ سب کا وکیل ہے، اسی طرح مہتمم مدرسہ کو طلبہ کی طرف سے دلالۃً انتظامی وکالت حاصل ہے۔ اس میں بہت سی مشکلات کا حل ہے۔

یہی سوال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ:

’’مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئے کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبض سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگر چہ وہ مجهول الكمية والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے، بس بعد موت معطی کے ملکِ ورثہ اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف کا مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی

ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک رہے۔ **واللہ تعالیٰ أعلم** (تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص:۱۶۵)

مدرسوں کے اندر جو خرابیاں ہیں۔ ان کی اصلاح ضروری ہے، مگر اصلاح ایسی نہ ہو، جس سے مزید خرابیاں یا نئی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ نفوس کی انفرادی خرابیوں نے اجتماعی خرابیوں کی تخم ریزی کی ہے، نفوس کی اصلاح نہ ہونے کہ وجہ سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کی اصلاح رابطہ وغیرہ سے کبھی نہ ہوگی۔ مجھے خوب تجربہ ہے، یہی لوگ اپنے نفس کی تمام خرابیوں کے ساتھ جب ایک جگہ اکٹھا ہوں گے تو ان خرابیوں کا ظہور نئے نئے انداز سے ہوگا، بسا اوقات ملنے سے زیادہ ''ہجران جمیل'' ہی مناسب ہوتا ہے۔ (۱)

(۲) مدرسہ صرف ارباب انتظام کا نام نہیں ہے، اس کے دو ارکان اور بھی ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ، اصلاح ہمہ جہت ہونی چاہئے۔ اور یہ بھی تجربہ ہے کہ کوئی مدرسہ دوسرے مدرسہ کی اصلاح نہیں کرسکتا، خود مدرسے میں کوئی ذمہ دار فرد اصلاح کی طرف توجہ دے، اور جو اصلاح وہ کرنا چاہتا ہے، اس کے خلاف خود اس کا عمل نہ ہو یعنی وہ صلاح سے متصف ہو، علم وتقویٰ دونوں کا خاص وزن اس کے اندر ہو، اس کا عمل اس کے قول کی تکذیب نہ کرتا ہو، اس کا حال اس کے دعویٰ کو جھٹلاتا نہ ہو، تو اصلاح کا امکان خاصا بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ ''خود را فضیحت دیگراں را نصیحت'' بن کر رہ جاتا ہے۔

آج صرف مدارس کے پیمانے پر نہیں، ملی پیمانے پر اتحاد و اتفاق کا نعرہ بہت لگتا ہے، مگر جو بھی اتحاد کا اعلان لے کر کھڑا ہوتا ہے، کچھ دنوں کے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ اس کا ٹولہ الگ بن کر رہ جاتا ہے، اور اختلاف کا نیا شاخسانہ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو خرابیاں نظر آتی ہیں، انھیں ہلکا کرنے کی کوشش کرتے رہئے، کم از کم اپنے کو ان خرابیوں سے بچائے رکھئے، انھیں خرابیوں کے ساتھ مدارس کو چلاتے رہئے،

اور اصلاح کی کوشش کرتے رہیے، مدرسہ اور تعلیم فرض کفایہ ہے، اگر کسی کو کسی خاص ماحول میں ایمان و عمل کے لئے خطرہ محسوس ہوتا ہو، تو چھوڑ کر الگ ہو جائے اور جہاں ایمان کی سلامتی ہو وہاں کام کرے، مگر تعلیم اور مدرسہ بند نہیں کیا جا سکتا، اور تجربہ تو یہ ہے کہ مدرسہ سے باہر ایمان و اعمال پر آگ برس رہی ہے۔ یہ اصحابِ کہف کی پناہ گاہ ہے۔ انھیں خرابیوں کے ساتھ چلنے دیجئے۔ ایک مدرسہ بند ہوگا، تو دوسرا کھلے گا، مگر اس نظام کو یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ مدرسہ کے تین ارکان میں سے ایک رکن اساتذہ ہیں، واللہ اگر اساتذہ انفرادی طور پر اپنی اصلاح کر لیں اور کرا لیں تو مدارس میں بڑی حد تک سدھار آ جائے گا۔ طلبہ اربابِ انتظام سے نہیں اساتذہ سے بنتے ہیں۔ انھیں کی نیتوں اور انھیں کے اعمال پر زیادہ مدار رہتا ہے۔ ان کا باطن شفاف ہو، ان کا ظاہر بے داغ ہو، ان کے اعمال میزانِ شریعت پر پورے اترتے ہوں، تو یہ خیر ہمہ جہت وسعت اختیار کر لے گا۔

اپنے علاقہ اور دوسرے علاقوں کے طلبہ میں تفریق ہے تو بہت بری، مگر آپ بتائیں کیا اربابِ مدارس کو قوت حاکمانہ حاصل ہے؟ نہیں ہے، تو بعض اوقات اھون البلیتین کے اصول پر ارباب مدارس کو ایسا کرنا پڑتا ہے، گو کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ مناسب نہیں ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اہل مدارس کوئی ایسا قانون نہ بنائیں، جس میں مجبوراً تفریق والا عمل کرنا پڑے۔ اصول و قانون چاہے جزوی ہو، بہت غور و فکر کے بعد اس کے اثرات کا جائزہ لے کر ہی بنانا چاہیے، اس میں ارباب انتظام سے بہت غلطی ہوتی ہے۔

اور کیا عرض کروں، غلطیاں اور ہماری خامیاں تو بہت ہیں۔ جن میں سے

اکثر کی اصلاح، انفرادی صلاح وتقویٰ سے ہوسکتی ہے۔ جب ان مدرسوں سے کثیر تعداد اچھے اور صالح علماء کی نکلتی تھی، اس وقت مدارس کے اساتذہ بزرگ ہوتے تھے، بزرگوں سے تعلق وربط رکھتے تھے، ذاکر وشاغل ہوتے تھے، خوفِ خدا اور محبت نبوی سے معمور وسرشار ہوتے تھے، آج کیا رنگ ہے؟ باہر کے قانون سے کسی چیز کی اصلاح ممکن نہیں، بنانے والا قانون بناتا ہے، توڑنے والا اس سے زیادہ ذہانت صرف کرتا ہے، اور قانون ٹوٹ جاتا ہے۔ اصل سرمایہ خشیت الٰہی، پاسِ شریعت، احساسِ جواب دہی اور مخلوق خدا پر شفقت وعنایت ہے۔ تنقید پوشیدہ ہو، اور اصلاح علانیہ ہو تو بہتر ہے، جراحی کا عمل ایک ضرورت ہے، اس کے لئے آپریشن روم مناسب ہے، علاج ایک مقصد ہے، اسے کھل کر پیش کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کی تدبیر بتائیے، اس کو خود اختیار کیجئے، اور دوسروں کو نشانۂ تنقید بنانے کے بجائے خود اپنی اصلاح میں پیش رفت کیجئے۔

رہا یہ کہ پھر حکومت کی سرپرستی والے مدارس پر تنقید کیوں کی جائے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ حکومت کی سرپرستی قبول کرنے پر علی الاعلان تنقید ضروری ہے، اس لئے کہ اس سے مدرسوں کا راستہ اور منزل سب یکسر تبدیل ہوجاتے ہیں، اگر لوگ انھیں دینی کے بجائے دنیاوی مدرسہ اور کاروبار قرار دیں، تو پھر تنقید واصلاح کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جیسے انگریزی مدارس وکالجز پر اس نقطۂ نظر سے کوئی نہیں تنقید کرتا، اسی طرح ان سرکاری مدارس پر بھی کوئی تنقید، اس خاص نقطۂ نظر سے نہ ہوگی۔ ہاں کسی اور زاویۂ سے ہو تو ہو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یکم / ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

(مـــزیـــــــد)

رابطوں سے متعلق اتنا اور عرض کروں کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر میں نے رابطے کی صورت دیکھی ہے، لیکن علم دین اور تعلیم کے حق میں اس کا ضرر کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں آیا۔ بلکہ مجھے تو یہ تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ہندوستان جیسے ملک کے مدارس میں، دوسرے مدارس کے علماء وارباب انتظام سے بہت زیادہ ربط نہ رکھا جائے۔ تو کچھ زیادہ غیر مناسب نہ ہوگا۔ یہ ’’**اعجاب کل ذی رای برایہ**‘‘ کا دور ہے۔ اللہ جانے ایک شخص دوسرے مدرسہ میں جاکر کیا اثر چھوڑے؟ کون سا بیج بودے؟ بعض لوگوں کے ساتھ خلاف وشقاق اس طرح لگا ہوا ہے کہ جہاں جاتے ہیں، کچھ نہ کچھ زہریلا تخم پڑ ہی جاتا ہے۔

میں الہ آباد میں پڑھاتا تھا۔ ایک جگہ سے دس بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک قافلہ آیا۔ جو دہلی جارہا تھا، اسے اپنے یہاں کسی کام کی منظوری، حضرت مولانا اسعد صاحب کے واسطے سے حکومت سے لینی تھی۔ یہ لوگ شام کے وقت الہ آباد حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں پہونچے، ایک استاذ نے ان کی ضیافت کی، یہ سب خواص تھے، ان میں علماء بھی تھے، ارباب سیاست بھی تھے، عشاء کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر ایک صاحب کھڑے ہوئے، اور خطبہ پڑھا، مجھے تعجب ہوا کہ یہ صاحب اس وقت کیسی تقریر کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ سب لوگ فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں، اور صبح سے اب تک سب لوگ ساتھ ہیں، اور کسی بات پر آپس میں اختلاف نہیں ہوا، یہ کہہ کر وہ صاحب بیٹھ گئے، میں لرز گیا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے، قافلہ پلیٹ فارم تک پہونچتے پہونچتے دو فرقوں میں تقسیم ہوگیا، نزاع شروع ہوگئی، گاڑی میں جب بیٹھنے کا وقت آیا،

تو ایک پارٹی اور بن گئی۔ دو پارٹیاں واپس گھر لوٹ گئیں، اور ایک پارٹی دلی گئی، اور ناکام لوٹ آئی۔ اگر ایسا کوئی آدمی مدرسہ میں آ گیا، تو بس اللہ ہی خیر فرمائے۔ بس انھیں چلنے دیجیے، جب تک کوئی نیا شر پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو اصلاح کیجئے، ورنہ چھوڑ دیجئے۔ کام کے لوگ اسی سمندر سے نکلتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

(۱) مولانائے موصوف نے مدارس عربیہ کے درمیان ارتباط وتعلق پر بہت زور دیا تھا کہ اس کے لئے ایک تنظیم میں تمام مدارس کو منظم ہو کر کام کرنا چاہئے۔ یہ خیال ہے تو بڑا خوش آئند! مگر بحالات موجودہ اس کی افادیت تجربہ سے بہت مشکوک ثابت ہوئی ہے، اگلے فقرے میں اسی کی قدرے تفصیل ہے۔

(۲) مکتوب سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ صرف اربابِ انتظام کی خرابیوں کا اثر مدرسہ پر پڑ رہا ہے، یہ فقرہ اسی کے جواب میں ہے۔

(۳) مولانا موصوف نے کچھ علاقائی عصبیت کا تذکرہ کیا تھا کہ ارباب مدارس اپنے علاقے کے طلبہ اور بیرونی طلبہ کے درمیان معاملات میں میں تفریق کرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگلا فقرہ اسی سے متعلق ہے۔

☆☆☆☆☆

بنام مولانا مفتی احمد الراشد صاحب

قصبہ مبارک پور کے رہنے والے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے مدرس، صاحب علم وتحقیق، حضرت مولانا سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مکتوب ان دنوں کا ہے جب یہ وہاں ناظم تعلیمات یا ناظم امتحان تھے۔ اور وہاں سے بحیثیت ممتحن حضرت مولانا مدظلہٗ کو مدعو کیا گیا، اس وقت ہمارے یہاں بھی سالانہ امتحان چل رہا تھا، اس وجہ سے حاضری مشکل تھی، درج ذیل خط میں اسی کی معذرت ہے۔

(ضیاء الحق خیرآبادی)

برادر عزیز جناب مولانا احمد الراشد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

آپ کا حکم نامہ پہونچا، احیاء العلوم کا اشارہ میرے لئے حکم ہے، اس کی تعمیل میں مجھے کوئی تردد روا نہیں ہے، مگر یہاں بھی امتحانات چل رہے ہیں، گو کہ کسی کام نہیں ہوں، لایعنی ہوں، لیکن بعض عوامل ہمزۂ استفہام اور حرفِ نفی کا سہارا پا کر عمل کرتے ہیں، میری حیثیت بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، اس لئے اس حرفِ نفی کی نفی ہی کر دیں، تو مناسب ہوگا۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۶؍شعبان ۱۴۱۵ھ

☆☆☆☆☆

بنام انیس بھائی (الہ آباد)

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں جن شخصیتوں نے دل پر گہرا نقش جمایا، ان میں ایک اہم شخصیت جناب انیس بھائی کی ہے۔ پورخاص ضلع الہ آباد کے رہنے والے! محبّ بھی اور محبوب بھی! ان سے دل کو بہت گہرا تعلق ہوا، اتنا گہرا کہ ان کی شخصیت دل میں اتر گئی۔ الہ آباد چھوڑے ہوئے تقریباً ۳۰؍سال گزر گئے، مگر محبت کا نقش مدھم تو کیا ہوتا اور تابناک ہوتا جا رہا ہے، لمبا قد، تواضع کی وجہ سے قدرے جھکا ہوا، سر میں اور داڑھی میں اس وقت سیاہی غالب تھی، اور اب سفید برق ہیں، دل کا نور چہرے اور بالوں سے پھوٹا پڑتا ہے، بہت باغ و بہار، دلچسپ، ظریف الطبع، ساتھ ہی نہایت رقیق القلب، خوف وخشیت سے لبریز دل، محبتِ رسول میں سرشار، عشق الٰہی میں سرمست!

یہ سرمستی اور سرشاری زور کرتی ہے تو طبیعت جھومتی ہے۔ اور حمد ونعت کے اشعار ڈھلنے لگتے ہیں، پھر جب وہ اپنے خاص ترنم سے پڑھتے ہیں تو سننے والے جھوم جاتے ہیں، محبت میں بے تاب ہو جاتے ہیں۔ صاحب دل آدمی اپنی آنکھوں پر قابو نہیں پاتا، اشعار کی حلاوت، لہجہ کی گھلاوٹ، ترنم کا سوز اور آواز کا گداز، سب مل کر وہ حالت پیدا کرتی ہے کہ

؎ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

یہ ہے شخصیت انیس بھائی کی! دلکش اور دل آویز۔ ان کے نام خطوط میں شخصیت کا اثر قارئین محسوس کریں گے۔

محترم ومکرم جناب انیس بھائی! زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

چندروز قبل خیرآباد جانے کا اتفاق ہوا، تو میرے کرم فرماؤں میں سے ایک صاحب حاجی نورالہدیٰ (مستری) سے ملاقات ہوئی، انھوں نے یہ مسرت خیز خبر سنائی کہ اس سال آپ بھی حج کی سعادت میں شریک تھے، اور یہ کہ اس مبارک سرزمین میں، مبارک ساعات میں اس دورافتادہ، ناکارہ کا ذکرآپ کی مبارک زبان پرآیا، اوراسی واسطے سے حاجی نورالہدیٰ سے تعارف ہوا۔ کتنی خوشی ہوئی یہ سن کر! میں بیان نہیں کرسکتا، ایک تو اس سرزمین قدس پرآپ کی حضوری، پھرآپ جیسے صاحب دل کی زبان پرایک گنہگار کا نام اوراس کی یاد ع

بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست

محبت کی ایک ہوک اُٹھ رہی ہے جی چاہتا ہے کہ ابھی آپ کی خدمت میں حاضری دوں، اوران آنکھوں کی زیارت کروں، جو بیت اللہ کا نقشہ اور روضۂ اطہر کا سراپا اپنے اندرسجا کرلائی ہیں، اللہ نے بڑا کرم فرمایا کہ اپنے گھر میں حاضری کی توفیق بخشی۔ آپ تو پہلے ہی سے ماشاءاللہ، انشاءاللہ بخشے بخشائے ہیں، وہاں جاکرکیا عروج نصیب ہوا ہوگا، کیسی طہارت حاصل ہوئی ہوگی، پھرمعلوم ہوا کہ والدمحترم بھی ساتھ تھے، دربارِخداوندی کی حاضری وحضوری، اور والدگرامی کی خدمت ومعیت، بس نورٌ علیٰ نور کا مصداق! اللہ تعالیٰ اس سفرحج کو، اس کے مناسک کواپنی شانِ عالی کے مطابق قبول فرمائے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ حاضرہوں، اورآپ کے پاؤں کو بوسہ دوں، جو عرفات ومنیٰ ومزدلفہ کے غبار سے سنور کے آئے ہیں، مگرکیا کروں کہ کچھ اعذار وعوارض کی وجہ سے سفرکی ہمت اپنے اندرنہیں پاتا، ہلکے پھلکے سفربھی متروک ہیں۔ بس دل کھنچتا

ہے، اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کارسازِ حقیقی آپ ہی کو یہاں تک پہونچادے، حالانکہ دل کی یہ جرأت اور خدا سے یہ دعا، آپ کی شان میں بے ادبی ہے، مگر وہ محبت ہی کیا جو اس طرح کی بے ادبیوں اور گستاخیوں سے محروم ہو۔

آپ اس خط کو پڑھ چکے، اب ہاتھ اٹھا کر اس غریب ومہجور کے لئے بحضور خداوندی دعاء کیجئے کہ حق تعالیٰ اس بے برگ وساز کو محض اپنے فضل وکرم سے اس سال اس کے والدین کے ساتھ حج کی توفیق عطا فرمائے۔ والدین کا قصد ہے، ان کا یہ بیٹا بھی ان کے سایۂ رحمت میں لگا لپٹا رہنا چاہتا ہے، ذرا خوب جی لگا کر دعاء کردیجئے، حاجی سے پہلی ملاقات میں جو دعا کرائی جائے وہ قبول ہوتی ہے، میں آدھی ملاقات میں دعاء کرارہا ہوں، آپ دعاء کیجئے، میں پیشگی آمین کہہ رہا ہوں، یا اللہ! یا کریم! آپ انیس بھائی کی یہ دعاء، اور سب دعائیں قبول فرماکر مجھ پر بھی اور ان پر بھی احسان کیجئے۔ **آمین یا رب العالمین**

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۸؍محرم ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم ومکرم جناب انیس بھائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

نظر سے غائب، مگر دل کے قریں، میں آپ کو سلام کرتا ہوں اور ثنا ارسال کرتا ہوں۔

در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

راہِ عشق میں قرب و بعد کا مرحلہ کہاں؟ کھلی آنکھوں آپ کو دیکھتا ہوں اور دعا بھیجتا ہوں۔

میں پرسوں دلی سے آیا، خطوط جو بیس دن میں آئے اور رکھے تھے، انھیں الٹ پلٹ رہا تھا، میں کچھ تلاش کر رہا تھا، میرے بیٹے محمد عابد سلّمہٗ نے مجھے راستے ہی میں بتادیا تھا کہ انیس بھائی الہ آباد سے آئے تھے، اور میں تڑپ گیا کہ میں ہی ملاقات کے لئے بے قرار تھا، اور میں ہی غائب ہوگیا۔ میں تلاش کر رہا تھا کہ انیس بھائی آئے تھے تو کچھ لکھ کر گئے ہوں گے، پھر ایک جگہ بوئے دوست محسوس ہوئی، جو مشامِ جاں کو معطر کرگئی، پھر بہت کچھ ملا، صرف بو نہیں، پورا گلستاں مل گیا، عطر کا ڈبہ ہی کھل گیا۔ ایک نہیں دو دو خط! مجمل نہیں مفصل! الفاظ نہیں قلب وجگر کے ٹکڑے! معانی نہیں عشق ومحبت کی سرشاری! بات نہیں قند ونبات! پڑھا اور پڑھتا چلا گیا، جنت نگاہ، فردوس گوش، سوز ہی سوز! حلاوت ہی حلاوت! روح شاداب ہوگئی، ایمان جگمگا اٹھا، دل زندہ ہوگیا، اور کیا کیا ہوا؟ میرے دل میں کوئی سما جائے، اور پھر محسوس کرے، میرا قلم کوتاہ، میرا بیان عاجز، میں درماندہ، میرا خیال پراگندہ، کہاں تک اور کیسے محسوساتِ قلبی کی ترجمانی کروں۔

ہاں تو انیس بھائی! آپ نے اپنے متعلق جو لکھا ہے، میں دل وجان سے اس کی تصدیق کرتا ہوں، آدمی معرفت کی جتنی منزلیں طے کرتا ہے، اسی قدر اپنے کو ذلیل وخوار، ہیچ ونا کارہ اور گنہگار ونابکار سمجھتا ہے، کیونکہ جب دل پر معرفت کی تجلی پڑتی ہے، تو وہ صاف دیکھتا ہے کہ خیرات وبرکات، حسن وجمال، خوبی وکمال جو کچھ ہے، سب براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اس کی اپنی ذات عدم در عدم، لاشے محض

اور فنا در فنا نظر آتی ہے، وہ اپنے اندر کوئی جمال و کمال نہیں دیکھتا، زمین روشن ہوتی ہے، تو یہ سورج کا پرتو ہے، ورنہ زمین اپنی ذات کے لحاظ سے محض تاریک ہے، یہی حال مخلوقات کا ہے، وہ محض عدم ہیں، وجود کی تجلی محض عنایت ربّانی ہے۔ اسی لئے عارف اپنی ذات سے یکسو ہو کر محض باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اپنے اندر جھانکے تو اسے کیا سجھائی دے، وہاں بھی حق تعالیٰ ہی کی تجلی دکھائی دیتی ہے، پس وہ سو جان سے عاشق ہو جاتا ہے، اور عشق است و ہزار بدگمانی! اس کو اپنی ذات سے بے زاری محسوس ہوتی ہے، وہ جلوۂ ربّانی میں محو ہو جاتا ہے۔

مبارک ہو کہ آپ کو معرفت کی تجلی حاصل ہوئی، یہ آپ کو اور آپ کی ذات کو سوخت کر دے گی، فنا کر دے گی، پھر صرف وہی باقی رہے گا، جسے باقی ہی رہنا ہے، اے اللہ اس کا کچھ حصہ اس ناکارہ و آوارہ اور گرفتارِ نفس امّارہ کو بھی عطا ہو۔

انیس بھائی! اور سنئے! آپ نے لکھا ہے کہ:

> ’’جب کسی عالم دین کا ذکر آتا ہے، تو فوراً آپ کی صورت سامنے آ جاتی ہے، حالانکہ میری اتنی عمر علماء ہی کی صحبت میں گذری ہے، لیکن عالم دین کا تصور جب بھی ہوتا ہے، تو آپ کی ذات سے شروع ہوتا ہے اللہ جانے کون سا جادو آپ نے کر دیا ہے‘‘

میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، حالانکہ میرا ضمیر میرے قلم کو پکڑ رہا ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہو، لیکن یہ محبت کا اظہار ہے، اس کی تصدیق نہ کرنا محبت کی توہین ہے، یہ میرا جادو نہیں ہے، آپ کی قلبی محبت کا کرشمہ ہے، ہاں یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کی جو محبت ہے، اس سے اس کو آب و تاب ملتی ہے، مجھے جب محبت کا تصور ہوتا ہے، تو آپ کا خیال ضرور جلوہ گر ہوتا ہے، اور اس وقت نہ جانے کتنی باتیں آپ کی یاد

آتی چلی جاتی ہیں، آپ کا دل گلاب کا پھول ہے، جس سے خوشبو کے جھونکے دم بدم آتے رہتے ہیں۔

آپ نے جو اشعار برجستہ موزوں کئے ہیں، وہ آپ کے دل کا حال ہے، مبارک ہو، کعبہ جانے سے بتوں کا عشق چھوٹ گیا، اور زمزم پینے سے جگر کی آگ بجھ گئی، اللہ اللہ کتنا مبارک حال ہے!

آپ کی دعا سے طبیعت نہال ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے ؎

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

میں پاکستان نہیں جا سکا، ویزا ملنے میں بہت دشواری تھی، اور اس میں کافی تاخیر ہو رہی تھی، اس لئے مدرسہ لوٹ آیا، دو تین ماہ کے بعد شاید پھر قصد کروں۔

الہ آباد کے لئے پر تول رہا ہوں، دیکھئے اُڑنا کب نصیب ہوتا ہے، شاید ایک ماہ کے بعد حاضر ہو سکوں، دعا کی درخواست ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
اعجاز احمد اعظمی

۲۰/ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا محمد رضوان صاحب بمہور

یہ مکاتیب حضرت مولانا کے رفیق درس حضرت مولانا محمد رضوان صاحب کے نام لکھے گئے ۔ مولانا موصوف استاذ محترم کے بچپن کے بے تکلف دوست ، رفیق درس اوران کے عظیم المرتبت استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی ہیں ، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ممتاز طالب علم اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل ! بہت نیک ، بہت متواضع ، خاشع اور خاضع ، نام الٰہی کا ذوق رکھنے والے ۔ بہت عرصہ تک جامعہ حسینیہ لال دروازہ جون پور میں استاذ رہے ، اوراب جامعہ رشیدیہ بمہور ضلع اعظم گڈھ میں صدر المدرسین ہیں ۔ مکتوب نگار کو ان سے گہرا لگاؤ اور قلبی محبت ہے ۔ اس کے آثار ان خطوط سے نمایاں ہیں ۔ درجِ ذیل خط ان کے اس عنایت نامہ کا جواب ہے جو انھوں نے جونپور سے حضرت الاستاذ مدظلہ کے نام بھیجا تھا ، جس کا حاصل یہ تھا کہ ’’ بڑی پریشانی کے عالم میں رہتا ہوں ، مدرسہ کے کاموں کی بھیڑ کی وجہ سے ذکر وغیرہ چھوٹ جایا کرتے ہیں ، پھر کوشش کرکے راستے پر لگتا ہوں ، جب ذکر چھوٹ جاتا ہے تو کسی کام میں جی نہیں لگتا ۔ استقامت اور دوام کے لئے خصوصی دعا فرمائیں ۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

محبی ومحبوبی فی اللہ! **عافاکم اللہ ورزقکم توفیقاً و کرامةً**

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہٗ

مدتِ دراز کے بعد جانب غرب سے نسیم محبت چلی ہے، دل کی کلی کلی کھل گئی، آپ کے ہر ہر لفظ میں محبت کی خوشبو محسوس ہوئی، اور محبت واُلفت وہ مسیحا ہے جس سے مردے بھی جی اٹھیں، کاش آپ اور لکھے ہوتے اور بوئے اُنس پھیلتی چلی جاتی، لیکن کیا ہوا بار بار پڑھ کر قند مکرر کا لطف حاصل کررہا ہوں۔ آپ کی یاد سے دل کو زندگی حاصل ہورہی ہے۔

میرے دوست! آپ نے جس پریشانی کا ذکر کیا ہے، یہ آپ کے احساس کے صحیح اور درست ہونے کی علامت ہے، لیکن آپ نے اتنی مصروفیات اپنے اوپر اوڑھ رکھی ہیں، جو آپ کے قلب کو، آپ کے وقت کو پراگندہ اور منتشر کردیتی ہیں۔ محبوبِ حقیقی کی یاد یکسوئی چاہتی ہے، اور مشاغل دنیا موجب تشتت ہوتے ہیں، دونوں میں مصالحت بغایت دشوار ہے، ایک طرف آپ کا قلب ہے جو یادِالٰہی کی غذا کا طالب ہے جسے بھوک ہے تو محض اس کی کہ ذکر خداوندی میں محو ومستغرق رہے، اور دوسری طرف کاروبارِ مدرسہ ہے جو صرف اعضاء ہی کو اپنی طرف نہیں کھینچتا بلکہ دل کو بھی پوری طرح اپنے اندر جذب کرلینا چاہتا ہے، اسی کشمکش میں آپ پریشان ہوتے ہیں، کبھی ذکر شروع کرتے ہیں جب قلبی تقاضا غالب آتا ہے، اور کبھی مصروفیات اس سے طبیعت کو ہٹادیتی ہیں، آپ دونوں کو نباہ رہے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں۔

اب میری سنئے! گو مہمل ہوں، پاگل ہوں، سنکا ہوا ہوں، لیکن بات کہوں پتے کی، وہ یہ کہ ہماری، آپ کی اور ساری کائنات کی تخلیق صرف اور صرف اس لئے ہے کہ اپنے خالق و مالک، اپنے آقا ومولیٰ، اپنے رب اور خدا کی یاد میں لگے رہیں۔

جو بھی طور ہو، جو بھی طریقہ ہو، بس اسی کی دُھن لگی رہے، اور جو چیز اس کی یاد میں روڑا بنے اسے ٹھوکر مار کر ہٹا دیں، کاروبارِ دنیا میں اگر حق تعالیٰ کی اطاعت ہو تو یہ بھی ذکر الٰہی کا ایک فرد ہے، لیکن پروردگار نے اس کو اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں سمجھا ہے کہ دنیا کے کاموں میں ہماری اطاعت کرتے رہو اور بس! دیکھئے حضور جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ایک لمحہ دینِ حق کی دعوت وتبلیغ میں صرف ہوتا تھا، آپ کی زندگی میں کوئی ایسی ساعت نہیں آتی تھی جو ذکر الٰہی سے خالی ہوتی ہو۔ ہمہ وقت، ہمہ تن مصروفِ یاد، لیکن دیکھئے تو سہی، یہ یاد مخلوق کے اختلاط کے ساتھ تھی، خدا کو اتنی ہی یاد منظور نہیں ہے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ میرا بندہ کچھ ایسا وقت بھی دے جس میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ اِدھر سے عبادت خالص حضوری کی ہو، اُدھر سے عنایت والتفات بے آمیز ہو۔ اُسی کے لئے کبھی قم اللیل فرماتے ہیں، اسی مقصد کے لئے کبھی **فإذا فرغت** الخ فرماتے ہیں کہ جب مخلوق کے کاموں سے فراغت ہو جائے تو اپنے آپ کو تھکاؤ اور اپنے رب کی جانب رغبت سے آؤ، اس لئے بات صاف یہ ہے کہ جہاں اور سب کاموں کو ضروری یا غیر ضروری سمجھ کر کیا جاتا ہے، وہیں چوبیس گھنٹہ میں ایک دو گھنٹہ ایسا بھی ہونا ضروری ہے جس میں صرف بندہ ہو اور اس کا خدا ہو، درمیان میں کوئی حجاب نہ ہو، کہاں کی مصروفیت اور کہاں کی مشغولیت سب کو ٹھکرا کر خلوتِ محبوب میں جا حاضر ہوں۔ سب کاروبارِ دنیا سے کہہ دیں کہ اب ٹھہرو، ہم کاسئہ گدائی لے کر ’’درِ کریم‘‘ پر حاضری دینے جا رہے ہیں، اب تمام مشاغل ہمارا انتظار کریں۔ خدا کی قسم جب تک ایسا نہ ہو جینے کا لطف نہیں۔ وہی لمحہ اصل قیمت رکھتا ہے جو محبوب کی مجالست میں بسر ہو جائے، آپ اپنی مصروفیات کو خواہ کم کریں یا نہ کریں، لیکن ہمارا پروردگار جب ہمارے پیغمبر سے اتنا وقت لے چکا ہے، تو ہم کو بھی بصد شوق

ونیاز اپنے آقا و مولیٰ کی تابعداری میں اس کریم کے دروازے پر پیشانی رکھنی چاہئے۔

میں آپ سے کیا کہوں، آپ نے طلبہ کی مالیات کا بکھیڑا اپنے سر لے رکھا ہے، سوچئے تو سہی! یہ طلبہ بھی مخلوق ہیں اور ان کے اموال بھی مخلوق ہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ **إتصالک بالحق بقدر إنفصالک عن الخلق**، پھر آپ بتائیے کہ مخلوقات کے ان بکھیڑوں میں پڑ کر خالق سے بے توجہی کیونکر روا ہوگی، آپ کہیں گے کہ طلبہ کی تربیت کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے، میں عرض کروں گا کہ ایسی تربیت میں آگ لگائیے جو اپنے محبوب سے مانع بن جائے، پھر تربیت کون کرتا ہے؟ ہم اور آپ؟ **کلا وحاشا** ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا، خالق عز وجل ہی مربی ہیں ہم صرف راستہ بتادیں، باقی ذمہ داری اپنے سر کیوں اوڑھیں، ان کا جی چاہے جنت میں لے جائیں، ان کا جو جی چاہے کریں۔ آخر ہمارا نفس اور ہمارا دل بھی اپنا حق رکھتا ہے یا نہیں! خدمت خلق وہی معتبر ہے جس کا رشتہ خدمت خالق سے اُستوار ہو، ورنہ خدمت خلق محض فریب نفس اور کید شیطان ہے، میرے بھائی! مجھ پر خفا نہ ہوں، جو چیزیں یادِ الٰہی سے مانع ہوں ان پر میرا غصہ بجا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں! حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں ایک بنکر بیچارہ سال بھر میں ایک بار آیا کرتا، اور کچھ دن خانقاہ میں قیام کرتا، اور جب آتا حضرت کے لئے ایک لنگی بُن لایا کرتا، ایک سال وہ نہیں آیا۔ دوسرے سال جب حاضر خدمت ہوا تو خواجہ صاحب نے دریافت فرمایا، کیوں جی؟ ایک سال کا تم نے ناغہ کر دیا۔ عرض کیا: حضور لنگی تیار نہ تھی اس لئے حاضر خدمت نہ ہوسکا، خواجہ صاحب نے فوراً لنگی میں آگ لگا دی، اور فرمایا جو چیز محبوب سے ملاقات میں مانع بنے، اس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہئے، اب خبردار لنگی مت لانا، کسی نے بہت خوب کہا ہے۔ ے

صد کتاب وصد ورق درنار کن　　روئے خود را جانب دلدار کن

آپ نے سمجھا یہ وہ کتابیں اور اوراق ہیں جو جانبِ دلدار نہیں ہیں انھیں درنار کرنا ہے، ورنہ جو کتابیں خود پکڑ کر جانبِ دلدار کھینچ رہی ہوں، انھیں کون درنار کرسکتا ہے، تو صاحب بات صاف یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی خدمت میں یکسوئی اور خلوت کے ساتھ ہم کو حاضری دینی ضروری ہے، اس کے لئے جو بھی جتن کرنا پڑے کرنا چاہئے۔ اس کے لئے اگر ضروری ہو کہ اپنی مشغولیات میں سے کچھ حصہ کم کیا جائے تو ضرور کرنا چاہئے۔ اس یاد میں بڑی برکت ہے، پھر ہر کام میں انھیں کی جانب سے اعانت ہوگی، جو کام بغیر یادِ الٰہی کے گھنٹوں میں انجام نہیں پاتے، یادِ الٰہی پر استقامت کے بعد وہ سکنڈوں اور منٹوں میں حل ہوا کریں گے، کتنے غیر ضروری اور مہلک مسائل جو غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ذکر الٰہی کے بعد ان کی پیداوار کا سلسلہ خود بخود بند ہوجائے گا۔ مجھے خوب تجربہ ہے۔ کتنا لکھوں، آپ میرے سامنے موجود ہوتے تو زبانی بہت کچھ عرض کرتا۔

محترم! ہم نے ایمان لاکر محبت کا دعویٰ کیا ہے، اس کی دلیل پیش کرنی ہوگی۔ اپنی عادات، مالوفات، مشاغل، عزت وآبرو سب کو اس محبوبِ حقیقی پر قربان کرنا چاہئے، پھر اُدھر سے ایک نگاہِ کرم ہوجائے تو قسم ہے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ساری محبت وصول، ساری مشقت سُوارت، اور پوری زندگی کامیاب وبامراد، ساری دنیا تو خرافات میں لگی ہی ہوئی ہے، اگر وہ چند لوگ جو نام خدا کے ذائقہ آشنا ہیں وہ بھی اس لذیذ وشیریں نام سے غافل ہوکر ایلوا اور اندرائن چبانے لگیں، تو بتائیے کیسا ہے؟

اس لئے صاحب! اس کا نام ضرور لیجئے، تنہائی میں رٹئے! جلوت کو مختصر کیجئے، خلوت کا اُنس حاصل کیجئے، کہاں کی مخلوق اور کیسی مخلوق، سب بے وفا، سب دغا باز،

بس وہی ہمارا سب کچھ ہے، اور کوئی کچھ نہیں۔ آپ خفا نہ ہوں، معلوم نہیں کیا کیا لکھ دیا ہے۔ غلطی ہوئی ہو تو معاف کردیں، اور دعاء کردیں۔

فقط والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۱؍صفر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

برادرِ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
مزاجِ گرامی!

اس سے پہلے والے خط میں، امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کے مکاتیب سے کچھ اقتباسات میں نے نقل کئے تھے۔ ابھی مطالعہ کے دوران ایک مکتوب شریف نظر سے گذرا، سوچا کہ آپ کو لکھ بھیجوں، شاید ہم دونوں کو نفع پہونچے، اصل عبارت کے بجائے ترجمہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

’’آدمی کو امراضِ ظاہری میں سے کوئی مرض لاحق ہوتا ہے، یا اس کے عضو ظاہر پر کوئی آفت پڑتی ہے، تو اس کے لئے آدمی اتنی محنت وکوشش کرتا ہے کہ بالآخر وہ مرض دور ہو جاتا ہے، اور وہ آفت زائل ہو جاتی ہے، مرضِ قلبی جو نام ہے، ماسوائے حق جل وعلا کے ساتھ گرفتاری کا، اس طور سے آدمی پر تسلط اور غلبہ پائے ہوئے ہے کہ عجب نہیں کہ اسے دائمی موت کے گڈھے میں ڈھکیل دے اور سرمدی عذاب میں گرفتار کرادے، لیکن اس کے ازالے کی کوئی فکر اور اس کے دور کرنے کی کوئی کوشش کام میں نہیں لائی جاتی۔ اگر کوئی شخص اس گرفتاری کو مرض نہیں سمجھتا تو وہ ’’سفیہ محض‘‘ ہے، اور اگر مرض سمجھتے ہوئے کچھ اندیشہ نہیں کرتا تو وہ ’’پلید صرف‘‘ ہے، البتہ اس مرض کے اِدراک کے واسطے عقل معاد درکار ہے۔ عقل معاش اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث محض

ظاہر بینی تک محدود رہتی ہے، اور جیسا کہ عقل معاش لذاتِ فانیہ سے لطف اندوزی کے باعث امراضِ باطنی کو مرض نہیں سمجھتی، اسی طرح عقل معاد بھی ثواب آخرت کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے امراضِ ظاہر کو قابل اعتناء نہیں شمار کرتی، عقل معاش قاصر البصر ہے اور عقل معاد کامل البصر ہے۔ عقل معاد انبیاء اور اولیاء کا حصہ ہے (علیہم الصلوات والتسلیمات) اور عقل معاش اغنیاء اور اربابِ دُنیا کو مرغوب ہے۔ وشتان مابینہما۔

وہ اسباب جن سے عقل معاد حاصل ہوتی ہے، ذکر موت، تذکرہ احوالِ آخرت، اور ان اکابر کی مصاحبت ہے جنھیں یادِ آخرت کی دولت حاصل ہے، ؎

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح مرضِ ظاہر، احکام، شرعیہ کی ادائیگی میں دشواری پیدا کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح مرض باطن بھی رُکاوٹ اور مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كبر على المشركين ماتدعوهم إليه**، وقال سبحانہ وتعالیٰ: **وإنها لكبيرة إلا على الخاشعين**، مرض ظاہر میں اعضاء وجوارح کا ضعف دشواری کا سبب ہے، اور مرض باطن میں ضعف یقین اور نقص ایمان۔ اس صعوبت کا باعث ہے، ورنہ تکالیف شرعیہ سب سہل اور آسان ہیں، آیت کریمہ: **يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر** اور آیت کریمہ **يريد الله أن يخفف عنكم وخلق الانسان ضعيفاً**، دونوں اس کی گواہ ہیں۔ ؎

خورشید نہ مجرم ار کسے بینا نیست

بس اس مرض کے ازالہ کی فکر لازم ہے، اور اطباء حاذق کی خدمت میں التجا کرنا فرض عین ہے۔ **وما على الرسول إلا البلاغ** (مکتوب ۲۱۹، دفتر اول)

والسلام

اعجاز احمد اعظمی یکم ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

برادر گرامی مرتبت! زادکم اللہ علماً وکرامۃً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی!

میں خط لکھ کر جواب کا انتظار کررہا ہوں، مختلف خیالات دل میں آتے ہیں، کبھی سوچتا ہوں، کہ شاید خط نہیں ملا، پھر جی میں آتا ہے کہ اگر نہ ملتا تو آپ تقاضا کرتے، کبھی خیال آتا ہے کہ اس خط میں میں حد ادب کو پھاند گیا ہوں، کہیں اس کی وجہ سے کبیدگی ہوئی ہو، اور آپ نے ترک جواب کا ارادہ کرلیا ہو، لیکن اس خیال کی تردید خود بخود ہوجاتی تھی۔ بھلا محبت وتعلق میں ایسا کب ممکن ہے، محبت کسی رنگ میں ہو، گستاخی کی صورت میں ہو، نیازمندی کے روپ میں ہو، ناز کے انداز میں ہو، شکایت کے لباس میں ہو، بہرصورت قابل قبول ہے۔ اسے ٹھکرایا نہیں جاسکتا، اور آپ جیسا دلدادۂ عشق ومحبت؟ بھلا اس خیالِ ناروا کا تصور بھی آسکتا ہے؟ مگر کیا کیجئے عشق است وہزار بدگمانی؟ آج آپ کا خط آیا۔ جان میں جان آئی، چمن دل میں بہار آئی، محبت میں تازگی پیدا ہوئی، دل میں نیا جوش نئی سرمستی موجزن ہوئی۔ آپ لکھتے رہئے، مجھے انتظار رہتا ہے۔ چند لفظ لکھئے، دو سطریں لکھئے، محبت حدود وقیود کی پابند نہیں، میری محبت بہت دراز نفس ہے، اس میں طول وعرض ہے۔ آپ کی محبت اتھاہ ہے، طول وعرض چاہے کم ہو، لیکن عمق اس قدر ہے کہ اس کی تہ تک کم از کم میں تو نہیں پہونچ سکتا۔ آپ کے چند حروف میرے لئے کافی ہیں۔

آپ نے اپنے اس خط میں ''ذہنی الجھاؤ'' کا ذکر کیا ہے۔ میرے خیال میں

آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مصروفیات کی کثرت کے باعث ذہن کو کاوش فکر کی فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے قلم اور کاغذ بہم جمع نہیں ہو پاتے، اور جواب میں دیر لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کے لئے ذہن و دماغ کو کچھ فرصت درکار ہوگی۔ اور وہ آپ کے اوقات میں عنقا ہے، یہ بالکل صحیح ہے، اگر اسی کو ذہنی الجھاؤ سے آپ نے تعبیر کیا ہے تو گو کہ آپ اس میں معذور ہیں، مگر میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ مصروفیات کس قبیل کی ہیں؟ اگر ایسی مصروفیات ہیں جو آپ کے لئے یادِ حق میں معین بنتی ہیں، یا خود ذکرِ الٰہی کی مشغولیات ہیں۔ تب تو سبحان اللہ، ماشاءاللہ! مقصد زندگی، حاصل عمر اور سرمایۂ روزگار یہی ہیں۔ ان مصروفیات کو کم کرنا کیا معنی؟ بڑھاتے رہنا چاہئے کہ دل میں یادِ الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز کا گذر تک نہ رہے۔ دل معرفت و محبت کا مرکز ہے، اس میں صرف یہی سرمایۂ گراں قدر ہونا چاہئے، باقی سب فضول ہے۔ لوہا اگر آگ میں ڈال دیا جائے اور آگ کو خوب دھونکا جائے تو تھوڑی دیر میں لوہا غائب، صرف آگ ہی نظر آئے گی، یوں ہی سمجھ لیجئے کہ دل کو ذکرِ الٰہی کی حرارت میں اتنا تپایا جائے دل غائب ہو جائے، صرف ذکر ہی رہ جائے۔

لیکن اگر مصروفیات اس کے علاوہ ہیں تو ہر وہ چیز جو مانع عن ذکر الحق ہو اس کی تقلیل ضروری ہے۔ آپ جیسے اصحاب کے لئے ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فضولیاتِ دنیا میں مشغول رہ کر دل کو تشویشات کا نشانہ بنائیں۔ کارِ دنیا کو خدا پر چھوڑیں، جس سے منظور ہوگا وہ یہ کام لے لیگا، ہمیں تو آنکھیں بند کر کے، اسی کے دامن سے وابستہ رہنا چاہئے۔ دنیا کا کام کرنے والے بہت ہیں، محض اللہ کا اور محض اللہ کے واسطے کام کرنے والے کتنے ہیں۔ آپ کے اندر اس کی استعداد ہے، جو کام دوسرے لوگ انجام دے سکتے ہیں، اس میں آپ کیوں دخل دیں؟ آپ تو وہ کام کیجئے جو کوئی نہیں

کررہا ہے اور اس کا کرنا ضروری ہے۔ آج دنیا میں ہر چیز کی کثرت ہے، اگر کمی ہے تو ذکر وطاعت کی، ورع وتقویٰ کی، اعتماد وتوکل کی، فراغت قلبی کی، اگر اس دولت سے مالا مال چند لوگ بھی نہ رہیں تو دنیا کسی طرح نہ مانے گی کہ یہ بھی کوئی چیز ہے، نمونوں کی کمی کی وجہ سے کتنے دینی حقائق انکار وتردید کی زَد میں آچکے ہیں۔ پرانے بزرگوں کے مقاماتِ عالیہ آج کسی سمجھانا بھی چاہیں تو نہیں سمجھا سکتے۔ دیکھئے امامِ ربّانی حضرت مجددِ الفِ ثانی قدس سرہٗ اپنے ایک مرید کو لکھتے ہیں:

> معرفتِ خدا برآں کس حرام کہ برابر خردلہ، در باطن او، محبت دنیا بود، یا باطن اورا، ایں قدر تعلق بدنیا باشد۔ یا ایں قدر مقدار خاطرے از دنیا در باطن او خطور کند، مکتوب: ۳۸، دفتر دوم
>
> (**ترجمہ**: خدا کی معرفت سے وہ شخص محروم ہے، جس کے قلب وباطن میں رائی کے برابر دنیا کی محبت ہو، یا اس کے باطن کو دنیا سے اتنا سا بھی تعلق ہو، یا دنیا کی اتنی مقدار اس کے دل میں گزر کرے)

غور کیجئے! آپ آج کسی کو یہ سمجھا سکتے ہیں کہ دنیا میں ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں، جن کے دل میں رائی کے برابر دنیا کی محبت نہیں ہوتی، نہ دنیا سے تعلق ہوتا۔ اور محبت وتعلق تو درکنار، رائی کے برابر دنیا کا خطرۂ وخیال بھی ان کے قلب میں نہیں گذرتا۔ دنیا نمونہ مانگے گی، آپ کس کو پیش کریں گے، تو کیا یہ حقیقت نہیں افسانہ ہے۔ **کلا وحاشا**، ایسا ممکن ہے، اور ممکن ہی نہیں واقع ہے۔ ایسے اشخاص ہوتے ہیں، لیکن بہت نادر، اور پہلے بہت ہوا کرتے تھے، اس لئے کسی کو اس کی صداقت پر شبہ نہیں ہوتا تھا۔ آج لوگ انکار کر دیں گے۔

اور سنئے! حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے اپنے ایک خلیفہ کے

صاحبزادے کی وفات پر انھیں جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اس کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں:

’’خبر فوت قرۃ العین محمد صدیق نوشتہ بودند إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ برادر عزیز! حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نزدِ مومناں از ہمہ چیز عزیز تر و محبوب تر ست، چہ اموال و چہ انفس و احیاء و امات فعل او تعالیٰ کہ دیگرے را در وے مدخلے نیست، پس ناچار فعل او تعالیٰ نیز عزیز تر و محبوب تر خواہد بود، جائے آنست کہ محباں از فعل محبوباں لذت بگیرند و عیش نمایند، بصبر چہ دلالت کند، کہ ایمائے بکراہت دارد، مقام رضاء ہر چند از رغبت و سرور خبر می دہد اما مرتبۂ التذاذ امرے دیگر ست ؎

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت   ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند   در نگر دل پس کہ بعد لا چہ ماند
ماند إلا اللہ باقی جملہ رفت   شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت

(مکتوب: ۴۸، دفتر دوم)

ترجمہ: قرۃ العین محمد صدیق کے حادثۂ وفات کی خبر آپ نے لکھی ہے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون برادرِ عزیز! حضرت حق سبحانہ تعالیٰ مومنوں کے نزدیک ہر چیز سے بڑھ کر عزیز و محبوب ہیں، کیا مال اور کیا جان؟ اور زندگی بخشنا اور موت دینا انھیں کا کام ہے، دوسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کا کام بھی عزیز تر اور محبوب تر ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب کے کام سے لذت حاصل کرے اور راحت محسوس کرے، صبر کی تلقین کیا کی جائے، کہ اس میں ناگواری کا اشارہ ملتا ہے، رضا کا مقام اگرچہ رغبت اور سرور کی خبر دیتا ہے، لیکن لذت پانے کا مرتبہ ایک دوسرا امر ہے۔

☆عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو معشوق کے علاوہ سب کو پھونک کر رکھ دیتا ہے۔

☆اس نے غیر حق کو قتل کرنے کیلئے ’’لا‘‘ کی تلوار چلائی، پھر دیکھو کہ ’’لا‘‘ کے بعد دل میں کیا باقی رہا

☆صرف ''الا اللہ'' باقی رہا، باقی سب چلا گیا، شاباش! اے عشق شرکت سوز! شاباش!۔

بھلا بتایئے، کہ آپ کیونکر یہ سمجھا سکتے ہیں کہ بیٹے کی وفات پر محض اس لئے ذوقِ لذت حاصل ہو رہی ہے کہ یہ فعل محبوب ہے، کون یقین کرے گا۔ جب نمونے بکثرت تھے، تو ہر شخص مانتا تھا، اب مثالیں نہ رہیں تو تصور بھی مشکل ہو گیا۔ مزید سنئے! ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں:

''نصیحتے کہ باخوی خواجہ محمد گدا نمودہ می آید بعد تصحیح عقائد کلامیہ و بعد اتیان احکام فقہیہ، دوام ذکر الٰہی ست جل سلطانہ، بر نہجے کہ یاد گرفتہ اند، باید کہ ذکر آں قدر استیلا یابد کہ غیر مذکور در باطن نگذارد و تعلق علمی وحبی را از ماسوائے مذکورہ زائل گرداند، ایں زماں قلب را نسیانے از ماسوا حاصل گردد، از دید و دانش غیر فارغ شود، کہ اگر بہ تکلف وتعمل اشیاء را بوے یاد دہند، یاد نہ کند ونشناسد ہموارہ مستغرق، مستہلک مطلوب بود، چوں معاملہ تا بایںجا رسد یک گام دریں راہ زدہ باشد، سعی نمایند کہ از یک گام کوتہی نکنند وبدید و دانش غیر گرفتار نمانند۔

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد

(مکتوب: ۴۹، دفتر دوم)

ترجمہ: میرے بھائی خواجہ محمد گدا کو نصیحت کی جاتی ہے کہ عقائد کی تصحیح اور احکام فقہیہ کی تعمیل کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت کریں، اسی طریقہ پر جو انھوں نے یہاں سیکھا اور یاد کیا ہے، ذکر کا اتنا تسلط ہونا چاہئے کہ مذکور کے علاوہ دل میں کسی اور کو نہ چھوڑے، مذکور کے ماسوا ہر چیز سے علمی اور حبی تعلق ختم کر دے، اس وقت قلب کو ماسوا سے نسیان حاصل ہو جاتا ہے، اور دوسروں کی دید و دانش سے فارغ ہو جاتا ہے، کہ اگر بتکلف بھی وہ اشیاء یاد دلائی جائیں، تو یاد نہ آئیں، ہمہ وقت مطلوب ومقصود میں فنا اور مستغرق رہے، جب معاملہ یہاں تک پہونچ جائے، تو (سمجھنا چاہئے کہ) بس

ایک قدم ابھی اس راہ میں چلا ہے، کوشش درکار ہے، اس ایک قدم کے رکھنے میں
کوتاہی نہ ہو، اور غیر کی دید و دانش میں گرفتار نہ ہو۔

توفیق و سعادت کی گیند سامنے موجود ہے، شہ سواروں کو کیا ہوا کہ میدان میں نہیں
اترتے۔

آج کس کو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے، کہ دل جب ذکر میں منہمک ہوتا ہے، ایسی ذات کے ذکر میں جس پر ایمان محض غیبی راہ سے ہے۔ اسی کے ذکر میں جب ڈوبتا ہے، تو اتنا ڈوبتا ہے کہ اس کے علاوہ سے تعلق جبی تو درکنار اس کے ساتھ علم ودانش کا تعلق بھی باقی نہیں رہتا۔ ماسوا کو ایسا بھولتا ہے، اس درجہ فراموش کرتا ہے کہ یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا، اگر یہ کیفیت کسی کو حاصل ہوگئی تو اس راہ کا، سمجھنا چاہیے کہ پہلا قدم رکھا ہے، اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے۔ بس ایک قدم اور رکھنا چاہیے، اور اس میں آدمی کو کوتاہی نہ کرنی چاہیے، بتائیے! کس کو یقین آئے گا کہ آدمی کو یہ مقام بھی حاصل ہوسکتا ہے، لیکن سچ ہے اور بالکل سچ ہے۔ آج نمونے اور مثالیں نہیں ہیں، اس لئے سمجھ میں آنا دشوار ہے، کل تک نمونے تھے، مثالیں تھیں تو ہر شخص نہ صرف یہ کہ سمجھتا تھا...... بلکہ یقین کرتا تھا...... کیونکہ آدمی عقلی نظریات کو رد کرسکتا ہے، لیکن مشاہدات کو کیونکر جھٹلائے گا۔ ہائے کل یہی بات مشاہدہ تھی، آج نظریہ ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ نے شوق وذوق عطا کیا ہے، اور اس قسم کی استعداد بنائی ہو، اس کے قلب میں اپنی محبت و معرفت کی قندیل جلائی ہو، اس کو اس سلسلے میں کوتاہی نہین کرنی چاہیے۔ آج دین، اور دینی اعمال غریب الدیار اور اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن سنئے کہ وہ جن کی زبان پر صدق وراستی کا نزول ہوا تھا،

ان کی زبان صدق ترجمان نے ان اجنبیوں کو بشارت سنائی ہے: **فطوبیٰ للغرباء**، ہم کو اجنبی بننے کی ضرورت ہے، اگر دنیا کی نگاہوں نے ہمیں اجنبی نہ سمجھا، یا اجنبیت میں انھیں کمی محسوس ہوئی تو سمجھ لیجئے کہ اسی کے بقدر ہمارے اندر روحِ دینی کی کمی ہے۔ ہمیں دنیا والوں کے ساتھ سازگاری نہیں کرنی چاہئے، ناسازگاری درکار ہے، جس قدر آدمی اعمالِ دنیاوی میں لگے گا، اسی قدر دنیا سے موافقت حاصل ہوگی، اور اس کی اجنبیت میں کمی ہوتی چلی جائے گی، اور جس قدر اعمالِ دینی میں انہماک رہے گا، اسی مقدار سے دنیا والوں کی نگاہ میں اوپرا اور اجنبی محض ہوتا چلا جائے گا۔ اس معیار پر ہم اپنے کو پرکھ سکتے ہیں، بہر کیف ہمیں اپنے محبوب کی رضاء مقصود ہے، وہ جس راہ سے حاصل ہو، اسے حاصل کرنا چاہئے۔ سر دینا پڑے، عزت وآبرو کی بازی بدنی پڑے، مال ودولت کو آگ لگانی پڑے، اگر اس کی رضاء حاصل ہو تو ہر سودا سستا ہے۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے ترے فکر سے، تری یاد سے ترے نام سے

ہاں اور سنئے! اگر اس راہ پر ہم لوگ محض چل پڑیں، منزل پر پہونچنے کی بات نہیں کرتا، محض قدم اٹھا کر پیش رفت کردیں، محض اتنے ہی سے تمام ''ذہنی الجھاؤ'' سلجھ جائیں گے، پھر فراغت قلبی حاصل ہوجائے گی۔

بس صاحب! اب دوسرے کام کا وقت آگیا، آپ کی چند سطریں آئیں گی، تو پھر کچھ لکھوں گا۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۸؍ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بنـــام

مولانا حافظ محمد مسعود صاحب (امام مسجد رحمت، مدینہ منورہ شریف)

پاکستان کے رہنے والے، عرصہ سے جوارِ رسول ﷺ میں قیام کا شرف رکھنے والے، سراپا اخلاص، پیکر محبت، بے عذر صاحب خدمت، علم و عمل کے جامع، خوش مزاج، صاحب سوز و گداز ایک بہترین انسان اور بہترین مسلمان! ۱۹۸۹ء میں جب پہلی مرتبہ مدینہ طیبہ کی حاضری کا شرف حاصل ہوا تو میرے عزیز دوست مولانا حکیم الدین صاحب کے واسطے سے حافظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کی محبت دل نشیں ہوگئی اور ان کی طرف سے بھی وہ برتاؤ ہوا کہ مجھے اپنی محبت ہیچ معلوم ہونے لگی۔ ان سے اب تک وہی تعلق اور محبت برقرار ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ خط لکھنے کی نوبت کم ہی آئی، لیکن حاضریٔ مدینہ اور ٹیلیفون کے واسطہ سے برابر رابطہ قائم رہتا ہے۔ وہ اکثر اس گناہ گار کا سلام اور درخواستِ دعا حضور رسالتماب ﷺ کے دربارِ گہر بار میں پیش فرماتے رہتے ہیں۔

مخدومی ومکرمی! زیدمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج سویرے برادرمحترم مولوی حکیم الدین صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ شمیم صاحب آئے ہوئے ہیں، کل ہی مدینہ طیبہ واپس ہوں گے، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ سے مخاطب ہونے کی سعادت ملی۔ ''الاسلام'' اور ''ضیاء الاسلام'' کے شمارے بھیج رہا ہوں، وہ آپ سے میرے لئے، ادارے کے لئے حصولِ دعا کے سبب ہوں گے۔ انشاءاللہ

اللہ تعالیٰ آپ کے سعادات وحسنات میں اضافہ فرمائے، آپ کو سوچتا ہوں اور دیارِ حبیب (ﷺ) میں ہونے کو سوچتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ میری مٹی تو وہ نہیں ہے جو اس خاکِ پاک تک پہونچ سکے، نہ اپنے اندر اس کی ہمت پاتا ہوں اور نہ صلاحیت، لیکن خوش ہوتا ہوں کہ مجھ سے قلبی محبت رکھنے والی ایک ذات وہاں موجود ہے، جس کی دعاؤں کا حصہ ادھر بھی آتا رہتا ہے، اور نازاں ہوں کہ الحمد للہ مجھے اس سے محبت کا فخر حاصل ہے۔ میں کیا عرض کروں، یہ حروف لکھ رہا ہوں، اور دل دھڑک رہا ہے، آنکھیں آنسو بہانے کیلئے بے تاب ہیں، لیکن طلبہ کی جماعت سبق کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے، اس لئے ضبط کا پہرہ لگا رکھا ہے، کاش میرے دل کی دھڑکنیں اور دل کی بے تابیاں اس رحمت بے کراں کے دربار میں آپ پہونچا دیتے کہ آپ کا امتی ہے، گو گناہوں سے لت پت ہے، لیکن آپ کو یاد کرتا رہتا ہے، آپ کی تعلیم وارشاد کو سینے سے لگائے رہنا چاہتا ہے، آپ سے بے تابانہ محبت رکھتا ہے، اور اسی محبت پر جینا اور مرنا چاہتا ہے، قریب آنے کا ......ظاہری طور پر قریب آنے کا ...... نہ سامان رکھتا ہے، نہ حوصلہ پاتا ہے، لیکن جسمانی دوری، روحانی قرب کی راہ میں شاید حائل نہیں ہے، دیکھتا

ہوں، اور بار بار دیکھتا ہوں، ان کی چشم وابرو کے اشاروں کو دیکھتا ہوں، سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، تعمیل ارشاد کا شوق رکھتا ہوں، بس قصورِ ہمت اور ضعف عزم کی وجہ سے گرگر جاتا ہوں۔ کاہل ہوں اور کاہلی ہی کے راستے سے پہونچنا چاہتا ہوں، اللہ جانے کیا انجام ہو۔ آپ ان سے بصد ادب واحترام سلام عرض کیجئے، اور کہنے والے جو چاہے کہتے رہیں، انھیں کہنے دیجئے، آپ اس دربار میں دعاء کی درخواست پیش کردیجئے کہ ایک غلام جو ظاہر کے اعتبار سے بھی، اور باطن کے اعتبار سے بھی، ہر لحاظ سے نجس ہے، بلکہ نجاست ہے، طہارت کا شوق رکھتا ہے، ان کی رحمت متوجہ ہو، اور رحمٰن ورحیم کی رحمت ان کے واسطے سے چشم التفات اِدھر کردے تو چشم زدن میں پاک ہوسکتا ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

(وہ لوگ جو ایک ہی نگاہ سے مٹی کو سونا بنادیتے ہیں، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا گوشۂ چشم ہماری جانب کردیتے)

ان کی نظر سے نہ جانے مٹی کے کتنے تودے سونا اور ہیرا بن چکے ہیں، اور بنتے ہی جارہے ہیں، اگر اس دور، بہت دور پڑے ہوئے غلام پر ان کی نظر! نہیں گوشۂ چشم پڑجائے تو کیا یہ مٹی کچھ نہ بنے گی۔ ہائے، مٹی کے اندر کیمیا بننے کی استعداد ہوتی ہے، تو وہ سونا بن جاتی ہے، اللہ جانے میری مٹی میں کوئی استعداد ہے بھی یا نہیں؟

خیر آپ ان خیالاتِ پریشاں سے قطع نظر کیجئے، اور عرضی تو گزار ہی دیجئے۔ آگے ان کی دعا ہے، پروردگار کا تصرف ہے، اور اس غلام کی طرف سے انتظار ہے۔

ہاں حاجی بابو کہہ رہے تھے کہ ”حق چار یار“ یہاں بھیجنے کا انتظام کریں، انتظار رہتا ہے، اور ملتا نہیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۲۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ یکشنبہ

☆☆☆☆☆

بنــــام

مولانا انتخاب عالم صاحب امام جامع مسجد اعظم گڈھ

دار العلوم دیوبند کے فاضل، جامع مسجد اعظم گڈھ کے امام وخطیب، مدرسہ تعلیم الاسلام اعظم گڈھ کے ناظم اور روح رواں، نہایت صالح، فہیم اور باصلاحیت عالم دین! یہ خط ان کو ان کے نومولود فرزند محمد رحمت اللہ کی وفات پر لکھا گیا، امام صاحب کے یکے بعد دیگرے پانچ بچے ہفتہ عشرہ زندہ رہ کر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، اور یہ غالباً چھٹا بچہ تھا، اس کی وجہ سے ان پر بے حد اثر تھا، اسی کی تعزیت میں یہ سطریں لکھی گئیں۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

برادرِعزیز! عافاکم اللہ ورزقکم صبراً جمیلاً وآتاکم أجراً جزیلاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں سے میرے دل ودماغ پر ''محمد رحمت اللہ'' چھایا ہوا تھا، ذہن وقلب سے کسی وقت اس کا تصور ہٹتا نہیں تھا، دل بھی دعاء میں مشغول تھا، زبان بھی دل کی موافقت میں ہلتی رہتی تھی، اس کے پیچھے والدین کا قلب بھی نظر آتا رہتا تھا، امید وبیم کی پرچھائیاں آتی جاتی محسوس ہوتی رہتی تھیں، دل کی دھڑکن کبھی بڑھ جاتی تھی، کبھی سکون کی ٹھنڈی ہوا چل جاتی تھی، میری نگاہِ تصور ان دونوں کیفیات کو تم لوگوں کے دلوں میں مسلسل دیکھ رہی تھی، اور مضطرب ہوہوکر بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتا رہتا تھا کہ یا اللہ! اس بچے کو والدین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنائے رکھئے۔ کبھی لگتا تھا کہ دعا قبول ہورہی ہے، اور کبھی محسوس ہوتا تھا کہ بہت سا اجروثواب لے کر پلٹ رہی ہے، امید وبیم کی پرچھائیاں کبھی نور پھیلاتیں، کبھی اندھیری چادر تانتیں، چوبیس گھنٹے یونہی گذرے، مغرب کے بعد ذکر کرنے بیٹھا، اور ذکر کے بعد بے ساختہ زبان سے دعا نکلی کہ اللہ! آپ مردوں کو زندہ کرتے ہیں، اس روح کو یہیں لوٹا دیجئے، دل میں فون آچکا تھا کہ بچہ کی روح اس کے ننھے بدن کی قید سے آزاد ہوکر آغوشِ رحمت کی وسعتوں میں تیر رہی ہے، کمرہ میں آیا تو عابد نے خبر دی، خبر کیا دی دل میں آئی ہوئی خبر کی تصدیق کی، اب کیا کرتا، رضا بالقضاء کا سبق ایک عرصہ سے دہرا دہرا کر یاد کررہا ہوں، اسی میں مشغول ہوا، اور تمہارے لئے اور تمہاری اہلیہ کے لئے اور سب اہل خاندان کے لئے دعا کرنے لگا، پھر سلیم (پپو) کا فون آیا، آواز رُندھی ہوئی تھی، صدمہ سے چُور، غم میں ڈوبی ہوئی، بس کچھ نہ پوچھو، مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا، مگر جو سبق دہرا رہا تھا دہراتا رہا، لیکن بدن سست ہوگیا، دل کا درد پورے بدن میں پھیل گیا، مشکوٰۃ شریف کا

سبق پڑھا رہا تھا، وہ بھی ادھورا رہ گیا، جب مجھ پر اتنا اثر ہے، تو اللہ ہی جانتا ہے کہ تم پر کتنا اثر ہوگا۔

اچھا درد کی داستان کو یہیں چھوڑو، اور وہاں چلو جہاں سب کو تسلی ملتی ہے، جہاں سے ہمارے ایمان کا دامن وابستہ ہے۔ دیکھو یہ مدینہ شریف کی بستی ہے، جہاں ہر دم رحمت برستی ہے، یہ بزمِ رحمت آراستہ ہے، اس بزم کے ایک رُکن حضرت اُسامہ بن زید ہیں، اسی بزم میں حضرت (ﷺ) کی ایک صاحبزادی قاصد بھیج رہی ہیں کہ میرا ایک ننھا سا بچہ دم توڑ رہا ہے، آپ تشریف لائیں، آپ نے سلام کہلوایا، اور یہ پیغام بھیجا، پیغام کیا ہے، تسلی واطمینان کا سامان ہے۔ فرمایا: **إن لله ما أخذ وله ما أعطیٰ، وکل عنده بأجل مسمیٰ، فلتصبر ولتحتسب**، دیکھو جو کچھ اللہ نے لے لیا وہ بھی انھیں کا تھا، اور جو کچھ انھوں نے دیا وہ بھی انھیں کا ہے، اور ہر چیز کا ان کے نزدیک ایک وقت مقرر ہے، اس لئے صبر کرو اور اجر کی امید رکھو۔ سب سے بڑا پیغمبر، اللہ کا سب سے زیادہ محبوب، اللہ کی چوکھٹ پر سر رکھے صبر واحتساب کی تلقین فرما رہا ہے، اور بجز اس کے چارہ بھی کیا ہے؟ اللہ کا محبوب بھی اللہ کے تصرف کو روک نہیں سکتا، یہاں سر تسلیم خم کرنا ہی عبادت ہے۔

اب چلو حضور (ﷺ) کے ساتھ، حضور کے فرزند دلبند جو بہت عرصے کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور گھر کے چراغ بننے کی ان سے امید تھی، ان سے پہلے جتنے فرزند ہوئے تھے، سب آغوشِ رحمت میں جا چکے تھے، اب یہ آخری شمعِ امید تھی، اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی آغوشِ محبت میں جھلملا جھلملا کر بجھ رہی تھی، آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، اور آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے: **إن العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول إلا ما یرضی ربنا وإنا بفراقک یا**

إبراهيم لمحزونون، آنکھ آنسو بہارہی ہے، دل رنجیدہ ہے لیکن بات ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے رب کو خوش کرے اور اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی سے محزون وملول ہیں۔

اور سنو! آپ فرمارہے ہیں، شاید تمہارے ہی لئے فرمارہے ہیں، بیشک حضور کا فرمان ساری امت کے لئے ہے، جو بھی مبتلا ہو، سب کے لئے یہ فرمان ہے، بس یہ فرمان انتخاب کے لئے بھی ہے، ان کی اہلیہ کے لئے بھی ہے، اور ان کے خاندان کے لئے بھی ہے، فرماتے ہیں:

> ’’جب کسی بندے کا بیٹا مرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں، تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کرلی؟ وہ عرض کرتے ہیں جی! فرماتے ہیں اس کے میوۂ دل کو تم نے لے لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں جی! پھر پوچھتے ہیں، اچھا میرے بندے نے کیا کہا؟ عرض کرتے ہیں آپ کی حمد کی اور إنا للہ پڑھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کیلئے جنت میں ایک گھر تعمیر کرو اور اس کا نام ’’بیت الحمد‘‘ رکھو!‘‘

اللہ اکبر! کتنی بڑی بات ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے صدمے کا کتنا لحاظ فرماتے ہیں، سب کچھ جانتے ہیں، مگر ایک مرتبہ نہیں تین تین مرتبہ پوچھتے ہیں، اور میرا بندہ کہہ کہہ کر پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کے بیٹے کی روح تم نے نکال لی؟ میرے بندے کے ثمرۂ قلب کو تم نے لے لیا؟ اچھا تو اس نے اس پر کیا کہا؟ شاید یہ کہنا چاہتے ہوں کہ میری شکایت تو نہیں کی؟ فرشتے کہتے ہیں! نہیں وہ ناراض کیا ہوتا، شکایت کیا کرتا، وہ تو آپ کی تعریف کررہا تھا، آپ کی حمد بیان کررہا تھا، اور آپ پر ایمان کو تازہ کررہا تھا، اور اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا کہ ہم بھی وہیں جانے والے ہیں، جہاں بچہ پہونچ چکا ہے۔

اور بھائی! حضور نے تو تین ہی بچوں کے جانے پر بڑی فضیلت سنائی ہے، اور تمہارے تو پانچ پانچ بچے جا چکے ہیں، آخرت کتنی آسان کردی ہے اللہ تعالیٰ نے! اور اب مجھے امید ہے کہ دنیا کے اس زخم پر بھی راحت کا مرہم رکھا جائے گا، اللہ کی ذات امیدوں کا مرکز ومرجع ہے، وہاں سے آس کبھی نہیں ٹوٹتی، امید لگائے رکھو، دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، آزمائش زیادہ ہوئی ہے، تو رُتبے بھی سوا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کیا کیا حکمتیں اور کیا کیا رحمتیں ان ظاہری آزمائشوں میں پنہاں ہیں۔

تم تو خوب جانتے ہو، میرے کہنے کی حاجت نہیں، ہاں اپنی اہلیہ کی تسلی کا سامان کرو، وہ کمزور بھی ہے اور ظاہر ہے کہ کم علم بھی ہوگی، ہاں اگر ایمان مضبوط ہو تو وہ خود ہی سمجھالے گا۔

میں نہیں آسکا، غمزدہ کا سامنا کیسے کروں؟ تاب وتواں نہیں پاتا، یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں بھیج رہا ہوں اور دعا کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اپنی رضا پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ **ولا نقول إلا ما يرضى ربنا وهو أن تقول إنا لله وإنا إليه راجعون ، أللهم اجرنا في مصيبتنا واخلف لنا خيراً منها يا أرحم الراحمين۔**

محزون وملول
اعجاز احمد اعظمی
۲۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆

بنام الحاج محفوظ الرحمٰن صاحب

عم مکرم الحاج محفوظ الرحمٰن صاحب میرے چھوٹے دادا جناب حاجی عباد اللہ صاحب ے صاحبزادے ہیں، ہمارے گھر کے دیگر افراد کی طرح یہ بھی حضرت مولانا مدظلہ سے نہایت مخلصانہ وعقیدتمندانہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خط دادا جان کے انتقال پر ان کو لکھا گیا، دادا جان مرحوم نہایت نیک وصالح اور پابند شریعت انسان تھے، ان کی موت بڑی قابل رشک تھی، ۲۶/فروری ۱۹۸۶ء کو ظہر کی نماز کیلئے وضو کر کے مسجد کیلئے نکلے، ابھی راستے ہی میں تھے کہ پیغام اجل آپہونچا، اور عین تیاری کی حالت میں جان جاں آفریں کے حوالے کردی، باری تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ آمین (ضیاء الحق خیرآبادی)

برادرِ عزیز! **عافاکم اللہ من جمیع الاحزان**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

برادرم! جو صدمہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو بالخصوص والدۂ مکرمہ کو پہونچا ہے، وہ اس لحاظ سے یقیناً بہت اہم ہے کہ سرپرست کا سایہ سر سے اٹھ گیا، بڑوں کی ذات سے جو فوائد متعلق ہوتے ہیں ان کا خاتمہ ہو گیا، کتنی ذمہ داریاں ایسی ہیں جن سے بے فکری رہا کرتی تھی، اب ان کا بار بھی پسماندگان ہی پر آپڑا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن کی محبت قلب کے ہر گوشے میں سمائی تھی اب وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں، اور ایسے اوجھل ہیں کہ ملاقات کرنی اب اس دنیا میں ناممکن ہے، اور یہ صدمہ اپنی شدت کے لحاظ سے اور بڑھ جاتا، جب یہ خیال آتا ہے کہ دردِ فرقت کی یہ کہانی اور غم وحزن کی یہ داستان اچانک شروع ہوئی اور اسی آن ختم ہو گئی، نہ ایسا ہوا کہ عرصہ تک موت وحیات کی کشمکش ہوتی، خدمت، دوا علاج اور تیمارداری کے مرحلوں سے گزرتے، یاس وامید کے اتار چڑھاؤ میں مبتلا ہوتے، چراغِ زندگی مدھم ہوتا، بھڑکتا، پھر گل ہوتا، ایسا کچھ نہیں ہوا، بس آنکھ بند ہوئی اور نصف صدی سے زیادہ کی زندگی افسانہ بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی ناگہانی موت اولادوں کو، اعزہ واقرباء کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، ہر ایک ہکا بکا ہو کر رہ جاتا ہے، لوگوں کو یقین نہیں آتا، اور عرصہ تک یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو گیا؟ لیکن خیال تو کیجئے، یہ سب کچھ اچانک ہوا، جب اس کا خیال تک نہ تھا، اس وقت ہوا، لیکن کیا یہ واقعہ غیر متوقع اور انہونا ہوا؟ نہیں یہ تو ہونے والی بات تھی، ہر ایک کی پیدائش ہی اس کی موت کا اعلان ہے، بلکہ حاصل زندگی جو کچھ ہے، وہ موت ہی ہے، دیر سویر ہر ایک کو یہ گھاٹی عبور کرنی ہے، اللہ تعالیٰ نے جب حیات کو پیدا فرمایا تو اسی کے ساتھ موت کو بھی پیدا فرمایا: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ

وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً ، وہی ذات گرامی ہے، جس نے موت وحیات کو پیدا فرمایا تا کہ یہ آزمالے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون شخص بہتر ہے۔

دنیا کے اس پورے کارخانے میں دو ہی عمل ہو رہے ہیں، اور باقی سب کچھ ان کے متعلقات اور لواحقات ہیں، ایک پیدا ہونا، دوسرے مرجانا، پیدا ہونا تمہید ہے اور مرجانا تکمیل ہے، جب تمہید مرتب ہوگئی تو تکمیل بھی ناگزیر ہے، یہ دنیا کی رِیت ہے، خواہ کسی کو رنج ہو یا کوئی صبر کرے، لیکن حق تعالیٰ کی اپنے بندوں ......مومن بندوں ...... پر خاص نظر عنایت ہے، یہ ہے تو ایک فطری اور طبعی عمل، بلکہ ایک ناگزیر ضرورت! اس سے خواہ کسی کے اوپر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے، لیکن کسی انسان کے رنج واندوہ سے متاثر ہوکر اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں بدلا جاسکتا، حق تو یہ تھا کہ جو کچھ ہونا ہوتا، وہ ہوجاتا، لیکن قربان جایئے رحمت خداوندی کے کہ اس نے وجود کو بھی انسان کے لئے نعمت بنایا اور موت کو بھی رحمت بنایا، مومن کے اوپر حق تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ پیش آجائے تلاش کریں گے تو اس میں رحمتِ حق ضرور ہوگی، سب سے بڑی قیامت جو اس دنیا میں کسی مومن کو پیش آسکتی تھی وہ جناب رسول اللہ ﷺ کی رحلت کا سانحہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے اس سانحہ کو بھی رحمت قرار دیا ہے، پھر اور لوگوں کی موت وحیات کے قصوں میں یقیناً رحمت پروردگار کی کارفرمائی ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ ایک حدیث سنئے!

> حضرت صہیب رومی ؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کا معاملہ عجیب ہے، اس کے ساتھ جو کچھ پیش آجائے، سب میں خیر ہے، اور یہ بات بجز مومن کے اور کسی کو حاصل نہیں، اگر اس کو خوشحالی اور مسرت نصیب ہو تو شکر کرتا ہے، پس یہ اس کے حق میں بہتر ہے، اور اگر بدحالی اور رنج سے دوچار ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے، پس یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ (مسلم شریف)

ایک اور حدیث سنئے !

> ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حق تعالی جب کسی بندہ کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں اور وہ اس سے گھبراتا اور پریشان ہوتا ہے تو اس بلا کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں، اور اس کے لئے اس کو طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں، ہاں شرط یہ ہے کہ وہ اس مصیبت کو غیر اللہ کی طرف سے نہ سمجھے، اور نہ اس کے دور ہونے کے سلسلے میں غیر اللہ سے حاجت روائی کا طالب ہو، (ترغیب و ترہیب)

یہ مومن کا حال ہے، نعمت و راحت ہو یا مصیبت و کلفت، مومن ہر رنگ میں خدا کی مہربانی کا مشاہدہ کرتا ہے، پھر یہ بھی دیکھئے کہ جن لوگوں نے مصائب پر صبر کیا، ان کو خدا کی طرف سے سمجھ کر صرف خدا ہی کے لئے جھیل گئے، کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے، ان کے سلسلے میں حق تعالی کیا ارشاد فرماتے ہیں اور خدا سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ :

> وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُوْلٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ، اور صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دو (کون صبر کرنے والے) وہ لوگ جن کو جب کوئی مصیبت پہونچتی ہے تو یہ کہتے ہیں (ایمان اور اعتقاد سے کہتے ہیں) کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں (یعنی اس کے بندے اور غلام ہیں) اور ہم کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے رب کی جانب سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہ لوگ ہدایت یاب ہیں۔

سنتے ہیں! یہ بشارت، یہ مہربانیاں، یہ رحمت، یہ ہدایت یابی کا اعلان کس بنا پر ہے؟ صرف اس بنا پر کہ انھوں نے اپنے اللہ کی بھیجی ہوئی مصیبت پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور صبر و ضبط کا عمل کیا، اللہ کے ہر تصرف کو اپنے حق میں گوارا کیا، اور دل

سے گوارا کیا، اور پھر اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ ہم سب کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے، مومن کا کام ہی یہ ہے کہ ہر حال میں وہ اپنے مالک ومولیٰ سے راضی رہے، اور دل سے راضی رہے، یہی ایمان کی جان ہے، اسی کے اوپر رحمت کردگار نازل ہوتی ہے۔

والدہ مکرمہ کو خط کا مضمون سنا دیجئے اور اچھی طرح سمجھا دیجئے کہ دل کو مضبوط رکھیں، دنیا میں کسی عورت کو جو بڑا سے بڑا صدمہ پیش آسکتا ہے وہ شوہر کی موت ہے، آل واولاد اور ماں باپ سب کے ہوتے ہوئے بھی اگر شوہر کی رفاقت میسر نہیں ہے تو دنیا بالکل اندھیری اور سونی معلوم ہوتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سہارا دینے والا نہیں، یہ مرحلہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے، عورت کی دنیا اندھیری ہو جاتی ہے، اسی کی رعایت کرتے ہوئے شریعت نے عورت کو شوہر کی وفات پر چار مہینے دس دن سوگ کرنے کی اجازت بلکہ حکم دیا ہے، لیکن دل کو مضبوط رکھنا چاہئے اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ سب کا ساتھ اس دنیا میں عارضی اور ناپائیدار ہے، تمام تعلقات بودے اور کمزور ہیں، اگر کوئی ذات ایسی ہے، جس کا ساتھ ایک لمحے کیلئے بھی چھوٹنے والا نہیں ہے، اور جس کا تعلق کمزور اور بودا نہیں ہے، تو وہ صرف ایک خداوند وحدہٗ لاشریک لہ کی ذاتِ یکتا ہے، شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اب براہ راست خدا کا سایہ سر پر ہے، شوہر کی یاد میں خود کو ہلکان نہ کریں، بلکہ یادِ الٰہی کے اندر وقت گزاریں، جتنا زیادہ سے زیادہ ذکر کرسکیں کریں، اسی سے خود کو بھی تسلی ہوگی، اور شوہر کی روح کو بھی راحت وخوشی ہوگی، پورے عدت کے ایام میں روزانہ کثرت سے کلمہ طیبہ کا وِرد رکھیں، **لاالٰہ الا اللہ** برابر تسبیح لے کر پڑھتی رہیں، اور جب سو مرتبہ پڑھ لیں تو ایک مرتبہ **محمد رسول اللہ** ﷺ کہیں، اور دن بھر میں جتنی مرتبہ پڑھ سکیں پڑھیں، اور بعد نمازِ عشاء پورے کا

ثواب حاجی صاحب کی روح کو بخش دیں، انشاءاللہ بہت نفع ہوگا، اپنا دل بھی مضبوط ہوگا اور ادھر بھی برابر تحفہ پہونچتا رہے گا۔ پریشان ہونے سے اور پریشانی بڑھے گی۔

اور آپ سے کہتا ہوں کہ والد صاحب کے بعد جو کچھ ان کی خدمت کا حق تھا، وہ حصہ بھی اب والدہ ہی کی طرف منتقل کیجئے، ان کی دلجوئی، دلداری پہلے سے بہت بڑھا دیجئے، شوہروں کے انتقال کے بعد عورتوں میں ایک خاص طرح کی حساسیت پیدا ہوجاتی ہے، آپ اور آپ کے بھائی پورے حوصلہ اور ہمت کے ساتھ ان کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کی کوشش کریں، اور آپ کی اہلیہ بھی اس کے لئے پورا اہتمام کریں، والدہ کی رضاجوئی میں دنیا وآخرت کی فلاح ہے۔

ایک بات اور کہوں؟ والد صاحب کی اچانک وفات نے دنیا کی بے ثباتی اور ناکارگی کی ایک بڑی دلیل آنکھوں کے سامنے رکھ دی، وہ تو ماشاء اللہ آخرت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، اور قسمت کی خوبی ہے کہ عین تیاری کی حالت میں دنیا سے گئے، خدا کی ذات سے قوی توقع ہے کہ ان کی مغفرت ضرور ہوچکی ہوگی، لیکن جو لوگ اس دلیل کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے انھیں بہت زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، اب ان کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ مردوں میں آپ کے گھر نماز کی پابندی کرنے والے کتنے ہیں، اگر ہیں تو بہت بہتر خوشی کی بات ہے، اور یہی عین مطلوب ہے، اور اگر نہیں تو خدارا سوچئے کہ کیا ان کے بعد اس گھر سے نماز کا اہتمام ساقط ہوجائے گا، ہرگز نہیں، دینداری کسی دیندار کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہونی چاہئے، ایک جائے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لے، وہ تو اپنا عمل سمیٹ کر لے گئے، اور بعد والوں کو عبرت کی داستان دے گئے کہ ہمارے پیچھے تمہیں بھی آنا ہے، اور آنے کے وقت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، موت اعمالنامہ پر مہر لگا دیتی ہے، ہم اپنی سانس کی گنتی پوری

کر چکے، تمہیں جو موقع میسر ہے اسے بسا غنیمت سمجھو، اور چن لو عمل کے جتنے گوہر چننے ہوں، اب مسجد کی وہ جگہ خالی نہ ہو، جہاں آپ کے والد کھڑے ہوا کرتے تھے، سلسلہ قائم رہے، یہ بہت ضروری بات کہہ رہا ہوں، اسے سرسری نہ سمجھئے گا، بہت زیادہ اہتمام کیجئے، آپ کے اعمالِ صالحہ کا ثواب خود بخود والد مرحوم کو پہونچتا رہے گا۔

ایک بات اور یاد آئی! کہے دیتا ہوں، ہمارے یہاں باپ کے مرنے کے بعد تقسیمِ وراثت کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا، یہ بات شریعت کے نزدیک بہت قبیح ہے، جتنے وارثین ہوں، فرائض نکلوا کر سب کا حصہ متعین کر کے دے دینا چاہئے، تاکہ ملکیت ہر ایک کی علیٰحدہ ہو جائے، پھر جس کا جی چاہے کاروبار و معاملات میں شریک رہے اور جس کا جی چاہے الگ ہو جائے، اور یاد رہے کہ وراثت میں عورتوں اور لڑکیوں کا حصہ بھی متعین ہے، جو لڑکیوں کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا، ان کا حصہ ضرور الگ کر کے دے دینا چاہئے، ورنہ غصب کا گناہ ہمیشہ سر پر رہے گا، لڑکیاں عام طور پر اپنا حصہ لینے سے گھبراتی ہیں، ان کو بتادینا چاہئے کہ شریعت کا دیا ہوا حصہ ہے، رشتہ داری اور قرابت داری کا لحاظ اس کے بعد بھی فرض رہے گا، لڑکیوں کا حصہ نہ دینے کا رواج بہت قبیح ہے، اس کو ختم کرنا چاہئے، اگر آپ لوگ اس کا اہتمام کریں تو بہت بڑا ثواب ہوگا، یہ کام فوراً ہو جانا چاہئے، بعد میں جب وراثت کے مال میں بہت کچھ کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے تو مشکل مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، بس صاحب اسی پر ختم کرتا ہوں، اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام الحاج اختر حسین صاحب غازی پور

غازی پور کے زمانۂ تدریس میں ایک نیک اور صالح نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ سیرت کا نیک ہونا تو بعد میں معلوم ہوا، صورت کا نیک ہونا ملاقات ہوتے ہی ظاہر ہوگیا۔ پھر ملاقاتیں بڑھتی رہیں اور ان کی سیرت کی نیکی کا نقش دل پر جمتا رہا۔ کسی بینک میں ملازم تھے، غازی پور کے مشہور علاقہ کمسار و بار کے رہنے والے، مجھے ان کی کسی چیز پہ اشکال نہ تھا مگر بینک کی ملازمت پر اشکال تھا، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اس اشکال سے متاثر ہوکر انھوں نے بینک کی ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے دو چھوٹے بچے ۱۴/ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ۲/ستمبر ۱۹۹۳ء بروز جمعرات ایک بارجہ کے ٹوٹ جانیکی وجہ سے دب کر مر گئے، اسی سے متاثر ہوکر یہ خط لکھا گیا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

برادرعزیز! **رعاکم اللہ و تولاکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

کل ’’آواز ملک‘‘ میں ایک عجیب دردناک خبر پڑھی، آپ کا نام پڑھا اور پھر پوری عبارت پڑھی، میں بالکل سناٹے میں آگیا، طبیعت دھک سے ہوکر رہ گئی، دل کسی طرح یقین کرنے کیلئے آمادہ نہ تھا، کہ دو معصوم بچوں کی یہ دردناک موت آپ ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اب بھی یہی جی چاہتا ہے کہ وہ ’’اختر حسین‘‘ آپ نہ ہوں، کوئی اور ہو جن سے میرا کوئی ظاہری لگاؤ نہ ہو۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خبر سچی ہے، اس وقت سے اب تک میری طبیعت کو عجیب بے چینی ہے، اندر آگ سی لگی محسوس ہوتی ہے، جمعہ کی نماز میں بہت الحاح و تضرع کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی ہے کہ آپ کو، بچوں کی ماں کو، اور تمام اہل تعلق کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں اور ایمان کی حفاظت فرمائیں۔ یہ ایک ایسا دردناک حادثہ ہے کہ آدمی از جا رفتہ ہو جائے، ہوش وحواس کھو بیٹھے، بارہا تقاضا ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے کہ کسی طرح آپ تک پہونچوں گو کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے پاس پہونچ کر تسلی اور تعزیت کا ایک لفظ بھی نہ کہ سکوں گا، تاہم محبت جوش کر رہی ہے مگر فی الحال ایسی مجبوری ہے کہ اسی خط پر اکتفا کر رہا ہوں۔

جب میرا یہ حال ہے تو آپ پر کیا گزری ہوگی، اور گزر رہی ہوگی، بچوں کی ماں کا کیا حال ہوگا؟ لیکن میرے محترم! جو واقعہ ہونا تھا، وہ تو ہوگیا اسے کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، اور نہ اب ان بچوں کی واپسی کسی کے بس کی بات ہے، حق تعالیٰ مالک حقیقی ہیں، سب چیز انھیں کی ملکیت ہے وہ جیسے چاہیں تصرف کریں، ہم بندے ہیں، غلام

ہیں، ہمارا کام ہے سر جھکانا اور اطاعت کرنا، انھیں کے نام سے تسلی حاصل کرنا، ان کے نام سے بڑی تسلی حاصل ہوتی ہے۔ کل جمعہ بعد میرا وعظ تھا، جمعہ سے پہلے یہ خبر پڑھ چکا تھا۔ ’’اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللہِ أَلَا بِذِکْرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ‘‘ پر وعظ کہنا تھا، پورے وعظ میں آپ ہی کا تصور چھایا رہا، اور دل کانپتا رہا، میں یہی کہہ رہا تھا کہ مومن اللہ کے نام پر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل لیتا ہے، سب سے آخری سہارا اللہ کا نام ہے، اس نام میں وہ برکت ہے کہ جلتا ہوا قلب ٹھنڈا ہو جائے، اسی نام کی بدولت صحابۂ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ کی رحلت کا صدمہ برداشت کرلیا، ورنہ وہ صدمہ ایسا نہ تھا کہ صحابہ جیسے عشاق اور فداکاروں سے برداشت ہوجاتا، اسی نام کی برکت سے حضرت خنساءؓ نے اپنے چار جوان بیٹوں کی شہادت کو سہ لیا تھا اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا، یہی وہ پاک نام ہے جس کے لئے عشاق نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، اسی نام کا اثر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے تیار ہوگئے تھے اور بیٹے کے دل میں بھی یہی نام بسا ہوا تھا کہ انھوں نے بخوشی گردن پر چھری پھروانے کے لئے سر جھکا لیا تھا، آہ!! کتنے کتنے صدمے اور کیسی کیسی تکلیفیں اسی پاک نام کی برکت سے جھیل لی گئیں، میں نے ایک واقعہ بھی سنایا جو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنے مواعظ میں بیان کیا ہے، وہ یہ کہ ایک بزرگ قاری صاحب تھے وہ خود حافظ قرآن تھے اور ان کے سات بیٹے تھے اور سب حافظ قرآن تھے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، تراویح ہو رہی تھی، ایک صاحبزادہ پڑھا رہا تھا، دو ایک رکعت کے بعد تکلیف ہوئی، وہ اجازت لیکر گھر چلا گیا اب دوسرا مصلیٰ پر آیا اس کی بھی طبیعت خراب ہوئی وہ بھی گھر چلا گیا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، اسی طرح یکے بعد دیگرے مصلیٰ پر آتے رہے اور بیمار ہو کر گھر

جاتے رہے، بالآخر باپ نے تراویح پوری کی، رات ہی میں ساتوں بیٹوں نے جان دیدی، صبح کو ساتوں کا جنازہ ایک ساتھ نکلا، قاری صاحب خاموشی کے ساتھ سر جھکائے جنازہ کے ساتھ تھے، لوگوں میں کہرام مچا ہوا تھا مگر یہ خاموش تھے، کسی نے کہہ دیا کہ کتنا سخت دل باپ ہے، سات بیٹوں کا جنازہ جا رہا ہے اور خود ہر قسم کی کیفیت سے خالی ہے، کتنا بے درد تھا وہ شخص جو باپ کے درد کو نہ پہچان سکا، قاری صاحب نے اسے قریب بلایا اور کھنکھار کر تھوکا تو منہ سے تھوک اور بلغم نہیں صرف خون نکلا، فرمایا کہ جگر خون ہو گیا ہے مگر اللہ کا نام اور اللہ کا حکم سب سے بلند ہے، ہم کو ان کی ہر تقدیر پر راضی رہنا اور ہر مصیبت پر صبر کرنا ہے۔ میں یہ واقعہ بیان کر رہا تھا اور آپ کے تصور سے میری آنکھوں میں آنسو چھلک رہا تھا، حاضرین کی آنکھوں پر بھی بار بار رومال پہونچ رہا تھا، میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ ! میرے اختر بھائی اور ان کی اہلیہ کو وہی صبر جمیل عطا فرما جو آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیا تھا، جس سے حضرت ایوب علیہ السلام کو نوازا تھا، جس سے رسول اللہ ﷺ سرفراز ہوئے تھے اور جیسا صبر حضور کے امتی قاری صاحب مذکور نے کیا تھا۔

تاہم جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کچھ لیتے ہیں تو اس سے کہیں بڑھ کر عنایت فرماتے ہیں، صبر کرنیوالوں کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت خاصہ سے نوازا ہے، ارشاد ہے ''انّ اللہ مع الصابرین '' اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے، اور ارشاد ہے '': وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ أُوْلٰئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُوْلٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ '' اے رسول! آپ صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے جو لوگ ایسے ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو بس یہ کہتے ہیں (دل سے بھی اور زبان سے

بھی) کہ ہم اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹیں گے یہی لوگ ہیں کہ ان پر ان کے رب کی جانب سے مہربانیاں ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

دیکھئے کس قدر عنایت ہے صبر کرنے والوں کے حال پر کہ بشارت خدا کی طرف سے لیکن اس کو سنانے کیلئے واسطہ رسول اللہ ﷺ کو بنایا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے حال پر اللہ و رسول دونوں کی خاص توجہ ہے، یہ کتنی بڑی سعادت ہے، یہی وہ عنایتیں ہیں جن کا تصور جب آتا ہے تو آدمی بڑے سے بڑا غم برداشت کر لیتا ہے اور ارشاد ہے "اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ" صبر کرنے والوں کو انکا اجر وثواب بے حساب ملے گا، یہ بے حساب اجر جب جنت کی صورت میں ملے گا تو آدمی تمام رنج وغم بھول جائے گا، اور وہاں تمام بچھڑے ہوئے بھی مل جائیں گے۔

اور سنئے! حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندے کا فرزند مر جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا تم نے میرے بندے کے بچے کی روح نکال لی؟ وہ کہتے ہیں جی! پھر فرماتے ہیں کہ کیا تم اس کے لخت جگر کو لے آئے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں جی پروردگار! اللہ تعالےٰ پوچھتے ہیں میرے بندے نے تب کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی حمد کی اور "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا، اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اسکا نام **بیت الحمد** رکھو،

حضور اکرم ﷺ کے لخت جگر حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہونے لگا تو رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا آپ بھی یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا کہ ابن عوف یہ محبت ہے پھر فرمایا کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، دل غم زدہ ہے لیکن بات ہم وہی کہیں گے جس سے ہمارا پروردگار راضی ہو،

اے ابراہیم! ہم تمہارے فراق میں رنجیدہ ہیں۔

یہ اللہ کے نبی ﷺ کا اسوہ ہے، جب اللہ کے سب سے بڑے پیغمبر کو اس گھاٹی سے گذارا گیا ہے تو ہمارے صبر کے لئے یہی کافی ہے، حضور اکرم ﷺ کے ایک نواسے کا انتقال ہورہا تھا صاحبزادی محترمہ نے رسول اللہ ﷺ کو بلوایا، آپ نے سلام کہلوایا اور فرمایا! جو کچھ اللہ نے لیا وہ اسی کا ہے اور جو کچھ دیا اسی کا ہے اور ہر چیز کا اس کے پاس ایک وقت ہے، اس لئے صبر کرو اور اجر وثواب کی نیت کرو، حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ انصار کی عورتوں سے فرمایا، اگر تم میں سے کسی خاتون کے تین چھوٹے بچے گذر جائیں اور وہ اس میں اللہ سے اجر وثواب کی نیت اور امید کرے تو ضرور جنت میں داخل ہوگی، ایک خاتون نے عرض کیا اگر دو بچے گذرے ہوں یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا دو ہوں جب بھی، اللہ اکبر کیسی عظیم بشارت ہے، اولاد لیکر جنت عطا فرمانے کا وعدہ ہے، اور وہاں وہی اولاد سفارش کرے گی، حق تعالیٰ سے جھگڑ کر اپنے ماں باپ کو بخشوائے گی۔

اور ہاں یہ بھی حدیث میں ہے کہ جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کی شہادت ہوئی تو حضرت ام سلمہؓ کو کمال رنج ہوا، دونوں میں انتہائی محبت تھی، حضرت ابوسلمہؓ یوں بھی بہت سمجھدار اور محبت والے شخص تھے، اور حضور اکرم ﷺ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے، حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے بے حد رنج تھا، پھر مجھے یاد آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ ''إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ '' پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی دعاء کرتا ہے ''اَللّٰهُمَّ اُجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْراً مِّنْهَا ''(اے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر عنایت فرما اور اس سے بہتر چیز مجھے اس کے بدلے میں عطا فرما) تو اللہ

تعالیٰ اس دنیا میں اس کا نعم البدل عطا فرما دیتے ہیں، حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ یہ دعا میں پڑھنے کو تو پڑھتی رہی، مگر دل میں یہ سوچتی بھی رہی کہ ابوسلمہ سے بہتر مجھے کیا کوئی ملے گا؟ لیکن عدت گذرنے کے بعد جب حضور اکرم ﷺ نے نکاح کا پیغام دیا تب میں نے سمجھا کہ واقعی یہ دعاء قبول ہوگئی، یہ تجربہ تو حضور اکرم ﷺ کے زمانے کا ہے اس کے بعد بھی جن جن لوگوں نے اس دعاء کو پڑھا ہے سب کو نفع ہوا ہے، اس کے نفع کا شاہد ایک میں بھی ہوں کئی مرتبہ مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے، آپ خود بھی اسے پڑھیں اہلیہ بھی، اور جب جب یاد آئے یا غم کی شدت ہو اسے پڑھ لیں۔

مصیبت تو بہت سخت ہے مگر اجر وثواب بھی بے حد وحساب ہے ہاں صبر شرط ہے، بعد میں تو صبر آ ہی جائے گا، فی الوقت صبر کرنے کی ضرورت ہے، زبان سے وہی بات ادا ہو جو اللہ کی رضامندی حاصل کرانے والی ہو، دل تو بیشک رنجیدہ ہوگا، آنسو بھی بہیں گے، ان دونوں پر مواخذہ نہیں مگر زبان پر اختیار ہے اسکی بے اعتدالی قابل مواخذہ بھی ہے اسلئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

خط میرا لمبا ہو گیا لیکن اس محبت کو جو آپ کو مجھ سے ہے اور مجھے آپ سے ہے اس کے بغیر آسودگی نہیں ہوتی، اسے آپ بار بار پڑھیے، گھر والوں کو پڑھ کر سنائیے انشاء اللہ تسلی ہوگی۔ میں برابر آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں صبر واستقامت کی، ایمان کی حفاظت کی، دل کی مضبوطی اور تسلیم ورضا کی، حق تعالیٰ کی طرف سے نعم البدل عطا ہونے کی، اور سب سے بڑھ کر صابرین والی بشارت میں شرکت کی، اللہ تعالیٰ قبول کریں، کوشش میں ہوں کہ موقع ملے تو حاضری دوں، اپنی اہلیہ اور دوسرے گھر والوں کو سلام ودعا کہہ دیں۔

فقط والسلام

اعجاز احمد اعظمی / ۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

☆☆☆☆☆

بنام حافظ قاری نسیم الحق صاحب معروفی

حافظ قاری نسیم الحق میرے بہت عزیز دوستوں میں ہیں، میں الہ آباد مدرسہ وصیۃ العلوم میں پڑھاتا تھا، وہیں یہ بھی حفظ کے مدرس ہوکر آئے، پورہ معروف ضلع مئو کے رہنے والے، ایک باصلاحیت اور دیندار شخصیت! صرف حافظ تھے، تجوید کا شوق انھیں مئو لے گیا۔ جامعہ مفتاح العلوم مئو میں تجوید کی تکمیل کی، فراغت کے بعد بمبئی مرغی محلّہ کی مسجد میں امام ہوگئے، اور ساتھ ہی مدرسہ امدادیہ میں مدرس بھی ہوگئے، اب اسی مدرسہ سے متصل جامع مسجد چونا بھٹی میں امامت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں، ایک مرتبہ انھیں کسب معاش کے لئے سعودیہ عربیہ جانے کا خیال ہوگیا تھا، اسی اطلاع پر یہ خط لکھا گیا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

عزیزم حافظ نسیم الحق سلّمہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

پرسوں تمہارا خط ملا، تم نے عرب جانے کی بات لکھی ہے، اس سے مجھے خوشی ہونی چاہئے، لیکن میرا دل رنج وغم میں ڈوب گیا، ایک بمبئی ہی میں تمہارا رہنا مجھے کھلتا تھا، اب اس سے بڑے سمندر میں کود رہے ہو، بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی وجہ سے دین کو کچھ قوت اور دینداری میں کچھ اضافہ ہوسکتا ہے، وہ جب اپنی اپنی صلاحیتوں سے آنکھیں بند کر کے محض دولت اور کسبِ مال کے ساتھ گردش کرنے لگتے ہیں تو میں اپنے رنج پر قابو نہیں پاسکتا، کیا تم اسی لئے رہ گئے ہو کہ صرف اپنے نفس کے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے روپیہ ڈھالنے کی مشین بن جاؤ۔

میں سچ کہتا ہوں کہ عرب بہت مقدس مقام ہے اگر آدمی اپنے دین وایمان کی حفاظت اور اس میں ترقی کی نیت سے جائے! لیکن اس جانے کا طور دوسرا ہوگا، اور بڑی بدنصیبی کی بات ہے ان دینداروں کیلئے جنھیں محض دولت کی ہوس لئے لئے پھرے۔ ؎

سب کو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے

حق تعالیٰ تمہارے دین وایمان کی حفاظت فرمائے، میرے لئے بھی یہی دعا کرو، اس دور میں مال ودولت کی فراوانی کے ساتھ دینداری کا اجتماع بہت مشکل ہوتا ہے، کاش زادِ آخرت کی بھی اتنی فکر ہوتی، جس قدر اہل وعیال کی پرورش کی ہوتی ہے، میں کسب (کمانے) کو ہرگز منع نہیں کرتا، مگر زندگی کا محور ومرکز کسب مال ہی بن جائے یہ بھی ہرگز گوارا نہیں، بس یہ بات ہے، مگر مجذوب کی بڑ کون سنے گا؟ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں بھی جاؤ، تم سے بھی یہی درخواست ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی / ۲۰؍صفر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

باب سوم

تلامذہ اور عزیزوں کے نام

بنام مولانا رفیع الدین صاحب و مولانا منیر الدین صاحب و مولوی ولی محمد صاحب

یہ تینوں طلبہ بھی مجھے جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے زمانۂ تدریس میں ملے۔ قدوری کی جماعت میں شامل تھے، عام طلبہ کی عمر کے لحاظ سے معمر تھے۔ بہار کے ایک پسماندہ ضلع سنتھال پرگنہ (دُمکا) سے آئے تھے، ان میں مولوی رفیع الدین سلّمہٗ اپنے علاقے کے دینی حالات سے بہت فکرمند تھے، انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے علاقہ میں دینی خدمت کے لئے چلوں۔ اس سال تو نہیں، دوسرے سال وہاں جانے کا آغاز ہوا، اور رمضان شریف اور ذی الحجہ میں طویل قیام ہوتا۔

دوسرے سال میرے بعد یہ تینوں بھی مدرسہ دینیہ غازی پور میں آگئے۔ وہاں متوسطات کی تعلیم مجھ سے حاصل کر کے دوسال کیلئے دار العلوم دیوبند گئے۔ مولوی رفیع الدین اور مولوی منیر الدین نے تعلیم کی تکمیل کی، مولوی ولی محمد تکمیل نہ کر سکے۔ فراغت کے بعد تینوں دینی خدمات میں لگے رہے۔ مولوی رفیع الدین اور مولوی ولی محمد کا تعلق میرے ساتھ بغیر انقطاع کے قائم رہا۔ مولوی رفیع الدین صاحب شاہ جنگی شہر بھاگلپور کے مدرسہ میں ناظم تعلیمات ہیں، اور مولوی ولی محمد اپنی جگہ پر امامت اور بچوں کی تعلیم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولوی منیر الدین ایک عرصے سے بنگال میں آسنسول کے قریب کسی جگہ مصروفِ خدمت ہیں، ان سے رابطہ نہیں رہا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

عزیزان من رفیع الدین، منیر الدین، عبد الحق وولی محمد

سلمکم اللہ تعالیٰ وزادکم علماً وفضلاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ اچھے ہو گے، عرصہ سے خط لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن امروز وفردا میں وقت کا کارواں آگے بڑھتا چلا گیا، پھر میں بنارس پہونچا، ملاقات ہوئی مگر اس ملاقات سے کیا حاصل جس میں نہ تم کچھ حالات بتا سکے اور نہ میں حدیثِ دردِ دل سنا سکا، اس بنا پر خط لکھنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

میری عین خواہش اور دعا یہی رہی ہے کہ تم لوگ سچے طالب علم بن کر حصول علم میں کوشاں رہو، علم صرف ذہانت وذکاوت ہی سے نہیں ملتا ممکن ہے دنیا کا علم اسی طرح حاصل ہوتا ہو لیکن جس کو میں علم کہتا ہوں اس کا حساب وکتاب اور ہے، یہ ضرور ہے کہ ذہانت ممد ومعاون ہے، اس سے راہِ علم میں سلوک کی سہولت ہوتی ہے، تاہم اس کی حیثیت اَساسی اور بنیادی نہیں ہے، دین کا علم زیادہ تر خلوص نیت، عزم وعمل اور مسلسل محنت وکاوش سے حاصل ہوتا ہے، ہم نے بہت سے ذہین دیکھے ہیں جو درمیان میں گر پڑ کے ختم ہو گئے، وہ نہ تو اپنے علم سے خود فائدہ اٹھا سکے، اور نہ ہی دوسروں کو کچھ دے سکے، اور بہت سے غبی، کند ذہن جن کو حصول علم کے زمانہ میں اساتذہ کے نزدیک بالکل وقعت حاصل نہ تھی، وہ اپنے اپنے دور کے شمس العلماء بنے۔

آج ضرورت بہت زیادہ ذہین علماء کی نہیں، ایسوں کی ضرورت ہے جن کے پاس علم کے ساتھ فراست ایمانی بھی ہو، اور یہ فراست حاصل ہوگی تصحیح نیت سے۔

میرے عزیزو! مجھے اس وقت سخت تکلیف ہوتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ عربی پڑھنے والا طالب علم کسی سرکاری ملازمت کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، یا وہاں چلا گیا ہے،

میرے نزدیک یہ چیز غلط نہیں ہے، بلکہ میں اس کو محمود سمجھوں اگر یہ اس نیت سے کیا جائے کہ سرکاری اداروں میں ہمیں دین کی خدمت کے جو مواقع میسر ہوں گے ان سے دریغ نہ کریں گے، بلکہ سچے دین کی سچی خدمت میں مصروفِ کار رہیں گے۔ پھر یہی کام ذخیرۂ آخرت بن جائے گا مگر تم جاننے والوں کے احوال کو پرکھو، جانچو، دیکھو کتنوں کی نیت یہ رہتی ہے اور کتنے اس قسم کا اقدام کرتے ہیں، تو کیا ایک مسلمان ذی علم کے سامنے حصولِ زر کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے، کیا وہ اسی لئے علم دین حاصل کر رہا ہے کہ اس کے عوض میں معمولی متاع دنیا خریدے گا، اگر یہی ہے تو پھر اس میں علمائے یہود میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے، جن کی مذمت قرآن میں تم پڑھ چکے ہو۔ **إشتروا بآيات الله ثمناً قليلاً**

درحقیقت یہ اس دور کا ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں زمانے کی باگ ڈور ہونی چاہئے تھی وہ مذہب کی قبا تار تار کر کے اس کی دھجیاں فروخت کر رہے ہیں۔ **فوا أسفاه** دل جلتا ہے، طبیعت سلگتی ہے لیکن کون جانے دل کا حال!

میرے عزیزو! یہ سچ ہے کہ معاش کا بحران انسان کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، ہر شخص پیٹ کا نعرہ لگا رہا ہے، معاشرہ حصولِ معاش کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان اس طرح پس رہا ہے کہ اس کو اپنے دین وایمان کا ہوش ہی باقی نہ رہا، یہ مسئلہ اگر صرف ان تک محدود ہوتا جو خدا کی لامحدود قوت پر ایمان نہیں رکھتے تو چنداں قابل تعجب نہ ہوتا کہ ان کا دستور فطرت یہی ہے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس آتش سوزاں میں وہ لوگ بھی دھڑ ادھڑ اپنا خرمن ایمان ویقین پھینک پھینک کر جلا رہے ہیں جن کو خدا کی عظیم قوتوں پر بھروسہ کا دعویٰ ہے۔ اس مصیبت کو کس سے کہوں کہ گھر کا سرمایہ لٹ رہا ہے، تجوریوں پر ڈاکہ پڑ رہا ہے، جائیداد برباد ہو رہی ہے اور

ہم برتنوں، سوئی دھاگوں کی حفاظت کی فکر کررہے ہیں، یہ کس درجہ غم واندوہ کی بات ہے، یہ تو یقین ہے کہ جواللہ طوفان کے ہیجان خیز تھپیڑوں میں سے ایک شیرخوار بچے کو نکال لے جانے والا ہے وہ اپنے ملت ومذہب کو بچالے گا، مگر سوچو ہمارا تمہارا کیا حشر ہوگا، کس کو ہم منہ دکھاسکیں گے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حصول علم سے نیت وعزم محض خدمت دین ہونی چاہئے یقین کا سرمایہ ساتھ رکھو، حطامِ دنیا تو جوتیوں میں آکر پڑی رہے گی، تم لوگ جس علاقے کے رہنے والے ہو جہاں تک میرا اندازہ ہے اس میں خالص مجاہد قسم کے علماء کی حاجت ہے اور تم لوگ ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہو، اس لئے ہر قسم کی دنیاوی آلائش سے پاک ہوکر تحصیل علم کی ضرورت ہے، میری بڑی تمنا یہ ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو دین پر قربان ہوتا ہوا دیکھوں، اس سلسلے میں ہر طرح کی مدد وتعاون کے لئے تیار ہوں، انشاءاللہ آخر دم تک تم لوگ مجھے اپنا رفیق پاؤ گے۔

عزیزانِ من! کیا بتاؤں امیدوں کے سہارا آج کے نوجوان طلباء ہی ہیں، لیکن جگر کٹ کر ٹکڑے ہوجاتا ہے جب ان کا رُخ دین مصطفیٰ سے پھرا ہوا دیکھتا ہوں، امید ہے کہ تم لوگ میرے درد کو سمجھو گے، حصول کامیابی کے لئے کوشاں رہو اور سب کچھ دینے والے سے مانگتے رہو، اس دروازے سے مانگنے والوں کو واپس نہیں کیا جاتا، ہاں یہ بتاؤ بقرعید کے موقع پر گھر جانے کا ارادہ ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس کا، جواب کا منتظر ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۶؍۱۲؍۱۹۷۳ء

☆☆☆☆☆

عزیزانِ گرامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فرصت نہ ہونے کی وجہ سے تینوں کو ایک ہی کارڈ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ بعافیت ہوگے، میں الحمد للہ بخیریت تمام میسور پہونچ گیا، یہاں لوگوں میں کافی طلب ہے، یہیں ٹھہر جانے پر اصرار ہو رہا ہے، لیکن میں کون ہوتا ہوں فیصلہ کرنے والا، قدرت نے جو کچھ لکھا ہوگا اس کے ظہور کا منتظر ہوں، انشاء اللہ رمضان میں یا اس کے بعد گھر آجاؤں گا، مدرسہ کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو بخل نہ کرنا، اپنے والدین سے سلام کہو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۶/ اکتوبر ۱۹۷۳ء

☆☆☆☆☆

عزیزم مولوی ولی محمد ڈُمکوی سلّمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، بہت مسرت ہوئی، کبھی کبھی لکھتے رہا کرو، یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، مزید دعا گوئی کی توفیق ملتی ہے، کچھ کام کی باتیں ذہن میں آجاتی ہیں تو لکھ دی جاتی ہیں، تعلق میں کمی نہیں آنے پاتی۔

والد صاحب کی عمر کا آخری مرحلہ ہے، ظاہر ہے کہ کمزوری بڑھتی ہی جائے گی، اس وقت جتنی خدمت کرلو گے اس کا اجر بے حد وحساب ہے، اسی وقت میں اولاد کی ضرورت ہوتی ہے، جب تم کمزور تھے، انھوں نے خدمت کی، اب وہ کمزور ہیں تو تم خدمت کرو، ان کی خدمت دنیا میں رزق اور عمر میں برکت کا باعث ہے، اور آخرت میں پروردگار کی رضا وخوشنودی کا سبب ہے، اس لئے بغیر کسی ملال اور

اکتاہٹ کے آخری حد تک ان کی خدمت کو اپنا فرض سمجھو، اور ہر قیمت پر انھیں راضی رکھنے کی کوشش کرو، اللہ توفیق دینے والے ہیں، دعا میں برابر کرتا ہوں۔

ذکر کی مشغولیت سے بہت مسرت ہوئی، ہاں ضرور! روزانہ ایک وقت تھوڑی دیر ہی کے لئے سہی فارغ کر کے یکسوئی کے ساتھ یہ تصور کر کے کہ حق تعالیٰ کی بارگاہِ عالم پناہ میں حاضر ہوں، عرشِ الٰہی میرے سامنے ہے، اور خدا کی عنایت میری جانب متوجہ ہے، یہ خیال کر کے ذکر کرو، اور کوشش کرو کہ اخیر ذکر تک یہی خیال قائم رہے، اگر ذہن منتشر ہو جائے تو پھر حاضر کر لو، کوشش کرو کہ یہ تصور جم جائے، اس طرح انشاء اللہ ذکر بہت مفید اور لذیذ ہوگا۔ اور نماز پڑھتے وقت یہ دھیان کرو کہ میں کعبہ مقدسہ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں، اور کعبہ کے اندر سے نور کی لہریں نکل کر میرے اندر پیوست ہو رہی ہیں، اس سے نماز میں دلجمعی پیدا ہوگی اور شوق زیادہ ہوگا۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھو، دنیا و آخرت میں مفید ہوگا۔ پردھان سے کہہ دو کہ مسجد کی بنیاد پڑ جانے سے مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کی تکمیل کی دعا کر رہا ہوں، اس کے آباد رکھنے کی فکر کریں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

مولوی ولی محمد دملوی کے نام

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارے خط کا مجھے انتظار تھا۔ الحمد للہ کہ انتظار کے مطابق خط آیا۔

عزیزم! دنیا میں سب سے بڑا حق خدا کا ہے وہی خالق و مالک ہے، ہمارا

پورا وجود، بلکہ ساری کائنات اسی کے احسان ورحمت کا کرشمہ ہے، اگر اس کی رحمت پل بھر بھی نگاہ پھیر لے تو یہ ساری کائنات اچانک معدوم ہوکر رہ جائے، وہ اپنے کرم سے ہر وقت اور ہر آن اس پورے عالم کی نگہبانی فرماتا ہے، آدمی اگر پوری عمر اس کے سامنے سجدہ میں پڑا رہے، اور دل میں ذرا دیر کے لئے بھی کسی دوسرے کا تصور نہ آئے زبان مسلسل اس کی حمد وثنا اور شکرگزاری میں مصروف رہے، جب بھی اس کا کوئی ادنیٰ سا حق بھی ادا نہیں ہوسکتا، اور کون اس کا حق ادا کرسکتا ہے، جبکہ سب عابدوں کے عابد، اور سب شکرگزاروں کے شکرگزار نے خود یہ اقرار کرلیا ہے کہ ہم نہ عبادت کا حق ادا کرسکتے ہیں اور نہ معرفت کا! تو اب بس چارۂ کار یہ ہے کہ اپنی طاقت بھر، اپنے مقدور بھر اس کی یاد میں، اس کے ذکر میں، اس کے فکر میں لگے رہیں، اور دنیا کو جیسے جیسے برتنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح برتتے رہیں، اس کے حکم کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھیں، اس کو کبھی ناراض نہ کریں، اگر اتنا کرنے کے بعد ان کی عنایت متوجہ ہوجائے تو کیا کہنا سبحان اللہ! اور ضرور متوجہ ہوگی، بس اپنی وسعت بھر کوتاہی نہ ہو۔

نماز کی پابندی، نوافل کا اہتمام، تمام حقوق العباد جو اپنے اوپر عائد ہوں، ان کو اچھی طرح عبادت وطاعت سمجھ کر ثواب کی نیت سے ادا کرنا، دل کو کینہ کپٹ، بغض وحسد، دنیا کی محبت، مال ودولت کی لالچ سے پاک وصاف رکھنا، صبر وشکر کا عادی بننا، دل میں خدا اور رسول کی محبت بلکہ عشق رکھنا، یہی سب کام اس دنیا میں کرنے کے ہیں، اگر یہ کام کئے تو زندگی ہر طرح کامیاب ہے، اگر اس میں کوتاہی ہوئی، تو آدمی چاہے دولت میں نہایا ہوا ہو، عزت میں سرمست ہو، کیا فائدہ؟ جبکہ وہ اپنے مالک ومولیٰ ہی کو ناراض کئے ہو، دنیا کے جائز کام، معاش کے مباح طریقے، سب اختیار کرنے درست ہیں، لیکن اس طرح نہیں کہ وہی دھندے اصل اور مستقل بن جائیں، اور یادِ خدا پیچھے

چلی جائے ، ہرگز نہیں ، اس طرح کہ ہر کام اور ہر مشغلہ اللہ کی عبادت وطاعت ، اللہ کے ذکر کے تابع ہو، اگر کسی مشغلہ کی وجہ سے عبادت ترک ہونے کا ڈر ہو تو وہ مشغلہ ہی ترک ، عبادت ترک نہیں ، یہ بہت ضروری اور بنیادی بات ہے، تمام ضروریات کے کفیل حق تعالیٰ ہیں ، ذکر کا اہتمام اور جماعت کا التزام ہمیشہ رکھنا ، اس میں فتور اور سستی نہ آئے ۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۷؍ رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا وسیم احمد بنارسی

میری تدریسی زندگی کا باضابطہ آغاز جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس سے ہوا۔ ہجری سنہ ۱۳۹۲ھ کا آخر تھا، اور غالباً عیسوی سنہ ۱۹۷۲ء کا بھی آخر تھا۔ جامعہ اسلامیہ میں چند طلبہ بہت ہونہار اور صاحب استعداد ملے، جن سے مجھے خاص اُنس ہوا۔ انھیں میں سے ایک مولوی وسیم احمد سلّمہٗ بھی ہیں۔ یہ مدن پورہ بنارس کے رہنے والے کافیہ اور قدوری کی جماعت میں تھے، میں ایک سال وہاں رہ کر مدرسہ دینیہ غازی پور آ گیا، اس وقت ان سے مکاتبت کا آغاز ہوا۔ یہ جامعہ اسلامیہ سے متوسطات کی تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند گئے، وہاں سے فضیلت حاصل کی اور جامعہ اسلامیہ میں استاذ ہوئے، اب وہاں کے صدر المدرسین ہیں۔ ایک سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے نام خطوط سب ان کی طالب علمی کے زمانے کے ہیں جنھیں انھوں نے بہت سنبھال کے رکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتوب نمبر (۱)

عزیزم مولوی وسیم احمد سلمک اللہ تعالیٰ وزادک علماً وفضلاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج تمہارا خط عین انتظار ہی میں ملا، **فجزاک اللہ**، طبیعت بہت خوش ہوئی، سوچ رہا تھا کہ تقریر کی رسید آجائے تو دوبارہ خط لکھوں، مگر آج کل طبیعت ایسی ہے کہ از خود لکھنے کو جی چاہتا ہے، یہ اچھا کیا کہ خط اپنے ساتھیوں کو دکھا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں کی ایک سالہ رفاقت نے مجھ پر کچھ عجیب اثر ڈالا ہے، نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش بار بار کروٹ لیتی ہے کہ تم لوگوں کو علم وعمل کے اچھے منصب پر دیکھوں۔

میرے عزیز! میں کچھ نہ بن سکا، اس لئے اپنوں کو بنتے دیکھ کر خوشی ومسرت چھانے لگتی ہے اور ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے ٹھیس لگتی ہے، اگر کچھ دن ساتھ رکھنا خدا کو اور منظور ہوتا تو اپنی آنکھوں کے سامنے تم لوگوں کو پروان چڑھتے دیکھتا، مگر کیا فرق پڑتا ہے اپنی اولاد اپنی ہی ہوتی ہے خواہ کہیں پرورش ہو، اللہ نے تمہیں شوق دیا ہے، ہمت دی ہے، دل ودماغ دیا ہے، اساتذہ میسر ہیں، کتابیں مہیا ہیں، ماحول ملا ہے، جس قدر محنت کرسکو کرکے علم حاصل کرلو، لوگوں نے اس متاع علم کے لئے دَر دَر کی ٹھوکریں کھائی ہیں، مصائب جھیلے ہیں، مشرق کی طنابیں مغرب سے ملادی ہیں، راتوں کی سرحدیں دنوں سے ملائی ہیں، خونِ جگر جلایا ہے، تب کہیں جا کر کچھ آیا ہے، اب تو بہت ساری سہولتیں فراہم ہیں، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ، سمجھ کر پڑھو، پڑھ کر سمجھانے کی کوشش کرو۔

عزیز من! تحصیل علم کے لئے بنیادی اصول مطالعہ اور ذوقِ مطالعہ ہے، میں نے پہلے بھی مطالعہ پر زور دیا ہے اب بھی دیتا ہوں، کتاب کا مطالعہ اس طرح کرو کہ عبارت حل ہو جائے، پہلے الفاظ اور ان کے معانی پر عبور حاصل کرو، صیغے اور ترکیب یعنی فاعل، مفعول مع اقسامہ، حال، تمیز وغیرہ متعین کرو، اس کے بعد اس کے مطلب پر غور کرو، ہر روز ایک ہی سطر حل کرو لیکن ضرور حل کرو، ہمت ہار کر ہرگز نہ بیٹھو، کسی فن کی کتاب ہو اتنا ضرور کرو، کیونکہ اس کے بغیر پڑھائی لکھائی کا نام تو ہوگا کام نہ ہوگا، اور اس پر قابو ہو گیا تو پھر کوئی کتاب ہو، مطلب از خود حل ہوگا، جن لوگوں نے اس کو سمجھا اور اسی اصول کے مطابق پڑھا، انھیں کہیں دقت نہیں ہوتی، درس کا مطلب معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا، استعداد پیدا کرنی چاہئے، استعداد در حقیقت ہر شخص میں ہوتی ہے، کہنا یہ چاہئے کہ وہ حجاب میں ہوتی ہے طالب علم استاذ کی معاونت سے اس حجاب کو چاک کر دیتا ہے تو استعداد کا نور پھیل جاتا ہے اور اس کی روشنی میں اشیاء نظر آنے لگتی ہیں، بس تو اسی حجاب کو چاک کرنا ہے اور تمہاری یہ درمیانی مدت ہے، ابھی حجاب کچھ زیادہ سخت نہیں ہوا ہے آسانی سے چاک کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد سخت ہو جائے گا اور دشواری ہوگی۔ یہ تو درسیات کا معاملہ تھا۔

لیکن اس سے ذرا بھی کم غیر درسیات کا بھی معاملہ نہیں ہے، بلکہ میرے نزدیک تو اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہے، ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے، علم سے مناسبت بڑھتی ہے، ذوق وشوق میں ترقی ہوتی ہے، قوت بیان پیدا ہوتی ہے، معلوماتی کتابیں پڑھنی چاہئے، خصوصاً تاریخ اسلام پر اچھی دسترس حاصل ہونی چاہئے، صرف تاریخ کا جاننے والا علوم وفنون کی بہت سی اقسام کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے، اسی لئے میں نے ''تاریخ ملت'' (۱) کے گیارہوں

حصے تمہاری انجمن کے لئے منگائے تھے، ان کا مطالعہ کرو۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے بچپن میں مطالعہ کیا تھا، اسی طرح اور نوع بنوع کی کتابیں جو مل سکیں دیکھتے رہنا چاہئے، یہ طالب علم کے لئے مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔

ان سب کے بعد میں اپنی اس آخری بات پر آتا ہوں جس کو میں نے بار بار بیان کیا ہے، مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل نہیں کیا ہے، وہ یہ کہ یہ سارے علوم مقصود بذاتہا نہیں ہیں کہ ساری عمر انھیں کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کردی جائے، بلکہ یہ وسائل ہیں، اصل مقصد شریعت مطہرہ پر صحیح ڈھنگ سے عمل اور اپنے مولیٰ کو راضی کرنا ہے، یہ سارا کاروبار کتابوں کا، مدرسوں کا، اساتذہ وطلباء کا، اسی لئے پھیلایا گیا ہے کہ اسلام پر صحت کے ساتھ عمل کرنے والے پیدا ہوتے رہیں، اگر یہ نہیں ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا، اخلاق درست ہوں، عبادات درست ہوں، معاملات ٹھیک ہوں، جب خدا کی رضامندی حاصل ہوگی، اور اس کے حصول کا زمانہ پڑھنے کے بعد نہیں آئے گا، یہی وقت ہے جس میں اپنے احوال ٹھیک کئے جاسکتے ہیں، آج جس چیز کو لوگ علم کہتے ہیں، درحقیقت وہ علم ہے ہی نہیں، سراسر جہل ہے، علم نام ہے اس نور کا جو اللہ رب العزت اسلام پر پختگی اور اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے مومن کے قلب میں پیدا کردیتا ہے، جو کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ معلومات ہیں علم کا نور ان سب کے بعد سچے عمل سے حاصل ہوتا ہے، اور عزیزِ من! آج اس کا فقدان ہے، میں جو سچائی کے ساتھ علم حاصل کرنے کو اکثر کہتا ہوں اس کا مطلب یہی ہے کہ پڑھنا، اس ارادہٗ وعزم کے ساتھ ہو کہ اس پر اپنے مقدور بھر کاربند رہیں گے، اس لئے اخلاق سنوارنے، عبادات کو درست کرنے اور معاملات کو ٹھیک کرنے کے لئے ابھی سے مشق کرنی چاہئے، ابھی کل مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ملی ہے جس کو میں نے نوٹ کرلیا ہے، حالانکہ اس

قسم کی میری عادت نہیں ہے، نوٹ کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس میں زندگی کے نو اُصول بیان فرمائے گئے، وہ اتنے جامع ہیں کہ ان پر عمل کرلیا بس اس میں کمال پیدا ہوجائے گا، انشاء اللہ آئندہ مکتوب میں لکھ کر بھیجوں گا (۲)۔ ہاں چلتے چلاتے یہ بات بھی سن لو کہ خط میں سلام مسنون کا لکھنا کچھ زیادہ پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا اسے چھوڑ دو، اسی طرح آداب وتسلیمات جو لکھتے ہو وہ بھی قابل ترک ہے، باقی خیریت ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۸/ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ

(۱) اس کتاب میں ابتداء اسلام سے لے کر اس کے عہد تصنیف تک کی مکمل اسلامی تاریخ طلبہ کے معیار کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ہیں، پہلے یہ گیارہ حصوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی، اب دیوبند سے اس کے تمام حصے تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوگئے ہیں۔ (۲) مکتوب نمبر ۲ دیکھئے۔

☆☆☆☆☆

(۲)

عزیزم مولوی وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ اچھے ہوگے، آج غازی پور آیا، تمہارے دونوں خطوط ملے، خوشی ہوئی، یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ محبت وارادت کا تعلق باقی ہے، تمہاری سلامت طبعی کی وجہ سے پُر امید ہوں کہ اس میں مزید استحکام ہی پیدا ہوگا، میری توجہ ہمیشہ تم لوگوں کی طرف رہتی ہے، دعا کرتا رہتا ہوں۔ عزیزم جاوید سلّمہٗ سے کہو کہ نماز، باجماعت کی پابندی کا التزام کرے کیونکہ علم دین کا حصول اس کے بغیر خواب وخیال ہے، میں جہاں تم لوگوں کو علم کے اعلیٰ معیار پر دیکھنا چاہتا ہوں اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر عملی

حیثیت میں بلند سے بلند تر دیکھنے کا خواہش مند ہوں، اس وقت علم بڑھ رہا ہے، عمل گھٹ رہا ہے، جو چیز گھٹ رہی ہے اس میں اضافہ کرو، جو چیز پہلے ہی سے زیادہ موجود ہے اس پر زیادتی اس وقت کرسکو گے جب اس کے لئے اپنے کو فنا کردو، اور پہلی چیز میں تھوڑا اضافہ بھی زیادہ محسوس ہوگا، اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ عمل کے بغیر علم ایک لایعنی شئے یا دماغی عیاشی ہے جس کا فائدہ ممکن ہے کہ دنیا میں کچھ نظر آئے، مگر آخرت میں سراسر باعث خسران ہوگا، میرا منتہائے نظر یہ ہے کہ تم سچائی کے ساتھ علم دین حاصل کرو، اور دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل کرو، یہ بات اس ماحول میں جس سے تمہارا سابقہ ہے خصوصیت کے ساتھ اہمیت کی حامل ہے، اچھی طرح یاد رکھو، عبداللہ اور محسن سے سلام کہو۔ ۳۰/ ذی الحجہ تک انشاءاللہ تقریر پہونچ جائے گی۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۸/ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

☆☆☆☆☆

(۳)

عزیزم مولوی وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا تیسرا خط ملا، نمبرات معلوم ہوئے، بے حد خوشی ہوئی، محنت کا ثمرہ ملنے سے خوشی ہوتی ہی ہے، ان بہترین نتائج نے تمہاری ہمت کو مزید ابھارا ہوگا، تمہیں اتنے ہی پر تمہیں قناعت نہیں کرنی ہے، آج تو چند ہی ساتھیوں سے سابقہ ہے جن پر فوقیت لے جانا چنداں مشکل نہیں ہے، کل جب رفقاء کی زیادہ تعداد سامنے آئے گی اور ان میں ہر قسم کی صلاحیت ومحنت والے افراد ہوں گے، ان پر سبقت حاصل کرنے

کی مہم دشوار ہوگی اس لئے ابھی سے زیادہ سے زیادہ محنت ومشقت کے عادی بنو، تواضع وفروتنی اور کسر نفسی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، محنت سب سے زیادہ کرو، اچھے بننے کی کوشش کرو، مگر احساس یہی رہے کہ سب سے ادنیٰ ہوں، ابھی کچھ نہیں آیا، یہی احساس تمہیں آگے بڑھاتا رہے گا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احساس کمتری کو اپنی طبیعت میں راہ دو، ہرگز نہیں، تواضع اور احساس کمتری میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ متواضع جھکتا ہے، اس لئے اسے اٹھایا جاتا ہے، اور احساس کمتری کا شکار جھکتا نہیں گرتا ہے، تو اس کی کچھ مدد نہیں ہوتی، متواضع حوصلہ مند ہوتا ہے، اور احساس کمتری کا شکار بے حوصلہ اور حاسد ہوتا ہے دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے، فوقیت حاصل ضرور کرو، مگر بڑائی ہرگز نہ ہو، اس کا نام تکبر وخود پسندی ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دینے والے ہیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۹؍ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

☆☆☆☆☆

(۴)

عزیز گرامی قدر! سلمکم اللہ عن نوائب الشر
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو روز ہوئے تمہارا خط ملا، مولوی ابوالقاسم صاحب کے خط میں تقاضا بھی لکھ دیا تھا، خیر خوشی ہوئی، فرصت نہ ہونے کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی معاف کرنا۔

میں الحمد للہ بخیریت ہوں، تعلیم باقاعدگی سے ہو رہی ہے، تمہاری بہی خواہی کے لئے ایک بات حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی نقل کر کے لکھتا ہوں،

امید کہ مفید ہوگی۔

’’بس تم تین باتوں کا التزام کرلو، پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں، اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعدادِ علمی حاصل ہوجائے گی۔ اول یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ کرلیا جائے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں، کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ معلومات ومجہولات میں تمیز ہوجائے، بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے، پھر سبق کو استاذ سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھے بلا سمجھے آگے نہ چلے، اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرلے، بس ان تینوں التزامات کے بعد بے فکر رہے، چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔ انشاءاللہ استعداد ضرور پیدا ہوجائے گی۔ یہ تینوں باتیں تو درجۂ وجوب میں ہیں، اور ایک بات درجۂ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرالیا کرے۔ ملخصاً

یہ بات اتنی ضروری اور قیمتی ہے کہ بس سارے تعلم کا خلاصہ ہے۔ اس لئے اس کو یاد رکھو اور پوری طرح کاربند ہوجاؤ، اللہ برکت دے گا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم علم نافع، عمل صحیح اور فہم سلیم سے نوازے، آمین میرے لئے بھی دعاءِ خیر کرو کہ باوجود ہر طرح کی علمی وعملی خرابیوں کے بزرگوں اور احباب کی دعاؤں اور حسن ظن پر جی رہا ہوں۔

اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

(۵)

برادر عزیز مولوی وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بنارس کی طویل اقامت کے باوجود جو گفتگو تم لوگوں سے کرنی چاہی تھی وہ نہ

ہوسکی، اب میں اس کا انتظام کررہا ہوں، کہ بنارس آنے کے بعد تم لوگوں کے ساتھ ایک مستقل نشست ہو، بہرکیف جو کچھ مجھے کہنا تھا، اب لکھ رہا ہوں، گوشِ قبول سے سنو! امید کہ فائدہ ہوگا۔

نیت کہتے ہیں دل کے قصد وارادہ کو، نیت اپنے وجود کے اعتبار سے فعل پر مقدم ہوتی ہے، مگر منوی کا حصول آخر میں ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے جس کو تم نے قطبی میں علت غائی پڑھا ہوگا۔ اس کا قصد تو کام کرنے سے پہلے ہوتا ہے، مگر حاصل بعد میں ہوتی ہے، یہ تھی نیت کی مختصر تشریح!

اب مسلمان کی نیت کا حال سنو! اس کی نیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ عمومی اور خصوصی۔ نیت عمومی سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے عمل میں خواہ کتنا ہی معمولی ہو رضاءِ خداوندی کا قصد رکھتا ہے، اس طرح اس کا ہر کام تقرب خداوندی کا زینہ بن جاتا ہے۔ اس کو ایک واقعہ سے سمجھو!

ایک بزرگ دریا کے کنارے مقیم تھے، ان کے دس بارہ بچے تھے، ایک دن ان کی بیوی نے کھانا پکایا، انھوں نے بیوی سے فرمایا کہ دریا کے اس پار جاکر فلاں بزرگ کو یہ کھانا دے آؤ، بیوی نے عرض کیا اور جو دریا میں کشتی نہ ملی تو؟ فرمایا کہ دریا سے کہہ دینا فلاں بزرگ کے واسطے سے (اپنا نام لیا) جنھوں نے کبھی اپنی بیوی سے جماع نہیں کیا ہے مجھے راستہ دیدو! بیوی نے کہا یہ کیا بات ہوئی، فرمایا جاؤ اپنا کام کرو، تم کو اس سے کیا مطلب؟ وہ بے چاری گئی اس نے یہی بات دہرائی معاً دریا میں راستہ نمودار ہوا اور وہ دریا پار ہوکر ان بزرگ کے پاس پہونچی، کھلایا پلایا، اب پھر وہی مصیبت پار کیسے ہو۔ بزرگ نے فرمایا دریا سے میرا نام لے کر کہہ دینا ان کی برکت سے جنھوں نے مدت العمر کھانا نہیں کھایا، مجھے راستہ دیدو۔ عورت نے یہی کہا پھر

راستہ مل گیا۔ اب حیران تھی کہ الٰہی کیا معاملہ ہے؟ میرے دس بارہ بچے ہیں، پھر بھی میرے شوہر نے کبھی جماع نہیں کیا، دریا اس پار والے صاحب نے ابھی کھانا کھایا ہے مگر کہتے ہیں کہ کبھی کھانا نہیں کھایا، یہ سب کیا ماجرا ہے؟ شوہر سے آ کر خلجان عرض کیا، انھوں نے فرمایا: ہاں سن، میں نے کبھی اپنی خواہش نفس کی تکمیل کے لئے جماع نہیں کیا، اور انھوں نے کبھی خواہش نفس کے لئے کھانا نہیں کھایا۔ دونوں کا مقصد ہر فعل سے رضائے خداوندی ہے، بس ہمارا کام دنیا کے واسطے ہوا ہی نہیں پھر گویا وہ کام ہم نے کیا ہی نہیں۔ دیکھا تم نے ان حضرات نے اپنی لذات کو کس طرح مرضیٔ مولا میں فنا کر دیا، اب ان کا ہر عمل محض اس لئے ہوتا تھا کہ اللہ راضی ہوں، یہ چیز بہت تیقظ اور اہتمام چاہتی ہے، اور اصل مدار کار فضل خداوندی پر ہے، کوشش کرنی چاہئے، زندگی کے کسی حصہ میں یہ چیز حاصل ہو جائے تو کامیابی ہے۔

خصوصی سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص عمل کے متعلق نیت کی تصحیح کی جائے، مثلاً نماز اس لئے ادا کی جائے کہ اللہ راضی ہوں، اس میں کسی مخلوق کی طرف نگاہ نہ ہو، حتیٰ کہ یہ بھی نہ ہو کہ استاذ کی تاکید ہے، یا ان کی سزا کا خوف ہے۔ ہر دور کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے اسی اعتبار سے نیتوں میں بھی تبدیلی آتی ہے، جب دور تھا مسلمانوں کی حکومت کا اس وقت یہ علم اس لئے حاصل کیا جاتا تھا کہ حکومت کے مناصب میں جگہ ملے گی، اب دور ہے عجیب قسم کی کشمکش اور بے یقینی کا، اس لئے کسی ارادہ پر جماؤ نہیں ہوتا۔ خدا فراموشی اس دور کا طرۂ امتیاز ہے، دنیا منتہاءِ نظر بنی ہوئی ہے، تعلیم کا فائدہ تجارت کی صورت میں حاصل کیا جاتا ہے۔

اس بنا پر جب تک اس میں متاع دنیا کی چمک دمک نہ ہو، انسان توجہ نہیں کرتا، تم دیکھتے ہو چونکہ اس تعلیم میں کمائی کے مواقع محدود اور کم ہیں، اس لئے لوگ

بھی اس میں لگانے کے لئے اپنی سب سے غبی اور گھٹیا اولاد کا انتخاب کرتے ہیں، جو کسی اور لائن میں چل ہی نہیں سکتی، سوچتے ہیں کہ اسی راہ سے جو تھوڑا کما لیں گے وہی غنیمت ہے، پھر یہی لوگ استاذ بن جاتے ہیں، ان کی نیت زندگی بھر درست نہیں ہوتی ایک طرف سرپرست کی نیت کی خرابی، اور دوسری جانب اس کے اثر سے استاذ کی نیت کا نقص، بس طالب علم پٹ کر رہ جاتا ہے، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ طالب علم کو سنبھل کر رہنا چاہئے، اور اگر کبھی معیار کا استاذ میسر آجائے تو اسے گوہر سے بڑھ کر سمجھنا چاہئے۔ آج ہر چیز پیٹ کی نظر سے پرکھی اور دیکھی جاتی ہے کہ اس میں شکم پروری کا کتنا حصہ ہے اور اسی کو معیارِ کمال قرار دیا جاتا ہے۔ میرے عزیز! یہی چیز علم دین میں گھس آئی ہے، ہر طرف دنیا دنیا کی ہاہا کار مچی ہوئی ہے، مولوی اسی میں چوپٹ ہوا ہے، حکومت کے کارندے چند سکے پھینکتے ہیں اور مدارس والے ٹوٹ پڑتے ہیں، کام خراب ہو چکا ہے، اب اس تاریک فضا میں نیت کیسے صحیح رکھی جائے، سنو میں بتاتا ہوں۔

علم دین کے حصول سے مقصود اللہ کو بناؤ! دنیا کی ہر چیز سے آنکھ بند کرلو، مخلوق کی طرف نگاہ تک نہ کرو، دنیا کا کوئی تقاضا ہو پسِ پشت ڈال دو، یہ نہ سوچو کہ جب میں اوپر سے نگاہ ہٹا لوں گا تو پھر کیا ہوگا، میری دنیا کیسے چلے گی، دنیا میں بیوقوف سمجھا جاؤں گا، کمتر معیار پر زندگی گزارنی پڑے گی، لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہوں گا، اور سب سے بڑا معاملہ والدین کا ہوگا کہ ان کی تابعداری کی مامور بہ ہے۔

میرے عزیز! یہ سب وساوس ہیں، اصولی بات یہ سمجھو کہ مخلوق خواہ کیسی بھی ہو مستقل نہیں ہے، ہر ایک اپنے وجود وبقا بلکہ اپنی ہر سکون وحرکت میں خدا کی محتاج ہے، ایک شخص سینکڑوں ہزاروں خواہشیں رکھتا ہے مگر اس کی زندگی مخالف راستوں پر دوڑتی چلی جاتی ہے۔ انسان ارادہ کرتا ہے اور خدا کے ارادے کے سامنے چل نہیں سکتا، بلکہ

یوں سمجھو ساری مخلوقات عدم محض ہے کچھ بھی نہیں ہے، جیسے رات تاریک ہو اور مکان میں اندھیرا ہو پھر یکا یک سورج نکلا اور مکان کے در و بام روشن ہو گئے تو کیا تم کہہ سکتے ہو کہ مکان اپنے آپ روشن ہے، اور جب تک چاہے روشن رہے، اگر کوئی بیوقوف ایسا کہے تو تم اس سے کہہ دو گے اچھا سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرو، خود بخود سمجھ میں آ جائے گا، اسی طرح مخلوقات کا حال سمجھو، یہ عدم کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے مکانات ہیں، خدا نے وجود کی روشنی ڈالی تو نمایاں ہو گئے، یہ روشنی ہٹالی جائے گی پھر ختم۔ جب انحصار خدا کی ذات پر ہوا، اور مخلوقات کی حقیقت عدم محض ہے تو اس کی طرف نگاہ ہی کیوں کی جائے، صرف خدا کو پکڑا جائے، بخدا کہتا ہوں کہ جب اس ایک کو پکڑو گے سب کے سب تمہارے ہاتھ آ جائیں گے۔

دیکھو حدیث میں آتا ہے کہ مخلوقات کے قلوب خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرح چاہتا ہے الٹتا پلٹتا ہے، کیا جب تم خدا کو راضی کر لو گے تو مخلوقات کے قلوب کو وہ تمہاری رضا مندی سے معمور نہیں کر دے گا، بلکہ اس طرف نگاہ بھی کرنا خطا ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ساری مخلوق ناراض رہے، ایک خدا راضی رہے کیا پرواہ ہے، جیسے بادشاہ کا کوئی خادم ہو، اس سے ملک کا ہر باشندہ خفا ہے مگر اسے کیا فکر جبکہ بادشاہ راضی رہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ خدا سے عافیت کا سوال کرتے رہنا چاہئے، یہ تو ایک عمومی بات کہی گئی۔

اب خاص طور سے والدین کے متعلق ایک بات کہتا ہوں، میرا تجربہ ہے کہ جب مقصود صرف خدا کی رضا ہو تو والدین ہرگز ناراض نہیں رہتے، اگر ہمارے طرزِ عمل سے والدین کچھ کبیدہ خاطر رہتے ہیں تو یہ یقیناً ہماری کوتاہی ہے۔ اب سنو!

حوصلہ یہ ہونا چاہئے کہ معصیت کے علاوہ ہم والدین کے ہر حکم پر کمر بستہ

رہیں گے، حتیٰ کہ وہ ہم سے تعلیم بھی چھڑانا چاہیں تو ہم کسی قسم کی شکن کے بغیر جبینِ نیاز خم کردیں گے۔ تعلیم دین کا وہ مرحلہ جس میں آدمی مولوی بنتا ہے فرض نہیں، اگر والدین نہیں چاہتے تو ہم قطعی اس سے دستبردار ہوجائیں گے، اور یہ محض اس لئے ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی اسی میں ہے، مقصود یہاں بھی وہی ہے، ارے میاں مقصود یہی ہے خواہ کسی راستے سے ہو، اگر اللہ تعالیٰ کی آزمائش اسی راستے سے آتی ہے تو سر آنکھوں پر، ہم بندے ہیں ہمارا کام تعمیل حکم ہے، چوں چرا نہیں، اپنے طرزِ عمل سے والدین کو اطمینان دلادینا چاہئے، پھر سچی بات یہ ہے کہ والدین ہمیشہ تمہارے حق میں رہیں گے، مگر خیال رہے کہ تمہارا یہ رویہ اس لئے نہ ہو کہ والدین ہمیشہ تمہارے حق میں رہیں، کیونکہ یہ بہت خطرناک نیت ہے، نیت یہ ہو کہ خدا راضی ہوں، بس، اس کلیدی چیز کو پکڑلو، علم دین کے حصول میں یہی نیت ہونی چاہئے، خدا تمہیں ہر مقصد میں کامیاب فرمائیں گے، اس کے بغیر یہ علم دین **أشد عذاب** کا سبب بن جائے گا، یاد رکھو قیامت کے دن سب سے سخت عذاب میں عالم دین ہی ہوگا، جس نے اپنے علم پر منصفانہ عمل نہیں کیا، علم دین دودھاری تلوار ہے، ذراسی غفلت میں یہ تلوار اپنے اوپر چل جائے گی، خوب دھیان رکھو، چند باتیں مختصر لکھ دی ہیں، امید کہ سمجھ میں آگئی ہوں گی۔ کچھ اشکال ہو تو لکھ بھیجو، مولانا ابوالقاسم صاحب نے وقتی معاملات کے متعلق تم لوگوں سے کچھ کہا ہوگا، ان کے ارشادات کو حرزِ جان بناؤ، تم لوگوں کی ہمدردی اور خیر خواہی میں ہم دونوں ایک نقطہ پر ہیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

(۶)

برادرِ عزیز مولوی وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ اچھے ہو گے، عرصہ ہوا تمہارا خط ملا تھا، اس کے جواب کا قرض ابھی تک باقی تھا، آج اس سے سبکدوش ہوتا ہوں۔

مولانا ابوالقاسم صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ طلبہ مولوی نصر صاحب سے مطمئن ہیں، (تم نے نصر ''ث'' سے لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے) اس سے بڑی مسرت ہوئی، اس دور میں اگر قابل اطمینان استاذ میسر آ جائے تو کبریت احمر ہے، کوئی بھی ہو میں تمہیں علم وعمل کے اعتبار سے مضبوط اور پختہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں ایک طرف جہاں استاذ سے اکتسابِ فیض ضروری ہے، وہیں اپنی قوت ذہنیہ پر مکمل اعتماد اور مسلسل لگن اور جد وجہد بھی شرط ہے، بلکہ یہی بنیاد واَساس ہے، اور پہلی چیز معاون ہے، علم وعمل کی پختگی محتاجِ تشریح ہے بھی اور نہیں بھی، نہیں تو اس لئے کہ اس کی توضیح اس قدر ہو چکی ہے کہ تقریباً تمام اَطراف وجوانب پر روشنی پڑ چکی ہے، اور ہے اس لئے کہ اس موضوع پر جتنا کچھ کہئے کم ہے، اس مسئلے پر مزید کچھ دیکھنا ہو تو رفیع الدین کے نام ایک خط لکھ چکا ہوں اس کو دیکھ لو، باقی سب خیریت ہے۔ اپنے ساتھیوں کو سلام کہو، والد صاحب اور بھائیوں کو بھی۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

☆☆☆☆☆

(۷)

عزیزی مولوی وسیم احمد سلمہ الصمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل تمہارا مکتوب عزیز دستیاب ہوا، مسرت ہوئی، الحمدللہ بخیریت ہوں۔

کل راشد(۱) کا خط بھی تمہارے خط کے ساتھ آیا، انھوں نے عربی میں لکھا تھا، اصلاح کرکے ان کو بھیج رہا ہوں، ویسے انھیں میری جدائی سے بڑا قلق ہے۔

عزیز من! اس وقت وہ اور تم ہو کہ دونوں نے خطوط کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور طبیعت پر پرانی یادیں تازہ ہوتی رہتی ہیں، باقی سناٹا ہے، یا بقول تمہارے ’’ٹھنڈی سانس لی‘‘ میرے خیال میں مقامات حریری کے درس میں شرکت مناسب رہے گی، کیونکہ اس سال دارالعلوم کے نصاب میں مختارات کے ساتھ غالباً مقامات کے ابتدائی دس مقالے بھی ہیں، اس لئے اس سے مناسبت ہونی بھی ضروری ہے، اس کے بعد اگر وقت اجازت دے تو مشق تجوید میں بھی حصہ لو کہ قرآنی حروف کی درستگی بھی نعمت عظمٰی ہے، تاہم زیادہ اس کی کوشش ہونی چاہئے کہ قرآنی ہدایات زندگی میں رچ بس جائیں، حضور ﷺ کی ایک طویل دعا ہے جس میں آپ نے خدا کی عظمت وجبروت اور بہت سی چیزوں کا واسطہ دے کر خدا سے سوال کیا ہے کہ: **أن ترزقني القرآن العظيم وتخلطه بلحمي ودمي وسمعي وبصري وتستعمل به جسدي بحولك وقوتك فإنه لاحول ولاقوة إلا بك**، کہ یا اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ مجھے قرآن عظیم نصیب فرمائیں اور اسے میرے گوشت، خون، کان، آنکھ میں پیوست کردیں، اور اس پر میرے جسم کو عامل بنادیں، محض اپنی قدرت وقوت سے، کیونکہ طاقت وقدرت صرف آپ ہی کو ہے۔

بڑی عجیب دعا ہے، مناجاتِ مقبول مصنفہ مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کہ چھٹی منزل میں ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے لئے قرآن سے بڑھ کر کوئی دولت ونعمت نہیں ہے۔ قرآن کی موجودگی میں کسی کتاب کو حق نہیں کہ اسے کتاب کہا جائے۔ تم قرآن پڑھتے ہو اس لئے چند سطریں لکھ رہا ہوں کہ قرآن پڑھنے سے زندگی میں تبدیلی آنی چاہئے۔ قرآن پڑھنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہی زندگی کا شعار بنے، پڑھنے والے کے ایک ایک قول وفعل سے قرآن کی ترجمانی ہو، حضرت عائشہؓ سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور اخلاق کے متعلق دریافت کیا، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: **کان خلقه القرآن** کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا، یعنی آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہو بہو قرآن کے مطابق تھی، اس کے باوجود دیکھ رہے ہو کہ کیسی دعا فرمارہے ہیں، جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ لکھ دوں، مگر خاصی طویل ہے، مناجاتِ مقبول میں مل جائے گی، اور یہ بھی بتادوں کہ مولانا ابوالقاسم صاحب کے یہاں مناجاتِ مقبول ہے، اونہہ، کہاں جاؤ گے ڈھونڈنے کے لئے، سن لو میری طبیعت بھی نشاط پر ہے۔

أللٰهم إنى أسئلک بمحمد نبیک وإبراهيم خليلک وموسیٰ نجیک وعیسیٰ روحک وکلمتک وبکلام موسیٰ وإنجیل عیسیٰ وزبور داؤد وفرقان محمد ﷺ وبکل وحی أوحیته أو قضاءٍ قضیته أوسائلٍ أوعطیته أو فقیرٍ أغنیته أوغنيٍ أفقرته أوضالٍ هدیته وأسئلک بإسمک الذی وضعته علی الارض فاستقرت وعلی السمٰوات فاستقلت وعلی الجبال فرست وأسئلک بإسمک الذی استقر به عرشک وأسئلک بإسمک الطاهر المطهر المنزل فی کتابک من لدنک وبإسمک الذی وضعته علی النهارفاستنار وعلی

اللیل فأظلم وبعظمتک وکبریائک وبنور وجھک أن ترزقنی القرآن العظیم وتخلطه بلحمی ودمی وسمعی وبصری وتستعمل به جسدی بحولک وقوتک فإنه لاحول ولاقوة إلا بک ۔

ترجمہ نہیں لکھا تم خود ہی حل کرلو۔ بہت عجیب دعا ہے، بہت دنوں سے یہ دعا پڑھ رہا تھا مگر غفلت کے ساتھ، کبھی توجہ نہیں ہوئی، خدا درجات بلند فرمائے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے، ان کے ملفوظات دیکھنے کے بعد اس کی اہمیت سمجھ میں آئی، پس میں نے نہیں چاہا کہ تم سے بخل کروں، قسم ہے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی، اس دعا کے مل جانے کے بعد ایسا محسوس ہونا چاہئے جیسے کونین کی ساری دولت مل گئی۔ اسی لئے غالباً ایک حدیث میں آتا ہے۔ آدمی کو جو چیز سب سے عمدہ دی جائے وہ قرآن ہے، قرآن مل جانے کے بعد اگر کسی نے کوئی اور چیز طلب کی تو اس نے ناشکری کی، دینار و اشرفی مل جانے کے بعد ٹھیکریوں کا طلبگار یقیناً احمق ہی ہوگا، پس میرے عزیز ہر روز تلاوت سے پہلے خوب جی لگا کے، اللہ کی طرف توجہ یکسو کر کے معانی کے استحضار کے ساتھ زبانی طور پر سرسری نہیں، ایک بار پڑھ لیا کرو اور اس کے ساتھ دل میں یہ عزم رکھو کہ قرآن کی تعلیمات سے اپنی زندگی آراستہ کروں گا، انشاء اللہ خدا کی مدد شامل حال ہوگی، تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ کیا لکھ رہا ہوں، میرے عزیز میں نجات چاہتا ہوں، اسی لئے میں تم کو بتا رہا ہوں کہ **الدال علی الخیر کفاعله** حدیث میں آتا ہے، ہوسکتا ہے اسی بہانے خداوند کریم میرا ٹھکانہ بھی لگا دیں، ہم نے قرآن چھوڑ کر دوسری چیزیں اختیار کیں، لٹ گئے، برباد ہوگئے، دنیا کی ساری دولتیں ضررِ محض ہیں اگر یہ نہ ہو، اور کسی دولت کی حاجت نہیں اگر یہ ہو، اب تم سوچو گے کہ قرآن کی تعلیمات تو پورے تیس پاروں میں پھیلی ہیں ان کو اخذ کیسے

کروں، تو قربان جاؤ حضور ﷺ کی مہربانی کہ آپ نے ان سب کو نو چیزوں میں سمیٹ دیا ہے، سن لو، فرماتے ہیں کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے:

۱۔ پوشیدہ اور علانیہ خدا سے ڈرتا رہوں۔
۲۔ خوشی و ناراضی میں کلمۂ عدل پر کاربند رہوں۔
۳۔ تنگی و فراخی میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کروں۔
۴۔ تعلق کاٹنے والوں سے تعلق ٹھیک رکھوں۔
۵۔ جس نے مجھے محروم کیا اس کو بخشش و عطا کرتا رہوں۔
۶۔ جس نے مجھ پر ظلم کیا اس کو معاف کروں۔
۷۔ یہ کہ میری خاموشی فکر (اللہ کا دھیان) اور میری بات اللہ کا ذکر ہو۔
۸۔ میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔
۹۔ اور یہ کہ اچھی بات کی تلقین کرتا رہوں۔

(پچھلے خط میں) اسی حدیث کو میں نے کہا تھا، مکتوب طویل ہو گیا، ورنہ مختصر تشریح بھی کر دیتا، اچھا پھر کبھی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۱۹؍ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ

(۱) استاذی حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ کے فرزند! انھوں نے جامعہ اسلامیہ بنارس میں کچھ روز تک تعلیم حاصل کی تھی۔

☆☆☆☆☆

(۸)

عزیزم مولوی وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا، حالات کی اطلاع تو مجھے پہلے ہی ہو چکی تھی، خدا کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے، ہم بندے ہیں کیا کر سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کوئی تدبیر کریں گے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ کامیاب ہو، باقی یہ حالات جو رونما ہو رہے ہیں کم از کم میرے لئے غیر متوقع نہیں ہیں، طلباء تو میرے جگر گوشے ہیں، اسی لئے کوئی کوئی حادثہ ہوتا ہے تو دل دکھتا ہے، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ نہ ہوا ہوتا، کیونکہ یہ خدا کی مشیئت پر اعتراض ہوگا، مگر یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس طرح باقی طلباء کا کیا حشر ہوگا؟ ان میں بددلی اور اساتذہ میں برہمی پیدا ہونا لازمی ہے، پھر افادہ واستفادہ کا سلسلہ موقوف، یہ ہے خرابی کی بات، میں سوچتا ہوں کہ اس فرار ونفور کے اسباب کا پتہ لگانا چاہئے، مگر سچی بات کہو، کون ایسا کرے گا، بس بھائی مجھے تو سو کی سیدھی ایک ہی آتی ہے کہ طلباء شوق ومحنت سے پڑھنا نہیں چاہتے، یا اساتذہ اخلاص ومحنت سے پڑھانا نہیں چاہتے، ان دونوں میں ایک بات ضرور ہے، یہ میں بطور منع خلو کے کہہ رہا ہوں، ممکن ہے دونوں خرابیاں اکٹھا ہوں، بہرکیف ہمارے مدارس کا یہ ایک عظیم المیہ ہے، جس سے میں بیحد متاثر ہوتا ہوں، جو بھی ہو تم محنت ودلجمعی کے ساتھ پڑھتے رہو، ان سب امور میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس میں خوامخواہ اضاعت وقت ہے، مقصود سامنے رکھو، اب میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں مجھ تک نہ آئیں تو اچھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے تشویش ہو ہی جاتی ہے، بس اپنے حالات کی اطلاع دیتے رہو، اس کا منتظر رہتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۳؍صفر ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۹)

عزیزم **زادک اللہ علماً وفضلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا جوابی کارڈ ملا، اس سے چندروز پہلے ایک کارڈ ملا تھا جس میں تم نے نیت تعلم کے متعلق دریافت کیا تھا، عادت کے موافق فوراً جواب لکھنا چاہا، مگر بعض شدید الجھنیں ایسی حائل ہوگئیں کہ کئی روز تک درس وتدریس میں بھی طبیعت حاضر نہ رہ سکی، خیر اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ان سے نجات عطا فرمائی، **فالحمد للہ علیٰ ذٰلک**، سوچ رہا تھا کہ تمہارا سوال چونکہ تفصیل طلب ہے اس لئے قدرے اطمینان کے بعد لکھوں گا کہ تمہارا دوسرا خط باعث مسرت بنا، سچی بات یہ ہے کہ تمہارا خط ملتا ہے تو بیحد خوشی ہوتی ہے اور بہت سے مضامین منشرح ہوکر ذہن میں آجاتے ہیں، تمہارے جوابی خط سے مجھے یہ تو آسانی ہوتی ہے کہ ساتھ ساتھ جواب لکھ دیتا ہوں جس سے تمہیں انتظار کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی، مگر میرے بھائی شرمندگی بھی ہوتی ہے، جوابی خطوط بڑے حضرات کے پاس جایا کرتے ہیں اور میں کیا ہوں، بہر کیف تم نے مطالعہ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق یہ بات یاد رکھو کہ کسی موڑ پر ہمت ہارنی نہیں چاہئے۔ لغت نہ ہو نہ سہی، صرف عبارت ہی اپنی امکان کی حد تک درست کرلیا کرو، اور سمجھنے کے متعلق جو بات تحریر کی ہے وہ قابل اطمینان ہے۔

جب استاذ کے یہاں بات سمجھ میں آجاتی ہے اور ٹھیک آتی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ذہن سے نکل جاتی ہو، پھر دیکھو گے تو پھر آجائے گی، ایسا تو ہوتا ہے اس کو یاد کرنے کے چکر میں پڑوگے تو سب بھول جاؤ گے، مقصد مناسبت پیدا کرنا ہے، عالم تو پڑھنے لکھنے کے بعد جب مطالعہ بڑھاؤ گے تب بنوگے، ابھی بس یہ ہے کہ

کتابیں سمجھنے کی استعداد پیدا کرو، جب استاذ کے پاس سمجھ جاتے ہو تو پھر کوئی فکر نہیں، ہاں اس کا البتہ خیال کرو کہ واقعی سمجھ میں آجاتا ہے یا طبیعت سمجھا دیتی ہے کہ چلو بس سمجھ لیا، طالب علم کو کبھی کبھی اس میں دھوکہ ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً سمجھے ہوئے نہیں ہوتا، چنانچہ جب اپنے ابناءِ جنس (طالب علموں) کو سمجھانا پڑتا ہے، تب پتہ چلتا ہے، چونکہ مجھ پر یہ بیت چکی ہے اس لئے کہہ رہا ہوں، ذہن کا سختی سے محاسبہ کرو، مجھے امید ہے کہ یہ صورت نہ ہوگی۔ باقی سب خیریت ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶؍ صفر ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۰)

برادرِ عزیز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا کارڈ دستیاب ہوا، الحمد للہ خیریت سے ہوں، کتابیں تمہاری سمجھ میں آجاتی ہیں، اس سے خوشی ہوئی، دعا کرتا ہوں خدائے علیم وخبیر مزید فہم نصیب فرمائیں۔

نیت وقصد کے سلسلہ میں اس وقت اجمالاً صرف اتنا سمجھ لو کہ اس علم کا مقصد صرف خلاق علیم کی رضامندی ہونی چاہئے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، حتیٰ کہ یہ بھی نیت نہیں ہونی چاہئے کہ ہم پڑھ کر دوسروں کو فائدہ پہونچائیں گے۔ نگاہیں صرف باری تعالیٰ پر ہونی چاہئیں، انھیں منظور ہوگا تو تم سے کوئی خدمت لے لیں گے، ورنہ اصل چیز ان کی فرمانبرداری اور اطاعت گذاری ہے، اس کے آگے سب ہیچ ہے، لیکن یہ نیت ہے بہت مشکل، تصحیح نیت کی کوشش ہونی چاہئے، لیکن بہت زیادہ چکر میں نہیں

پڑنا ہے، میں انشاء اللہ گیارہ ربیع الاول کو بنارس حاضر ہوں گا، وہیں کسی وقت تفصیل سے گفتگو کروں گا باتیں بہت سی ذہن میں ہیں، تحریر کا موقع نہیں ملتا، امید کہ بخیر ہو گے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۹؍ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۱)

عزیز وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا، حالات معلوم ہوئے، **تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ** اسی کو کہتے ہیں۔ ایک جاتا ہے دوسرا اس کی جگہ پہونچ جاتا ہے، ایسا بھی ہوا کہ ظاہراً شر نظر آتا ہے، حقیقت میں خیر ہوتا ہے، بہر حال حق تعالیٰ کی یہ مختلف شانیں ہیں جو عام انسان میں ظہور کیا کرتی ہیں، خوش قسمت انسان وہی ہے جو دیدۂ عبرت سے ان کرشمہ ہائے گوناگوں کو دیکھا کرے اور نصیحت حاصل کرے، دیکھو یہاں تمہارے لئے بہتری اور خیر اسی میں ہے کہ جس قدر ان مسائل سے دامن سمیٹ سکو سمیٹتے رہو، نوجوانوں کو ہمت وجرأت للکارتی ہے کہ ہر حق وناحق میں کود پڑو، مگر یہ ناعاقبت اندیشی ہے، مآل کار خوب سوچ لینا چاہئے، ابتک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر قسم کے شرور وفتن سے بچایا ہے، دعا کرتے رہو کہ طالب علمی کا یہ دور نیک نامی اور پاکبازی سے گزر جائے، اللہ کی مدد ہو تو پھر کوئی امر دشوار نہیں، اور اگر اللہ نے توفیق سلب کر لی تو پھر کبوتر جال دیکھتے ہوئے بھی اس میں اتر پڑتا ہے، اس لئے ہمیشہ شئونِ خداوندی سے لرزاں

وترساں رہنا چاہئے ، اور اسی سے حفظ ونگہداشت کی دعا کرتے رہنا چاہئے ، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں کامیاب وبامراد بنائیں ۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ نئی کھیپ جو طلبہ واساتذہ کی تمہارے یہاں پہونچی ہے وہ مبارک ثابت ہو، اور جامعہ اسلامیہ تلون وتغیر کی مصیبت سے محفوظ رہے، ہوسکے تو مولوی امین اور عبد القدوس سے سلام کہو، جمعرات کو انشاء اللہ بنارس آؤں گا۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۲)

عزیز وسیم احمد سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا، اس امتحان کو ہوّا نہ سمجھو، تمہارا اپنا سالانہ امتحان جیسا ہوتا ہے، اس سے کچھ آسان ہی ہوگا ، انشاء اللہ نصاب جتنا ہوا ہے ٹھیک ہے ۔ جلد اول میں کتاب الحج اور کتاب الزکوٰۃ مستثنیٰ نہیں ہے، اچھی طرح سے تیاری کرلو، گھبرانے سے بھی کوئی کام بنتا ہے، اللہ نے صلاحیت دی ہے، اب یہی تو وقت آیا ہے صلاحیت آزمانے کا، تمہیں تو خوش ہونا چاہئے ، ابھی دس پندرہ روز باقی ہے، کتابوں میں ڈٹ جاؤ، نصاب اور کتابیں اتنی زیادہ نہیں ہیں کہ بہت بوجھ ہوجائے ، خاطر جمع رکھو، انشاء اللہ نتیجہ اچھا آئے گا۔ دعا کرتا ہوں اور خاص طور سے کرتا ہوں، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۰؍رجب ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۳)

عزیزم وسیم احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امتحانات ختم ہوگئے ، امید کہ پرچے اچھے گذرے ہوں گے ، تمہارا خط ملا ، مصروفیات کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی ، میں تمہیں کیا نصیحت کروں ، ہاں اتنی بات ضرور دل میں آتی ہے کہ اگلا مہینہ رمضان ہے ، اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے ، اس کے لئے میرے خیال میں بنیادی چیز ترکِ گناہ ہے ، اس مہینے میں تم تین باتوں کا التزام کرلو ، انشاء اللہ رمضان کی برکتوں سے بھرپور معمور ہوسکو گے ۔

(۱) نماز باجماعت مع تکبیر اولیٰ کا اہتمام ، مہینہ بھر اس کی پابندی نہایت مستعدی کے ساتھ کرو ۔

(۲) ہر روز کم از کم ایک منزل کی تلاوت ، یہ تلاوت اگر ترجمہ کی رعایت سے ہو تو بہت عمدہ ہے ، ورنہ اس میں کمی نہ کرو ۔

(۳) غیبت اور جھوٹ سے مکمل پرہیز ، اگر کہیں سرزد ہوجائے تو فوراً توبہ واستغفار ، ان تین باتوں کا التزام کرلو ۔

دعواتِ صالحہ میں اس گناہ گار فراموش نہ کرو ۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۳؍شعبان ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۴)

عزیزم وسیم احمد سلّمک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط کئی روز ہوئے ملا، سوچا تھا کہ لگے ہاتھوں جواب لکھ دوں گا، پھر ذہول ہوگیا۔

درس قرآن کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کہنی ہے، بھائی میں تو عقید تمندانہ سن رہا تھا، کچھ تنقید کرنے کا ارادہ تھوڑا ہی تھا، طبیعت خوش ہوئی، ضرورت اس کی ہے کہ جو کچھ کہا جائے، پڑھا جائے اس کا مقصد دوسروں کے عمل کرانے سے پہلے خود کو اس رنگ میں رنگنا ہو، پہلا مخاطب ان ہدایات کا خود کو سمجھو اور یہ بات صرف برائے گفتن نہیں کہہ رہا ہوں، جانتے ہو قرآن کا مطالبہ کیا ہے؟ ارے بھائی اس کو مانو، اس کے آجانے کے بعد اپنی رائے فنا کردو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی رائے ہی قائم نہ کرو، قرآن ہی سے پوچھو کیا کرنا چاہئے اور اس کی ہدایات پر عمل کرو، اس کے لئے سب سے پہلے قرآن اور صاحب قرآن کی عظمت ومحبت دل میں پیوست کرنی ہوگی، اس کا سیدھا سادہ اور آسان طریقہ یہ ہے کہ قرآن پڑھنے اور درس قرآن سنانے سے پہلے موقع ہو تو زبان سے ورنہ دل میں کہہ لیا کرو کہ اے میرے رب یہ آپ کا کلام حق ہے، اس پر ایمان لاتا ہوں، اس کا ہر امر و نہی سر آنکھوں پر، اے اللہ اس کی عظمت ومحبت سے میرا قلب معمور کردیجئے، میرے بھائی اس کے بغیر قرآن اپنے پڑھنے والے پر حجت ہوگا، اس کی سفارش نہیں کرے گا، امید کہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی، سال شروع ہو چکا ہے، اپنے تعلیمی کوائف سے آگاہ کرو، استعداد پر گفتگو پھر کبھی کروں گا۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی
یکم/ذو القعدہ ۱۳۹۴ھ

☆☆☆☆☆

(۱۵)

عزیزم وسیم احمد سلّمک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے پہلے خط کا جواب دے چکا ہوں، اب مل گیا ہوگا، الحمد للہ خیریت سے ہوں، گزشتہ خط میں تم نے استعداد کے متعلق دریافت کیا تھا، اس کے بارے میں مختصراً تحریر کرتا ہوں۔ استعداد کے معنیٰ عرف کے لحاظ سے صلاحیت کے ہیں، آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو بالکل سادہ ہوتا ہے، مگر اس کے اندر کچھ ایسے اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں، کہ ان کو اجاگر کرکے دنیا جہاں کے بہت سے کام لئے جا سکتے ہیں، اس کی مثال زمین کی سی ہے کہ اوپر سے تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے مگر اس قابل ہوتی ہے کہ اس کو کھود کر، جوت کر عمدہ سے عمدہ فصل تیار کی جائے، اب یہ کسان کی محنت پر ہے کہ وہ کیسی کوشش کرتا ہے، اس مثال سے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ انسان ذی استعداد ہوتا ہے، لیکن محاروہ کے اعتبار سے جس کی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں اسے ذی استعداد کہا جانے لگتا ہے، اس سے تم یہ سمجھ گئے ہوگے کہ اصل سوال استعداد کے متعلق یہ نہیں ہے کہ وہ کیا شئے ہے؟ بلکہ یہ ہے کہ اس کو کیسے اُجاگر کیا جائے کہ اس سے کماحقہٗ کام لیا جا سکے، اس کی ایک بہت اچھی مثال ذہن میں آگئی، سنو! دیکھا ہوگا کہ مزیک کا فرش بنتا ہے تو ابتدائی احوال میں کیسا کچھ ہوتا ہے، پھر اس کو پتھر کی مخصوص بٹّی سے گھسا جاتا ہے، کافی محنت ہوتی ہے، پھر اس میں مختلف رنگ کے دانے نمودار ہوکر چکنے

مکنے کیسی نگاہ کو تازگی بخشتے ہیں، ٹھیک اسی طرح یہ خوبصورت دانے ہر انسان کے جوہر طبیعت میں پوشیدہ رہتے ہیں، اس کو ایک خاص ڈھنگ سے ایک خاص مدت تک گھستے ہیں، پھر وہ چمک دمک کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں، اب رہ گیا گھسنے کا معاملہ تو اس میں قدرے تفصیل ہے، اور سب کچھ زبانی گفتگو میں بتا چکا ہوں، امید کہ اس سے مقصود کی طرف اشارہ مل گیا ہوگا، کیا سمجھے تحریر کرو۔

اعجاز احمد اعظمی

۶/ ذوالقعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۱۶)

عزیز گرامی قدر! سلّمکم اللّٰہ تعالیٰ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

خط ملا، خیریت سے ہوں، خدا کرے تم بھی ہمیشہ بعافیت تمام رہو، اور مقاصد حسنہ میں کامرانی سے ہمکنار ہوتے رہو۔ آمین

عزیز گرامی! طالب علمی کا دور ایک قیمتی دور ہے، جس نے اسے غفلت اور فراموشی میں گزارا وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہا، اور جو احتساب وقت کرتا رہا، بلا شبہہ کامیاب رہا، حصول علم کا مرحلہ بڑا نازک ہے، ساری زندگی صرف کر کے علم کا شمہ حاصل ہو جائے تو ارزاں سودا ہے، کیونکہ زیادہ سے زیادہ علم ہو اس کو بھی علیم مطلق ''علم قلیل'' کا لقب دیتا ہے اور یہاں مسلمانوں کا معاملہ اور بھی نازک ہے، مگر یہ نزاکت صرف اسی وقت تک ہے جب تک اس پر عمل پیرا نہ ہو، ورنہ پھر تو بڑا پُر لطف مرحلہ ہے، بس میاں لگے رہنا ہے، اور محنت شیئاً فشیئاً بڑھاتے رہو، شوق بھی اسی کے

بقدر بڑھتا رہے گا، انشاء اللہ۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۹/ صفر ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۱۷)

عزیز وسیم! سلّمک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاته

خط ملا، کچھ مصروفیات، کچھ کسل، کچھ بے کیفی، جواب میں تاخیر ہوئی، پڑھائی کا حال معلوم ہوا، دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ علم نافع، عمل صالح، حیاة طیبہ نصیب فرمائے، اس مرتبہ اور اس سے پہلے بنارس پہونچا تو ایک چیز محسوس کی، وہ یہ کہ تم مسجد اور جماعت میں نظر نہ آئے، کیا بات ہے؟ کیا جماعت کی نماز میں کچھ کوتاہی آگئی ہے، اگر ایسا ہے تو بہت برا ہے، نماز باجماعت کے بغیر کچھ حاصل نہیں سب بے کار ہے، اس کا اہتمام کرو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۱۸)

از: نانہی ڈیہی، دُمکا

عزیز وسیم! سلّمک اللہ تعالیٰ

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاته

کل شام کو تمہارا خط گھر سے واپس آکر ملا، مدرسہ میں ایک خط تمہارا ملا تھا، مگر

اس وقت میں کچھ ایسا مصروف تھا کہ شاید جواب تحریر نہ کرسکا، البتہ جوابی کارڈ کا ملنا ذہن میں بالکل نہیں ہے، ممکن ہے کئی روز تک مدرسہ سے غائب تھا، اسی دوران آیا ہو، اور میرے ہاتھ نہ پہونچ سکا ہو، بہرکیف تمہیں اس سے پریشانی رہی، معذرت خواہ ہوں، آئندہ سے انشاء اللہ پابندی کروں گا۔

میں اس سال بھی رفیع الدین وغیرہ کے یہاں آیا ہوا ہوں، ارادہ تو نہیں تھا، مگر کچھ اصرار اور کچھ واقعی ضرورت، آنا پڑا۔ بنارس ہوکر نہیں آسکا، اس کا افسوس ہے، ادھر بنارس کی غیبوبت بہت طویل ہوگئی، معلوم نہیں تمہیں دیوبند جانا ہے یا نہیں! اگر جانا ہے تو کب تک؟ میں انشاء اللہ زیادہ سے زیادہ ۵/شوال تک غازی پور پہونچ جاؤں گا، بنارس نصف شوال کے پہلے پہونچنا ذرا مشکل ہے، اگر دیوبند جانے کا ارادہ ہو، اور ۵/ کے بعد کا قصہ ہو، تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایک دن کے لئے غازی پور ہو لیتے، ملاقات ہو رہے گی، بہت سی باتیں ذہن میں رہتی ہیں اور انھیں کاغذ پر لانے کی فرصت مجھے ذرا کم ہی رہتی ہے، وہ میں کہہ سن لیتا۔

رمضان کی مبارک ساعتوں میں اپنی اور اپنے اساتذہ واحباب کی صلاح وفلاح کے لئے بکثرت دعا کرتے رہو، میں بھی مصروفِ دعا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ قبولیت سے نوازیں، آمین۔ قرآن کی تلاوت بھی زیادہ سے زیادہ کرو، خاموشی کو اپنا شعار بناؤ، کہ بہت زیادہ بولنے والے کی عقل زائل ہوجاتی ہے، اور دل مرجاتا ہے، لوگوں سے اختلاط کم سے کم کرو کہ بکثرت لوگوں سے ملنا جلنا سخت قسم کی غفلت پیدا کرتا ہے، جس سے دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے، اور کیا لکھوں، والد صاحب اور بھائیوں سے سلام کہہ دو، مولانا ابوالقاسم صاحب سے بھی سلام اور اس کے بعد دعا کی درخواست۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۸؍ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۱۹)

عزیز وسیم! **جعلك الله وسماً على الاسلام**

وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته

غالباً دو تین روز ہوئے تمہارا خط ملا، الحمد للہ کہ میرے مندرجات نے تمہیں نفع دیا، میری آرزو ہے کہ تم لوگ جن کو مجھ سے تعلق ہے وہ سچے معنی میں طالب علم بنیں، اور اس کا طریق یہی ہے کہ حصول علم کے جتنے اسباب عادیہ ہیں ان کو مہیا کیا جائے، اور عوائق وموانع کو دفع کرتے رہا جائے۔ اس کے اسباب تو یہ ہیں کہ علم اور ذرائع علم کا پورے طور پر ادب واحترام بجا لایا جائے، کامل توجہ، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مشغول رہا جائے۔ اور موانع یہ ہیں کہ وقت، دماغ اور قوت کو فضولیات ولغویات یا ناروا چیزوں میں برباد وضائع کیا جائے، یا اپنے کو ذہین، قابل ہوشیار سمجھ لیا جائے، یا حصول علم میں عار وذلت محسوس کی جائے، یا محنت ومشقت سے جی چرایا جائے۔

بقدر الكد تكتسب المعالي ومن طلب العلىٰ سهر الليالي
ومن رام العلىٰ من غير كد أضاع العمر في طلب المحال

اضاعت علم وذہن کا ایک بہت بڑا سبب گناہوں سے نہ بچنا بھی ہے، افسوس میں تمہیں یہ حکم دے رہا ہوں کہ گناہ سے بچو اور خود نہیں بچتا۔ میرے لئے دعا کرو، یہ چیزیں جتنی خطرناک ہے بیان نہیں کیا جاسکتا، اگر آدمی خدا اور رسول ﷺ کی

نافرمانی سے بچتا رہے تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرلے، لیکن مشکل تو یہ ہے کہ گناہ کو اس زمانہ میں نہ صرف ہلکا سمجھا جاتا ہے بلکہ زمانۂ طالب علمی کا تو ایک لازمہ بلکہ فیشن خیال کیا جاتا ہے، **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون**،

بہت سے گناہ تو ایسے ہیں کہ ان کی کثرت کی وجہ سے ان کا گناہ ہونا بھی ذہن سے نکل گیا ہے، مثلاً جھوٹ کہ معمولی معمولی امور میں بے تکلف جھوٹ بول دیا جاتا ہے، اور اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے کوئی گناہ کیا، غیبت کو تو پوچھو ہی مت، ابتلاء عام ہے، تو گناہوں کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پھر ان سے بچنے کی تدبیریں، پھر اس کا پختہ عزم کہ گناہ کے گرد پھٹکیں گے ہی نہیں، اس کے بعد اگر کبھی ہوجائے تو احساسِ ندامت اور سچے دل سے توبہ واستغفار اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عہد! انشاء اللہ ایک ایک کرکے چھوٹ جائیں گے، اور دل علم کے نور سے جگمگا اٹھے گا، کاش مجھ کو بھی عمل کی توفیق ہوتی۔ یا اللہ ہم سب کو ہر قسم کے گناہ سے محفوظ کرکے تقویٰ کی زندگی نصیب فرما، اور نورِ علم سے ہمارے قلوب کو منور فرمادے، آمین۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۷/ذوالقعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۲۰)

عزیزی الوسیم!

و علیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ

خط ملا، عیوب کی وجہ کی بابت تم نے سوال کیا ہے؟

جس وقت میں نے خط لکھا تھا، اس وقت کوئی خاص بات ذہن میں تھی اب نکل گئی، تاہم سنو!

خرابی اور عیوب پیدا کرنے کا ذمہ دار اپنے نفس اور شیطان کے بعد آدمی کا ماحول ہوتا ہے، آدمی کے گردو پیش جن چیزوں کا عمومی رواج ہوتا ہے وہ اس کے لئے معمولی اور غیر اہم بات ہوجاتی ہیں، ان کا قبح ذہن سے نکل جاتا ہے، حالانکہ بسا اوقات وہ باتیں بیحد خطرناک ہوتی ہیں۔

مثلاً بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں تجسس عیوب بہت ہے، ہر شخص انتہائی رازدارانہ طریقہ پر دوسرے کے حالات سے بحث کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں بدگمانی، اس کے آگے دشمنی، غیبت، حسد وغیرہ امراض پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات ہر جگہ بالعموم اور ۔۔۔۔۔ بالخصوص اس درجہ رواج پذیر ہے کہ اس کی برائی کا احساس تک باقی نہیں رہا، اچھے اچھے لوگ جن کے تقدس کی بعض لوگ قسم کھاتے ہیں اس مرض مہلک میں گرفتار ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سخت ترین گناہ ہے اور جب انسان دوسروں کے عیوب دیکھنا شروع کرتا ہے تو اس کی نگاہ سے اپنے عیوب پوشیدہ ہوجاتے ہین اس کے بعد وہ خود بینی یعنی اپنے ہنر اور خوبی کو دیکھنے میں مبتلا ہوجاتا ہے، پھر ظاہر ہے کہ اس کا ردیف کبر ہے، تم خود سوچو، مجالس میں تھوڑی دیر بیٹھو، اور کسی خاص شخص کے عیوب پر بحث ہورہی ہو، اس وقت اپنے دل کو ٹٹولو، دوسروں کے چہرے مہرے کا جائزہ لو، کیا تم اپنے دل میں یا دوسروں کے چہرے پر کراہیت کے آثار پاتے ہو، بلکہ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ چلو اچھا ہوا، وہ بدنام ہوتا ہے، حالانکہ بھائی جیسے اس کے اندر عیوب ہیں ویسے ہی تمہارے اندر بلکہ اس سے زیادہ عیوب ہیں، تو جو تم اس کی پردہ دری پر خوش ہورہے ہو، کیا اللہ تعالیٰ تمہاری پردہ دری پر قادر

نہیں ہیں۔ خوب سمجھ لو اگر تم اپنے بھائی کے عیب چھپاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عیوب کو چھپائے رکھیں گے، اور تم دوسروں کے عیب کھولو گے تو دوسرا تمہارا عیب کھولے گا، اور آج کل کسی ماحول میں چلے جاؤ ہر جگہ یہ وبا عالمگیر پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے، اسی وجہ سے کوئی کسی پر ذرہ برابر اعتماد نہیں کرتا، تم خود اپنے متعلقین کا گہری نظر سے جائزہ لو، دیکھو کتنے ایسے ہیں جن کے بارے میں تمہیں اطمینان ہے کہ وہ کبھی تمہارے خلاف زبان وعمل سے کوئی حرکت نہیں کریں گے، یا کون ہے جو تم پر اتنا اطمینان کرتا ہے، مشکل سے ایک آدھ نکلے گا، بلکہ ایک بھی نہیں، یہ کیوں ہے؟ اسی لئے تو کہ ہر شخص دوسرے کی عیب چینی میں مشغول ہے، اپنا عیب کسی کو نظر نہیں آتا، اور آتا بھی ہے تو اہم نہیں سمجھتا، یہ خود بینی بھی بہت بری بلا ہے، اس سے بچنے کا بس یہ طریقہ ہے کہ اپنے اعمال وافعال کا ہر وقت محاسبہ کرتے رہو، اور اس طور پر کرو کہ ہمارے فلاں فعل سے خدا کی رضامندی اور فلاں فعل سے خدا کی ناراضگی ہوتی ہے، اس نظریئے سے نہیں کہ فلاں کام کروں گا تو لوگوں کی نگاہ یا فلاں شخص کی نگاہ میں میری وقعت گر جائے گی، آج کل اگر غور کر کے جائزہ لو تو ہمارے زیادہ تر افعال واعمال کی بنیاد یہی ملے گی کہ فلاں کام ہماری بے عزتی کا باعث ہوگا، اسی لئے ایسا کام ہم تنہائی میں کر گزرتے ہیں، اور اگر وہ فعل ظاہر ہو جاتا ہے تو ہمیں بے انتہاء شرمندگی ہوتی ہے، اس کے برخلاف اچھے اعمال کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اس سے ہماری وقعت وعزت ہوگی، اَقران وامثال یا اساتذہ واکابر کی نگاہ میں ہم معزز ہو جائیں گے۔ محنتی طالب علم محنت کرتا ہے کہ اچھے نمبر حاصل کرے، اور دیوبند میں فرسٹ کلاس کہلائے۔ زاہد اس لئے زُہد اختیار کرتا ہے کہ لوگوں میں عزت وحرمت بڑھے، یہ کون دیکھتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہوں گے، میرے بھائی یہی دنیا ہے، تم یہ نظریہ کبھی نہ اپناؤ، مخلوق کو لگاؤ جوتے اور خالق کو

دیکھو کہ کون سا عمل ان کو پسند آئے گا، چاہے دنیا ہزار ناپسند کرے، جب اس نقطۂ نظر سے اپنے اعمال پر غور کروگے تو نماز روزہ بھی باعث وبال نظر آئیں گے، کیونکہ نماز خدا کے نزدیک وہی پسند آتی ہے جو خشوع وخضوع اور حضورِ دل سے پڑھی جائے، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سب وبالِ جان معلوم ہوگا، کیونکہ کسی کام میں یہ نیت نہیں ہوتی کہ میں خدا کا حکم پورا کر رہا ہوں، سب لاپرواہی سے مشینی طور پر انجام پاتے ہیں بلا قصد وارادہ، میاں ایسا کام خدا لے کر کیا کریں گے، بہت تیقظ وبیداری کی ضرورت ہے، جب اپنے اعمال وافعال کا مسلسل محاسبہ کروگے تو اپنے عیوب مستحضر ہوجائیں گے، پھر تمہیں فرصت ہی نہیں ملے گی کہ دوسروں کے عیب کی جستجو میں پڑو، دل کی مثال ایک زمین کی سی ہے جس پر مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے، ہر وقت طرح طرح کے خیالات اس پر گزرتے رہتے ہیں، تم غور سے دیکھو ان میں کتنے ایسے خیالات ہوتے ہیں کہ جن کو لوگوں کے سامنے بیان کرسکتے ہو، اب تم سوچو سب خیالات خداوند کریم دیکھ اور سن رہے ہیں، آدمی کو تو شرمندگی سے کٹ جانا چاہئے، مگر بے حیا جئے جاتا ہے، یقین ہے کہ کل میدانِ قیامت میں سب راز ظاہر کردئے جائیں گے، جب یہ بات سامنے ہوگی تو اپنے اندر کوئی ہنر اور خوبی نہیں معلوم ہوگی، اور یہی مطلوب ہے۔

اب رہ گیا مسئلہ تنعم کا، تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی مالی حیثیت بلند ہے، اور وہ اسی بلندی پر رہتے ہیں، باقی لوگ متوسط طبقہ میں ہیں، وہ بھی انھیں کی ریس کرتے ہیں، مالداروں میں عیش پرستی لازماً آہی جاتی ہے، اور وہ اس کا نام تمدن رکھتے ہیں، اور اس تمدن کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ بلائے جان ہے، اور تم لوگوں کو چونکہ اس ماحول سے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا، اس لئے اس کے بالکل عادی ہوجاتے ہو اور اس کے خلاف میں عار محسوس ہوتا ہے۔ خیر اس پر

کبھی زبانی گفتگو میں مکمل بحث کروں گا، تمھیں اس سلسلے میں کرنا یہ ہے کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کے تکلفات سے دور رہو، دار العلوم دیوبند میں کھانے پکانے کا بہت رواج ہے، اور اس میں کافی انہماک رہتا ہے، ایسا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں فرصت بہت زیادہ ہے، اس کے علاوہ زرق برق لباس کا بھی اہتمام رہتا ہے یہ سب تکلفات میں داخل ہے، وقت پر جو میسر آئے اللہ کا شکر ادا کرکے کھالو، زیادہ پسند و ناپسند اور لذتِ کام و دہن کے چکر میں نہ پڑو،، ہفتہ میں ایک مرتبہ کپڑا بدلنے کو کافی سمجھو، سامان کم سے کم رکھو، خوامخواہ زیادہ سامان کا بوجھ نہ رکھو، نرم گرم بستروں پر سونے والا صبح کی نماز کیسے پڑھے گا، اوقاتِ درس میں کیسے بیٹھے گا، تم اپنے مشاغل علمیہ میں اتنا منہمک رہو کہ ان سب کاموں کی جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی رہے، غالباً حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خدمت میں ایک نوجوان آیا، رہنے لگا، اس کے بال بڑھے اور بکھرے ہوئے، خط بڑھا ہوا، کپڑے میلے، غرض حالت خراب وخستہ، لوگوں نے کہا میاں اپنی صورت تو ٹھیک کرلو، کپڑے دھولو، اس نے کہا مجھے فرصت نہیں، شاہ صاحب نے اس جواب کو سنا تو ان کو وجد آگیا، فرمایا یہ کام کا آدمی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ تم گندے رہو، لیکن ایسے بھی نہ رہو کہ جب کوئی دیکھے یہی سمجھے کہ ابھی نیا لباس پہنا ہے، میاں طالب علم کو اتنی فرصت کہاں، عیش کو حرام کرو، تب علم آوے گا، ورنہ مولوی کا نام لگ جائے گا اور کچھ نہ ہوگا۔

عام وخاص، ہر گناہ سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ اول گناہ کو گناہ جان لو، اور اللہ تعالیٰ کا استحضار رکھو کہ وہ مجھے ہر وقت اور ہر حال میں دیکھ رہے ہیں، اور میرا کوئی فعل ان سے پوشیدہ نہیں ہے، اور ہمت سے کام لے کر ایک ایک گناہ ترک کرتے چلے جاؤ، اللہ کی جناب میں توبہ ہر روز کرو، اور ہر گناہ سے کرو، انشاء اللہ خیر کا

دروازہ کھلے گا۔

اور ہاں طلباء کے ساتھ زیادہ خلا ملا ہرگز نہ رکھو، زیادہ تر تنہائی میں رہ کر کتاب میں مشغول رہنے کی کوشش کرو، زیادہ خرابی مجلس ہی سے آتی ہے، آج کل حقیقی دوست جو خیر پر مدد کرے اور شر سے بچائے، کمیاب ہی نہیں نایاب ہے۔ اس لئے ہر شخص سے احتراز کرو، خصوصاً اپنے قریبی جن سے زیادہ بے تکلفی ہو ان سے کم سے کم ملو، اساتذہ میں سوائے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے اور کسی کے پاس جانا کچھ مفید نہیں ہوگا، بلکہ مضر ہی ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حصول علم کا مقصد رضائے خداوندی بناؤ، اور رضاء کے لئے جو چیزیں مفید ہیں، ان کو استعمال کرو، باقی سب ترک کرو اور ہر وقت اپنے اعمال واحوال کا تنقیدی جائزہ لیتے رہو، اپنے نفس سے کبھی مطمئن نہ رہو۔

اندریں رہ می تراش ومی خراش   تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

دعا کا طالب ہوں، اور دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ علم نافع، عمل صالح اور اپنی رضا سے نوازیں۔ آمین

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۸؍ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۲۱)

عزیزم مولوی وسیم احمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا عربی مکتوب ملا، بارک اللہ فیک، بعض اغلاط ہیں، کوشش اور محنت کرتے رہوگے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ خاص لحاظ کرنے کی بات یہ ہے کہ الفاظ کے مظان (مواقع) استعمال معلوم کرو، ایک ہی لفظ اُردو میں دوسرے معنوں میں،

اور عربی میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کو پہچاننا ضروری ہے، مثلاً مضمون اردو میں جس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، عربی میں اس معنی میں نہیں آتا ہے، اس فرق کو بہت دقت نگاہ سے سمجھنا ہوگا، معلم الانشاء حصہ دوم، سوم کا مطالعہ غور سے کرو، تو بہت کچھ معلوم ہو جائے گا، کچھ الفاظ کی فہرست اس کے آخر میں بھی ہے، اس کے علاوہ عربی میں مؤنث معنوی کی خاصی تعداد آتی ہے، اس کی جستجو کرتے رہو، اسی طرح موصوف صفت کی موافقت بہت اہم اور ضروری ہے، اس میں بہت غلطی واقع ہوتی ہے۔ الحمدللہ میں بخیر ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۸؍ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

(۲۲)

عزیزم وسیم!

وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته

جو سوال تم نے اُٹھایا ہے وہ خاصا تفصیل طلب ہے، اتنا موقع میرے پاس کہاں کہ اس کو مفصل تحریر کرسکوں، کبھی ملاقات ہو اور یاد دلاؤ تو کسی قدر تفصیل عرض کردوں گا، خلاصہ اس کا یہ سمجھو کہ **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده**، حدیث میں آیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ حقیقت میں مسلمان کہلانے مستحق وہی ہے جس کی زبان یا ہاتھ سے دوسرے مسلمان اپنے کو محفوظ سمجھیں، اور اب ایسا سو میں ایک بھی نظر نہیں آتا، اس لئے کہ روحِ اسلام لوگوں کے قلوب سے نکل چکی ہے۔

سلطنت جسم کا سلطان ''قلب'' ہے، یاروں نے اسے مہمل چھوڑ دیا ہے، یہ

سارے امراض وہیں سے اُبلتے ہیں، سب کا منبع وہی ہے، اب دنیا والے جسم وصورت کی آراستگی وزیبائش میں اس طرح منہمک ہیں کہ سلطان قلب کی جانب کسی کو توجہ وخیال ہی نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نجاستوں اور پلیدگیوں سے بھر گیا، پھر برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی باہر نکلتا ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا اس کے بعد بے اطمینانی، بدگمانی، اضطراب، بے اعتمادی سے بھرنا ضروری تھا، چنانچہ یہی ہوا، یہ سب اسی لئے ہوا کہ دل نہیں سنورا، اب کوئی چاہے کہ یہ خصائل بد چھوڑے تو نہیں چھوڑ سکتا، کیونکہ جڑ خراب ہو چکی ہے، خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور اس کی اصلاح کر لی، یہ تو تمہارے سوال کا مجمل جواب ہے۔

اب یہ بتاتا ہوں کہ ساری دنیا کا چکر چھوڑ دو، دوست واحباب سے منہ موڑ لو، اپنے اس لطیفۂ قلب کو جو درحقیقت لطیفۂ غیبی ہے، اس کو درست کرنے کی جانب توجہ دو، اگر تمہارا قلب احکامِ الٰہی میں رنگ گیا تو بس سب ٹھیک ہے، اور اس کی درستگی موقوف ہے کسی ایسے شخص پر جو اپنا قلب درست کر چکا ہو۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی صاحب (مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ، المتوفی ستمبر ۱۹۹۶ء) کی ہستی اس کے لئے بہت مناسب ہے، اگر ان کے پاس آمد ورفت رکھو تو بہت بہتر ہے، لیکن اس میں یہ نیت نہ ہونے پائے کہ حضرت مفتی صاحب کا مقرب بن جاؤں گا، اور اپنے اقران وامثال میں امتیاز کا موقع ملے گا، اس نیت سے تباہی آئے گی۔ مقصد یہ ہو کہ حضرت کی صحبت نیک کی برکت سے نیک وبد کی تمیز آئے گی، نفحاتِ الٰہیہ جو بزرگانِ دین کے قلوبِ صافیہ پر دم بدم متوجہ ہوتے رہتے ہیں، ان کی کچھ لپٹیں ہم ناکاروں پر بھی منعطف ہو جائیں، اس طرح قلوب کی اصلاح ودرستگی کا موقع بہم پہونچ جائے۔

اگر میرا یہ مشورہ کسی درجہ میں قابل عمل ہو، تو حضرت مفتی صاحب کو ایک پرچہ کے ذریعہ اپنا مقصود بتلا دو، پھر وقتاً فوقتاً ادب وتواضع کے ساتھ ان کی صحبت میں بیٹھا کرو، اور ان کے کسی قول وفعل پر لساناً وقلباً کسی طرح کا اعتراض وانکار نہ کرو، انشاء اللہ بہت جلد فائدہ محسوس کروگے۔

میرے عزیزو! موجودہ حالات میں یہ امر بہت ضروری ہے، اگر مناسب سمجھو تو حضرت پر یہ بھی ظاہر کردو کہ ایک شخص کی ہدایت پر ایسا کررہا ہوں، اور مناسب موقع دیکھ کر میرے لئے بھی دعاء کی درخواست کردو، اور ہاں! کسی کے کہنے سننے پر کان نہ دھرنا، آج کل خیر خواہ مفقود اور بدخواہ بہت ہیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

بنام مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب

میں جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس میں مدرس تھا۔ قدوری کے طلباء کی ایک چھوٹی سی جماعت میرے سامنے بیٹھی تھی ، ایک کمسن طالب علم نے قدوری کی عبارت پڑھنی شروع کی ، بہت صاف اور بہت صحیح۔ آواز قدرے بلند ، میں نے استعجاب کی نظر اس پر ڈالی ۔ شکل وصورت سے معمولی اور لباس سے بہت غریب معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس پر خصوصی توجہ کی ، میری نگرانی میں اس نے دیوبند تک تعلیم حاصل کی ۔ وہ بہت غریب اور یتیم طالب علم تھا ، پھر اللہ نے اسے نوازا ، اس کے ذریعہ سے علم دین کی خوب اشاعت ہوئی اور بکثرت علماء تیار ہوئے۔ یہ ہیں مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب ! جو اب اپنے وطن بھوارہ ضلع مدھوبنی میں قاضی شریعت اور مدرسہ فلاح المسلمین کے صدر مدرس ہیں۔ اللہ ان کی عمر اور علم میں برکت عطا فرمائے۔

عزیزم محمد حبیب اللہ سلّمہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں ایک ملفوف ملا تھا، آج کارڈ ملا، حالات معلوم ہونے سے سکون ہوتا ہے، آج سے پڑھائی کا آغاز تو ہوگیا ہوگا، ہر طرف سے کامل یکسوئی حاصل کرکے امورِ تعلیمی میں منہمک ہوجاؤ، رسمی طالب علمی جو نام ہے بے قیدی اور آزادی کا۔ جو عبارت ہے لااُبالی پن اور غفلت ومدہوشی سے۔ جس میں ہر طرح کی قید وبند سے رہائی حاصل ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ ایمان اور اعمال ضروریہ کی بھی فکر باقی نہیں رہتی، ایسی طالب علمی سے بہت دور ونفور رہنے کی ضرورت ہے۔

عزیزِ من! آج کل دور بڑے ہی فتنے کا ہے، قدم قدم پر فتنہ اُبلتا ہے، اور حسرت تو یہ ہے کہ اس کی نشاندہی کرنے والا کوئی نہیں ہے، نشاندہی تو الگ رہی اب الا ماشاء اللہ فتنہ کو فتنہ سمجھنے والے بھی خال خال ہی رہ گئے ہیں، ورنہ فساد کو ترقی وعروج کے مترادف سمجھا جاتا ہے، ایسے وقت میں علم صحیح حاصل ہو تو کہاں سے؟ اسی بنا پر کہتا ہوں کہ زیادہ اختلاط وتعلقات سے پرہیز ضروری ہے، دیکھو جس کے پاس جو چیز ہوگی، اس کے اثرات سے تم محفوظ نہیں رہ سکتے، اگر عالم کی صحبت میں علم حاصل ہوتا ہے تو کیا جاہل کی صحبت میں اس کے جہل کے اثرِ بد سے محفوظ رہ سکتے ہو، اور میاں! آج کل جن کو پڑھا لکھا خیال کیا جاتا ہے، وہ بیشتر جاہل ہوتے ہیں، سمجھے کیا کہہ رہا ہوں پڑھا لکھا وہ ہے جس کے قلب وجوارح میں خوف وخشیت الٰہی کا اثر ہو اللہ کی محبت اس کے دل میں ہو، دنیاوی جاہ وجلال سے اس کا دل سرد ہو، ایسے آدمی کتنے ملتے ہیں، اس کے علاوہ ہدایہ ومشکوٰۃ پڑھ لینے سے عالم کا نام تو لگ جاتا ہے، باقی حقیقت کہاں؟ اسی کو رسمی طالب علمی کہا کرتا ہوں۔

میاں سنو! تم ایک بڑی بھیڑ میں پہونچے ہو، اس لئے مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں یارانِ طریقت تمہیں لے نہ ڈوبیں، خیریت گمنامی میں ہے، اگر یہ میسر نہ ہوتو بہر حال تعلقات تو بہت محدود ومختصر ہوں، درس کے علاوہ اوقات میں کتب خانہ میں رہا کرو، طلبہ کی عام مجالس جس کا دیوبند میں بہت رواج ہے، ہرگز ہرگز شریک نہ ہو، اور ہاں دیکھو جماعت اسلامی کے لٹریچر کے قریب بھی نہ پھٹکنا اور نہ اس کے افراد سے بات کرنا، اس سلسلے میں بہت کچھ بتا چکا ہوں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر تمہیں اعتماد باقی ہوگا، میری مراد یہ ہے کہ طالب علمی، سچی طالب علمی ہو، اور پڑھ کر فارغ ہوتو چاہے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ تمہارے پاس نہ ہو لیکن علم کا نور کچھ نہ کچھ حاصل ہوجائے اور بس ۔ میری اس گفتگو سے تم کیا سمجھے؟ تحریر کرو، میں الحمدللہ بخیر ہوں ۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۵/ ذوقعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم محمد حبیب اللہ سلّمہٗ! **جعلك اللّٰه له حبيباً**

السلام عليكم ورحمة اللّٰه وبركاته

کل شام کو تمہارا خط ملا، سوچتا تھا کہ کیا جواب لکھوں، آج صبح تھوڑی سی فرصت ملی، اقبال کی زبورِ عجم ہاتھوں میں تھی، کھولا تو یہ داؤدِ عجم یوں زمزمہ پرواز تھا

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہوائے او ببالِ تو دہد پرواز کوتاہے

غبارے گشتۂ آسودہ نتواں زیستن ایں جا
ببادِ صبحدم در پیچ و منشیں بر سرِ راہے
ز جوئے کہکشاں بگذر، ز نیلِ آسماں بگذر
ز منزل دل بمیرد، گرچہ باشد منزلِ ماہے
اگر زاں برقِ بے پروا، درونِ او تہی گردد
بچشمم کوہِ سینا می نیرزد، با پرِ کاہے

کچھ سمجھے! اقبال کہتا ہے کہ:

☆اے بلند ہمت شاہین! تم نے اپنا آشیانہ چمن میں بنالیا ہے، کچھ خبر بھی ہے، چمن کی آب وہوا بازوئے پرواز میں ضعف وشکستگی پیدا کردیتی ہے☆ (اقبال کا شاہین مومن ہے) ☆ اوہو! تم غبار ہوگئے ہو، اور پھر راستہ میں بیٹھ گئے ہو، یہاں اطمینان کی زندگی نہیں گزر سکتی، ہر آنے والا پامال کرے گا، بادِ صبح میں اُڑ جاؤ، راستہ میں نہ بیٹھو☆ اور ہمت تو اتنی بلند رکھو کہ کہکشاں کی نہر روشن سے گزر جاؤ، آسمان کے نیل بیکراں سے آگے بڑھ جاؤ، اور منزل ہرگز نہ کرو، منزل کرنے سے دل مرجاتا ہے، خواہ چاند کی ہی منزل کیوں نہ ہو☆ کوہِ سینا جو اک مقدس وعظیم پہاڑ ہے، اگر وہ بھی اس برقِ بے پروا سے خالی ہوجائے تو میری نگاہ میں اس کی بھی وقعت تنکے کے برابر نہ رہے گی۔ (طورِ سینا پر تجلی الٰہی کا نزول ہوا تھا، شاعر نے برقِ بے پروا سے اسی کی جانب اشارہ کیا ہے)

ان اشعار کے نقل کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں نے اپنے جن لوگوں کو علم دین اور دین اور سب سے بڑھ کر طلبِ الٰہی کے شرارِ آرزو سے بھر کر بھیجا ہے، ہر وقت اندیشہ ناک رہتا ہوں کہ خداوندانِ مکتب ان کو رُوباہی کا سبق نہ دینے لگ

جائیں، میرے لوگوں کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے، وہ ہے دین اور دین کے مالک کو پالینے کی لگن اور جنونِ آرزو، حطامِ دنیا تمہارا مقصد نہیں، عزت وجاہ تمہارا مطمحِ نظر نہیں، تمہیں عشق و دیوانگی ہی زیب دیتی ہے، دنیا میں عاقلوں اور فرزانوں کی کمی نہیں ہے، دیوانوں کی کمی ہے، نگاہ اُٹھاؤ، گردوپیش کو دیکھو، بیشتر ایسے ہیں جن کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ماں باپ نے بھیج دیا، آگئے اور بس۔ جو ذرا ان سے آگے ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ پڑھ کر کسی دھندے میں لگیں گے، ان سے بڑھ کر وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم عربی تحریر وتقریر کی مشق کر کے ملک عرب کی راہ لیں گے یہ سب کیا ہے؟ دنیا ہے، دین ایک بھی نہیں ہے، دین صرف یہ ہے کہ حصول علم کے راستے میں نظر خالق علم کے سوا کسی پر نہ ہو، اور یہ اتنا بڑا مقصد ہے کہ اس کے سامنے اور چیزوں کو مقصد کہنا ہی مہمل ہے، بھائی تم نے اچھی تقریر کر لی تو ایک اچھے مقرر ہو جاؤ گے، کیا آج کل کی تقریریں خدا کو پسند آتی ہیں، تم نے بہت عمدہ لکھنا سیکھ لیا تو مانا کہ اچھے مصنف بن جاؤ گے، لیکن کیا حاصل؟ یہ سب ہیچ ہے، ایک خدا کے ہو جاؤ، پھر وہ جو کام لینا چاہیں گے اس کا راستہ آسان کر دیں گے، ابھی صرف پڑھو، علم بڑھانے کی کوشش کرو، ذہن و دماغ کو جِلا دو، کتب درسیہ میں خاص محنت کرو، معصیت و نافرمانی سے دور بھاگو کہ اس کے ساتھ علم تو نہیں آسکتا چاہے معلومات بڑھ جائیں، یاد رکھو معلومات کا نام علم نہیں، علم اس نور کا نام ہے جو مومن کے قلب صافی میں رکھا جاتا ہے، جس سے حقائق اشیاء تک رسائی ہو جاتی ہے، دیکھو صحابہ کی صفت **أعمقهم علماً** آتی ہے، حالانکہ ان کے پاس معلومات بہت کم تھیں، اور یہ جو اخباری معلومات، صنعت وحرفت کی معلومات و تجربات کا نام علم رکھ دیا ہے، یہ سراسر جہل ہے، علم حقیقت میں وہ ہے جو رضائے الٰہی کا راستہ بتائے، لیکن خوب سمجھ لو آج کل یہ راستہ بالکل متروک ہے، اکیلے چلنا پڑے گا،

لوگ بہت ڈرائیں گے، کہ میاں کہاں جا رہے ہو، اس راستے میں فقر ہے، غربت ہے، ذلت ہے، ناکامی ہے، آہ! کہ وہ غافل ہیں، محبوب کے راستے کی فقیری عین امیری ہے، غربت ہی دولت ہے، ذلت کا نام عزت ہے، ناکامی ہی کامیابی سے عبارت ہے، کچھ ڈرو نہیں، گھبراؤ نہیں۔ اوروں کا جہاں اور ہے تیرا جہاں اور، کہاں ان ظالموں کے چکر میں پڑ لئے، ہر انجمن کو تین طلاق دو، اور اپنے دل کی انجمن سجاؤ، دل کو مردہ کر کے زبان کو زندہ کرنا دورِ جدید کی لعنتوں میں سے ایک لعنت ہے۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسرو وسمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

جانتے ہو دار العلوم ہو یا کوئی اور ادارہ، فساد کی اصل جڑ کیا ہے، یہی انجمن، اور انجمن سازی۔ بھائی! میں تو انجمن ہی کا کشتہ ہوں، بظاہر یہ بہت خوبصورت ہوتی ہے، لیکن یہ انسان کو کچھ دینے کے بجائے اس کی جان، مال، آبرو سب کچھ لے لیتی ہے، **فالحذر فالحذر**۔ شاید میری بات تمہیں انہونی اور اوپری معلوم ہو لیکن بھائی اگر میرے تجربے پر اعتماد ہے تو اس کو قبول کر لو، اب رہ گئی یہ بات کہ تمہارا نام آ گیا ہے، اب کیا کرو گے، اگر صراحۃً مخالفت کرو گے تو طلبہ پیچھے پڑ کر عافیت تنگ کر دیں گے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ انجمن وغیرہ سے دلچسپی لینا بالکل کم کر دو، اور انجمن والوں پر ثابت کر دو کہ تمہارے اندر صلاحیت ہے ہی نہیں، بس پیچھا چھوڑ دیں گے، اور ہاں دیکھو طلبۂ دار العلوم میں علاقائی عصبیت بہت ہوتی ہے، یوپی بہار کا جھگڑا مستقل رہتا ہے، پھر ضلع ضلع کی الگ الگ مسجد ڈیڑھ اینٹ کی بنی ہوتی ہے، تم لوگوں کو ان جاہلانہ عصبیات سے بالکل الگ تھلگ رہنا ہے۔ علم و دین کسی خاص علاقہ و خطہ کی جاگیر نہیں ہے، ان سب چیزوں میں پڑ کر اپنے آپ کو تباہ مت کر لینا، اگر کبھی ملنا جلنا ہو تو

دوسرے ہی ضلعوں کے لوگوں سے ملوجلو، اپنے ضلع کے لوگ بہت نقصان کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ ہر اس چیز سے دور رہو جو تمہاری تعلیم اور تعلیمی مشاغل میں حارج ہو، اور یہ جتنی چیزیں میں نے ذکر کی ہیں وہ سب انتہائی قاتل ہیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں ادبی ذخیرہ اچھا خاصا ہوتا ہے، لیکن اے بسا ابلیس آدم روئے ہست، قند کے اندر زہر ہلاہل ملا ہوا ہے، اور اس سے خاص طور سے اس لئے روکتا ہوں کہ یہ فتنہ دارالعلوم میں بہت سر اُٹھائے ہوئے ہے، اگر ادبی چیزیں حاصل ہی کرنی ہیں تو مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا علی میاں، مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ کی کتابیں بہت کافی ہیں، اگر محنت کر کے سیرۃ النبی ہی کا مطالعہ کر ڈالو تو ایک کام ہو جائے۔ مولانا بدرِ عالم صاحبؒ کی ترجمان السنہ بھی بہت عمدہ ہے، علم اور ادب، عشق و محبت ہر اعتبار سے۔

قلبی کیفیات کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے، تو یہ چیزیں از قبیل خواطر ہیں، ان سے کسی انسان کو مفر نہیں، ان کا علاج بس یہ ہے کہ ان کی طرف التفات بالکل نہ کیا جائے، یہ خیالات دل میں ہوتے ہی نہیں، شیطان باہر سے داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بس، جیسا کہ آئینہ پر پر مکھی بیٹھی ہو تو اس کے اندر نظر آتی ہے، حالانکہ باہر ہوتی ہے، ایسے ہی یہ خیالات دل کے باہر ہوتے ہیں، اندر نہیں، مگر اندر نظر آتے ہیں، کچھ مضر نہیں، ان کی فکر بالکل نہ کرو، توجہ اپنی پڑھائی لکھائی کی جانب منعطف رکھو۔

باقی آخری بات یہ ہے کہ خود را فضیحت اور دیگراں را نصیحت کا پورا پورا مصداق ہوں، بد ہوں بلکہ بدتر ہوں، تم لوگ دعا سے میری مدد کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائیں، آہ! شاید نظر عنایت ہو جائے، ایک رَو میں لکھتا چلا گیا، انتشارِ مضامین

بہت ہوگا، امید کہ میرا مقصد پالوگے۔ والسلام

فقیر ودرماندہ، اعجاز احمد اعظمی

۱۳/ ذوقعدہ ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم محمد حبیب اللہ سلّمہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط کا مختصر جواب دے چکا ہوں۔ اس وقت فرصت بہت محدود تھی اس لئے چند سطروں پر اکتفا کیا، نیز کوئی بات ایسی ذہن میں تھی بھی نہیں جسے قابل تحریر سمجھتا۔ پھر اس کے بعد چند امور ذہن میں آئے، سوچتا رہا کہ لکھوں یا نہ، مگر پھر سوچا کہ لکھ دینا ہی مناسب ہوگا۔ ہوسکتا ہے کچھ مفید ہو۔

مدرسہ دیوبند میں سال کے تین مراحل ہوتے ہیں۔ ابتدائی جو سہ ماہی امتحان پر پورا ہوجاتا ہے۔ ثانوی جو ششماہی امتحان پر تمام ہوتا ہے۔ پھر آخری جو سالانہ امتحان تک ممتد ہوتا ہے۔

اب غور سے جائزہ لو۔ سہ ماہی تک کیسا کچھ گزرا۔ اس سال کا یہ وقت وہ تھا جو تمہارے لئے نیا تھا، شناسائی محدود، تعلقات کم، اجنبیت زیادہ، ماحول سے آمیز کم کم۔ تم نے بھی کم لوگوں کو جانا پہچانا ہوگا۔ لوگ بھی تمہیں کم جانتے پہچانتے رہے ہوں گے۔ یہ وقت اس لحاظ سے بہت ٹھیک تھا کہ غفلت وبے احتیاطی کم رہی ہوگی۔

اب دوسرے مرحلے میں تم داخل ہوئے ہو، یہ مرحلہ زیادہ اہم ہے، کیونکہ کچھ تو امتدادِ وقت نے اور کچھ اعلان نتائج نے اور اس سے قبل امتحان کی ہماہمی نے تمہیں روشناس کرایا ہوگا۔ اس کے بعد آدمی میں ایک خاص قسم کا ولولہ پیدا ہوتا ہے،

اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں شہرت طلبی کا جذبہ ترقی پا کر تعلقات کو وسیع کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ جذبہ بظاہر اچھا اور بے ضرر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں دوسروں کو فائدہ پہونچانے اور دوسروں سے کچھ حاصل کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے، لیکن تم جانتے ہو یہ صورت حال میری نگاہ میں خاصی مضر ہے۔ اتنی کہ بعض اوقات آدمی کی صلاحیتیں غلط رُخ پر ہو لیتی ہیں اور نتیجہ بربادی تک پہونچ جاتا ہے، اس لئے میں اب خاص طور سے ہدایت کرتا ہوں کہ بہت سختی سے اپنے آپ کا اور وقت کا محاسبہ اور جائزہ لو۔ جہاں کہیں رخنہ پیدا ہو گیا ہو یا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، ہوشیاری کے ساتھ بند کر دو۔ آدمی کے وقت اور صلاحیت کو دو چیزیں گھن کی طرح کھاتی ہیں۔ بہت زیادہ گفتگو میں حصہ لینا۔ اپنے مزاج و کام کے خلاف افراد سے تعلقات۔ اب ضرورت ہے کہ محنت و مشقت نے تمہیں جس جگہ لا کھڑا کیا ہے اب وہاں سے آگے بڑھو۔ اس وقت ساری قوت تمامتر صلاحیت اسی ایک کام پر لگنی چاہئے۔ وقت کی قدر و قیمت اس مرحلہ میں اور بڑھ گئی ہے۔ یکسوئی بہت ضروری ہے، اسباق بہت غور سے مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے جاؤ، اب اساتذہ کی تقریریں مختصر اور مجمل ہوں گی۔ سمجھنے میں دقت ہوگی، مطالعہ ہی ایسے موقع پر کام آئے گا، کوئی بات سمجھے بغیر نہ گزرو۔ اور سمجھنا بھی ایسا کہ اس کے سمجھانے پر قدرت ہو جائے، کتاب خواہ کوئی ہو، پوری مستعدی کے ساتھ مطالعہ کرو۔ خصوصاً ہدایہ اخیرین، اول کتاب کو بغیر کسی شرح و حاشیہ کی معاونت کے ذہن پر زور ڈال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر کام نہ چل سکے تب کسی شرح و حاشیہ کا رُخ کرو، اگر شرح دیکھنے کی ضرورت ہو تو ہدایہ کے سلسلے میں بجائے فتح القدیر کے عنایہ زیادہ بہتر ہوگی، وہ مختصر اور واضح ہے، میبذی کیلئے عین القضاۃ۔ اساتذہ کا لفظ لفظ سننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ سبق کے بعد

پھراس پر ایک دو بار نگاہ ڈالو، یہاں تک کہ مسئلہ بالکل ہضم ہوجائے، اور بغیر کتاب دیکھے اس کے بیان کی قدرت ہوجائے۔ یہ اُصول تعلیم کا رکھو۔ مختصر طور پر اصولی بات بیان کردی، اگر کوئی سوال ہو تو پوچھ لینا۔

اب دوسری بات سنو! دارالعلوم کا ماحول تو اب بالکل سمجھ چکے ہوگے کہ کیا ہے، مجھے یہ معلوم ہے کہ جماعت اسلامی وغیرہ سے تمہیں بہت بعد ہے۔ الحمدللہ یہ بہت اچھی بات ہے، ابھی ان کے لٹریچر کو ہاتھ نہ لگانا اور نہ ایسے لوگوں سے ملنا۔ بہت دور رہنے کی کوشش کرو۔ اگر کوئی اس کے مطالعہ کیلئے رہنمائی کرے اور وسیع النظر بننے کا مغالطہ دے تو ہرگز فریب میں نہ آنا۔ اس زمانے میں وسیع النظری بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی نابالغ کو طوائف خانوں کے طواف کی ہدایت کی جائے۔ اول صلابت فکر کی ضرورت ہے، پھر وسیع النظر ہونے کا مطلب درست رہتا ہے۔ ہرگز فریب میں نہ آنا خواہ تمہیں کتنا ہی تنگ نظر، متعصب، کوتاہ بیں وغیرہ کہا جائے۔ یہ سب فریب ہے، کسی انجمن، کسی مجلس، کسی کمیٹی میں ہرگز نہ پھٹکو۔ دربھنگہ والوں کی کوئی انجمن نہضۂ شبان المسلمین ہے، یا اسی طرح کا کچھ اور نام ہے، اس سے بھی دور ہی رہو، مجھ کو یہ سب مضر ہی معلوم ہوتی ہیں۔

تیسری بات سنو! اپنے اعمال کے سلسلے میں مضبوط رہو۔ نماز باجماعت سب سے اولین فریضہ ہے۔ تلاوت ہمیشہ کرتے رہو، مجھے افسوس ہے کہ تمہارے دونوں قرآن مجید کے نسخے میرے ہی پاس رہ گئے۔ انشاء اللہ آؤں گا تو لیتا آؤں گا۔ بہر کیف تلاوت ضروری ہے، بعد نمازِ فجر سورۂ یٰسین، بعد نمازِ مغرب سورہ واقعہ اور بعد نمازِ عشاء سورہ ملک اور سورہ الم سجدہ اور ہو سکے تو سورہ دخان بھی، نیز جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھنے کا معمول رکھو، اس میں بے انتہا فوائد ہیں۔ اور کوئی بہت زیادہ وقت

صرف نہیں ہوتا۔ دعاء استخارہ تم لوگوں نے یاد کی تھی، اس کو بھی ایک بار کسی نماز کے بعد باستحضارِ قلب پڑھ لیا کرو۔

آخری بات سنو! پڑھنے میں یہ نیت وارادہ ہرگز نہ رکھو کہ ذریعہ معاش کا ایک دھندا ہے، بلکہ قصد صرف یہ رکھو کہ علم دین حاصل کر کے اس کے مقتضیات پر عامل ہوں گے اور اس طرح اپنے رب کو راضی کریں گے۔ رزق ومعاش کے کفیل حضرت حق ہیں۔ ڈھلمل یقین مولویوں کی طرح اس چکر میں ہرگز نہ پڑنا۔ یہ خط اپنے سب ساتھیوں کو سنا دینا، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم محمد حبیب اللہ سلّمہٗ!

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

فتنہ کی خبر سے طبیعت کو تشویش ہوئی، آج کل فتنے جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں، فتنوں کی طرف جہاں کسی نے نگاہ اُٹھائی، وہ گیا۔ ان فتنوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، فتنے خود لپک لپک کر لگتے ہیں، اس لئے خوب مضبوط رہ کر محفوظ رہنے کی کوشش کرو، جو لوگ فتنے میں پڑے ہوئے ہیں ان سے بالکل نہ ملو، نہ ان کی گفتگو میں حصہ لو۔ زبان کو لگام دے لو، کان بند کر لو، نہ بولو اور نہ سنو، اور اللہ کی پناہ میں آجاؤ۔ **اللٰهم إنی أعوذ بک من الفتن ماظهر منها ومابطن**، رسول اکرم ﷺ کی وصیت ہے کہ فتنوں میں بیٹھنے والا کھڑے رہنے والے سے بہتر ہے، اور لیٹ جانے والا اس سے بہتر ہے، بعض اوقات طبیعت کے جوش کا تقاضا ہوتا ہے کہ

فلاں تحریک ہمارے اور طلبہ اور فلاں فلاں کے مفاد میں ہے، اس میں حصہ لینا مناسب ہے، یہ بات بہت مضر ہے، خبردار! یکسوئی سے بڑھ کر دولت نہیں، میں تم لوگوں کو آج کل کے فتنوں سے بہت ڈرا چکا ہوں، اور ڈراتا رہتا ہوں، اس کو خوب اچھی طرح گرہ میں باندھ لو اور سب ساتھیوں کو بھی میری یہ بات پہنچادو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم ! **السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ**

کل تمہارا خط ملا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے، تم میرا طریقہ سمجھے ہوئے ہو، غلطی سب سے ہوتی ہے، غلطی پر اَڑنا برا ہے، خدا کا شکر ہے تم ایسے نہیں ہو۔

اگر والدہ کا کوئی اہم کام ہو، تو ضرور بمبئی چلے جاؤ، لیکن خواہش ملاقات کی تھی، اگر چھٹی کے معاً بعد یہاں آجاتے، تو میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں، ویسے تم اپنی سہولت دیکھ لو، یہ معلوم کرلو کہ وہاں (دیوبند) سے بمبئی کا کرایہ کیا ہے؟ اگر کوئی صورت جمع بین الصورتین کی نکل سکے تو بہتر ہے، ورنہ میری مرضی پر والدہ کی مرضی مقدم ہے، البتہ اس کا خیال رکھو کہ جتنی دیر بمبئی میں کام ہو اتنا ہی ٹھہرو، مزید وہاں رہنے کی کوشش نہ کرنا، بمبئی ایسا شہر ہے جہاں دنیوی زیب وزینت اور مال ومتاع اس قدر ہیں کہ کسی کمزور انسان کا بچ نکلنا بڑا مشکل ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۳/ رجب ۱۳۹۶ھ

☆☆☆☆☆

(مکتوب الیہ کے گھر میں چوری ہوگئی تھی، اس موقع پر یہ خط لکھا گیا)

عزیزم ! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**

کل تمہارا خط ملا۔ بڑا انتظار تھا، حالات معلوم ہوئے، خدا کا شکر ادا کیا، کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا یہ بھی بہت ہے، حق تعالیٰ تمام نقصان کی تلافی فرمائیں، اور نعم البدل عطا فرمائیں۔

کتوں کے رونے کی کوئی اصل از روئے شرع مجھے معلوم نہیں۔ یہاں بھی روزانہ تجربہ ہوتا ہے، الہ آباد میں تھا، تو وہاں بھی یہی دیکھتا تھا، کبھی کبھی میرے ذہن میں بھی کھٹک پیدا ہوتی تھی، لیکن کبھی اس کے حل کی طرف ذہن نہیں گیا، بس یہ سوچ لیتا تھا کہ اذان کی آواز میں ایک طرح کا تسلسل ہوتا ہے، کتے اس سے متاثر ہوتے ہیں، اور وہ بھی آواز ملانے لگتے ہیں، چنانچہ اذان کی آواز سن کر وہ معتاد طریقہ پر نہیں بھونکتے بلکہ ایسی آواز نکالتے ہیں جس میں تسلسل ہوتا ہے، کبھی یہ توجیہ ذہن میں آتی کہ اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے **ولہ ضراط** ، کتوں کی طبیعت کو شیطان سے خاص مناسبت ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کا ذکر ہے، تو ان کے بھاگنے سے، اور بھگدڑ کی آواز سے کتے بھی متاثر ہوتے ہیں، اور بولنے لگتے ہیں، یہی دونوں توجیہیں ذہن میں آیا کرتی تھیں۔ باقی کسی کتاب میں اس مسئلے پر کچھ نہیں دیکھا۔

بعض اوقات کسی مصیبت کے آنے سے پہلے یا بعد میں کتے روتے ہیں، اس لئے کہ مصائب کی شکل مثالی انسانوں کے علاوہ دوسرے جانوروں پر کبھی کبھی منکشف ہوتی ہے، ایسا ہونا کچھ بعید نہیں ہے، تمہارے یہاں ایک بھونچال آچکا ہے، ہوسکتا ہے اس کی صورت مثالیہ سے کتے متوحش ہوتے ہوں۔ **والعلم عند اللہ**

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۵؍صفر ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم ! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**

درس قرآن کا سلسلہ شروع کردیا ہے، بہت اچھا کیا، معارف القرآن دیکھ لیا کرو، اسے پڑھ کر سنانا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا، قرآن کی اصل تفسیر کے لئے تفسیر ابن کثیر کو پیش نظر رکھو، لیکن ہم لوگوں کو صرف تفسیر بیان کرنا مطلوب نہیں ہے، ایک مقصد تذکیر بھی ہے، اور تذکیر کے لئے ہر جگہ کا اندازِ بیان، لہجہ اور معلومات الگ الگ ہوتے ہیں، اس کا انطباق کرنا، اور موجودہ ماحول کی اس سے اصلاح کرنی، ایک اہم کام ہے، اس لئے وعظ کے طور پر ہی مناسب ہے۔ اللہ کے کلام کے متعلق تمہارا خوف بالکل بجا ہے، یہ خوف ہمہ وقت رہنا چاہئے، لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ کتاب سنا دیجائے، مراداتِ قرآنیہ کا علم کتابوں سے حاصل کرکے محفوظ رکھو، پھر اس کا سہل بیان اور حالات حاضرہ پر اس کی تطبیق کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں۔

مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو قائم وباقی رکھیں اور اس سے راضی رہیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۹؍جمادی الاخریٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۴؍دسمبر ۱۹۹۳ء

☆☆☆☆☆

بنام مفتی عبد الشکور صاحب دربھنگوی

مولانا مفتی عبد الشکور صاحب دربھنگوی (سابق مدرس مدرسہ عربیہ اشرفیہ پوہدی بیلا، ضلع دربھنگہ) حضرت مولانا مدظلہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں حاصل کی، اس وقت حضرت مولانا وہیں مدرس تھے، پھر ایک سال مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں رہے، مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سے مدرسہ دینیہ غازی پور میں پڑھی، اور مظاہر علوم سہارن پور سے دورۂ حدیث پڑھ کر فراغت حاصل کی، افتاء مدرسہ ریاض العلوم گورینی سے کیا، پھر مدرسہ دینیہ غازی پور اور مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اب اپنے آبائی گاؤں سیسونی ضلع دربھنگہ میں ایک دینی درسگاہ چلا رہے ہیں۔

(ضیاء الحق خیر آبادی)

حبی و محبی عزیزی مولوی عبدالشکور!

عافاک اللّٰہ تعالیٰ فی الدنیا والآخرۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین ،،

اس سے پہلے محمد اسرائیل کو ایک مفصل خط لکھا ہے، اس کا خلاصہ تم کو بھی ایک کارڈ پر لکھ دیا تھا، لیکن میری غفلت سے وہ کارڈ میرے پاس ہی پڑا رہ گیا، اب دوبارہ اسرائیل کا خط آیا اور اس کے جواب میں پھر ایک مفصل مضمون قلم بند ہو گیا، اسے تمہارے پاس من وعن بھیج رہا ہوں، شاید نفع ہو۔

ایک حدیث ....جس کو امامِ ربّانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ نے اپنے اپنے مکتوبات میں کہیں کہیں نقل کیا ہے.......... میں آیا ہے کہ بندے سے خدا تعالیٰ کے اعراض کی علامت اس کا لایعنی میں اشتغال ہے، لایعنی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دنیا وآخرت کا کوئی فائدہ نہ ہو، دنیوی فائدہ سے مراد مباح فائدہ ہے ورنہ گناہوں میں بھی ایک عارضی ووقتی فائدہ اور لذت محسوس ہوتی ہے جس کو دنیادار فائدہ تصور کرتا ہے، درحقیقت گناہوں میں ابتلاء اللہ تعالیٰ کے اعراض کی علامت نہیں بلکہ اس کے قہر وغضب میں مبتلا ہونے کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ کے اعراض کی نشانی کسی ایسے کام میں اشتغال ہے جس سے نہ کوئی دنیوی مباح نفع ہو اور نہ اخروی منفعت!

اس اصول پر ہم تم اپنے اوقات کا جائزہ لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کس وقت خدا کی رحمت وعنایت ہم پر متوجہ ہوتی ہے، اور کس وقت ان کی مبارک توجہ وعنایت سے ہم محروم ہوتے ہیں، اور کس وقت ان کا قہر وغضب ہماری حرکتوں پر نازل ہوتا ہے

، اللہ کی طاعت، تعلیم میں مشغولیت، بقدر ضرورت تفریح اور تعلیمی تازگی حاصل کرنے کی غرض سے دوستوں سے باہم ہنس بول لینا یہ چیزیں اللہ کی عنایت ورحمت کے لئے جالب (کھینچنے والی) ہیں۔ بے ضرورت تفریح، مباحات میں غلو، اور فضول گھومنا پھرنا ہمیں خدا کی رحمت سے دور کر دیتا ہے، گناہوں کے اندر ابتلاء خدا کے قہر وغضب میں انسان کو ڈال دیتا ہے۔

ہر انسان کا عموماً اور ہر مسلمان کا خصوصاً فرضِ اولین ہے کہ وہ اپنے مالک ومعبود اور خالق ومربی کی رضا اور خوشنودی کے لئے کوشاں رہے، عشاق اپنے محبوب کے لئے جان کی بازی لگا دینا آسان سمجھتے ہیں، خدا کی رضا کے لئے اگر جان کی بازی لگائی جائے تو عین مناسب ہے کہ ہر مسلمان نے کلمۂ توحید پڑھ کر خدا سے عہد وفا باندھا ہے کہ خدایا! ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اور طالب علم نے تو مدرسہ میں داخل ہو کر اور وراثت نبوی کو حاصل کرنے کی نیت کر کے اس عہد و پیمان کی تجدید کی ہے، اسے تو ہر وقت اپنا یہ عہد و پیمان مستحضر رکھنا چاہئے، اس کی کوتاہی عجب نہیں کہ ناقابل معافی جرم بن جائے، ہر وقت دیکھ بھال رکھنی ضروری ہے، ہمارے مورثِ اعلیٰ سید الموجودات سرور کائنات فخر بنی آدم سیدنا ومولانا حضرت محمد رسول اللہ **فداہ ابی وامی وروحی وقلبی علیہ الف الف تحیۃ وصلوۃ** ہیں، آپ ہمارے روحانی باپ ہیں، جن کا ترکہ حاصل کرنا ہے، پھر

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراثِ پدر کیونکر ہو

اگر ان سے ہماری نسبت اور ہمارا رشتہ منقطع ہو گیا تو یقیناً ہم ترکہ پانے سے محروم رہیں گے۔ دیکھو وارث اور مورث کے دین میں تباین ہو، یا وارث نے مورث کو قتل کر دیا ہو تو وہ اپنے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے، بس یوں ہی سمجھ لو کہ حضرت رسول

مقبول ﷺ کا دین اور طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وخوشنودی کا حصول ہے، اگر ہم نے اپنا مذہب نافرمانی بنالیا یا کم ازکم فرمانبرداری کی لگن سے ہم خالی ہوگئے تو طریقہ بدل گیا، یا اگر ہم نے آپ کی سنتوں اور طریقوں کو ترک کرنا اپنا دستور بنالیا یا کم ازکم ان کا اہتمام باقی نہیں رکھا تو ہم ....معاذ اللہ سو بار اللہ کی پناہ! **أعاذنا الله منه وسائر المسلمين** ....آپ کی لائی ہوئی شریعت کے قاتل ثابت ہوں گے، سوچو کیسی محرومی کی بات ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ کا ترکہ ہمیں ملے گا۔

دیکھو یہ سطریں لکھتے ہوئے میرا دل کانپ گیا، بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا گئیں، کیا ہم نے اپنے آپ کو اس سطح پر اتار لیا ہے، جہاں ہم کو اس طرح خطاب کیا جائے؟ اللہ سے توفیق مانگو، استعاذہ کرو، **اللّٰهم نسألك علماً نافعاً ورزقاً طيباً وعملاً متقبلاً ونعوذبك من علمٍ لا ينفع وقلبٍ لايخشع ومن دعوةٍ لا يستجاب لها** (اے اللہ! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں علم نافع کا، رزق پاکیزہ کا، عمل مقبول کا اور ہم آپ کی پناہ میں آتے ہیں ایسے علم سے جو نافع نہ ہو، ایسے قلب سے جو خشوع سے خالی ہو، اور ایسی دعا سے جو قبولیت سے محروم ہو)

اصل یہ ہے کہ آدمی کو ہر وقت ایک دھن ہونی چاہئے کہ اللہ کی رضا کہاں سے، کس عمل سے، اور کس نیت وارادہ سے حاصل ہوسکتی ہے، اسی میں آدمی غلطاں وپیچاں رہے، سوچ سوچ کر ایسے اعمال اختیار کرے اور دل کی نیت ایسی بنائے جس سے حق تعالیٰ خوش ہوں، باقی سب ہیچ ہے، نہ دنیا کچھ ہے اور نہ اہل دنیا کچھ ہیں، سب پر جھاڑو پھیرو، پھر کیا ہوگا، بس تمہیں کیا بتاؤں، میں بتاؤں تو میری حیثیت کیا؟ ان کی زبان سے سنو جن کی صداقت وامانت پر دنیا اس وقت سے ایمان لائی ہوئی ہے جبکہ انھوں نے ایمان لانے کی ابھی دعوت بھی نہیں دی تھی، حق تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

یا عبدی أنا أقول للشئ کن ، فیکون أطعنی أجعلک تقول للشئ کن ، فیکون (اے میرے بندے! میں جب کسی چیز کے متعلق کہتا ہوں کہ ہوجا، تو وہ ہوجاتی ہے، تم میری فرمانبرداری کرو، میں تم کو بھی ایسا بنادوں گا کہ تم کسی چیز سے کہو گے کہ ہوجا تو وہ ہوجائے گی) اور **رُبَّ أشعث اغبر مدفوع بالابواب لوأقسم علی اللہ لأبرہ** (بعض پراگندہ بال، غبارآلود، دروازوں سے دھکا کھائے ہوئے لوگ ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر اعتماد کرکے کسی بات پر قسم کھالیں، تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرمادیں گے) اور **وإن من عباد اللہ من أقسم علی اللہ أن یزیل جبلاً أو الجبال عن أماکنھا لأزالھا وأن لا یقیم القیامۃ لما أقامھا** (بعض اللہ کے بندے اس مرتبہ ومقام ے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھالیں کہ وہ کسی پہاڑ کو یا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹادیں گے، اور یہ کہ قیامت نہ قائم کریں، تو اللہ تعالیٰ قائم نہ کریں گے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:٢، ص:٣٦٧)

دیکھتے ہو! یہ بشارتیں تو دنیا ہی میں ہیں، اور آخرت کی قدردانیاں تو جانتے ہی ہو، اگر جنت کی ہوا بھی لگ جائے تو بندہ نہال ہوجائے، مگر یہاں تو قدردانی کی وہ معراج ہے کہ رنگ ہی نرالا ہے، فرماتے ہیں: **إن المومن یأتیه التُّحفُ من اللہ مکتوب علیھا من الحیّ الذی لا یموت إلی الحیّ الذی لا یموت** (مومن کے پاس اللہ کی طرف سے تحفے آئیں گے، ان پر جو مہر ہوگی اس کی عبارت یہ ہوگی ''اس ذات کی طرف سے جو زندہ ہے، اسے موت نہیں آسکتی، اس شخص کی طرف جو زندہ ہے، اسے بھی موت نہیں آئے گی) سرنامہ ہوگا، بندے کے القاب ہوں گے اس کے پروردگار کی طرف سے، بھلا جب تھوڑی سی اطاعت کا یہ عظیم صلہ ہے تو سمجھ سکتے ہو کہ اس کے لئے جس قدر محنت وکاوش کی جائے عین ضروری ہے۔

وفقنی اللہ وإیاکم **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۱۶؍ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم مولوی عبد الشکور سلّمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل تم لوگوں کے خطوط مولوی محمد شمیم کے ہاتھوں موصول ہوئے، مدرسے کے حالات دور ونزدیک سے سنتا رہتا ہوں، اس سلسلے میں تم لوگوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ می نوش ومی نیوش وچیزے مخروش، کسی عقلمند کا قول میں نے کبھی سنایا ہوگا کہ آنکھ اور کان دونوں کھلے رکھو، لیکن زبان پر قطعاً خاموشی اور سکوت کا پہرہ رہنا چاہئے، یہ حالات جن سے نہ صرف تمہارا مدرسہ بلکہ اکثر مدارس بلکہ سارا عالم گذر رہا ہے، صرف قلب ودماغ ہی کو نہیں فاسد کرتے بلکہ دین وایمان کو بھی برباد کردیتے ہیں۔ فساد ذات البین کو ’’حالقہ‘‘ کہا گیا ہے، وہ حالقہ نہیں جو سر کو مونڈے بلکہ وہ جو دین کو مونڈ دے۔

عزیزم! یہ سب دنیا پرستی اور حب جاہ ومال کے کرشمے ہیں، جو مختلف قوالب میں نمودار ہوتے رہتے ہیں، جس طرح آدمی شراب کے نشے میں بدمست ہوکر ہر ’’ناکردنی‘‘ کرڈالتا ہے، ایسے ہی حب جاہ اور حب مال کے نتیجے میں دین ودیانت سب کا لحاظ اُٹھ جاتا ہے، کل کو تم لوگ بھی علماء کی صف میں جگہ پاؤگے، خوب سمجھ لو کہ علماء کی ذمہ داریاں دہری ہوتی ہیں۔ تم لوگوں نے قرآن وحدیث کا علم حاصل کرکے خوب وناخوب کی تمیز پیدا کرلی ہے، یہ علم تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اس کے تقاضوں کو پورا کرکے اپنے پروردگار کو راضی کرلو، جس نے یہ علم دنیا میں اہتمام کے ساتھ بھیجا ہے، اگر یہ ہوا تو خیر، ورنہ یہ علم پشت پھر کر چل دیتا ہے، اور پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل،

اس کا حصول نعمت عظمیٰ اور اس سے رُوگردانی **عذاب الیم**، کہنے کو تو آدمی تا عمر عالم اور مولوی کہلاتا ہے لیکن معاملہ وہاں نام سے نہیں کام سے ہے، کسی نام کی قدر و منزلت نہیں ہے، حقیقت مطلوب ہے۔ اس حقیقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے، آج ہمارا فساد یہی ہے کہ رسم رہ گئی حقیقت اُٹھ گئی، **لم یبق من الدین إلا إسمه ولم یبق من القرآن إلا رسمهٗ**، (دین کا صرف نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کے صرف نقوش وحروف باقی رہ جائیں گے)

سیدنا امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: دنیا کی رغبت ومحبت علماء کے چہرۂ جمال کا بدنما داغ ہے، مخلوق گو کہ ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، لیکن ان کا علم خود ان کے حق میں سودمند اور نافع نہیں ہوتا، اگر چہ تائید شریعت اور تقویت ملت ان سے حاصل ہوتی ہے، مگر ایسا ہوتا ہے کہ ''اہل فجور'' اور ''اربابِ فتور'' سے کبھی تائید وتقویت کا کام لے لیا جاتا ہے، چنانچہ سید الانبیاء **علیه وعلیهم والصلوات والتسلیمات** نے مرد فاجر کے واسطے سے تائید دین کی اطلاع دی ہے، فرماتے ہیں: **إن الله لیؤید هٰذا الدین بالرجل الفاجر**، (بیشک اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد فرمائے گا فاجر آدمی کے ذریعہ) ایسے علماء جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں سنگ پارس کے ہم رنگ ہیں، کہ اگر تانبا اور لوہا اس سے مس کرلے تو سونا بن جائے، لیکن وہ سنگ کا سنگ ہی باقی رہے، لکڑی اور چقماق میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے، دنیا اس سے آگ نکال کر فائدہ حاصل کرتی ہے مگر وہ لکڑی اور چقماق خود محروم ہے، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ علم ان کے حق میں سخت مضر ہے، کیونکہ اس نے ان پر خدا کی حجت تمام کردی ہے: **إن أشد الناس عذاباً یوم القیامة عالم لم ینفعه الله بعلمه**، اور کیوں نہ مضر ہو؟ جو علم کہ حق تعالیٰ کے نزدیک

موجودات میں عزیز واشرف ترین ہے، اس کو ان لوگوں نے دنیائے دنیہ یعنی مال وجاہ اور ریاست کا زینہ بنا رکھا ہے، حالانکہ دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک ذلیل وخوار ہے، اور مخلوقات میں سب سے بدتر! پس خداعزوجل کے عزیز کو ذلیل کرنا اور اس کے ذلیل کو عزت دینا بغایت قبیح ہے، اور درحقیقت حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ معارضہ ہے، تدریس وافتاء کا مشغلہ اسی وقت سود مند ہوگا جبکہ خالصاً لوجہ اللہ ہو اور حب جاہ وریاست اور حصول مال ورفعت کے شائبہ سے پاک ہو، اس کی علامت سامانِ دنیا کی تقلیل اور اس سے بے رغبتی ہے، جو علماء اس بلا میں مبتلا ہیں اور محبت دنیا میں گرفتار ہیں، وہ علمائے دنیا ہیں، یہ ہیں علمائے سو ''شرار مردم'' اور ''لصوص دین'' اور بزعم خویش خود کو مقتدائے دین اور مخلوق میں افضل ترین سمجھے جاتے ہیں:

وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ عَلىٰ شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ إِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللهِ أُوْلٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ۔

ترجمہ: وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم کسی اچھی حالت میں ہیں، خوب سن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں، ان پر شیطان نے پورا تسلط کرلیا ہے، سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلادی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں، خوب سن لو شیطان کا گروہ ضرور برباد ہونیوالا ہے۔

ایک بزرگ نے شیطان لعین کو دیکھا کہ فارغ بیٹھا ہے اور تضلیل اور اغواء سے مطمئن ہے، ان بزرگ نے اس کا سبب دریافت کیا، لعین نے کہا کہ اس وقت کے علمائے سو میرے کام میں بڑی مدد کررہے ہیں، انھوں نے مجھے اس مہم سے فارغ کردیا ہے، اور سچی بات یہی ہے کہ اس زمانے میں امورِ شرعیہ میں جتنی بھی کمزوری ومداہنت واقع ہورہی ہے اور ترویج دین وملت میں جتنا کچھ فتور رونما ہورہا ہے، سب

علمائے سو کی نحوست اور ان کی نیتوں کے فساد کی وجہ سے ہے۔

ہاں جو علماء دنیا سے بے رغبت اور حب جاہ وریاست اور خواہش مال ورفعت سے آزاد ہیں، وہ علمائے آخرت ہیں، اور ورثۂ انبیاء **علیهم الصلوات والتسلیمات!** یہ لوگ بہترین خلائق ہیں، یہی ہیں جن کی روشنائی کل بروزِ قیامت شہداء فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ تولی جائے گی، اور وہی وزنی ثابت ہوگی، **نوم العلماء عبادة** انھیں کی شان ہے، جمالِ آخرت ان کی نگاہوں میں مستحسن ہے، اور قباحت دنیا ان کے واسطے مشاہد ہو چکی ہے، انھوں نے آخرت کو بنظر بقا دیکھا اور دنیا کو داغِ زوال سے عیب دار پایا، ناچار خود کو باقی کے سپرد کیا اور فانی سے باز رکھا، عظمت آخرت کا شہود درحقیقت نتیجہ ہے عظمت جلالِ لایزال کے شہود کا، اور دنیا ومافیہا کو ذلیل سمجھنا ثمرہ ہے عظمت آخرت کے شہود کا، **لأن الدنیا والاخرة ضرتان إن رضیت أحدهما سخطت الأخرىٰ**، (دنیا وآخرت دونوں سوکن ہیں اگر ایک کو راضی کروگے تو دوسری ناراض ہو جائے گی) اگر دنیا عزیز ہے تو آخرت ذلیل ہے، اور اگر دنیا ذلیل ہے تو آخرت عزیز ہے، ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین الضدین ہے۔ (مکتوب: ۳۳ دفتر اول)

حضرت مجدد صاحب کے ارشادات کے اس آئینے میں تم علمائے سو کے بدنما چہرے اور علمائے خیر کے جمالِ جہاں تاب کو بخوبی دیکھ سکتے ہو، اب خیال کرلو کہ کس صنف میں شامل ہونا بہتر ہے، لیکن دور بڑا پُر فتن ہے، آدمی بچنا چاہے تو مشکل میں پڑ جائے گا، میں تو حیران ہوں کہ کیا کرنا چاہئے لیکن قربان ہادیٔ برحق علیہ السلام کے، کہ ان کی تعلیم زندگی کے ہر پہلو اور دنیا کے ہر دور سے تعرض کرتی ہے، دو حدیثیں لکھتا ہوں:

عن ابی ثعلبة فی قوله تعالیٰ " علیکم أنفسکم لایضرکم من ضل إذا اهتدیتم "فقال: أما والله لقد سألتُ عنها رسول الله ﷺ فقال: بل

ائتمروا وتناهوا عن المنكر حتىٰ إذا رأيتَ شحاً مطاعاً وهوىً متبعاً ودنيا مؤثرةً وإعجاب كل ذى رأيٍ برايه ورأيتَ أمراً لابدّ لک منه فعليک نفسک ودع أمر العوام فإن وراء كم أيام الصبر فمن صبر فيهن قبض على الجمر، للعامل فيهن أجر خمسين رجلاً يعملون مثل عمله قالوا يارسول الله !أجر خمسين منهم قال أجر خمسين منكم (ترمذی)

حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد " عليكم أنفسكم لايضركم من ضل إذا اهتديتم " کے متعلق روایت ہے کہ میں نے اس آیت کے متعلق جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا، آپ نے فرمایا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، پھر جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی عام اطاعت ہو رہی ہے، خواہش نفس کا اتباع کیا جا رہا ہے، دنیا ترجیح پاتی چلی جا رہی ہے اور ہر شخص اپنی عقل پر نازاں ہے، اور کوئی برائی ایسی دیکھو کہ عوام کے ساتھ اختلاط کی صورت میں تم بھی لازماً اس میں مبتلا ہو جاؤ گے تو بس اپنے آپ کو لے کر الگ ہو جاؤ، اور عوام کے معاملہ کو ترک کر دو، تمہارے بعد ایام صبر آئیں گے جو شخص ان ایام میں ثابت قدم رہے گا وہ انگارہ ہاتھوں میں لے گا، ان دنوں عمل کرنے والا پچاس آدمیوں کے اجر کا مستحق ہوگا، صحابہ نے عرض کیا: اس دور کے پچاس آدمیوں کا اجر؟ فرمایا نہیں تم میں کے پچاس آدمیوں کا اجر۔ (ترمذی شریف)

اس حدیث کو غور سے پڑھو، ورأيتَ أمراً لابدّ لک منه فعليک نفسک خاص طور پر قابل ذکر ہے، صاحب مرقاۃ اس پر لکھتے ہیں: ای رأيت أمراً تميل إليه هواک من الصفات الذميمة فعليک نفسک واعتزل الناس حذراً من الوقوع، یعنی کوئی ایسی برائی جس کی طرف نفس کا میلان ہے، تم دیکھتے ہو اور

سمجھتے ہو کہ لوگوں کے درمیان رہوں گا، تو اس برائی سے بچ نہیں سکتا، تو بس چپکے سے الگ ہو جاؤ، دوسرا نسخہ اس کا یہ بھی منقول ہے کہ **رأیتَ أمراً لا ید لک منہ فعلیک نفسک**، یعنی تم کوئی ایسی برائی دیکھو جس کے دفع پر قدرت نہ ہو تو بس اپنے کو سنبھالے رہو، میں تفصیل نہیں لکھتا، تم سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا سمجھانا چاہتا ہوں۔

اب دوسری حدیث دیکھو:

عن عبد اللہ بن مسعود ؓ قال : قال رسول اللہ ﷺ لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نھتھم علمائھم فلم ینتھوا فجالسوھم فی مجالسھم وواکلوھم وشاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علیٰ لسان داؤد وعیسی بن مریم ذٰلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی اسرائیل معاصی میں گرفتار ہوئے اور انہیں علماء نے روکا، لیکن وہ باز نہیں آئے، پھر بھی علماء ان کی مجلسوں میں ان کے ساتھ بیٹھتے رہے، ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کا دل بعض سے ٹکرا دیا، پھر ان پر حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ذریعہ لعنت بھیجی، یہ ان کی معصیت اور عدوان کی وجہ سے ہوا۔

اس حدیث نے بتلایا کہ اگر لوگوں کے ساتھ مواکلت ومشاربت اور مجالست کو جاری رکھنا ہے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ہرگز ترک نہ کرو اور اگر اس کی ہمت نہ ہو تو پھر مجالست ومشاربت کو ترک کرو۔

اصل یہ ہے کہ ایک عالم دین کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول ہے، اور فکر آخرت اس کی زندگی کا مشغلہ، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو بلند فرماتے ہیں اور تمام فکروں سے اسے آزاد کر دیتے ہیں، اور اگر دنیا کو مقصد بنا لے گا تو کس وادی میں جا کر گرے گا،

کون جانتا ہے؟ عالم دنیا کی مذمت قرآن میں بھی بہت شدید وارد ہے، فرماتے ہیں:

وَاتْـلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِىْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَـكَانَ مِنَ الْغَاوِيْنَ ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔

ترجمہ: اور ان کو اس شخص کا حال سنا دو، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا، پھر اس کے پیچھے شیطان لگ گیا، تو وہ گمراہوں کی صف میں چلا گیا، اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اس کا رُتبہ بلند کرتے، لیکن وہ تو زمین کا ہو رہا، اور اپنی خواہش کے پیچھے چل نکلا، تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، اس پر تم بوجھ لادو تب بھی ہانپتا ہے، اور چھوڑ دو تب بھی ہانپتا ہے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے، جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، تو یہ احوال بیان کردو، تاکہ وہ غور کریں۔

ان آیات کا تعلق بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم کے ساتھ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مذمت کسی کی ذات پر وارد نہیں ہوتی، اس کے اوصاف مستحق مذمت ہوتے ہیں ۔ ان آیات میں اوصافِ مذمت کیا کیا ہیں؟ ترکِ آیات، اِخلاد الی الارض، اتباعِ ہویٰ پھر ان سب کے نتیجے میں شیطان کی رفاقت، پھر غوایت میں مماثلت مرتب ہوئی، حرصِ دنیا اور اتباع ہویٰ ایسی ہی چیز ہے، سمجھنے والوں کیلئے یہ ایک دفتر ہے، اگر موقع ملا تو اس پر مفصل کلام کروں گا، اس وقت اشارہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

غرض یہ ہے کہ وہ طریقہ اختیار کرو جس سے حق تعالیٰ راضی ہوں، اور وہ طریقہ منحصر ہے سنت نبوی کے اتباع میں، ظاہراً و باطناً بھی اور قلباً و قالباً بھی، عبادت میں بھی اور دیگر امورِ دنیا میں بھی، عالم کا امتیاز یہی ہے کہ وہ اتباع سنت کے ساتھ

متصف ہوتا ہے، اور اسی کا داعی ہوتا ہے: أقول قولی ہٰذا وأستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم مولوی عبد الشکور سلمک اللہ تعالیٰ عن الفتن والشرور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا ایک تفصیلی خط دو ہفتہ قبل ملا تھا، اس کا جواب ابھی نہ لکھ سکا تھا کہ مدھوبنی کا سفر سامنے آ گیا، مولوی حبیب اللہ سلّمہٗ کا نکاح تھا، اور وہاں کے لوگوں کا تقاضا بھی بہت دنوں سے تھا، اِدھر ششماہی امتحان کی تیاری میں اسباق بھی بند ہونے تھے، موقع ملا اور میں بھوارہ چلا گیا، ایک عشرہ وہاں قیام رہا، اللہ کا بہت زیادہ فضل وکرم شامل حال رہا، بحمد اللہ میری شومئ اعمال سے وہاں کے لوگوں کو کچھ ضرر نہیں ہوا، بلکہ اُلٹے یہ معلوم ہوا کہ دینی اعتبار سے لوگوں کو بہت فوائد حاصل ہوئے، روزانہ کم از کم دو اور کبھی کبھی تین تین وعظ ہوتے تھے۔ اللہ کی ستاری تھی کہ بایں زبوں حالی لوگوں کے قلوب میں محبت وعظمت بھر دی ہے، اللہ کی رحمت وعنایت کو بھی کیا کہو، جب چاہیں ذرہ کو آفتاب کریں، بس اسی پاک ذات کا شکر گذار ہوں، یہاں نوازتے ہیں شاید وہاں بھی نوازا جاؤں۔ کل وہاں سے واپسی ہوئی۔

آج تمہارا دوسرا خط ملا، اللہ تمہیں توفیق نیک دے۔ تم لوگوں کے خطوط سے بہت خوشی ہوتی ہے، بڑی جگہ پہونچ کر اور بڑے لوگوں کو دیکھ کر بھی چھوٹوں کی قدر کرتے ہو۔ مدرسہ کے حالات جو تم نے لکھے ہیں، بالکل صحیح ہے، ہر جگہ کا تقریباً یہی حال

ہے، الا ماشاء اللہ۔ مدارس کے یہ اجتماعی ماحول اب افراد کی تربیت تو کیا کرتے انھیں بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، اس ماحول میں دامن کشاں چلنا ہی کامیابی کی راہ ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے کسی موقع پر فرمایا تھا کہ پہلے اہل اللہ چار مجاہدے تجویز فرماتے تھے، تقلیل طعام، تقلیل کلام، تقلیل منام اور تقلیل اختلاط مع الانام۔ مگر اب سب منسوخ اور آخر کا متعین ہے، اس کے بغیر کامیابی ہرگز نہیں ہوسکتی، تقلیل کلام تو اس کے ضمن میں ہوجائے گی، طالب علم کے لئے بھی یہی اصول متعین ہے۔

اب علم کا تعلق رجال سے زیادہ کتب سے ہوچکا ہے، رجال کے پیچھے صرف جال ہی جال ہے، یوں کہئے کہ جعل ہی جعل ہے، کتابوں کا مطالعہ قاعدہ سے کرو۔ ہمارے مدارس میں تفقہ فی الحدیث کا اہتمام ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ حدیث کو حنفی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو غلط نہ ہوگا، میرا خیال اس باب میں یہ ہے کہ حنفی مسلک اس کا محتاج نہیں کہ ہر ہر حدیث اس پر منطبق ہو، رسول اللہ ﷺ نے عمل میں سہولت بخشی ہے، چاروں مسالک آپ کے ارشاد و عمل کی روشنی میں ماخوذ ہیں اور سب درست ہیں، اس لئے یہ کاوش بیجا ہے کہ ہر حدیث کو توڑ مروڑ کر لازماً حنفی ہی بنالیا جائے۔

حضرت قاسم بن محمدؒ فقہاءِ مدینہ میں شمار ہوتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں، ان سے کسی نے سوال کیا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر پڑھوگے تو صحابہ میں اس کا بھی نمونہ موجود ہے، اور نہ پڑھوگے تو اس کا بھی نمونہ موجود ہے۔ **بأيهم إقتديتم إهتديتم** ، دیکھو تم نے حدیث کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کو نماز میں سورۂ فرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا، وہ کسی اور طریقے پر پڑھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسرے طریقے پر پڑھتے تھے، انھیں جلال آگیا، سوچا کہ نماز ہی میں دبوچ لیں، لیکن صبر کیا جب وہ نماز

سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی گردن میں اپنی چادر لپیٹ دی اور پوچھا کہ پڑھنے کا یہ نیا طریقہ تم نے کہاں سے نکالا، عرض کیا میں نے حضور ﷺ سے ایسا ہی سیکھا ہے۔ حضرت عمرؓ انھیں کھینچتے ہوئے دربارِ رسالت میں لائے اور عرض کیا کہ یہ قرآن غلط پڑھتا ہے، آپ ﷺ نے ان کی قرأت سنی، اور فرمایا کہ ٹھیک ہے، پھر حضرت عمر سے پڑھوایا اور ان کی بھی تصویب کی، اور فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے، اور ہر ایک کافی وشافی ہے، اور یہ سمجھ لو کہ سات حروف سے مراد سات قرأتیں جو اب رائج ہیں یہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے الفاظ بھی بدلے ہوئے ہیں، غرض جب قرآن کریم میں تلاوت کی یہ سہولت دی گئی ہے تو آثار واحادیث سے پتہ چلتا ہے کہ عمل میں بھی سہولت دی گئی ہے، انھیں قاسم بن محمد کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس بیٹھے، اعمال کی کچھ حدیثیں سنا رہے تھے، جب کوئی حدیث پڑھتے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز اس کے برخلاف دوسری حدیث پڑھ دیتے، اس سے قاسم بن محمد کو گرانی محسوس ہوئی، خلیفہ راشد نے فرمایا آپ کو تکدر کیوں ہو رہا ہے، خدا کی قسم ان اختلافات کے عوض اگر مجھے سرخ اونٹ عطا کئے جائیں تو میں پسند نہ کروں۔ حضرت قاسم بن محمد اس پر بہت مسرور ہوئے۔ بعض غالی حضرات کہہ دیتے ہیں کہ حق اللہ کے نزدیک ان چاروں میں سے کسی ایک میں دائر ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ بہر کیف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حنفی مسلک نہایت قوی اور مضبوط دلائل پر قائم ہے، اس کی خاطر احادیث کے صریح مدلولات کو توڑنا مناسب نہیں، اگر کوئی حدیث امام شافعی علیہ الرحمہ کی تائید کرتی ہے تو چشم ما روشن ودلِ ما شاد، ہمارے لئے بھی نبی کا اسوہ موجود ہے۔ ہاں نبی کا کوئی اُسوہ نہ ہو تب الزام دو۔ خلاصہ یہ کہ **تحنف فی الحدیث** کا طریقہ مجھے پسند نہیں ہے، شاید مشکوٰۃ شریف کے درس میں بھی اس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، تم

حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کا مطالعہ کرو، حنفیت وشافعیت کا جھگڑا ایک طرف رکھدو، ان چند مسائل کے سوا عام زندگی کے اُطوار وعادات میں حنفیت وشافعیت کا اختلاف نہیں ہے، صرف اختلافی مسائل میں ہی آپ کا عمل اُسوہ نہیں، بلکہ آپ کا ہر ہر طریقہ، ہر ہر عقیدہ اور ہر ہر عمل اُسوہ ہے۔ احناف والی نماز بھی حضور نے پڑھی ہے، بس مطمئن رہو۔ پوری زندگی کیلئے آپ کو معیار بنا کر حدیث پڑھو، میرا مدعا شاید تم سمجھ گئے ہوگے اور اگر نہ سمجھ میں آیا ہو تو ایک واقعہ سے سمجھو۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت میں ایک اعلیٰ پایہ کے غیر مقلد عالم پہونچے، پوچھا مولوی صاحب تم عامل بالحدیث ہو، عرض کیا جی ہاں الحمدللہ، فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ حضور جب گھر سے نکلتے تھے تو کیا دعا پڑھتے تھے؟ عرض کیا حضرت یاد نہیں، دیکھ کر بتاؤں گا، پوچھا اچھا جب لباس پہنتے تھے تو کیا دعا پڑھتے تھے؟ اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ اسی طرح کئی مواقع کی احادیث دریافت کیں، اور ہر ایک کا جواب لاعلمی کی صورت میں ملتا رہا، حضرت نے فرمایا کہ بس جی مولوی صاحب صرف اختلافی مسائل کی حدتک تم عامل بالحدیث ہو اور بس، اسی کا نام عمل بالحدیث ہے۔ مولوی صاحب بہت شرمندہ ہوئے۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں، سیدھی بات یہ ہے کہ حدیث کا مدلول جو ہو رہنے دو، یہ دیکھو کہ ان احادیث کے آئینے میں آپ کی سیرت کیسی نظر آتی ہے، اپنی سیرت کو اسی پر جانچو۔ اس کے لئے احادیث کو بہت غور سے پڑھنا ہوگا، بالخصوص وہ احادیث جو آپ کی عبدیت، ذوقِ عبادت، اخلاق واوصاف، خشوع وانابت اور سیرت کی بلندی کا آئینہ پیش کرتی ہیں، یا وہ احادیث جو غیبی حقائق مثلاً صفاتِ الٰہیہ، جنت ودوزخ، برزخ وقیامت اور اس قسم کے احوال پر روشنی ڈالتی ہیں، ان کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے،

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے یہاں سارا زور اختلافی مسائل پر صرف کر دیا جاتا ہے، اور اس قسم کی احادیث سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ہمارا تعلق ہی نہیں، اسے کیا کہوں مجھے تو **أفتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض** کا منظر نظر آتا ہے، خدا تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، گو کہ یہ بات ذرا سخت ہے لیکن غلط نہیں ہے، انداز کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے، ورنہ احوالِ آخرت اور سیرت واخلاق کی احادیث کے ساتھ یہ بے اعتنائی کا سلوک کیوں ہے۔ ہمارے متقدمین اکابر دیوبند کو ان اختلافی مسائل پر ضرورۃً کلام کرنا پڑا تھا، کیونکہ غیر مقلدیت ان دنوں نئی نئی اٹھی تھی، اور شور وطوفان برپا کر رکھا تھا، لیکن ان حضرات کا کلام مختصر ہوتا تھا، دوسرے وہ حضرات سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، آدمی اگر ایک طرف ان سے اختلافی مسائل کی تحقیق کرتا تھا تو دوسری طرف ان کے اخلاق وعمل سے روشنی بھی حاصل کرتا تھا، اب صرف اختلاف ہی اختلاف رہ گیا ہے، وہ روشنی گل ہو گئی ہے۔ اس لئے میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر حدیث میں حنفیت کی تلاش مناسب نہیں ہے، اصل میدان محنت واجتہاد کا یہ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ **والقصة بطولها۔**

باقی یہاں سب خیریت ہے، آج سے امتحانِ ششماہی ہو رہا ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی، مدرسہ دینیہ غازی پور

۳۰؍ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیز گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا، مدرسہ کے حالات معلوم ہوئے، حضرت ماسٹر صاحب مدظلہٗ کو کچھ لکھ تو دیا ہے، لیکن یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ آدمی پر جو وقت و پریشانی آتی ہے، اگر اس پر دل سے رضامندی اور حق تعالیٰ کی تقدیر پر صبر وشکر نہیں ہے، بلکہ شکایت کا عنصر ہے تو وہ اپنی کرتوت کی سزا ہے، ایسے مواقع پر حضور اکرم ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ جو تم پر حق ہے اسے ادا کرو، اور جو تمہارا حق دوسروں پر ہے، اسے اللہ سے مانگو، اسی لئے اپنی اصلاح کی بہت ضرورت ہے، نیت کی بھی اور عمل کی بھی۔ اس بات کو اپنے لوگوں کے درمیان عام کرنے کی ضرورت ہے، آدمی اپنی مصیبت کا الزام دوسرے پر رکھ کر خود کو فریب دیتا ہے، یہ فریب دنیا ہی تک رہے گا، آخرت میں سب پردہ کھل جائے گا۔ اپنی اصلاح کرنی چاہئے اپنے معاشرہ میں اصلاح کو عام کرنا چاہئے، اپنی ناکارگی اور اپنی معصیتوں کی توجیہ کر کے مزید دلدل میں پھنسنا عقلمندی نہیں ہے، اس باب میں مدرسین بہت قصوروار ہیں، مگر انھیں احساس نہیں، تنخواہ اہل مدرسہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ وقت بے وقت وہی کرتے ہیں، اس میں کسی کا کوئی اختیار نہیں، تمہارے قلم سے یہ شکایت پسند نہیں آئی۔

وفاق بنیادِ نفاق ہے، خدا کرے ایسا نہ ہو، مگر مجھے تجربہ ہے، یہ مدارس کو کسی اور رُخ پر ڈال دے گا، تجربہ کرو۔ والد صاحب کی صحت وعافیت کی دعا کرتا ہوں، خدا کرے عبداللہ سلّمہٗ اچھا حافظ اور عالم باعمل بنے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

یکم؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

عزیزانِ گرامی مولوی عبدالشکور و برادران سلّمہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل تمہارے ٹیلفون کا انتظار تھا، بڑی پریشانی میں تھا، پھر ایک دن کلکتہ

ٹیلیفون کیا، وہاں بیت العلوم کے مدرس حافظ صابر حسین نے بتایا کہ حافظ زبیر صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہٗ کا خط آیا، انھوں نے بھی اس کی اطلاع دی، **إنا لله وإنا إليه راجعون، غفر الله له وكفَّر عن سيئاته وأدخله الجنة برحمته ورزقكم صبراً جميلاً وأعظم أجوركم بفضله ومَنِّهٖ وهو أرحم الراحمين ۔**

اس حادثہ کی خبر سے طبیعت بہت محزون ہوئی، تم لوگوں سے مجھ کو جو تعلق اور محبت ہے، اس کی وجہ سے دل پر وہ اثر ہوا جو میں بیان نہیں کرسکتا، لیکن انسان تو ایک بندہ اور غلام ہے، اسے اپنے مالک و مولیٰ کی مرضی کے آگے بہر حال سر جھکانا، اور اسی کے ساتھ دل لگانا ہے، ان کے تمام تصرفات میں ان کی قدرت کا بھی ظہور ہے، اور حکمت کا بھی اور نتائج و انجام کے لحاظ سے ہمارے حق میں رحمت کا بھی۔ انھوں نے ایک مدتِ متعینہ دے کر ہر انسان کو دنیا میں بھیجا ہے، ان کی رحمت ہے کہ وہ مدت کسی انسان کو بتائی نہیں، ورنہ پوری زندگی ایک مصیبت میں بسر ہوتی، اب چونکہ وہ مدت معلوم نہیں، اس لئے آدمی زندگی کے نشیب و فراز سے کبھی خوشی اور کبھی رنج و کلفت کے ساتھ گذرتا رہتا ہے، پھر جب مدت پوری ہوجاتی ہے تو نہ ایک سیکنڈ ادھر اور نہ ایک سیکنڈ اُدھر، آدمی! نہیں بلکہ غلام اپنے آقا کے پاس پہونچ جاتا ہے، اگر نیک و صالح ہے تو خوشی خوشی جاتا ہے، اور وہاں پہونچ کر بہت زیادہ خوشی پاتا ہے، ایسی خوشی جس میں رنج کا نام و نشان نہیں۔ دائمی اور ابدی خوشی، البتہ اس کے اعزہ و اقرباء اس کی دنیاوی صحبت کی جدائی سے پریشان ہوتے ہیں، مگر پریشانی اجر سے خالی نہیں ہوتی، الحمد للہ کہ تم لوگوں کے والد مرحوم خود نیک تھے، اور امکان بھر اپنی اولاد کو نیک بنانے میں لگے رہے اور بحمد اللہ اس میں کامیاب رہے۔ خدا کی ذات سے یہی امید ہے کہ

وہاں پہونچ کر زندگی کے سفر کی تکان اتر گئی ہوگی، اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوں گے، اور تم لوگوں کے صبر اور رضا بالقضا اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی خبر انھیں پہونچائی جاتی رہے گی، تو انھیں مزید فرحت وسرور حاصل ہوگا۔

انھوں نے حج کا فارم بھرا تھا، اب ان کا سب مال ترکہ بن گیا ہے، ترکہ کے سلسلے میں جو شریعت کا حکم ہے، اسے تم جانتے ہو، اسی کے مطابق عمل کرو، سارا ترکہ شریعت کے حکم کے مطابق تقسیم کردو، ہر ایک وارث کا حصہ متعین کر کے بتادو، پھر اس کے بعد شرکت یا علیحدہ عمل جو بھی منظور ہو کریں، لیکن شرعی ضابطہ اور قانون کے مطابق! اسی سے آپس میں اتفاق واتحاد باقی رہے گا، اور ماں کی خدمت بھی ہو سکے گی، اور اس مسئلے میں پریشان نہ ہونا کہ ابھی فلاں کی شادی باقی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے سب آسان فرمادیں گے، ان سے دعا مانگنے کی کثرت کرو، اگر والدین پر کچھ قرض رہا ہو تو اسے ان کے مال سے ادا کرو، کوئی وصیت ہو تو اسے پورا کرنے کا اہتمام کرو، اور والد کے دوستوں کے ساتھ وہی سلوک کرو، جو اپنی زندگی میں وہ کیا کرتے تھے، اس سے ان کی روح کو خوشی ہوگی، سب سے بڑا حق والدہ کا ہے، ان کا صدمہ بھی بڑا ہے، ان کی دلجوئی اور خدمت کی ہر ممکن تدبیر کرو، اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے، سب بھائی ان کی جانی اور مالی خدمت کریں، اور اس خدمت کو خود انجام دیں، اپنی بیویوں کے حوالے نہ کریں، اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنی رضامندی کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، انھیں پر توکل کرو، اسباب پر زیادہ نظر نہ رکھنا، میں دل وجان سے تم سب کے حق میں دعا گو ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

عزیز گرامی قدر! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ میرا مفصل مکتوب مل گیا تھا، مجھے اس کی تشویش تھی، بلکہ میں نے حضرت ماسٹر صاحب مدظلہٗ سے دریافت کیا ہے کہ وہ خط ملا یا نہیں؟ اگر ملا نہ ہوتو اس کی نقل میں نے رکھ لی ہے، پھر بھیج دوں، مگر اب الحمد للہ اطمینان ہوا۔ ارادہ ہے کہ کسی مناسبت سے نام حذف کر کے ضیاء الاسلام میں شائع کرادوں، امید ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس سے نفع ہوگا۔

مدرسین کو اس کی طرف متوجہ کرتے رہنے کی ضرورت ہے، اگر یہ حضرات اپنی ذمہ داری اور جوابدہی کو محسوس کریں گے تو بڑا کام ہوگا، اللہ کی رحمت نازل ہوگی، اس سلسلے میں تم کو پوری سنجیدگی اور اہتمام سے کام کرنا ہوگا۔ تم میرے پاس رہے ہو، میرے کام کو دیکھا ہے، پورے خلوص اور انہماک اور دلچسپی سے کارِ منصبی کا اہتمام کرو، طلبہ کو سمجھاؤ، نجی مجالس میں سنجیدہ طریقہ پر باتوں باتوں میں کام کی باتیں کہہ جاؤ، اس طرح سے کہ کسی کو لگتی ہوئی محسوس نہ ہو۔ خود عملی زندگی میں ذکر وعبادت کا اہتمام کرو، کام میں برکت اسی سے ہوتی ہے، علم کے ساتھ ذکر وعبادت بہت ضروری ہے، اس کی برکت سے حیاۃ طیبہ نصیب ہوگی، دنیاوی الجھنیں کم ہوں گی۔ جب کوئی الجھن پیش آئے تو فوراً تضرع وزاری کے ساتھ اللہ کے حضور میں اسے پیش کرو، اس کے بعد بقدر ضرورت اس کی تدبیر کرو۔

حضرت اقدس ماسٹر صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں سلام عرض کرو، اور دعا کی درخواست بھی۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

بنام مفتی محمد اسرائیل صاحب

میری تدریس کا زمانہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک الہ آباد مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی خانقاہ اور مدرسہ وصیۃ العلوم میں گذرا ہے۔ اس وقت متعدد طلباء مجھے ایسے ملے جن سے اللہ تعالیٰ نے دین اور علم دین کی خدمت لی۔ ان میں ایک عزیز گرامی مولانا مفتی محمد اسرائیل صاحب بھی ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہوئی، پھر یہ میرے ساتھ غازی پور مدرسہ دینیہ میں آگئے۔ فراغت دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی۔ افتاء کی تکمیل مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں کی، اور اب اپنے آبائی وطن ضلع نوادہ بہار میں ایک مدرسہ کے بانی اور مہتمم ہیں، اور علم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔

عزیزم مولوی محمد اسرائیل سلّمہٗ!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل یا پرسوں تمہارا خط ملا، اس سے پہلے تمہارا ایک خط ملا تھا، جس میں تم نے عربی مشق وتمرین کے سلسلے میں استفسار کیا تھا، غالبًا اس کا جواب یہاں سے نہیں گیا تھا، میرا خیال ہے کہ پہلے تم نے جو بات لکھی تھی وہ درست نہ تھی، اب جو کچھ لکھا ہے وہ منشاء کے عین مطابق ہے، تم افتاء میں داخلہ کی کوشش کرو، عربی لکھنے اور بولنے والوں کی کمی نہیں ہے، اور نہ اس کی ضرورت ہے، ضرورت ہے دینی علوم کی جو مفقود ہوتے جارہے ہیں، اس سلسلے میں جتنی مہارت پیدا کرسکو کرو، چند آدمی تو اخلاص کے ساتھ محض خدا کے ہوکر کام کریں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جو حضرات تصوف وسلوک یا کسی لائن میں نام آور ہیں علمی دنیا میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے، اور جو لوگ عملی اعتبار سے فائق سمجھے جاتے ہیں اخلاقی لحاظ سے وہ قابل اعتماد نہیں ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو علم کامل اور اخلاقِ فاضلہ سے بہرۂ وافر نصیب فرمائیں تاکہ خدا کے یہاں سرخرو ہوسکو اور دنیا میں دینی حفاظت کا کام تم لوگوں سے لیا جاسکے۔ ایک مفتی جو فتویٰ دیتا ہے وہ درحقیقت لوگوں کے دین وایمان کی حفاظت کرتا ہے، کیا کروگے عربی بول کر، یہ کام کرلو، نفع میں رہوگے، میرا خیال رمضان میں یہیں رہنے کا ہے، تم لوگ غازی پور ہوتے ہوئے گھر جاؤ تو بہتر ہوگا، انشاء اللہ یہیں مل جاؤں گا۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۲۱؍رجب ۱۴۰۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم!   **سلمک اللہ تعالیٰ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، حسب عادت جواب میں تاخیر ہوئی، معاف کرنا، دیوبند بھی گیا تھا، مولانا عبدالحلیم صاحب سے ملاقات ہوئی تھی لیکن شاید انھوں نے پہچانا نہیں، دیوبند کی تفصیلات تو بعد میں بتاؤں گا، مختصراً اتنا ہے کہ

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

آپس میں جذب محبت نہیں، دلوں میں آرزو کی حرارت نہیں، نگاہوں میں آدابِ معرفت نہیں، بس متاعِ کارواں گم ہے اور اہل کارواں شاید احساسِ زیاں سے بھی محروم ہیں، میرا مدعا تم دوستوں سے یہی ہے کہ دنیا سرمایہ گم کرچکی ہے، اس کو پانے کی کوشش کرو، دلوں میں حوصلہ وآرزو نہ ہو تو وہ دل کا ہے کو ہے، لیکن معاذ اللہ میری مراد دنیا اور دولت دنیا کی آرزومندی نہیں ہے، یہ تو انسانیت کے لئے زہر ہے، جس نے اس حرص وہوس کا جال پھیلایا وہ پھر کبھی اس سے نکل نہ سکا، میری مراد وہ آرزومندی ہے جو ہمارے اسلاف واکابر کے سینوں میں موجزن تھی یعنی **قل ماعند اللہ خیر**، کیا سمجھے۔

اسبابِ علم کی فراوانی اور علم کی گمشدگی نے کلیجہ فگار کررکھا ہے، مدرسے ہیں، کتابیں ہیں، مطالعے ہیں، مصنفین ہیں، سب کچھ ہے مگر علم نہیں ہے، حقیقت علم نہیں ہے اور یہی حاصل کرنے کی چیز ہے۔ اجمال سے کام لے رہا ہوں، تفصیلات اپنے حافظہ کی مدد سے نکالو، مولانا مفتی محمد حنیف صاحب میرے نزدیک یکے از علمائے خیر ہیں، ان کی صحبت کو غنیمت سمجھو، ان کے علاوہ اور کسی پر دل نہ جماؤ، مولانا کی صحبت **فیما أظن** بہرحال مفید اور بارآور ہوگی، معلوم ہوا کہ اب مولانا کی توجہ تم لوگوں پر مبذول ہوئی ہے، جب بھی ہو اور جتنی بھی ہو بہت ہے، میں سب جگہ دیکھ چکا ہوں، محض نام ہے اور کچھ نہیں، مولوی عبدالشکور سلمہٗ کو سلام کہو اور یہی مضمون انھیں بھی سنادو،

مولانا محمد حنیف صاحب کی خدمت بابرکت میں بہت ادب سے میرا سلام عرض کردو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! **سلمك الله تعالىٰ**

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

تمہارا خط ملا، اس خط سے بہت مسرت ہوئی، میں برابر دعا کرتا تھا کہ مدرسہ تمہارا بڑھے، اور منتظر تھا اور اس یقین کے ساتھ منتظر تھا کہ ایک نہ ایک دن تم اپنے مدرسہ کی ترقی کی خبر دوگے بحمداللہ اس کی پہلی قسط موصول ہوئی، خدا تعالیٰ مزید ترقیات سے نوازیں، تمہارے اپنے علاقے میں کام کرنے سے مجھے جتنی مسرت ہے، میں اسے بیان نہیں کرسکتا، مجھ کو تمہاری محنت پر اطمینان ہے، دنیا کی محبت اپنے دل میں گھسنے نہ دینا، محض اللہ کی رضا کے لئے رہو، دنیا رہے یا جائے اور جائے گی کہاں؟ کام آدمی کا وزن بڑھاتا ہے، مجھے یہ سوچ کر خوشی ہورہی ہے کہ تمہارا وزن بڑھ رہا ہے۔ لگے رہو انشاء اللہ کام ہوگا۔

حطامِ دنیا اور زخارفِ دنیا کچھ نہیں ہیں، یہ دور بڑا نازک ہے، اللہ پر مضبوط توکل کرو، دعاء وابتہال اور تضرع والتجا بجناب الٰہی کو اپنا شعار بناؤ، تمام امور انھیں کے دربار میں طے ہوتے ہیں، وہاں سے رابطہ قائم رکھو، اس رابطہ کا ذریعہ ذکر اور دعا ہے، بعد نمازِ مغرب تھوڑی دیر کے لئے کم از کم آدھ گھنٹہ خلوت کا متعین کرلو، اس میں کلمہ طیبہ کا ذکر یا درود شریف کا وِرد رکھو، اور خلوص دل سے دعا کرو، بہت نفع ہوگا۔ ہاں ایک

بات اور بغور سنو! اگر مدرسہ کا مال تمہارے تصرف میں رہتا ہو تو اس میں امانت اور دیانت کا بہت زیادہ خیال رکھنا، یہ بہت خطرناک چیز ہے، حتی الامکان اپنے پاس بالکل نہ رکھو، مگر ایسا کرنا تمہارے لئے مشکل ہوگا، اس میں ہمیشہ احتیاط پیش نظر رکھو، یہ دھیان رہے کہ اس کے نگراں حق تعالیٰ ہیں، حق تعالیٰ کی نگرانی کا مراقبہ کیا کرو، ورنہ دنیا کی ذلت اور آخرت کے عذاب کا سخت اندیشہ ہے، تم سے اطمینان ہے لیکن احتیاطاً لکھ دیا، مولانا عباس صاحب کو سلام کہہ دینا۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۹؍ذوقعدہ ۱۴۰۷ھ

☆☆☆☆☆

عزیزی ومحبی! سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، بڑی خوشی اس بات سے ہوئی کہ اب تمہارا مدرسہ وسعت اختیار کررہا ہے، خدا کرے اس وسعت مکانی کے ساتھ تعلیمی استحکام، تربیتی نظام اور دینی مرکزیت کا ایک خاص مقام بھی اسے حاصل ہوجائے، اور حق تعالیٰ یہ سب کام تمہارے ہاتھ سے انجام کو پہونچائیں، پڑھنے پڑھانے کا جو جال میں نے پھیلایا ہے حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا ہوں کہ اس میں ایسے شاہباز شکار ہوتے رہیں جو زخارفِ دُنیوی اور مال ومتاع فانی کی حرص سے بالکل آزاد ہوکر محض رضاء معبود برحق کو اپنا نصب العین بنائیں اور زندگی کی تمام تر توانائیاں حق سبحانہ وتقدس کی پاکیزہ راہ میں نچھاور کردیں۔ دنیا کی عزت وجاہ اور مال ومنال کو آنا ہو تو خادم بن کر آئے، مخدومیت ومقصودیت کی نشست گاہِ بلند ورفیع کی جانب نگاہِ ہوس نہ اٹھائے،

وہ مقام ومرتبہ مخصوص ہے اس ذاتِ عالی مقام کے لئے جس کی مخلوق ہونے کا شرف ہمیں حاصل ہے، آج دنیا کمانے اور اس کی فکر وطلب میں مرنے کھپنے والوں کی کمی نہیں ہے، انسان بہائم کی طرح اپنے رزق کی جستجو میں حیران وسرگشتہ ہے، رزق ملتا ہے بقدر مقسوم ہی! لیکن کتنی مشقت، کتنی ذلت اور کتنی مصیبت اس کے جلو میں چلتی ہے، آدمی رزق کا غلام ہوکر رہ گیا ہے، کہاں ہیں وہ شاہبازانِ بلند پرواز! جن کی نگاہیں زمین کی پستیوں کے بجائے آسمان کی بلندیوں میں اپنا نشیمن تلاش کرتی ہیں، کہاں ہیں وہ مردانِ جانباز! جو دینِ حق کی سربلندی کے لئے اپنی جاہ وعزت، اپنے مال ومنال اور اپنے جسم وجان کو قربان کردینا اتنا ہی پُرکیف اور پُرلطف سمجھتے ہیں جتنا دوسرے لوگ تن پروری اور عیش کوشی کو! حق تعالیٰ نے ہمیں دین کامل اور نعمت تام سے نوازا ہے، ہماری قسمت میں سب سے عظیم وبزرگ نبی روزی فرمایا ہے، ہمارے قلب وزبان کو اپنے محفوظ ومنزل کلام سے حلاوت بخشی ہے! حق تو یہ تھا کہ ان احسانات پر ہم، جو کچھ ہمیں ملا ہے سب قربان کردیتے۔

خدا کا بہت شکر ہے کہ تمہارے لئے کام کی راہیں کھل رہی ہیں، مالیات کا حساب ضرور رکھو، مگر خود کو سنبھال کر، مدرسہ کے مال کو امانت سمجھو، کسی ضرورت میں خواہ وہ کتنی ہی اہم اور فوری ہو، مدرسہ کی رقم بطور قرض بھی ہرگز نہ لو، اپنی بڑی سے بڑی ضرورت روک دو، مگر مدرسہ کی رقم سے اسے پورا نہ کرو، ممکن ہے آزمائش کے ایسے مرحلے آجائیں، لیکن اگر تم نے اجتناب کلی سے کام لیا تو ایک دو مرتبہ کے بعد ایسا دروازہ کھلے گا کہ تم خود حیران ہوجاؤ گے، یہی اس زہر کا تریاق ہے، امانت ودیانت کے ثمرات دنیا وآخرت میں اس کثرت سے دیکھو گے کہ تم خود دوسروں کے لئے نمونہ بن جاؤ گے، لیکن بعض مواقع پر اس باب میں سخت آزمائش ہوسکتی ہے، دیکھو قدم جادۂ

مستقیم سے نہ ہٹے۔

بعد نمازِ فجر ذکر پر دوام اختیار کرو، طبیعت کے انتشار کی فکر نہ کرو، ذکر کے الفاظ پر ایک سرسری توجہ قائم رکھو، آہستہ آہستہ یکسوئی پیدا ہوگی، یہ ٹھیک ہے کہ اگر کبھی فوت ہوجاتا ہے تو بعد مغرب کرلیتے ہو، لیکن کوشش کرو کہ فوت نہ ہو، میں یکسوئی اور دلجمعی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ مولانا محمد عباس صاحب آئے ہوں تو ان کو سلام کہہ دو، الحمد للہ میں خیریت سے ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۴؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! **بارک اللہ فی جہودکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عرصہ کے بعد تمہارا خط ملا، اور جواب میں بھی تاخیر ہوئی، زیادتیٔ مصروفیت کا عذر تو کچھ ایسا نہیں، البتہ عموماً خطوط کے جوابات جمعرات کو لکھتا ہوں، اسی انتظار میں رکھ دیا تھا، مگر اِدھر ایسا اتفاق ہوا کہ جمعرات کو سفر ہوتے رہے اور تمہارا خط رکھا رہ گیا، تمہیں انتظار رہا ہوگا۔

جس فتنہ کا ظہور تم نے لکھا ہے، اس کا تدارک فتویٰ سے ہونا مشکل ہے، زبانی گفتگو، جلسوں میں تقریروں کے ذریعہ کام لو، اور جہاں زور دیکھو وہاں جلسوں کا انعقاد کراؤ، دعائیں کرو، اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ عوام کو مشائخ حق کی صحبت کی ترغیب دو، علماء سے قریب کرو، اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اسلامی عبادات کی اہمیت اور فرضیت پر لکھ کر شائع کرو جو چند صفحات پر مشتمل ہوں، زیادہ طویل نہ ہوں،

اردو میں بھی اور ہندی میں بھی، حق تعالیٰ نے تمہیں کام کے میدان میں پہونچا دیا ہے، اخلاص کے ساتھ اور لگن کے ساتھ کام میں لگے رہو، اس وقت دین متین کی حمایت ونصرت سب سے بڑا فریضہ ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کی اصلاح اور دینی فضا میں شکوک وشبہات کے گرد اُڑانے والے فتنوں کی سرکوبی کا کام بہت اہم ہے، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ تمہیں ثابت قدم رکھیں اور خلوص سے کام کی توفیق عطا فرمائیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۸ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بہت عرصہ کے بعد تمہارا خط نظر نواز ہوا، تمہاری یاد برابر آتی رہی، ماشاء اللہ تم استقامت کے ساتھ کام کر رہے ہو، اس سے قلبی خوشی ہوئی، جس طرح کا تم جلسہ کر رہے ہو میں تو حتی الامکان اس طرح کے جلسوں میں شرکت نہیں کرتا، کچھ تو اپنی نااہلی کے باعث اور کچھ اس لئے کہ بعض تجربات ایسے ہوئے جن سے قلب ودماغ کو بھی نقصان پہونچا اور دین وایمان کو بھی، اس طرح کے جلسوں کی افادیت کا قائل ہوں، لیکن اپنی کمزوری کے کے سبب نقصان اٹھا جاتا ہوں، اس لئے ہمت نہیں ہوتی، بار بار تجربے ہو چکے ہیں، لیکن تمہارے یہاں ضرور آؤں گا، البتہ میری خواہش یہ ہے کہ اشتہار میں میرا نام شائع نہ کرو، گمنام رہنے دو، تاہم اگر تمہاری اور مدرسہ کی کوئی ضروری مصلحت ہو تو مجھے اس خواہش پر اصرار نہیں ہے لیکن مصلحت ہو جب! اور

صرف اپنے جذبۂ محبت کے تقاضے سے ہو، تو ہرگز شائع نہ کرنا۔ مولانا محمد عباس صاحب سے سلام عرض کردو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۲؍ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

تمہارا سابقہ خط ملا، اور میں نے اس کا جواب بھی لکھا تھا، تمہیں شاید مل نہیں سکا، کہیں ایسا تو نہیں کہ کچھ لوگ ڈاک گڑبڑ کردیتے ہوں۔

مدرسہ کے خلاف جو لوگ سازش کرتے ہیں، وہ منہ کی کھائیں گے، تم اخلاص کے ساتھ محض اللہ کے واسطے کام کرتے رہو۔ مخالفت تو اصل میں شیطان کو ہے، وہ اپنی ذریت کو اس کے لئے اُکساتا رہتا ہے، لیکن خدا پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے کیدِ شیطان کو اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اس لئے اطمینان کے ساتھ کام کرتے رہو، اخلاص کے ساتھ حسن عمل کو فلاح ہے۔

غیر مقلدین کا فتنہ، ایک فتنۂ کبریٰ ہے، یہ لوگ ہمیشہ ڈنک مارتے رہتے ہیں مجھ کو اس فرقہ سے کم واسطہ پڑا ہے، نیز یہ کہ اس موضوع سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے، اس لئے اس باب میں میری معلومات کم ہیں، تاہم میں مئو میں پتہ لگا کر کچھ رسائل وکتابیں بھیجوں گا، مولانا محمد طاہر حسین صاحب سے مراسلت کرو، ایک زمانے میں انھوں نے اس موضوع کا امعان واتقان کے ساتھ مطالعہ کیا تھا وہ بہت سی کتابوں کا پتہ بتائیں گے، اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے ان موضوعات کی حدیثیں جن میں اختلاف ہورہا ہے، بشکل اشتہار وکتابچہ اگر چھپوا دیا جائے تو مفید ہوگا، مولانا محمد

یوسف صاحب لدھیانوی کی کتاب ’’اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم‘‘ اس موضوع پر بہت جامع اور اچھی کتاب ہے، اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا تو ردّ بریلویت اور ردّ مودودیت پر ہے، اور دوسرا حصہ خالص غیر مقلدوں کے لئے ہے، اگر نہ ہو تو دیوبند سے منگوالو، ان لوگوں کا جواب دینے کے لئے حدیثوں پر نظر ضروری ہے، کم از کم نصب الرایہ، امام زیلعی کی ضرور منگوالو، اس سے بہت مدد ملے گی، جن کتابوں کو تم نے لکھا ہے، مئو جاؤں گا تو انشاء اللہ وہ کتابیں بھیجوں گا۔

طلقاتِ ثلٰثہ پر حضرت محدث کبیرؒ کا ایک رسالہ ’’ **الاعلام المرفوعة** ‘‘ ہے، عنقریب اس کی طباعت کا انتظام ہوگا، بہت جامع اور مکمل رسالہ ہے۔

میں الحمد للہ خیریت سے ہوں، حضرۃ الاستاذ مولانا محمد مسلم صاحب کا ۲۹/ محرم ۱۴۱۴ھ کو بعارضہ فالج دماغی صرف آٹھ دن کی علالت میں انتقال ہوگیا، ان کی وفات سے کمر ٹوٹ گئی، ان کے لئے دعاءِ مغفرت اور ایصال ثواب کرو، والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۴/صفر ۱۴۱۴ھ

☆☆☆☆☆

عزیز مکرم! **عافاکم اللّٰہ وتولاکم**

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہٗ

میں مدھوبنی گیا تھا، ایک ہفتہ کے بعد پرسوں لوٹا ہوں، یہاں تمہارا خط رکھا ہوا ملا، میلاد اور قرآن خوانی کے مسئلہ میں تمہارا طرزِ عمل پسند آیا، دل سے دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں استقامت نصیب فرمائیں، اس مخالفت کے بعد تم سمجھ لو کہ تمہاری ذمہ داریاں بڑھ گئیں، سب سے پہلے تو یہ کہ لوگ جو مخالفت کریں گے وہ تو ہوگی ہی،

اس کے ساتھ تمہاری عملی اور علمی حالت کی جانچ بھی شروع کر دیں گے، اس سلسلہ میں تم ماشاء اللہ فہیم آدمی ہو، اتنا سمجھ لو کہ تمہارے اوپر کوئی اخلاقی عیب یا عملی گراوٹ کے الزام کا موقع لوگ نہ پائیں، جماعت کی نمازوں سے معمولی امور تک شرعی حدود کی رعایت حق تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی نیت سے کرتے رہو، انشاء اللہ اس کی برکت سے صالحین کے قلوب میں محبت اور بد دماغوں کے دلوں میں مرعوبیت وہیبت پیدا ہوگی، اور یہ دونوں ایک عالم کے لئے بہت ضروری اور بنیادی چیزیں ہیں، کوئی قدم غفلت کے ساتھ نہ اٹھاؤ، دیکھتے بھالتے رہو کہ حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی نیت تمہارے کاموں میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یہ کام قدرے دشوار ہے، لیکن اگر چندے اہتمام کر لیا تو پھر کچھ دشوار نہیں، حق تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے، پوری ہمت اور مستعدی کے ساتھ حق سبحانہٗ کی رضا جوئی میں مشغول رہو، دنیا بڑی تاریک ہے، اللہ کا نام روشنی ہے، میری دلی خواہش ہے کہ تم روشن رہو اور روشنی پھیلانا تمہارا کام ہو۔

جنات کے سلسلے میں صاحب روح المعانی نے کسی قدر ذکر کیا ہے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ایک فیصلہ کن بات ''بیان القرآن'' میں سورۂ احقاف کی تفسیر میں فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''اور جنات کو عقاب ہونا کفر ومعصیت پر متفق علیہ ہے، اور ثواب وجنت ملنا ایمان وطاعت پر متکلم فیہ ہے، جمہور تو اس کے قائل ہیں: **للعمومات الشرعية ولخصوص قوله تعالىٰ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ، وقوله تعالىٰ فى سورة الانعام بعد ذكر الجن والانس: وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** (۱) اور امام ابوحنیفہؒ نے غایت احتیاط سے بوجہ کسی خاص نص قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ کے نہ پائے جانے کے اس میں توقف فرمایا ہے: **كمافى الروح وقال النسفى فى**

التیسیر توقف ابو حنیفة فی ثواب الجن ونعیمهم لأنه لا إستحقاق للعبد علی الله تعالیٰ ولم یقل بطریق الوعد فی حقهم إلا المغفرة والاجارة من العذاب وأما نعیم الجنة فموقوف علی الدلیل (۲)اور یہ جو امام صاحب کا قول مشہور ہو گیا ہے کہ وہ ان کے عدم دخول فی الجنۃ کے قائل ہیں، غالباً توقف کی تقریر میں ناقلین کو غلطی ہوئی ہے، **واللہ أعلم**

خلاصہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے عموم سے اگر استدلال کیا جائے تو جنات کے جنت میں جانے میں کوئی شبہ نہیں، نیز حضرت تھانویؒ نے جن آیات کی جانب اشارہ فرمایا ہے، ان سے بھی دخول جنت پر استدلال ہو سکتا ہے، لیکن کسی جگہ خاص طور پر جنات کے لئے جنت میں جانے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، صرف اتنا ہے کہ انھیں عذاب سے بچایا جائے گا، اس کے باعث امام صاحب سے توقف منقول ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ جنت میں نہ جائیں گے، توقف کوئی کرے تو گنجائش ہے، مگر یہ فیصلہ کر لینا کہ انھیں جنت میں داخلہ نصیب نہ ہوگا، صحیح نہیں ہے، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ جنات جنت میں جائیں گے، روح المعانی میں ان کا قول نقل کیا گیا ہے، اس لئے راجح یہی ہے۔

عالمگیری میں امام صاحب سے جو روایت نقل کی گئی ہے، وہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق توقف کے نقل میں غلطی کا ثمرہ ہے، درحقیقت امام صاحب نفی ثواب اور عدم دخول جنت کے قائل نہیں، بلکہ اس سلسلے میں وہ سکوت فرماتے ہیں ’’ہاں اور نہیں‘‘ میں جواب نہیں دیتے، اور ایسا وہ غایت احتیاط کے باعث کرتے ہیں، ناقلین نے اسے نفی بنا دیا ہے۔ الحمد للہ سب خیریت ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۶؍ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

(۱) جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ جن بھی ثواب اور دخول جنت کے مستحق ہیں، چنانچہ عام دلائل شرعیہ سے اس کا پتہ چلتا ہے، اور خاص طور سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت کی حوروں کے بارے میں فرمایا: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ، ان سے پہلے کسی انسان اور نہ کسی جنات نے انھیں ہاتھ نہیں لگایا ہوگا، اس نفی سے پتہ چلتا ہے کہ حورانِ جنت کو جنات ہاتھ لگا سکتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے، اور سورہ انعام میں جنات اور انسانوں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ: وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوْا ، ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کی وجہ سے درجات ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جنات کے بھی درجات ہیں۔

(۲) امام نسفی نے تیسیر میں فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے جنات کے ثواب وانعام کے باب میں توقف کیا ہے، کیونکہ بندے کا اللہ کے اوپر کوئی استحقاق نہیں ہے، اور اللہ نے جنات کے حق میں بطور وعدے کے سوائے مغفرت اور جہنم سے نجات کے اور کچھ نہیں فرمایا ہے، رہا جنت کی نعمتوں کا ملنا تو وہ دلیل پر موقوف ہے۔

☆☆☆☆☆

عزیزم مولوی محمد اسرائیل سلّمہٗ!　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا مرسلہ مکتوب اور استفتاء موصول ہوا، استفتاء اور شخص مذکور (۱) کی ضلالت پر مطلع ہوکر طبیعت جتنی مکدر ومنغص ہوئی، اسی درجہ تمہاری سرگرمی اور دینی حمیت دیکھ کر قلب مسرور ہوا، میرا مقصد پورا ہوا، تم لوگوں کو اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں، دن بھر میرے قلب پر ایک کیف سا چھایا رہا، بہت بہت دعائیں جذرِ قلب سے تمہارے لئے نکلیں، دینی حمیت وغیرت تمہارے لئے صد مبارک ہو، کسی کو ہدایت دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے، لیکن حق تعالیٰ ہمارے قلب میں دین کا درد دیکھ لیں، یہی کامیابی

ہے، عمدہ کام کیا تم نے، لیکن ایک بات اچھی طرح دھیان میں رکھ لینا، اہل باطل کا ردّ وانکار ضرور کرو، لیکن ان کی ''تصدی'' بہتر نہیں۔ ''تصدی'' کی تفسیر سورہ عبس میں دیکھ لو، اعتدال قائم رہنا چاہئے، اصل کام اپنے آپ کو مرضیاتِ الٰہی پر ڈالے رکھنا ہے، غلو کسی کام میں مناسب نہیں، تم نے ذوقعدہ کے آخر میں آنے کو لکھا ہے، بہت مسرت ہے، مولوی عباس صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کردو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲/ذوقعدہ ۱۴۰۵ھ

(۱) ایک شخص عبدالغنی نامی نوادہ، بہار کے علاقے میں زندقہ پھیلا رہا تھا، مفتی محمد اسرائیل سلّمہٗ اور ان کے رفقاء نے نہایت استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، بالآخر وہ اور اس کے متبعین پسپا ہوئے، وہ تو مرگیا، اس کے ماننے والے بیشتر تائب ہوگئے، ان کی اس سلسلے کی سرگرمیوں پر اس خط میں مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

عزیزم مولوی محمد اسرائیل سلّمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے جواب میں تاخیر ہوئی، معاف کرنا، مئو کا فساد اپنے اثرات کے لحاظ سے پھیل گیا تھا، ہمارا علاقہ بھیرہ، ولید پور، خیرآباد، مبارک پور بھی متاثر تھا، اور اس کی صورت اتنی بھیانک اور مخدوش ہوگئی تھی کہ طبیعت کی ساری توجہ سمٹ کر ادھر ہی لگ گئی، مدرسہ میں بیٹھا کچھ کر تو سکتا نہیں تھا، دن رات مصروفِ گریہ وزاری تھا، حضورِ خداوندی میں دعائیں کرتا تھا، جو زعماء میدان میں اتر کر کام کررہے تھے، مثلاً ہاشمی صاحب وغیرہ وہ بھی مئو کے اندر داخلہ کی اجازت نہیں پاسکے تھے، اس درجہ کرخت اور بے لچک کرفیو تھا کہ کچھ نہ پوچھو، کچھ حالات اندر کے باہر آ بھی نہیں رہے تھے، جگر خون ہوکر رہ گیا تھا، سخت کشمکش کی ابتلائی کیفیت تھی، آمدورفت مسدود، بسوں اور ٹرینوں کا سفر خطرناک، غرض بہت ناگفتہ

بہ حالت تھی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر رحم وکرم فرمائیں، نہ جان محفوظ، نہ مال محفوظ، نہ عزت وآبرو کا بچاؤ، پولیس سے جتنا ظلم ہو سکا کیا، کئی آدمی مرگئے، مکانات جل گئے، کتنی عورتیں بے آبرو ہوئیں، میں اپنے دل کا حال کیا بتاؤں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے، انھیں الجھنوں کی وجہ سے مدھوبنی کا سفر جو پہلے سے پختہ تھا منسوخ کردیا، اور اسی وجہ سے تمہارا خط بھی اب تک منتظر جواب رہ گیا، اب بحمد اللہ حالات ٹھیک ہیں، کرفیو کھل گیا ہے، امن وامان کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

میرے عزیز! تمہارے یہاں میں ضرور آؤں گا، لیکن کب تک؟ یہ ابھی نہیں کہہ سکتا، تم جہاں کام کررہے ہو، خلوص اور لگن کے ساتھ لگے رہو، تمہاری استعداد انشاء اللہ برباد نہ ہوگی، میں حق تعالیٰ سے برابر دعا کررہا ہوں کہ تم کو اپنی عنایت سے ایسی جگہ مرحمت فرمائیں جو تمہارے علم وعمل کے لئے مفید ثابت ہو، کیا کروں میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے، بجز اس کے کہ اس حکیم وعلیم کی خدمت میں عجز ونیاز پیش کروں، پھر جو مناسب ہو وہ ظہور میں آئے، میرا یا کسی کا کیا دھرا ہیچ ہے، سب کچھ ادھر ہی سے ہے، بندہ سے وہ اپنے دین کا کام لے لیں، یہی مقصد اعلیٰ ہے ورنہ ہم کسی لائق نہیں ہیں، ان کا کرم ہے، یہاں الحمد للہ خیریت ہے، امتحان سہ ماہی ہو رہا ہے، آج دوسرا دن ہے، کل تک امتحان ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی ۴؍صفر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارے پہلے خط کا جواب میں نے لکھا تھا، شاید تمہیں ملا نہیں، یا کوئی دوسرا خط تم نے لکھا ہو، جو مجھے نہ ملا ہو۔ تم نے اپنے علاقہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اسی کے

باعث میری خواہش رہتی ہے کہ تم لوگ اپنے علاقے میں کام کرو، کام کا طریقہ مجھ سے سیکھو، اور اپنے بس بھر اپنے علاقے میں اشاعت دین کا کام کرو۔ (۱)

اس زمانے میں کیا، کسی بھی زمانے میں اس سے بڑھ کر مرضی حق کام کوئی اور نہیں، اس میں بڑے صبر وتحمل اور استقامت ودوام کی ضرورت ہے، مجھے تمہاری صلاحیتوں سے امید ہے کہ انشاء اللہ تم اس میدان کے مرد ثابت ہوگے، بہت مسرت ہے کہ تمہارے اس خط سے اس کی جھلکیاں ملنے لگی ہیں، تم گھبراؤ نہیں، مجھے خیال رہتا ہے، کارِثواب اور بہت بڑا کارِثواب یقین کر کے میدان میں لگے رہو، انشاء اللہ حق تعالیٰ کی نصرت ہوگی۔ بقیہ سب خیریت ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۳۰؍رجب ۱۴۰۵ھ

---

(۱) حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ بہار کے طلبہ فارغ ہونے کے بعد اپنے علاقہ میں دین کا کام کریں، وہاں خدمت کی بہت ضرورت ہے، بہار کے بکثرت علماء دوسرے صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور خود بہار خالی، مفتی محمد اسرائیل صاحب حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ کی منشاء کے مطابق اپنے علاقہ میں کام کررہے ہیں، اسی سے خوش ہوکر حضرت نے یہ خط لکھا ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

☆☆☆☆☆

بنام مولانا مفتی محمد انعام صاحب غازی پوری

مدرسہ دینیہ غازی پور کے ممتاز طلباء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور وہیں افتاء کی تکمیل کی۔ کچھ عرصہ مدرسہ قاسم العلوم زمانیہ اور مدرسہ دینیہ غازی پور میں تدریس کی خدمات انجام دیں اور اب اپنے گاؤں بھورا ضلع غازی پور میں مدرسہ مدینۃ العلوم کے بانی اور مہتمم ہیں۔ علاقہ کے با اثر علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

عزیزم سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کم از کم دو ہفتہ قبل تمہارا خط ملا تھا، خط کا جواب اگر مختصر دیتا تو ہوسکتا تھا، مگر میں نے خیال کیا کہ قدرے مفصل لکھنا چاہئے تاکہ تشفی ہوسکے، اور صورت حال ادھر یہ ہوئی کہ مسلسل الہ آباد، گورکھپور اور اطراف کے سفر پے بہ پے پیش آتے رہے، اور میرا مدرسہ میں قیام کم رہا، اس لئے تاخیر ہوئی۔ اب اپنی بات کا جواب سنو!

مختصر جواب تو یہ ہے کہ اجتہادی مسائل اور خبر واحد سے ثابت شدہ مسائل میں حق منحصر فی فرد واحد نہیں ہے، بلکہ فی کلٍ خیر ہے۔ اس لئے اختلافی مسائل میں الجھن کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جواب تو محض اتنا ہی ہے۔ اب کی اس کی تفصیل ملاحظہ کرو۔

اسلام میں احکام دو طرح کے ہیں، بعض احکام ایسے ہیں جن پر دین کا مدار ہے، جنھیں تم بنیادی احکام سے تعبیر کر سکتے ہو، اور بعض احکام انھیں بنیادی احکام کی تعمیلی شکلوں سے متعلق ہیں، جنھیں تم فروعی احکام سے تعبیر کر سکتے ہو۔

بنیادی احکام مثلاً توحید و رسالت، بعث بعد الموت، تقدیر وغیرہ کا عقیدہ، نیز نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور اخلاق و معاشرت سے متعلق بہت سے احکام، یہ تمام امور تو قرآن کی نصوصِ صریحہ سے یا سنت متواترہ سے ثابت ہیں۔ ان میں تم کہیں اختلاف نہ پاؤ گے، تمہیں کوئی یہ کہتا نہیں ملے گا کہ نماز مثلاً فرض نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے۔ ان امور میں تو واقعی حق ایک نفس الامری چیز ہے، یعنی خدا کے نزدیک ایک چیز متعین طے شدہ ہے اس کی موافقت حق ہے، اس سے انحراف باطل ہے۔ ایسے چیزوں کا اعلان واشتہار اتنی کثرت اور تکرار کے ساتھ ہے کہ کوئی احمق سے احمق انسان بھی اس کی قطعیت میں شبہ نہیں کر سکتا، اور اگر کسی نے اس سے انحراف کی جرأت کی تو وہ خارج از اسلام قرار پایا۔ دیکھو اہل قرآن نے پانچ وقت کے بجائے تین وقت کی نماز مقرر کی، اور کافر ہوئے، قدریہ نے تقدیر کا انکار کیا اور اسلام سے باہر ہوگئے۔ روافض نے کتاب اللہ کی محفوظیت تسلیم نہیں کی، اور کفر میں جا گرے۔ قادیانیوں کو ختم نبوت میں شبہ ہوا، اور مرتد ہوگئے۔ غرض یہ ایسے قطعی امور ہیں کہ اسلام میں داخل رہتے ہوئے کوئی شخص ان میں شبہ نہیں کر سکتا۔

فروعی احکام اپنے ثبوت کے اعتبار سے دو قسم کے ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں جن کا ثبوت سنت متواترہ اور تعامل امت سے ہے۔ مثلاً پانچوں وقت کی نمازوں میں رکعات کی تعداد، اور وضو میں ہاتھ دھونے سے ابتداء کرنا، پھر کلی، پھر ناک میں پانی ڈالنا۔ نمازوں میں قرآن پڑھنا۔ ارکانِ نماز کی ترتیب وغیرہ۔ ان احکام میں بھی

تم کسی امام کے یہاں اختلاف نہ دیکھو گے، مثلاً کسی امام کے نزدیک یہ بات نہیں ہے کہ پہلے رکوع کرلو، پھر قیام کرو۔ یا پہلے سجدہ کرلو پھر رکوع کرو۔ ان کا تعلق سنت متواترہ اور تعامل و توارث سے ہے۔ یہ بھی اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں بھی نفس الامر واحد ہے اس کی موافقت حق ہے اور اس سے انحراف ظلم و تعدی کا مصداق ہے، لیکن یاد رکھو ان سے انحراف کا درجۂ شناعت وہ نہیں ہے، جو اول الذکر بنیادی احکام سے گریز کا ہے۔ بنیادی احکام کا انکار کفر میں گرا دیتا ہے، جبکہ یہاں کفر کا فتویٰ دینا درست نہیں **الا فی بعض الاحکام۔**

فروعی احکام کی دوسری قسم وہ ہے جن کا ثبوت اخبارِ آحاد یا قیاس سے ہو، اختلاف جو کچھ ائمہ کے درمیان پیدا ہوتا ہے، اس قسم میں ہوتا ہے۔ یہ تشکیل اعمال کی تفصیلات ہیں، ان میں شریعت نے وسعت دی ہے۔ ان احکام میں یہ کہنا کہ نفس الامر ایک ہے اور اس کا ظہور بروزِ قیامت ہوگا، اور حق کوئی ایک ہی ثابت ہوگا غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کے اظہار کے لئے قیامت کا انتظار نہیں کرایا ہے، دنیا میں حق و باطل کو بالکل واضح فرما دیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ہم بہت اطمینان اور وثوق کے ساتھ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر سکتے ہیں۔ اگر فروعی احکام کے مختلف فیہ مسائل میں حق کو کسی ایک جانب میں منحصر کر دیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ اس حق کا اظہار دنیا میں ممکن نہیں ہے اور پھر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ اصل قبولیت تو محض حق کی ہی ہوگی، باقی حق سے منحرف راہوں کو معافی دی جا سکتی ہے، تو سوچو یہ ظلم ہوگا یا نہیں، کہاں ایک طرف تو **لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعها** کا اعلان ہے، اور کہاں یہ تنگی کہ معمہ بنا کر چھوڑ دیا۔ غور کرو جن کا مسئلہ حق ہوا وہ تو خوش ہوں گے، اور جن کا اس کے برخلاف ہوا گو کہ انھیں معافی نصیب ہو لیکن کس درجہ شرمندہ ہوں گے اور یہ

شرمندگی کچھ کم عذاب ہے۔ جو لوگ ان فروعی مسائل کے بارے میں جو خبر واحد اور اجتہاد سے ثابت ہوتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ حق کسی ایک جانب میں منحصر ہے، معلوم نہیں اس کے لئے وہ دلیل کیا دیتے ہیں۔ میں نے بھی زمانہ طالب علمی میں کسی سے یہ بات سنی تھی لیکن اس وقت بھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ میرے خیال میں اپنے اس دعویٰ پر وہ کوئی صریح تو کجا معمولی دلیل بھی پیش نہ کر سکیں گے۔ اب تم ایک مسئلہ کو لو، امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا بعض ائمہ کے نزدیک واجب اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، اور دونوں کے حق میں دلائل نقلیہ وعقلیہ ہیں، صریح بھی اور غیر صریح بھی، کسی دلیل کی نہ تکذیب ہوسکتی ہے اور نہ دعوئ نسخ آسان ہے۔ اب اگر تم کسی ایک کو صراحۃً غلط کہہ دو تو اس کے دلائل کو کیا کرو گے، آخر شریعت کے مسائل سنت ہی سے تو ثابت ہیں۔ یہ راستہ بہت خطرناک ہے کہ دونوں کی تغلیط کردو، یہ بھی غلط ہے کہ ایک کی تغلیط اور دوسرے کی تصدیق کرو، اور پھر رجوع کرو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے صاحب حق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت پائی ہے، جن کے بارے میں **بأیهم إقتديتم إهتديتم** وارد ہے، اور ان کی طرف جنھوں نے نبی کے صحبت یافتوں سے شریعت پائی اور ان سے تربیت پائی اور ان سے مزاجِ شریعت سیکھا ہے۔

حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں متصل سند کے ساتھ ایک روایت اسامہ بن زید سے نقل کی ہے، اسامہ بن زید نے مشہور تابعی، مدنی امام، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد رشید حضرت قاسم بن محمد سے سوال کیا۔ کہتے ہیں:

سألت القاسم بن محمد عن القرأة خلف الامام فيما لم تجهر فيه فقال إن قرأت فلك في رجال من أصحاب النبي ﷺ أسوة وإن

لم تقرأ فلک فی رجال من أصحاب النبی ﷺ أسوة (ج:۲،ص:۸۰)

میں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ جن فرض نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں امام کے پیچھے پڑھنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، اس پر قاسم بن محمد نے فرمایا اگر تم پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ ہے، اور نہ پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں میں اس کا بھی نمونہ موجود ہے۔

دیکھو قاسم بن محمد قدس سرہٗ دونوں عمل کو صحیح قرار دے رہے ہیں، اس سے بڑھ کر سنو! نسائی کے حوالہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں ایک روایت نقل کی ہے جس کو مولانا گیلانی نے تدوین حدیث میں نقل کیا ہے۔

عن طارقٍ أن رجلا أجنب فلم یصل فأتی النبی ﷺ فذکر ذٰلک فقال أصبت، فأجنب رجل آخر فیتیمم وصلیٰ فأتاه فقال له نحواً مما قال للاٰخر یعنی أصبت۔

طارق سے مروی ہے کہ ایک شخص جنابت میں مبتلا ہوا، اور اس نے نماز نہیں پڑھی، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کا قصہ ذکر کیا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرا آدمی جنابت میں مبتلا ہوا، اور تیمّم کر کے نماز پڑھی، وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اور اس سے بھی رسول اللہ ﷺ نے وہی بات کہی جو پہلے سے کہی تھی، یعنی تم نے ٹھیک کیا۔

اور بنو قریظہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آپ نے عجلت میں صحابہ کو بنی قریظہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ نماز عصر بنو قریظہ میں جا کر پڑھنی ہے۔ بعض لوگوں نے آپ کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی اور راستے میں نماز قضا کر دی، اور بعض صحابہ کا خیال ہوا کہ عجلت مقصود ہے نماز قضا کرانی مقصود نہیں ہے۔ ان حضرات نے راستے

میں نماز پڑھ لی، دونوں معاملے جب حضور کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے ہر دو کی تصویب فرمائی۔ ظاہر ہے کہ آپ پر تو حق مخفی نہ تھا اگر ایک ہی جانب اس اجتہاد میں حق تھا تو دوسرے کی تصویب کا کیا معنیٰ؟ خلاصہ یہ کہ بنیادی احکام کی تشکیلی صورتیں جو اخبارِ آحاد یا قیاس سے ثابت ہیں، ان میں جتنی صورتیں دلیل سے ثابت ہیں سب بجا درست ہیں اور سب حق ہیں۔

مولانا گیلانی نے امام جصاص کا ایک قول نقل کیا ہے کہ:

> ان حدیثوں کی بنیاد پر مسائل کی جتنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں، مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان میں سے جس شکل کو چاہیں اختیار کریں، فقہاء اور ائمہ میں یہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان شکلوں میں افضل و بہتر شکل کیا ہے۔
>
> (تفسیر جصاص، ج:۱، ص:۲۰۴)

بلکہ اس سے بڑھ کر امام جصاص ہی کی اور بات اور بھی نقل کی ہے:

> ”مختلف روایتوں کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمان ان ان شکلوں اور پہلوؤں میں سے جس شکل اور جس پہلو کو چاہیں اختیار کریں۔ آنحضرت ﷺ نے سب ہی کر کے دکھایا تا کہ معلوم رہے کہ ساری صورتیں جائز ہیں۔ (حوالہ بالا)

اور دیکھو مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں، مثلاً عیدین وتشریق کی تکبیریں، محرم کا (بحالت احرامِ حج) نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد کے کلمات جو ابن مسعود اور ابن عباس کی طرف منسوب ہیں، یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ پڑھنا یا زور سے پکار کر کہنا، یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دو

> دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات کو ادا کرنا، اور اسی قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق ہے، اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے، بلکہ سلف کا اگر اختلاف تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے، ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے پر سب متفق ہیں۔
>
> (الانصاف، ص: ۸۹)

اس تفصیل سے مسئلہ کی حقیقت تم سمجھ گئے ہوگے، اگر مزید معلومات چاہو تو مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب تدوین حدیث ص: ۲۹۴ سے ۳۷۰ تک ذرا غور سے پڑھ لو۔ انشاء اللہ اختلاف کی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

البتہ یہاں پر چند سوال پیدا ہوں گے۔ (۱) جب تمام صورتیں حق ہیں تو کسی ایک امام کی تقلید کی کیا حاجت ہے، آدمی جس مسئلہ پر چاہے عمل کرے۔ (۲) مثال کے طور پر امام کے پیچھے جب سورہ فاتحہ پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں صحیح ہے تو امام شافعی علیہ الرحمہ کے فتویٰ کے مطابق اگر مقتدی نہ پڑھے گا تو اس کی نماز فاسد کیوں ہوتی ہے، اور امام صاحب کے فتویٰ کے مطابق اگر پڑھ لے تو اساءت وملامت کا مستحق کیوں ہوتا ہے۔ یا مثلاً ایک رکعت وتر امام صاحب کے نزدیک کیوں درست نہیں ہے جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک صحیح ہے؟ (۳) اگر سب صحیح ہے تو مجتہد کے خطا وصواب کا کیا مطلب؟ کہ خطا پر ایک ثواب کا وعدہ ہے اور صواب پر دوہرے اجر کا۔

پہلے سوال کا جواب سنو! حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ نے لکھا ہے کہ عامۃ المسلمین چوتھی صدی ہجری سے پہلے کسی ایک امام کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے بعد کسی ایک امام کے مسائل پر تخریجات کا

سلسلہ شروع ہو چکا تھا، تاہم کسی ایک امام کے مسلک کی مکمل تقلید کا ظہور چوتھی صدی ہجری تک نہ تھا، بلکہ عام لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اجماعی مسائل جن میں ائمہ کا اختلاف نہ تھا، ان میں صاحب شرع کی تقلید ہوتی تھی۔ چنانچہ وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے طریقے خود اپنے گھروں سے سیکھتے تھے، جو بطور تعامل رسول اللہ ﷺ سے ان تک پہونچے تھے، اور اگر کہیں مسئلہ معلوم نہ ہوتا اور دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تو کسی مفتی اور فقیہ سے پوچھ لیتے، اور اس پر عمل کرتے، خواہ وہ کسی مسلک کا ہو، اور علماء خواص کا طریقہ یہ تھا کہ محدثین تحصیل حدیث میں مشغول رہتے اور انھیں ایسی صحیح اور مشہور حدیثیں مل جاتیں، جو عمل کے لئے کافی ہوتیں اور اگر کہیں روایات مختلف ہوتیں تو ترجیح کے لئے فقہاء متقدمین کی جانب رجوع کرتے، اور اگر فقہاء کے دو یا چند اقوال ملتے تو دلیل کے لحاظ سے جو راجح ہوتا اسے اختیار کرتے۔ خواہ فقیہ اہل مدینہ میں سے ہو یا اہل کوفہ میں سے۔ اور فقہاء جن مسائل کو صراحۃً نہیں پاتے اپنے اساتذہ کے مسلک پر ان مسائل کی تخریج کرتے، اور انھیں کی جانب منسوب ہوتے، چنانچہ ”فلاں شافعی ہے اور فلاں حنفی ہے“ کی حقیقت یہی ہے۔ بلکہ محدثین بھی بکثرت مسائل میں جن ائمہ کی موافقت کرتے ہیں انھیں کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے، جیسے امام نسائی وبیہقی وغیرہ شافعی مشہور ہیں، ورنہ یہ اکابر خود مجتہد تھے، اس زمانے میں قاضی ومفتی وہی ہوتا تھا جو مجتہد ہو۔

یہ تو اصل صورت حال تھی، اور یہی طریقہ فطری اور مزاج شرع کے موافق ہے، لیکن حالات کے بدلنے سے طریقۂ کار میں تبدیلی کرنی پڑی۔ بعد میں جوں جوں دین سے دوری بڑھتی گئی، شریعت کی وقعت قلوب سے کم ہوتی گئی، اور خواہشات کے اتباع کا زور بڑھتا گیا، ویسے ویسے دین کی گرفت لوگوں پر ڈھیلی پڑتی گئی۔ ایسی

حالت میں اگر سابقہ طریقۂ کار کو باقی رکھا جاتا تو تلعب بالدین کا دروازہ کھل جاتا۔ انتظام شریعت کے واسطے تقلید شخصی ضروری قرار پائی، اوراب غیر مقلدین کی حالت دیکھ کر یہ بات بداہۃً محسوس ہوتی ہے کہ تقلید شخصی انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔

دوسرے سوال کا جواب اُنا عندظن عبدی بی پر غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مجتہد نے یا مبتلیٰ بہ نے حق اجتہاد پورا کر کے یا مکمل تحری کر کے جس جانب کو راجح قرار دیا، اور سمجھا کہ حق تعالیٰ کی مرضی یہی ہے، اب اس کے خلاف دوسری راہ اختیار کرنے کی اسے اجازت نہ ہوگی۔ دیکھو جب جہت تحری قبلہ بن چکی تو اس کے علاوہ کسی اور جہت میں رُخ کرے گا تو اپنی نماز کھودے گا، گو وہ عین قبلہ کی جہت میں ہو۔ اسی کے مثل تمہاری تحریر کردہ مثال بھی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ خطا اور صواب کا تعلق آخرت سے نہیں ہے، بلکہ دنیا سے ہے یعنی مجتہد نے اخلاص کے ساتھ معاملہ سمجھنے کی کوشش کی اور اجتہاد کی تمام شرائط پوری کیں، اور ایک فیصلہ کیا، مگر بعد میں کسی اور دلیل سے معلوم ہوا کہ وہ فیصلہ غلط تھا، تو گناہگار نہ ہوگا، بلکہ اجر کا مستحق ہوگا، اور اگر اس کا فیصلہ صحیح تھا تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ آخرت میں خطا وصواب کے معلوم ہونے کا یہ مسئلہ نہیں ہے۔

خدا کرے تمہیں اس سے تشفی ہوجائے، اگر مناسب سمجھو تو یہ پورا خط کسی ایسے استاذ کو جس پر تمہیں پورا اعتماد ہو، دکھا دو۔ اگر اس میں غلطی کی نشاندہی کریں تو اور تصویب کریں تو اطلاع دو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یکم/ مارچ ۱۹۸۵ء

☆☆☆☆☆

بنام مولانا صفی اللہ مدھوبنی

عزیزم مولوی صفی اللہ سلّمہٗ ضلع مدھوبنی، بہار، کے رہنے والے سعادت مند طالب علم تھے، جس وقت یہ خط لکھا گیا، وہ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، اس سے پہلے مدرسہ دینیہ غازی پور میں اس خاکسار کے پاس پڑھتے تھے، اب ماشاء اللہ مدھوبنی شہر میں ایک مدرسہ میں مدرس ہیں، تعلیم کے ساتھ تجارت کا مشغلہ بھی ہے، بہت کامیاب تاجر ہیں، اللہ تعالیٰ برکت دے۔ (اعجاز احمد اعظمی)

عزیزم مولوی صفی اللہ سلّمہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، میں دعاء تو تم لوگوں کے لئے کرتا ہی ہوں، تم لوگ بھی اس کا لحاظ رکھو کہ وقت لہو ولعب، فضولیات وخرافات میں نہ گزرے، مقصد صرف علم دین کی تحصیل ہی نہیں بلکہ اخلاقِ فاضلہ اور خصائل حمیدہ کا بھی حصول ہے، اور دونوں کا ایک دوسرے سے ربط ہے، انسان اگر اپنے اخلاق واعمال کے لحاظ سے بلند اور ممتاز ہوگا تو اس کا علم بھی معتبر اور کارآمد ہوگا، اور اگر علم نافع اسے حاصل ہو رہا ہے تو لازماً اس کے اخلاق وعادات بہتر سے بہتر ہوتے چلے جائیں گے، ایک کے بغیر دوسرا چنداں قابل

اعتبار نہیں ہے، حدیث ہے: **تعلموا العلم وتعلموا للعلم الوقار** ، علم سیکھو اور علم کے واسطے وقار و سنجیدگی سیکھو، پھکڑ پن، کھلنڈرانہ مزاج، فضولیات میں انہماک، یہ سب مزاج علم کے خلاف ہے، طالب علم غیر سنجیدہ حرکات کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اسے علم سے مس بھی نہیں ہوا، اے کاش! آج طلبہ اس بات کو سمجھ لیتے تو کتنے مسائل حل ہو جاتے، لیکن **کم حسراتٍ فی بطون المقابر** ، دارالعلوم بہت بڑی جگہ ہے، بڑی جگہ میں آدمی گم ہو جاتا ہے، لیکن ٹھوس سنجیدگی، وقار و متانت اور کتابوں کی مشغولیت انسان کو گم ہونے سے بچالے گی، معلوم نہیں تم لوگوں کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں، جوں جوں وقت اپنا قدم آگے بڑھاتا جاتا ہے، تم لوگوں کی تحصیلی عمر کم ہوتی چلی جا رہی ہے، جتنا وقت بچ گیا ہے اس کی قدر کرو، علم میں رسوخ پیدا کرنے کے لئے کمالِ جد و جہد کرو، سستی و کاہلی اور آرام پسندی نیز زیب و زینت سے بہت اجتناب کرو، یہ میری نصیحت ہے، پہلے بھی تھی، اب بھی ہے، آئندہ بھی رہے گی، آرام و راحت اور زیب و زینت کی اصل جگہ جنت ہے، دنیا نہیں، یہ کارگاہ ہے، کارخانہ میں کوئی اچھے لباس کی طرف دھیان نہیں دیتا، جب وہاں سے فارغ ہو جاتا ہے، جب صورت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

والسلام

دعاگو اعجاز احمد اعظمی

۲۰؍ صفر ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا مفتی انعام الحق صاحب سیتامڑھی

مدرسہ دینیہ شوکت منزل غازی پور کے ممتاز طلباء میں ہیں۔ صاحب استعداد، شریف الطبع، محنتی اور جفاکش دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اور جن دنوں میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں مدرس تھا انھوں نے وہیں افتاء کی تکمیل کی، اور عرصہ سے عالی پور صوبہ گجرات کے ایک مدرسہ کے استاذ حدیث ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنے آبائی وطن سیتامڑھی صوبہ بہار میں مکاتب کا نظام چلا رہے ہیں۔ انھوں نے سوال کیا تھا کہ ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب روئے زمین پر سو سال تک زندہ نہیں رہ سکتے، یہ حدیث کہاں ہے؟ بابا رتن نے جب یہ دعویٰ کیا کہ میں صحابی ہوں تو علماء کرام نے مذکورہ حدیث کی بنا پر ان کی تکذیب کردی، سوال یہ ہے کہ جنات کے صحابی ہونے پر دلائل ہیں، اور ان کی عمر چودہ سو سال کی ہوئی ہے، جیسا کہ مشہور واقعہ (شاہ اہل اللہ برادر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا واقعہ) سے معلوم ہوتا ہے، تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟“ اس کے جواب میں یہ مکتوب تحریر کیا گیا۔

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عرصہ کے بعد تمہارا خط ملا، جبکہ مجھے انتظار تھا۔ جس حدیث کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ مسلم شریف کی روایت ہے، مسلم شریف یہاں نہیں ہے، مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اسی کے حوالے سے نقل کیا ہے، صاحب فتح الباری نے بھی نقل کیا ہے مگر حوالہ نہیں دیا ہے، اس سلسلے میں جو قول تم نے نقل کیا ہے کہ ممکن ہے کہ اجنہ صحابہ اس وقت فضاء آسمانی میں ہوں، وہ واقعی کمزور بات ہے، کلام خواہ الفاظ کے اعتبار سے بالکل مطلق ہو، لیکن متکلم ومخاطب اور ماحول وزمان کے لحاظ سے اس میں قیدیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے متعلق ہدہد کی زبان سے نقل کیا ہے کہ **واوتیت من کل شیٔ**، ظاہر ہے کہ **من کل شیٔ** سے مراد دنیا کی ہر چیز نہیں ہے، بلکہ بادشاہت کے جو لوازم واسباب ہیں وہ مراد ہیں، اسی طرح حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ **لایبقیٰ علی وجہ الارض بعد مائۃ سنۃٍ ممن ھو علیھا الیوم أحد**، اس سے مراد پوری کائناتِ مکلفین تو کیا، تمام انسان بھی مراد نہیں ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **أراد بذٰلک إنخرام قرنہ**، رسول اللہ ﷺ کا منشا یہ ہے آپ کا قرن ختم ہو جائے، جس کے بارے میں آپ نے **خیر القرون قرنی** فرمایا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ سو سال تک صحابہ کی موت بھی ضروری نہیں، مجموعی اعتبار سے آپ کا قرن مراد ہے سو سال گذرنے کے بعد اگر بعض صحابہ زندہ وحیات ہوں تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔

ہاں جہاں تک ہندوستان کے مدعی صحابیت کا مسئلہ ہے، تو اس میں محدثین کا طریقہ قوی ہے، صحابیت ایک شرف عظیم ہے، اس پر بہت سے احکام وامور متفرع ہوتے ہیں، اس کے ثبوت کے لئے صرف امکان کافی نہیں ہے، بلکہ صحیح سند کے ساتھ

اس کا ثبوت بھی ضروری ہے، کم از کم خبر واحد کے درجے کا ثبوت صحابیت کیلئے درکار ہے، اور بابارتن ہندی کے لئے، اس طرح کا کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف امکان، حسن ظن اور ان کا دعوائے صحابیت ہے، اس سے اتنا تو ہوسکتا ہے کہ ایک معمولی گمان کے درجے میں انھیں صحابی تصور کیا جائے، لیکن صحابیت کے احکام ان پر جاری نہ ہوں گے۔ اگر ان شرائط کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دین میں بڑا رخنہ پیدا ہوجائے گا۔ کوئی عمر دراز شخص اگر اس کا دعویٰ کر بیٹھے تو کیا ہم سب کو صحابی مان لیں گے۔ ہندوستان میں ایسے عمر دراز شخص بہت ہوئے ہیں، جو حبس دم کر کے ایک دو سال نہیں سینکڑوں سال بیٹھے رہے ہیں، اس لئے بابارتن کے باب میں حضراتِ محدثین ہی کا قول معتبر ہے، یہی اصول اجنہ صحابہ کے متعلق بھی ہے، یہ تو بہرحال معلوم ہے کہ اجنہ میں بھی صحابہ ہوئے ہیں، لیکن متعین طور پر کسی فرد کی صحابیت معلوم نہیں۔ اس لئے اگر کوئی جن دعویٰ صحابیت کرلے تو اس کی صالحیت وغیرہ کی بنا پر حسن ظن قائم کرنے کی گنجائش ہے، مگر قطعیت کے ساتھ فیصلہ درست نہیں، مشہور قصہ میں بھی اصل حکم یہی ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حقیقۃً صحابی تھے، اسی بنا پر شاہ اہل اللہ صاحب جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا وہ کسی درجہ میں تابعی نہیں ہوئے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲؍رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا شرافت ابرار صاحب دیناج پوری

مدرسہ دینیہ غازی پور میں جن طالب علموں سے خصوصی تعلق رہا ان میں ایک پورا خانوادہ ہی تھا، جس کے اکثر افراد نے اس خاکسار سے تعلیم حاصل کی۔ یہ مولوی شرافت ابرار۔ مولوی نثار خالد۔ مولوی فروغِ الیاس۔ حافظ منہاج اصغر۔ مولوی خورشید ربّانی ہیں۔ یہ سب سگے بھائی ہیں جو بیک وقت مدرسہ دینیہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ حافظ منہاج اصغر کو چھوڑ کر باقی سب نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ ان کا پرانا تعلق اب بھی باقی ہے۔ یہ صوبہ بنگال ضلع دیناج پور کے رہنے والے ہیں۔ مولانا شرافت ابرار کلکتہ میں جامع مسجد نارکل ڈانگہ کے امام وخطیب ہیں اور ایک عربی مدرسہ جامعہ امام ابوحنیفہ کے بانی اور مہتمم ہیں۔

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کلکتہ سے واپسی پر ابھی مدرسہ نہیں پہونچا تھا جبھی ایک خط غازی پور سے بعجلت تمہارے پاس بھیجا تھا، خدا معلوم ملا یا نہیں، اس خط میں تم نے کوئی تذکرہ اس کے متعلق نہیں کیا ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید خط ملا نہیں۔

تمام احوال اللہ کے اختیار میں ہیں، اپنے ہوں یا غیر! نہ ان پر اعتماد کرو اور نہ انھیں موردِ الزام ٹھہراؤ۔ سب خدا کی تقدیر کے سامنے بے بس اور معذور ہیں، کوئی کچھ

نہیں کرسکتا، سب کچھ ادھر ہی سے ہے، اگر آدمیوں کے بس میں ہوتا تو اب تک تم اپنے حالات پر قابو پا چکے ہوتے، یا تمہارے دشمن تمہیں پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے ترسا دیتے، لیکن نہ تم اپنے ارادہ میں کامیاب ہو پارہے ہو، نہ تمہارے دشمن، بس ہر شخص دست قدرت میں لاچار ہے، سوائے رضا بالقضا اور دعاء عافیت کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اب اپنے سوالات کے جواب ملاحظہ کرو۔

(۱) **أو لكلم ثوبان** ایک حدیث کا ٹکڑا ہے، جو رفع حرج کے سلسلے میں ناطق ہے، پوری حدیث سامنے ہو تو مطلب کھل جائے گا۔ **عن أبی هريرة أنه ﷺ سئل عن الصلوٰة فی ثوبٍ واحدٍ فقال أو لكلكم ثوبان**’’رواه الستة إلا النسائی، جمع الفوائد ج:۱ ص:۱۹۵‘‘ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا ایک کپڑے میں نماز ہوسکتی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جب ہر آدمی دو کپڑے کا مالک نہیں تو کیا اس کی نماز نہیں ہوگی، یعنی دو کپڑا ہونا صحت نماز کے لئے شرط نہیں۔

(۲) ملاء اعلیٰ کی تمہید میں شاہ صاحب نے ایک آیت اور چند حدیثیں ذکر کی ہیں، انھیں بغور پڑھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ملائکہ کی دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت وہ ہے جو براہ راست بارگاہِ قدس میں حاضر ہے، اور احکام خداوندی کا نزولِ اولیں انھیں پر ہوتا ہے اور ان کے واسطے سے فرشتوں کی دوسری جماعت ان احکام کو حاصل کرتی ہے۔ یہ دو جماعتیں تو فرشتوں کی ہیں، اس کے بعد سنو کہ انسانوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے ملکوتی استعداد رکھی ہے، یہ استعداد کم اور زیادہ ہوتی ہے، جو خوش بخت اس کا حظِ وافر پاتے ہیں، اور پھر اس کو کام میں لاکر اسے ترقی دیتے ہیں، وہ جوں جوں ملکوتیت کی طرف آگے بڑھتے ہیں ان کی بہیمیت مدھم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بالکل

مضمحل ہوکر رہ جاتی ہے، یہ لوگ اپنی استعداد کے مطابق کبھی فرشتوں کی پہلی جماعت میں جا شامل ہوتے ہیں، اور کبھی دوسری جماعت میں۔ شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کام فرشتوں سے انجام پاتے ہیں ان کی انجام دہی یہ لوگ بھی شریک ہوجاتے ہیں، ان فرشتوں اور آدمیوں سے کیا کام انجام پاتے ہیں، اجمالاً شاہ صاحب نے **إعلم أنه قد استفاض من الشرع الخ** میں بیان کیا ہے۔

چونکہ دونوں طرح کے فرشتوں کی استعدادیں متفاوت ہوتی ہیں، اور اسی لحاظ سے ان کے درجات میں تفاضل ہے، اس لحاظ سے ان کے اجسام واشباہ کے اندر بھی فرق ناگزیر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ **قسم علم الحق ان نظام الخير إلىٰ نفوس كريمة** یعنی ایک قسم وہ ہے کہ نظام خیر ان کے وجود پر باذن خداوندی موقوف ہے، تو حق تعالیٰ نے کچھ “اجسام نوریہ” کو پیدا فرمایا اور ان میں “نفوس کریمہ” کی روح پھونکی۔ ان اجسام کو اللہ تعالیٰ نے عناصر کے لوث سے پاک رکھا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جو عناصر کے لوث سے مبرا نہیں ہے، بلکہ عناصر کے “بخاراتِ لطیفہ” کی ترکیب سے ان کا مادہ تیار ہوا پھر ان میں نہایت اعلیٰ درجہ کی روح ڈالی گئی، جو بہیمیت کی تلویثات سے یکسر منزہ ہے، یہ بھی فرشتے ہی ہیں، پہلی جماعت ملاء اعلیٰ کے نام سے موسوم ہے، اور دوسری جماعت ملاء سافل کے نام سے، تیسری قسم انسانوں کی جماعت سے اٹھتی ہے، یہ کبھی ملاء اعلیٰ کے ساتھ لحوق رکھتی ہے اور کبھی ملاء سافل کے ساتھ، بلکہ بعض اکابر تو دونوں جماعتوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں، جیسے انبیاء کرام **علیہم الصلوٰۃ السلام**۔

پھر شاہ صاحب نے ملاء اعلیٰ کے شئون پر گفتگو کی ہے کہ ان کو باری تعالیٰ کی جانب دوام توجہ حاصل ہوتا ہے، ایسا دوام جس کو کوئی بھی مانع منقطع نہیں کرسکتا، وہ ہر

حال میں متوجہ الی اللہ رہتے ہیں، انھیں اپنی فطری استعداد کے باعث جو خدا نے ان میں ودیعت کی ہے، ''ہر نظام خیر'' اور ''انتظامِ صالح'' محبوب اور مطبوع ہوتا ہے، اور نظامِ شر کی نفرت سے یہ معمور ہوتے ہیں، ملاءِ اعلیٰ کے انوار باہم متداخل ہو کر ''روحِ اعظم'' کے پاس جمع ہوتے ہیں، اس جگہ کا نام شاہ صاحب ''حظیرۃ القدس'' رکھتے ہیں، اگر خدا تعالیٰ کو مخلوقات کے ساتھ خیر منظور ہوتا ہے تو ''حظیرۃ القدس'' میں اجماع منعقد ہو جاتا ہے کہ اس وقت کے سب سے صالح استعداد والے شخص کی تربیت کرکے اسے درجۂ کمال تک پہونچا دیا جائے، اور پھر بنی آدم کے قلوب میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ اس کے اتباع پر جمع ہو جائیں، اس طرح ایک نظام صالح کا رواج ہوتا ہے، پھر نظام صالح کے لئے اسی کے مناسب علوم وحقائق کا انکشاف ہوتا ہے، کبھی بصورتِ وحی، کبھی الہام، کبھی بصورت صدائے غیبی اور کبھی بصورت مشاہدہ، ملاءِ اعلیٰ کے یہ فرشتے ان لوگوں کی مدد میں سرگرم ہوتے ہیں، جو اس نظام کو قبول کرتے ہیں اور جو اس سے دور ہوتا ہے اس پر لعنت بھیجتے ہیں، یہی حقیقت نبوت کی اصل اصول ہے، ملاءِ اعلیٰ کی اس سرگرمی کو شریعت کی اصطلاح میں ''روح القدس کی تائید'' کہتے ہیں، ''روح القدس کی تائید'' سے عجیب وغریب برکات وخوارق کا ظہور ہوتا ہے، جس کا تعلق عام اسبابِ عادیہ سے نہیں ہوتا، انھیں معجزات کہتے ہیں، یہ حال تو ملاءِ اعلیٰ کا تھا۔

ملاءِ اعلیٰ کے بعد دوسرے کچھ نفوس ہیں، یہ قسم اول کے مرتبہ پر نہیں ہوتے ......جیسا کہ پہلے گزر چکا......ان کا کمال یہ ہے کہ ہر وقت منتظر رہتے ہیں کہ اوپر سے جو احکام آئیں تو انھیں اپنی استعداد کے مطابق قبول کرکے ان کے نفاذ میں سرگرم ہو جائیں جیسا کہ حیوانات اور پرندے اپنے طبعی تقاضوں کے مطابق سرگرم کار رہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی الٰہی اور خداوندی تقاضوں پر سرگرم عمل ہوتے ہیں، ان کی نہ اپنی

کوئی طبیعت ہوتی ہے اور نہ اس کے تقاضے، یہ اپنی خواہشات کے لحاظ سے فانی اور اللہ کی مرادات کے لحاظ سے باقی ہوتے ہیں، جو کچھ ان کے قلوب میں اوپر سے الہام ہوتا ہے اس کے موافق یہ انسان اور بہائم کے قلوب میں موثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہی کی تاثیر ہوتی ہے کہ انسان کا ارادہ شر سے پلٹ کر ایک دم خیر کی طرف ہو جاتا ہے، بلکہ ان کی تاثیرات اشیاء طبعیہ میں بھی اپنا رنگ دکھاتی ہیں، چنانچہ کبھی کوئی پتھر پھینکا جاتا ہے تو جتنی دور اسے جانا چاہئے اس سے بہت آگے چلا جاتا ہے، درحقیقت وہاں کوئی فرشتہ آ جاتا ہے جو اس پتھر کو مزید لڑھکا دیتا ہے، ایک شکاری اپنا کانٹا دریا میں ڈالتا ہے تو فرشتوں کی جماعت آتی ہے اور کسی مچھلی کو اس سے بھگا دیتی ہے اور کسی مچھلی کے دل میں کوئی دوسرا اثر ڈال دیتی ہے کہ وہ کانٹے میں آ کر گرفتار ہو جاتی ہے، وہ خود نہیں جانتی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، یونہی کبھی دو فوجوں میں مقابلہ ہوتا ہے، ایک فوج شجاعت وہمت سے بھرپور ہوتی ہے، اور دوسری جبن وپستی کا شکار ہو جاتی ہے، یہ درحقیقت ملاء سافل کی کارفرمائی ہے، ملاء سافل کی عین ضد ایک اور جماعت ہے جس کا مادہ ’’بخارات ظلمانیہ‘‘ سے تیار ہوا ہے، یہ ہر خیر سے عناد رکھتی ہے، ان کی ساری جدوجہد اور سرگرمی فرشتوں کے خلاف ہوتی ہے، یہ شیاطین کا گروہ ہے۔ **أعاذنا اللہ منها** ۔

فرصت نہ تھی، مختصراً اتنا لکھ دیا۔ تفصیل کے لئے مزید مثالیں اور ان کا انطباق درکار ہے جس کی فرصت نہیں، زبانی گفتگو اس کیلئے مناسب رہے گی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۶؍صفر ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

بنام مفتی سفیان احمد صاحب اعظمی

غالباً ۱۹۸۴ء میں مدرسہ بیت العلوم سرائمیر کے سالانہ جلسہ میں میری حاضری ہوئی تھی۔ وہاں ایک ذہین وفطین طالب علم کو بہت غور اور اہتمام سے وعظ سنتے ہوئے دیکھا، پھر وعظ کے بعد وہ میرے قریب دیر تک رہا۔ جلسہ کے کچھ دنوں بعد جب مدرسوں کے تعلیمی سال کا اختتام ہوا تو وہی طالب علم مدرسہ دینیہ شوکت منزل میں میرے پاس اپنے چند رفقاء کے ساتھ آیا اور درخواست کی کہ ہم لوگ اگلے سال مدرسہ دینیہ میں پڑھنا چاہتے ہیں، چنانچہ ایک سال اس طالب علم نے مدرسہ دینیہ میں تعلیم حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ یہ ہیں مولانا سفیان احمد سلمہٗ! کچھ دنوں گجرات کے ایک مدرسہ میں رہے، پھر دوتین سال کے لئے سعودی عرب چلے گئے، اور اب ایک طویل عرصہ سے میرے ساتھ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں مصروف تدریس ہیں۔

عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج تمہارا خط ملا، اس سے پہلے وہ خط ملا تھا جس میں تم نے رفع یدین فی الدعاء کا مسئلہ دریافت کیا تھا، میں نے علی الفور اس کا ایک مختصر اور اجمالی جواب لکھا اور اس میں یہ وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ اس پر ایک مفصل اور سیر حاصل مضمون لکھوں گا، مگر غلطی یہ ہوئی کہ المآثر کا جو پیکٹ بنایا اسی میں وہ خط بھی ڈال دیا، المآثر معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کہیں ضائع ہوگیا اسی کے ساتھ وہ خط بھی مرحوم ہوگیا۔ افسوس یہ ہے

کہ اس کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے کہ پھر لکھ کر بھیج دوں، اور اس وقت ذہن میں مضمون بھی مستحضر نہیں ہے، البتہ اتنی بات لکھ دینی ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی عمل کے ثبوت کے لئے انحصار صرف عمل رسول اور عمل صحابہ پر نہیں ہے، اگر کسی بات کا ثبوت عملی دلائل سے نہ ہو مگر اقوال وفرمودات سے ہوتا ہو تو وہ کسی طرح درجے میں اس سے کم نہیں ہے جس کا ثبوت عمل سے ہو، مگر آج کل کے ظاہر پرستوں اور عقل سے بیگانوں کے یہاں سوائے جمود کے کچھ نہیں ملتا، ظواہر الفاظ کے عاکفین کو کوئی بات سمجھانی بہت مشکل ہے، میں پوچھتا ہوں کہ نمازوں کے بعد دعاؤں کی قبولیت کی بشارت اور اس کی ترغیب احادیث میں آئی ہے یا نہیں؟ اور پھر دعاؤں میں اور اس کے آداب میں ہاتھ اٹھانے کا تذکرہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر دونوں بات ثابت ہے تو جماعت کی نمازوں کے بعد یا انفرادی نمازوں کے بعد اگر سب نے یا ایک نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تو اس میں بدعت کی کیا بات ہوئی؟ کیا جو حکم مطلق آیا ہو اگر اس کی تعمیل کسی خاص صورت میں کر دی گئی تو وہ بدعت ہو جائے گی، نہ جانے بدعت کی کیا تعریف اور اس کی کیا حدود ان اللہ کے بندوں کے نزدیک ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ استنباط واجتہاد کے تو دشمن ہیں، جب تک ظواہر ان کے سامنے نہ پیش کرو ان کی عقل کھلتی ہی نہیں، اور اسی ظاہر پرستی کے باعث یہ عجب عجب خبط .... میں پڑے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں ظواہر حدیث کو بھی پیش کیا ہے، ابھی وہ مکمل اور صاف نہیں ہوا ہے، بعض حوالوں کی بھی تلاش ہے، اس لئے تھوڑی تاخیر ہے، مگر اس کو بدعت کہنا یا اسے غیر ثابت کہنا محض مکابرہ ہے، جس چیز کی ترغیب وتحریض حدیث میں آگئی، اس کا مطلوب ومحمود ہونا ثابت ہو گیا، اور اس کی تعمیل کی جتنی جائز صورتیں ہو سکتی ہیں خواہ وہ دورِ صحابہ میں پائی جاتی ہوں یا نہ، بشرطیکہ کسی خاص صورت میں منحصر

نہ کر دیا گیا ہو بالکل درست اور ثابت بالسنۃ ہیں، البتہ اس کی تعمیل کو کسی خاص صورت میں منحصر کر کے باقی صورتوں کی نفی کر دی جائے تو یہ البتہ زیادۃ فی الدین ہے، جیسا کہ ان غالین نے کر رکھا ہے۔ دیکھو فرض نماز کے بعد دعاء کی ترغیب وارد ہے، دعاؤں میں ہاتھوں کا اٹھانا بالاتفاق داخل آداب ہے، پھر کیا بات ہے کہ بعد نماز فرض اسے ترک رفع کے ساتھ خاص کر دیا جائے، اور رفع یدین کو بدعت قرار دیا جائے، اگر اس تخصیص وانحصار کو بدعت کہا جائے تو بجا ہے، رہی بات التزام کی تو عزیزم یہ التزام نہیں ہے دوام ہے، اور دوام فی نفسہٖ مطلوب ہے۔ علامہ انورشاہ کشمیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”لا ریب ان الادعیة دبر الصلوٰة قدتواترت تواتراً لا ینکرا ما رفع الایدی فثبت بعد النافلة مرة او مرتین فالحق بها الفقهاء بعد المکتوبة ایضاً وذهب ابن تیمیة وابن قیم الی کونه بدعة بقی ان المواظبة علی امر لم یثبت عن النبی ﷺ إلامرة او مرتین کیف هی؟ فتلک هی الشاکلة فی جمیع المستحبات فانها تثبت طوراً فطوراً ثم الامة تواظب علیها ۔‘

حاصل یہ ہے کہ نمازوں کے بعد دعا کرنا ایسے تواتر سے ثابت ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، باقی ہاتھوں کا دعا میں اٹھانا تو نفل کے بعد ایک یا دو مرتبہ ثابت ہے، فقہا نے اسی قیاس پر فرض نمازوں کے بعد بھی ہاتھ اٹھانے کو ملحق کیا ہے، اور علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ایک یا دو بار ثابت ہے اس پر دوام کرنا کیسا ہے؟ تو معلوم ہونا چاہئے کہ تمام مستحبات کے اثبات کا یہی طریقہ ہے کہ ان کا ثبوت حضور اکرم ﷺ سے کبھی کبھی ہوتا ہے، پھر امت اس پر مواظبت کرتی ہے،‘ (فیض الباری ج۴ ص۴۱۷)

اس عبارت میں خط کشیدہ جملے بہت قیمتی اور اصولی ہیں، اور علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے جو تشدد اس بات میں اختیار کیا ہے وہ بہت نامناسب ہے، اور اس طرح کے نامناسب تشددات ان دونوں نے بہت سی جگہوں پر اختیار کئے ہیں، اپنی کسی بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو نصوص کو خوب توڑتے مروڑتے ہیں اور اگر ان کے مزاج کے خلاف کوئی اصولی گفتگو کرتا ہے تو ظواہر نصوص کی دہائی دیتے ہیں، ان کا اور ان کے متبعین کا کچھ اعتبار نہیں، پھر عبارت میں جو ایک دومرتبہ ثبوت کا ذکر آ گیا اس سے ثبوت عملی مراد ہے ورنہ ثبوت قولی بہت موجود ہے، اور اسی پر زیادہ اعتماد ہے۔ اصولی بات ہے کہ ثبوت کے لئے قول رسول، عمل رسول پر مقدم ہے، باقی تفصیل اصل مضمون میں آئے گی۔

تم نے لکھا ہے کہ ”میں نہیں جانتا تھا کہ کسی مسئلہ کی تحقیق میں گفتگو کرنا بے ادبی یا گناہ ہے“ عزیزم! تم کو اس کا وہم کیوں ہوا؟ مجھے تو واقعۃً اس سے خوشی ہوتی ہے اور تمہارے متوجہ کرنے سے میں اس کی مزید تحقیق میں لگا۔ مجھے کوئی ملال یا رنج ہونا کیا معنی؟ میں تو تم لوگوں سے یہی چاہتا ہی ہوں، اور میری طرف سے بالکل کھلی اجازت ہے کہ اس مسئلہ میں یا کسی مسئلہ میں جو خدشات ہوں انھیں بے تکلف لکھو، البتہ ان نجدیوں اور مقلدین ابن تیمیہ اور عاکفین ظواہر نصوص کے طریقۂ استدلال اور طرز فکر سے سخت وحشت ہوتی ہے، ان کم بختوں نے تو تمام ائمہ اربعہ اور علماء کی اجتہادی کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

١٧/رجب ١٤١٣ھ (شیخوپور)

☆☆☆☆☆

بنام مفتی منظور احمد صاحب بھیروی

میرے ہم وطن بلکہ ہمسایہ، مدرسہ دینیہ شوکت منزل غازی پور میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میں جب ریاض العلوم گورینی گیا تو یہ بھی وہاں میرے ساتھ گئے۔ ایک سال وہاں رہ کر پھر دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے۔ وہاں سے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کے بعد تکمیل ادب اور شعبۂ افتاء میں شامل رہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں مدرس و مفتی ہیں۔ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں ان کے فتاویٰ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

۳؍جون ۲۰۰۳ء کو ایک مختصر علالت کے بعد ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا، جس کا اثر مفتی صاحب پر بہت تھا، اسی کی تعزیت و تسلی میں یہ خط لکھا گیا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

عزیزم!   **عافاکم اللہ ووفقنی وإیاکم لما یحب ویرضیٰ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

صدمہ بڑا ہے، اسی لحاظ سے غم بھی بڑا ہے، اسی اعتبار سے دل کا زخم بھی بڑا ہے، اسی لئے اس کے اندمال میں دیر لگ رہی ہے۔ یہ ایک طبعی اور فطری غم ہے، ایمان بالغیب اس رنج وغم کو ہلکا کرتا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غم کی یہ آگ آدمی کے جسم وجان کو گھلا دے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبائع مختلف بنائی ہیں، بعض لوگوں پر صدمات کا اثر کم پڑتا ہے، وہ چندے متاثر ہوتے ہیں اور پھر اثر ختم ہو جاتا ہے، بعض طبیعتیں لطیف ہوتی ہیں ان پر اثر زیادہ ہوتا ہے، اور دیر تک قائم رہتا ہے۔ تاہم کچھ بھی ہو، دنیا کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، جلد یا بدیر، صدمہ بھی فنا ہو جاتا ہے، اس میں اگر انسان کے ارادہ اور عمل کا دخل ہوتا ہے تو صدمہ جاتے جاتے بہت کچھ اجر وثواب بھی ڈالتا جاتا ہے، صدمہ کے فنا کرنے کا یہی ارادۂ وعمل شریعت کی اصطلاح میں صبر ہے، جس کی محبوبیت اور مقبولیت قرآن وحدیث میں اس کثرت سے بیان کی گئی ہے کہ شاید اتنی محبوبیت ومقبولیت ایمان کے علاوہ کسی اور عمل صالح کی نہیں بیان کی گئی ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ دل نہیں بہلتا، کسی کام میں جی نہیں لگتا، ایک بے کیفی سی بے کیفی ہے، ایک بے لطفی سی بے لطفی ہے، رفاقت کا چراغ ایسا یک بیک گل ہوا کہ آدمی متحیر اور ششدر کھڑا رہ جائے، وہم وگمان سے پہلے ہی ایک ایسی بات ہوگئی جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں رہی، مادی روشنی اچانک گل ہوتی ہے، تو دیر تک آدمی ہوش وحواس سے بے گانہ رہتا ہے، یہی کیفیت یہاں بھی ہے، پس اگر بے دلی اور بے کیفی ابھی تک باقی ہے، تو کچھ محل تعجب نہیں ہے۔

ہاں ! اگر بہت دیر تک یہی کیفیت باقی رہ گئی، تو اندیشہ ہے کہ جی جان کو گھلا اور پگھلا نہ دے، اس لئے اس بے کیفی کو دور کرنے کی تدبیر کرنی چاہئے، اسباب ظاہر کے اعتبار سے ایک تدبیر تو کی جا چکی، دوسری تدبیر رضا بالقضاء ہے، کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے تصرف فرمایا، ہم غلاموں کو اس پر راضی ہی رہنا ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ فِیْ بَلَائِکَ وَصَنِیْعِکَ إِلیٰ خَلْقِکَ وَ لَکَ الْحَمْدُ فِیْ بَلَائِکَ وَصَنِیْعِکَ إِلیٰ أَهْلِ بُیُوْتِنَا وَ لَکَ الْحَمْدُ فِیْ بَلَائِکَ وَصَنِیْعِکَ إِلیٰ أَنْفُسِنَا خَاصَّةً وَلَکَ الْحَمْدُ بِمَا هَدَیْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِمَا اَکْرَمْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِمَا سَتَرْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْقُرْآنِ وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْاَهْلِ وَالْمَالِ وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْمُعَافَاةِ وَلَکَ الْحَمْدُ حَتّٰی تَرْضٰی وَلَکَ الْحَمْدُ إِذَا رَضِیْتَ یَا أَهْلَ التَّقْویٰ وَأَهْلَ الْمَغْفِرَةِ۔

اس دعا کو جی لگا کر استحضار قلب کے ساتھ پڑھتے رہو، ایک دعاء اور لکھتا ہوں، جو رنج وحزن کے اثرات کو قلب سے زائل کرنے میں بہت موثر ہے۔

اللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ أَمَتِکَ نَاصِیَتِيْ بِیَدِکَ مَاض فِيَّ حُکْمُکَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَائُکَ لِکُلِّ اسْمٍ هُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ أَوْ أَنْزَلْتَهٗ فِيْ کِتَابِکَ أَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَداً مِّنْ خَلْقِکَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِکَ الْغَیْبِ عِنْدَکَ. أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِيْ وَجَلَآءَ حُزْنِيْ وَذِهَابَ هَمِّيْ وَنُوْرَ بَصَرِيْ۔

ایک دعا اور لکھتا ہوں، جو مجھے بہت پسند ہے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُکَ تَعْجِیْلَ عَافِیَتِکَ وَدَفْعَ بَلَائِکَ وَخُرُوْجاً

مِّنَ الدُّنْيَا إِلٰى رَحْمَتِکَ، يَا مَنْ يَكْفِيْ عَنْ كُلِّ أَحَدٍ وَلَا يَكْفِيْ مِنْهُ أَحَدٌ، يَا أَحَدَ مَنْ لَّا أَحَدَ لَهٗ يَا سَنَدَ مَنْ لَّا سَنَدَ لَهٗ اِنْقَطَعَ الرَّجَاءُ إِلَّا مِنْکَ نَجِّنِيْ مِمَّا أَنَا فِيْهِ وَأَعِنِّيْ عَلٰى مَا أَنَا عَلَيْهِ مِمَّا نَزَلَ بِيْ بِجَاهِ وَجْهِکَ الْكَرِيْمِ وَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ عَلَيْکَ اٰمِيْنَ۔

اس تدبیر سے ان شاء اللہ بہت کچھ حاصل ہوگا۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۳؍ربیع الآخر ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆

۱۹۹۶ء میں سفر پاکستان کے موقع پر ویزے کے حصول کے لئے کئی ہفتے تک دہلی میں قیام رہا، اسی موقع پر یہ خط لکھا گیا۔

عزیزم مولانا منظور احمد سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم لوگ دہلی الحمد للہ خیریت سے پہونچ گئے، راستہ میں چند گھنٹے کے لئے امروہہ اتر گئے، وہاں محمود الحق، انوار الحق اور ایوب سے ملاقات ہوئی۔ امروہہ سے جو مجھے تعلق ہے اس کی وجہ سے گوارا نہ ہوا کہ ٹرین وہاں رکے، اور میں وہاں سے اترے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ وہاں پہونچ کر دل کو بہت فرحت حاصل ہوتی ہے، میں نے عبد القادر اور حاجی بابو سے کہا کہ میری اس وقت وہ حالت ہے، جو امرؤ القیس نے اپنے اس مصرعہ میں ظاہر کی ہے ؎

قفا نبک من ذکریٰ حبیب ومنزل

صبح نو بجے وہاں اترے تھے، اور شام کو بعد نماز عصر وہاں سے دہلی کے لئے

روانہ ہوئے، دہلی پہونچ کر شفاعت گیسٹ ہاؤس میں قیام ہوا۔ مولوی مظہر صاحب کو فون کیا گیا، تو وہ بے چارے معذرت کرنے لگے کہ ویزے پر ایک افسر کا دستخط نہیں ہوسکا تھا، وہ بیمار ہے اس لئے فیکس نہ ہوسکا، آج انشاء اللہ کسی وقت بھیج دوں گا، یہ جمعرات کی بات ہے، شام کو ان سے رابطہ قائم کرنا چاہا، لیکن نہ ہوسکا، دوسرے دن صبح بھی نہیں ہوسکا، ساجد رضوی (منیجر پی۔ آئی۔ اے) جس کے پاس ان کا فیکس آنے والا تھا، ہم لوگ پی۔ آئی۔ اے میں ان کے دفتر میں پہونچے، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی ، ہم نے پوری صورتحال بتائی، وہ کہنے لگے کہ میں تو کل عمرہ کے لئے جا رہا ہوں۔ آج جمعہ ہے، پاکستان کے دفاتر آج بند ہیں، کل سنیچر اور اتوار کو یہاں کا دفتر بند رہے گا، اس لئے اب جو کام ہونا ہے، دوشنبہ کو ہوگا۔ دوشنبہ کو آپ فون کر کے معلوم کر لیجئے گا، اگر فیکس آگیا ہوگا تو آ کر لے لیجئے گا، ہاتھوں ہاتھ سفارت خانے سے ویزا مل جائے گا، اس نے متعلقہ آدمی کو ہدایت کر دی کہ ہم لوگوں کی مدد کرے، اچھا آدمی ہے، ہم لوگ جمعہ ہی کو دیوبند آگئے۔ مولوی راشد کے یہاں میرا قیام ہے، اب یہاں سے پی۔ آئی۔ اے کے دفتر میں دوشنبہ کو فون کریں گے، اس کے مطابق دلی جائیں گے ، ان شاء اللہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ آسان فرما دیں، ویزا مل جائے گا تو رائے یہی قرار پائی ہے کہ ہوائی جہاز سے جائیں گے ان شاء اللہ۔ کیونکہ کسی پاکستان جانے والے نے ریل سے جانے کی موافقت نہیں کی، اور اندازہ ہوا کہ دونوں طرف کے خرچ میں زیادہ فرق نہیں واقع ہوگا۔

جمعہ کے روز نو بجے کے قریب مدرسہ میں فون کرنا چاہا تھا، گھنٹی بھی ہو رہی تھی ، مگر شاید دفتر میں کوئی تھا نہیں اس لئے بات نہ ہوسکی، اس کے بعد پھر کوشش کی، مگر وہاں تک لائن درست نہ ہوسکی۔

امتحان تو پرسوں سے شروع ہوگا، امید ہے کہ مدرسہ میں خیریت ہوگی ، میں بہت دعائیں کررہاہوں ، ہاں قاری سیف الدین صاحب سے کہہ دو کہ ہم لوگ جمعرات کو رات میں ہاشم بھائی کے یہاں گئے تھے ، انھوں نے اپنی گاڑی بھیج کر بلوایا تھا، بہت خلیق آدمی ہیں، اس وقت صبح دس بجے تک مسلسل خاطرداری میں لگے رہے، پھر انھیں کی گاڑی سے پی۔ آئی۔ اے کے دفتر میں ساجد رضوی سے ملنے گئے، اور پھر وہاں سے گیسٹ ہاؤس آئے، ان سے مل کر خوشی ہوئی، باقی سب خیریت ہے۔

اساتذۂ مدرسہ اور منشی جی اور مولوی حکیم الدین صاحب کو سلام عرض کردو، اور دعاؤں کی درخواست بھی!

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۳؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی

(مرتب کتاب)

غالباً عیسوی سنہ ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء تھا، میں الہ آباد حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں مدرس تھا۔ اس وقت کسی تقریب سے میرے گاؤں کے قریب خیرآباد کا ایک قافلہ اترا۔ اس قافلہ کے ایک فرد حاجی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے اسی وقت دوستی کی بنیاد پڑی، پھر ان کی محبت مجھے بار بار کھینچ کر ان کے گھر لے گئی، ان کے گھر کا ہر فرد محبت کا پیکر ثابت ہوا۔ انھیں افراد میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی میری گود میں آکر بیٹھتا تھا، یہ ’’حاجی بابو‘‘ کہلاتا تھا، کیونکہ یہ جب گود میں تھا، تو والدین اسے حج میں لے گئے تھے، جوں جوں یہ بچہ بڑا ہوتا رہا مجھ سے مانوس ہوتا رہا، اور اس کی ذہانت وذکاوت بال و پر نکالتی رہی۔ مکتب میں تعلیم شروع ہوئی تو اردو کی درسی کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھتا رہا، مطالعہ کا بیحد شوقین! پھر قرآن کریم حفظ کیا، حافظ ہونے کے بعد کئی سال میں نے اس کے پیچھے تراویح پڑھی۔ عربی درجات کا آغاز ہوا، تو میرے پاس مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں آگیا، یہاں جلالین شریف تک عربی کی باستثنا دو ایک کتابوں کے سب کچھ مجھ سے پڑھا، سفر حضر میں میری رفاقت اختیار کی، اور ہر جگہ درس جاری رہا، پھر دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، طالب علمی کے زمانے میں میرے سفر پاکستان اور پھر سفر حج میں رفیق رہا، اور تعلم کا

سلسلہ بھی جاری رکھا، فراغت کے بعد مدرسہ شیخ الاسلام میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی، یہی بچہ آج ''**مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی**'' ہیں۔ یہاں یہ میرے دست وبازو ہیں۔ رسالہ ضیاء الاسلام کا اجراء ہوا تو انھوں نے اس کی ادارت سنبھالی، مجھ سے کچھ لکھوالینا انھیں کا کام ہے۔

میں ایک نرا مدرس ہوں، لکھنا میرا شوق نہیں، محض ضرورت پر مجبوراً لکھتا ہوں، اور جو کچھ لکھتا ہوں، اس کی حفاظت سے بے پروا ہوتا ہوں۔ میرا لکھا ہوا سب گم ہو چکا ہوتا، لیکن جب سے اس عزیز کا ساتھ ہوا ہے انھوں نے میرا حرف حرف سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرے نام سے ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں باستثنائے چند سب انھیں کی توجہ اور محبت کی مرہونِ منت ہیں۔ مکاتیب کا یہ مجموعہ بھی انھیں کی فکرمندی اور اہتمام کا نمونہ ہے، **میں ان کے لئے کیا دعا کروں، میرا وجود ہی ان کے لئے سراپا دعا ہے۔**

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد

(اعجاز احمد اعظمی)

ذیل کے خطوط اس سیہ کار مرتب کے نام ہیں، اور شروع کے تین چار خطوط اعتکاف کے متعلق سوالات وجوابات پر مشتمل ہیں، رمضان ۱۴۱۵ھ میں مَیں نے پہلی مرتبہ حضرت مولانا کی تشویق اور حوصلہ افزائی پر اعتکاف کیا تھا۔ اس میں ''ا'' سے اشارہ ''اعجاز احمد اعظمی'' کا، اور ''ض'' ''ضیاء الحق خیرآبادی'' کا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ض......مخدومنا المکرّم! **زادکم اللہ شرفاً وفضلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

لگے ہاتھوں آپ کی دعاؤں کا اثر ظاہر ہوگیا، میرے اعتکاف کے بارے میں سن کر ایک دوسرے صاحب بھی اعتکاف کے لئے تیار ہوگئے۔

ا......عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**

بہت خوب اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں۔

ض......اعتکاف کا خاص عمل کیا ہے؟

ا......تلاوت اور دعا، دل کی نگرانی کہ اللہ کی طرف متوجہ رہے، خیالاتِ واہیہ کا مرکز نہ بنا رہے۔

ض......اعتکاف میں کون سی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے، اخیر میں پھر دعاؤں کی درخواست ہے۔

ا......معلوم نہیں تمہارے پاس کیمیائے سعادت یا منہاج العابدین ہے یا نہیں؟ (۱) اگر ہوتی تو اس کا مطالعہ بہت مفید ہوتا، ”ترجمان السنۃ“ (۲) اگر موجود ہوتو اسے پڑھ ڈالو، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی معارف الحدیث (۳) کا وہ حصہ جو اخلاق اور دعاؤں سے متعلق ہے، اسے پڑھو، کسی غیر متقی شخص کی کوئی کتاب اعتکاف میں نہ پڑھنا، تفسیر عثمانی (۴) بھی مناسب رہے گی، میں دل وجان سے دعا کرتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ

(۱) یہ دونوں کتابیں حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کی مشہور تصانیف میں سے ہیں، اور دونوں فارسی میں ہیں، ان کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲) یہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنیؒ کی نہایت معرکۃ الآراء تصنیف ہے، جو حدیث پاک کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ چار جلدوں میں ہے۔

(۳) یہ حدیث کی عام فہم تشریحات پر مشتمل ۸؍جلدوں میں نہایت مفید کتاب ہے، اور عوام کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے خوب قبولیت بخشی۔

(۴) مراد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد ہیں، جو ترجمہ شیخ الہند پر ہیں۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ض......مخدومنا المکرّم! **زادکم اللّٰہ شرفاً وفضلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

مزاج عالی!

والا نامہ موصول ہو کر باعث سکون قلب وجگر ہوا، معارف الحدیث جلد دوم، مشتمل بر ’’کتاب الاخلاق‘‘ اور جلد پنجم مشتمل بر ’’کتاب الدعوات‘‘ منگوالی ہے، اور تفسیر عثمانی بھی ہے، ان کا فائدہ بھی خوب محسوس کر رہا ہوں، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ جو کچھ پڑھتا ہوں اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا بنا دیں۔ آمین

ا......عزیزم! **وفقنی اللّٰہ وإیاکم لما یحب ویرضیٰ**

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

احادیث کا مطالعہ دو نیت سے کرو، ایک تو یہ دیکھو کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کتنی پاکیزہ اور مقدس ہے، اس سے آپ کی عظمت ومحبت پیدا ہوگی، اور اس میں

اضافہ ہوگا، دوسرے یہ کہ ہم کو حکم ہے کہ ہم اپنے آپ کو اسی نقشہ میں ڈھالیں جو رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہے، وہ نقشہ احادیث میں ملتا ہے، کوشش کرو کہ اسی نقشے میں ڈھل جاؤ، ایسی مشابہت ہوجائے ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی، کہ دیکھتے ہی پہچان لئے جاؤ، اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق دیں اور تمہیں بھی۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ض...... زیادہ زور قرآن پاک کی تلاوت پر دیتا ہوں، تلاوت کے علاوہ نفل نمازوں (تہجد، اشراق، چاشت اور اوابین وغیرہ) میں ایک ترتیب سے پڑھنے کا معمول بنالیا ہے، بفضلہٖ تعالیٰ ان نمازوں میں آج دس پارے مکمل ہوگئے، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھیں۔ آمین

ا...... نماز میں قرآن کی تلاوت کا معمول بہتر ہے، اللہ تعالیٰ اس پر استقامت بخشیں اور قبول فرمائیں۔

ض...... آپ کے اس جملے سے کہ ”میں دل وجان سے دعا کرتا ہوں“ اب تک ایک کیف طاری ہے، اس ایک جملہ پر سیکڑوں ہزاروں دفاتر قربان کئے جاسکتے ہیں، آپ کے لئے بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ شفقت تادیر ہمارے سروں پر باقی رکھیں، آمین

والسلام

محتاجِ دعا ضیاء الحق خیرآبادی

۲۳/ رمضان المبارک ۱۴۵۱ھ

ا...... یہ تمہاری محبت کا اثر ہے، ورنہ میں کس کام کا ہوں، سوائے اس کے کہ دوستوں اور اہل تعلق کے لئے دعا گوئی میں لگا رہوں، البتہ تمہارے ان جملوں سے اپنی بے حقیقتی اور ناکارگی کے باوجود دل کی گہرائیوں میں خوشی محسوس کررہا ہوں۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی
دیدۂ سعدی و دل ہمراہِ تست تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

''تنہا میروی'' سے مراد ظاہری راستہ پر چلنا نہیں، بلکہ زندگی کا راستہ ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۳؍ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ض...... مخدومنا المکرّم! **زادکم اللہ شرفاً وفضلاً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ سامی!

والا نامہ باصرہ نواز ہوا، مجھے آپ کی مصروفیات کا پورا احساس ہے، لیکن کچھ ایسی ناگزیر ضروریات پیش آ گئی ہیں کہ بغیر استفسار کے چارہ کار نہیں۔

ا...... عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میری کون سی مصروفیت ہے، بس بطالت میں وقت گزر رہا ہے، صرف دیکھنے میں مصروفیت معلوم ہوتی ہے، اور اسی کا رُعب جما رہتا ہے۔

ض...... کیا ہاتھ دُھلنے کے لئے وضو خانہ تک جانا مفسدِ اعتکاف ہے؟

ا...... نہیں، تمہاری مسجد کا وضو خانہ تو فرشِ مسجد سے بالکل متصل ہے، وہاں جانے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، لیکن یہ ایسی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے لئے خواہی

نخواہی جانا ہی پڑے، پس احتیاط مناسب ہے، میں نے احتیاط اس وقت کے لئے لکھی ہے، جبکہ وہ مسجد سے منفصل ہو۔

ض......ٹنکی کا پانی ختم ہوجائے تو کیا ہم لوگ جا کر پانی کا پمپ چالو کر سکتے ہیں؟

ا......سخت ضرورت ہو، یعنی کوئی اور موجود نہ ہو، اور پانی کی فوری ضرورت ہو تو کر سکتے ہیں ورنہ نہیں، دیکھو گھر سے کوئی کھانا لانے والا نہ ہو تو فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں (کہ معتکف گھر جا کر کھانا لے آئے) بس اسی طرح کی ضروریات کو اسی پر قیاس کرلو۔

ض......فسادِ اعتکاف کی صورت میں پورے عشرہ کا اعتکاف فاسد ہوتا ہے یا صرف ایک دن ایک رات کا؟ قضا کی کیا صورت ہے؟

ا......صرف ایک دن کا اعتکاف فاسد ہوتا ہے، اور اس کی قضا یہ ہے کہ بعد رمضان ایک روزہ رکھ کر اعتکاف کیا جائے۔

ض......آج ہمارے یہاں شناختی کارڈ بن رہا ہے، ہم لوگ تو مسجد سے نکل نہیں سکتے، کیا یہیں بلوا کر بنوالیں؟

ا......(بنوانا ناگزیر ہو تو) فوٹو لینے والا مسجد کی حد سے باہر کھڑا ہوجائے، اور معتکف مسجد کی حد کے اندر رہے، اس کے لئے مسجد سے باہر جانا درست نہیں، فوٹو والا کام بچا کھچا عید بعد بھی ہوگا، اسی وقت پر موقوف رکھو، یہ تو معصیت ہی، گو ہم پر نہ لکھی جائے، اس لئے مسجد سے اسے دور ہی رکھو۔

ض...... پوری تفسیر عثمانی تو اس عرصہ میں دیکھنا مشکل ہے، کچھ خاص خاص مقامات یا سورتیں تجویز فرمادیں، جو میرے لئے فلاحِ دنیا اور ذخیرۂ آخرت بنے۔

ا......سورۂ احزاب اور سورۂ حجرات (ا) کی تفسیر بالاستیعاب پڑھ لو اور باقی جہاں سے جی چاہے۔

ض......آپ کی توجہ اور دعاؤں کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہا ہوں، اسی کا اثر ہے کہ آج بغیر کسی کوشش اور جہد وطلب کے ''کیمیائے سعادت'' مل گئی، مولانا عبد السمیع صاحب مدظلہٗ (۲) تشریف لائے، برسبیل تذکرہ میں نے آپ کے خط کا ذکر کیا، کہ مولانا نے بطور خاص ''کیمیائے سعادت'' پڑھنے کی تاکید کی ہے، ان کے پاس نول کشور لکھنؤ کا چھپا ہوا بہت عمدہ اردو ترجمہ ''اکسیر ہدایت'' تھا، انھوں نے گھر جا کر فوراً بھیج دیا۔

''تنہا میروی'' کی تشریح نے تو اس کیف وسرور کو دوآتشہ بنا دیا، اور اس سے بہت ڈھارس ہوئی کہ میں تنہا نہیں ہوں، بلکہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کے سایۂ شفقت اور توجہ میں ہوں، یہ میرے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے، دعواتِ صالحہ میں یاد فرمائیں۔

والسلام

ضیاءالحق خیرآبادی

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ شنبہ

☆☆☆☆☆

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے بھی ''کیمیائے سعادت'' کا ترجمہ ''اکسیر ہدایت'' اعتکاف ہی کی حالت میں پڑھا تھا، اس نے میری زندگی کا موجودہ رُخ متعین کرنے میں بڑی مدد دی تھی، اس میں امام غزالی کے جوشِ قلبی کا مجھ پر خاص طور پر اثر پڑا تھا، اللہ پر توکل اور اللہ سے محبت کا سرمایہ اس کتاب سے مجھے حاصل ہوا تھا، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھی اس دولت خاص سے سرفراز فرمائے۔

میری کوئی حقیقت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ بندوں کے گمان کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں، آج کل درسِ قرآن کے بعد نفل باجماعت ہوتی ہے، ابوذر اور نفیس مل کر اس میں کبھی تین پارے اور کبھی چار پارے پڑھتے ہیں، رات کافی مجمع اس میں ہوگیا تھا، سولہ پارے پورے ہوئے ہیں، بڑا کیف حاصل ہوتا ہے، رات دعا میں ایک مضمون مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بالکل اِلہامی طور پر وارد ہوا، وہ یہ کہ اور دعاؤں کے ساتھ یہ الفاظ زبان سے ادا ہوئے کہ ''بار، الہا! جن لوگوں کو مجھ سے محبت ہے، یا جن سے مجھ کو محبت ہے، ان پر اپنی رحمت خاصہ نازل فرما'' ان الفاظ سے مجھے بڑی قلبی فرحت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۵/رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ

(۱) سورہ احزاب اکیسویں پارہ کے سترہویں رکوع سے شروع ہوکر بائیسویں پارہ کے چھٹے رکوع پر ختم ہوتی ہے، یہ تفسیر عثمانی مطبوعہ شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ کے ص: ۵۵۵ سے ۵۶۹ تک ہے، اور سورہ حجرات چھبیسویں پارہ کے رکوع ۱۳/اور ۱۴ پر مشتمل ہے، یہ تفسیر عثمانی مطبوعہ مدینہ منورہ کے ص: ۶۸۴ سے ۶۸۷ تک ہے

(۱) مولانا عبد السمیع صاحب ہمارے محلّہ اتراری خیر آباد کے رہنے والے تھے، مظاہر علوم سہارنپور کے قدیم فضلاء میں سے تھے، ۱۹۳۱ء میں دورۂ حدیث شریف پڑھ کر فارغ ہوئے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا عبد الرحمٰن صاحب کاملپوری، مولانا اسعد اللہ صاحب رام پوری جیسے اساطین علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، بیعت وارادت کا تعلق مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے تھا، مولانا موصوف مجھ پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے، جب حاضر خدمت ہوتا تو بڑی دعائیں دیتے، پچھلے کچھ عرصہ سے صاحب فراش تھے، ۲۷/جولائی ۲۰۰۰ء جمعرات کو طویل علالت کے بعد ۹۵/سال کی عمر میں انتقال فرمایا، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا کریں۔ آمین

باسمہ سبحانہ

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہٗ**

تمہارا خط مجھے ۱۴؍شوال کومل گیا تھا، مگر اس وقت نئے طلبہ کے داخلہ کی ایسی ہماہمی اور بھیڑ تھی کہ جواب کا موقع نہ ملا، اس سال ارادہ تھا کہ ذرا محدود داخلہ کروں گا، مگر بالکل برعکس ہوگیا۔ داخلے بھی بہت ہوئے اور واپسی بھی بہت ہوئی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مدرسہ کو حسن قبول عطا فرمایا۔

تمہارے نہ رہنے کی وجہ سے مجھے بھی بہت کمی محسوس ہورہی ہے، خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتا ہوں، لیکن کیا کرو دنیا کی ریت یہی ہے، کبھی اجتماع، کبھی افتراق، بس اپنے کام کی دھن میں رہنا چاہئے، جیسا نتیجہ ہو مطلع کرنا، میں الحمدللہ خیریت سے ہوں، تمہارے لئے دعا کرتا ہوں، آج سے تعلیم شروع ہوگئی ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۸؍شوال ۱۴۱۷ھ

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ امتحان کے موقع پر میں نے ایک خط لکھا تھا، جس کے جواب میں حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ نے مذکورہ بالا مکتوب تحریر فرمایا۔

☆☆☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہٗ**

اللہ کا شکر ہے کہ تم خیر وعافیت سے دیوبند پہونچ گئے، اب یکسوئی اور محنت کے ساتھ پچھلے چھوٹے ہوئے اسباق کی تلافی کی کوشش کرو، ساتھ ہی آگے کا مطالعہ بھی جاری رکھو، سبق کی رفتار تو اب بھی کم ہی ہوگی، تم ہر کتاب کے کچھ صفحات متعین

کرلو اور اتنے کا روزانہ مطالعہ کرلیا کرو، اور کوشش کرو کہ کتاب پورے طور پر حل ہو جائے، تمہارا مطالعہ کیا ہوا حصہ سبق میں گذرتا رہے گا، اس طرح کتاب کا معتد بہ حصہ سبق سے پہلے ہی حل ہو چکا ہوگا، جو کتابیں مشکل ہیں مثلاً شرح عقائد، ان کا مطالعہ غور و تعمق سے کرو، اور ذہن کو مشکل مسائل حل کرنے کا مکلّف اور عادی بناؤ، ذہن اور علم کی سطحیت سے آگے گزر کر اب عمق کی طرف متوجہ ہو، عربی کتب کا مطالعہ زیادہ کرو۔(۱)

''نقوش''(۲) کا سیرت رسول نمبر لے لو، یہاں الحمد للہ سب خیریت ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۲۷/محرم ۱۴۱۸ھ

---

(۱) دار العلوم دیو بند کی طالب علمی کے دوران بفضلہ تعالیٰ حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ کے ہمراہ حج بیت اللہ کے سفر سعادت کی توفیق ملی، دو ماہ کے بعد جب دار العلوم حاضر ہوا تو مذکورہ بالا خط ملا۔

(۲) ''نقوش'' میاں محمد طفیل کی زیر ادارت لاہور سے نکلنے والا نہایت مشہور و معروف اور مقبول ادبی رسالہ تھا۔ یہ اپنے خصوصی نمبرات کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔ شوکت تھانوی نے اپنے مخصوص اسلوب میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس کا ہر نمبر خاص نمبر ہوتا ہے، خاص خاص موقعوں پر عام نمبر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس نے ''سیرت رسول'' پر ۱۳/ ضخیم جلدیں شائع کی ہیں، اور ہر جلد ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اردو میں ''سیرۃ النبی ﷺ'' پر میرے علم کے مطابق اب تک اتنی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

پرسوں تمہارا خط ملا، انتظار تھا، میں نے **تقریب التھذیب** کے لئے نہیں،

تعجیل المنفعة کے لئے کہا تھا، اگر وہ مل جائے تو لے لو، **تبصیر المنتبه** بھی اچھی کتاب ہے، امام طحاوی کی شرح مشکل الآثار اگر مل جائے تو اسے ترجیح دو، اگر یہ دونوں نہ ملیں تو **تبصیر المنتبه** لے لو، اگر فہرست بھیج دیتے تو اچھا تھا۔ یادداشت کا تعلق دلچسپی سے ہے، حافظہ کی قوت تو اپنی جگہ برحق ہے، مگر باتوں کو یاد رکھنے میں بہت کچھ دخل دلچسپی اور یکسوئی کو ہے، یکسوئی تو اختیاری نہیں ہے، جس قدر حاصل ہو جائے اسے غنیمت جانو، البتہ دلچسپی پیدا کرنا قدرے اختیار میں ہے، دوسرے نمبر پر مکرر پڑھتے رہنا ہے، ایک مضمون ایک مرتبہ نہ پڑھا جائے، بلکہ بار بار پڑھا جائے، تو ذہن نشین ہوتا ہے، یہ بالکل اختیار میں ہے، ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد آدمی اسے دہرانے سے گھبراتا ہے، مگر یہ چیز حصول علم کے لئے مضر ہے، بار بار دہراؤ تو بہت دن تک محفوظ رہنے کی ضمانت ہے۔ (۱)

میں نے تجربہ کے طور پر جلالین پر کام شروع کر دیا ہے، طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ قرآنی کلمات کا ترجمہ قوسین میں کر دیا ہے اور جلالین کی عبارت کو درمیان میں رکھا ہے، کوشش یہ کی ہے کہ دونوں کا ترجمہ مل کر مسلسل اور مربوط عبارت رہے، ترجمہ نہ بالکل لفظی ہے اور نہ بالکل آزاد! اپنے طریقے کے مطابق اصل اور ترجمے کے الفاظ قریب قریب مساوی ہیں، البتہ عام فہم اور مطلب کشا ہیں، اس کے بعد جلالین کی عبارتوں کے فوائد پر بقدر ضرورت تفصیل سے کلام کیا ہے، مفسر کے الفاظ کی توجیہ کی ہے، کسی اشکال کا جواب دیا ہے تو اس اشکال کو لکھ دیا ہے، تعلیل و ترکیب کو واضح کیا ہے، جلالین کی شرح ہی ہے، مستقل علیٰحدہ تفسیر نہیں بننے دیا ہے، وقت کم ملتا ہے، ابھی تک دو رکوع کی شرح کر چکا ہوں۔ (۲) اس سلسلے میں کیا کروں؟ جاری رکھوں یا بند کر دوں، (۳) رفتار سست ہی رہے گی، لیکن مجھے بظاہر یہ اچھا کام معلوم ہوتا ہے۔

الحمدللہ یہاں سب خیریت ہے، والسلام

اعجاز احمد اعظمی / ۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ

(۱) میں نے اپنے حافظہ کی کمزوری اور باتیں یاد نہ رہنے کی شکایت کی تھی، اور سوال کیا تھا کہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں کہ باتیں یاد رہیں۔

(۲) حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ نے ہم لوگوں کی خواہش پر جلالین شریف کی شرح لکھنی شروع کی تھی، یہ شرح اہل علم کیلئے حد درجہ مفید اور کارآمد ہے، مصنف کی مصروفیات کے باعث اب تک صرف سورہ نساء تک کی شرح ہوسکی ہے، اور وہ بھی اب تک غیر مطبوعہ ہے، البتہ اس کے کچھ اجزا ’’ضیاء الاسلام‘‘ میں شائع ہو چکے ہیں، قارئین اس کی تکمیل کے لئے دعا فرمائیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ بھی شائع ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ

(۳) یہ حضرۃ الاستاذ مدظلہٗ کی ذرہ نوازی اور عالی ظرفی کی بات ہے کہ انھوں نے اس اہم تصنیف کے سلسلہ میں اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کی رائے دریافت کی۔

☆☆☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

پرسوں تمہارا خط ملا، بہت مسرت ہوئی، دعائیں تو کرتا ہی رہتا ہوں، روزانہ پابندی سے کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں، اور قبولیت کا ظہور فرمائیں، یکسوئی کے ساتھ محنت میں سرگرم رہو۔

ماشاء اللہ! جیسا میں چاہتا تھا تم نے مولانا قاسم عبداللہ صاحب کے ساتھ ویسا ہی حسن معاملہ کیا، **جزاک اللہ خیراً** ، میں تو ان کے ساتھ کوئی خاص کام نہ کرسکا، لیکن تم نے اچھا نباہا، طبیعت بہت خوش ہوئی، امید کہ حضرت مولانا مدظلہٗ (۱) بھی خوش ہوں گے۔

یہاں الحمدللہ سب خیریت ہے، کل قاری شبیر احمد صاحب کا فون آیا تھا، وہ

اپنے یہاں بلا رہے ہیں، شاید رجب کے پہلے ہفتہ میں سفر ہو، اگر امام سیوطیؒ کی ''الاتقان'' مل جائے تو لیتے آنا۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ

(۱) ''حضرت مولانا مدظلہٗ'' سے مراد حضرۃ الاستاذ کے شیخ ومرشد حضرت اقدس مولانا عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم مہتمم جامعہ حمادیہ کراچی، پاکستان ہیں، حضرت کے صاحبزادے مولانا قاسم عبد اللہ صاحب ہندوستان تشریف لائے تھے، میں اس وقت دیوبند میں زیر تعلیم تھا، اور ان کی خدمت وسہولت کے لئے دہلی آ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

باسمہٖ تعالیٰ

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

آج انتظار کے بعد تمہارا خط ملا، خط لکھا کرو، ٹیلیفون پر اکتفا نہ کرو، اس سال حدیث کے علاوہ اور کوئی مشغولیت نہ رکھو، مضامین وغیرہ کا سلسلہ اس سال بند رکھو، دوسرے مطالعے بھی کم کرو، حدیث ہی پر محنت کرو، اس کا طریقہ بتاتا ہوں۔ (یہ حکم مجھے دورۂ حدیث شریف کے سال ملا)

بخاری وترمذی کی حد تک اس کا التزام کرو کہ جب درس ہو، اور جیسا بھی ہو اس سے الگ ہر حدیث کا مالہ وماعلیہ کے ساتھ بنظر غائر مطالعہ کرو، بخاری شریف کا جو متداول نسخہ ہے اس میں پہلے ایک حدیث پڑھو، پھر اس پر جو حاشیہ ہو، اسماء الرجال پر کلام ہو، اسے پڑھو، کوئی سوال ذہن میں آئے تو اسے نوٹ کرلو، اور دوسرے موقع پر فتح الباری اور عمدۃ القاری میں اسے دیکھو، اگر حل ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس پر سے گذر جاؤ، سوال موجود ہوگا تو جواب انشاء اللہ مل ہی جائے گا، اس طریقے سے

مقدار سبق کا نہیں بلکہ مسلسل مطالعہ کرتے چلے جاؤ، آج کل جو وقت خالی مل رہا ہے اس میں بھی یہی کام کرو، بعد میں موقع نہ ملے گا، ترمذی شریف میں بھی یہی عمل کرو، حدیث پڑھو، امام ترمذی علیہ الرحمہ نے ہر باب پر جو کلام کیا ہے اس کے مقصد کو سمجھو، اس سلسلے میں حاشیہ سے مدد لو، طول طویل شرحوں کی ضرورت نہیں، بس ساری حدیث نظروں سے گذر جانی چاہئے، حدیث شریف کا مطالعہ کرتے وقت دل و دماغ میں یہ تصور مسلسل قائم رکھو کہ تم جناب نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں حاضر ہو، اور آپ کا کلام آپ ہی سے اخذ کر رہے ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو۔

ان دونوں کتابوں کا از اول تا آخر مطالعہ کر ڈالو، پھر حسب فرصت مسلم شریف، ابوداؤد شریف وغیرہ کا بھی جتنا ہو سکے مطالعہ کرتے رہو، حضراتِ اساتذۂ کرام اس وقت تم لوگوں کو فارغ کئے ہوئے ہیں، بعد میں سارا وقت گھیر لیں گے، تمام خالی اوقات کو اسی میں صرف کرو، اور مجھے اطلاع کرتے رہو کہ کہاں تک مطالعہ پہونچا ہے، کوئی اشکال ہو تو اس کی بھی مجھے اطلاع کرو۔

کانفرنس اور سیمینار میں جانے کا ارادہ نہ کرنا، اب تمہارے لئے اس کی حیثیت ایک تماشے سے زیادہ نہیں ہے، جو کام بتایا ہے اسی میں لگو، اللہ تعالیٰ توفیق بخشیں۔ (دورہ کے سال تھانہ بھون میں ایک سیمینار ہو رہا تھا، اس میں شرکت کی اجازت چاہی تھی)

میں الحمد للہ بخیر و عافیت ہوں، جلالین شریف کی شرح اب شروع کرنے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ پورا کریں، تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ جیسا پسند کریں، ویسے عالم بنو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۷/ ذوقعدہ ۱۴۱۸ھ

(ہمارے فاضل دوست مفتی اشتیاق احمد صاحب دربھنگوی (استاد دارالعلوم دیوبند)
سراجی کی شرح لکھ رہے تھے، جو "طرازی" کے نام سے شائع ہوگئی ہے، انھوں نے اس
سلسلے میں میرے واسطہ سے رہنمائی چاہی تھی، ذیل کا مکتوب اسی کا جواب ہے)

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہٗ**

کل تمہارا خط ملا، میں تو سب پڑھا لکھا بھولتا جا رہا ہوں، اور اب مطالعہ وغیرہ سے دلچسپی بھی باقی نہیں رہی، علمی مضامین پر غور وفکر کا موقع بھی نہیں ملتا، کام تو پہلے ہی کیا کیا؟، اب تو اور بھی رائیگاں معلوم ہوتا ہوں، مفتی اشتیاق سلّمہٗ کی رہنمائی میں کیا کر سکتا ہوں، یہ تم لوگوں کا حسن ظن ہے کہ مجھ سے اچھی امیدیں قائم کر رکھی ہیں، جی چاہتا ہے کہ معذرت کر دوں کہ میں اس میدان کا آدمی نہیں، بلکہ کسی میدان کا آدمی نہیں ہوں، تاہم دل شکنی نہ ہو اس لئے چند باتیں لکھتا ہوں، شاید ان سے وہ اپنا کوئی مطلب اخذ کر لیں۔

(۱) وراثت انتقال ملکیت کی ایک جبری صورت ہے، اس میں نہ صاحب ملکیت کے اختیار وارادہ کا کوئی دخل ہے، اور نہ اس شخص کے ارادہ سے اس کا کوئی تعلق ہے جس کی طرف ملکیت منتقل ہو رہی ہے، اس مضمون کی وضاحت کیلئے انتقال ملکیت کی تمام شرعی صورتوں کو اجمالاً لکھنا مناسب ہوگا، مثلاً یہ کہ مورث کی موت ہوتے ہی پورا ترکہ مشترک ملکیت بن جاتا ہے، جبکہ متعدد ورثاء ہوں، تو پھر اس سے کسی ایک کا استفادہ کرنا، دوسروں کی مرضی کے بغیر، یا ورثاء میں کوئی نابالغ ہو تو اس میں تبرع کرنا، وغیرہ صحیح نہ ہوگا، اس لئے اس کی تقسیم کا عمل جتنی جلد ممکن ہو عمل میں لانا چاہئے، یہ مضمون ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت کا حامل ہے، اسے ذرا زور دے کر بیان کرنا چاہئے۔

شریعت میں وراثت کی بنیاد قرابت اور اتحادِ دین ہے۔ اس میں ''الاقرب فالأقرب '' کا اصول ملحوظ ہے، اللہ نے ورثاء کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ جن کے حصے اللہ نے متعین کر دیئے ہیں، دوسرے وہ جو باقی ماندہ مال میں اپنے حصوں کے مطابق مالک ہوتے ہیں۔

وراثت میں شریعت نے مرد عورت کے درمیان فرق کیا ہے، اس کی حکمت پر کلام اطمینان بخش ہونا چاہئے، اس کو اس طرح لکھیں کہ قانونِ عدل پر پورا اترے۔

جہاں قرابت قریبہ پر گفتگو ہوگی، وہاں یتیم پوتے کی میراث کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے گا، اسے اچھی طرح غور وفکر کے بعد لکھیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ آدمی اپنے ورثاء کو محروم کرنے کا کوئی اقدام نہ کرے، اس موضوع پر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ایک رہنما اصول بتاتی ہے۔

اسی ذیل میں وارث کو عاق کرنے کی بحث بھی آئے گی، اسے بھی لکھنا چاہئے، یتیم پوتے کے ذیل میں ایک ذرا غیر متعلق، لیکن اسی کے دامن سے لگی ہوئی یہ بحث بھی تحریر میں آنی چاہئے کہ خاندان میں ملکیتیں مشترک ہوں یا علیٰحدہ ہوں، اس سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟ پھر ہمارے یہاں مشترک نہیں بلکہ ایک کے مالک ہونے کا دستور ہے، اور اس کے تمام بیٹے وغیرہ محض کارندے کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہوتی، اسے شریعت کس نظر سے دیکھتی ہے، اس مسئلہ کا وراثت سے بہت گہرا اور مؤثر تعلق ہے، اس کو علمی اور فتویٰ کے انداز میں آنا چاہئے۔

(۲) اہم پہلوؤں کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں، قرآن کی آیات جو وراثت سے متعلق ہیں، سورۂ نساء میں تو کافی موجود ہیں، اس کے علاوہ سورہ مائدہ کے اخیر میں

دیکھیں، حدیثیں بھی اس باب میں وارد ہیں، ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ میں بھی متعلقہ حصہ کا ضرور مطالعہ کرلیں۔

(۳) اس موضوع پر معارف القرآن کے مباحث کو ضرور پڑھیں، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ’’یتیم پوتے کی وراثت‘‘ پر ایک رسالہ لکھا ہے، اسے دیکھ لیں، اسی سے اور دوسرے مآخذ کا بھی سراغ ملے گا۔ (یہ رسالہ ان کی کتاب ’’ہمارے عائلی مسائل‘‘ میں چھپا ہے۔)

(۴) وراثت کے باب میں مرد، عورت کی تفریق اور یتیم پوتے کی میراث سے محرومی کو زیادہ تر موضوعِ اعتراض بنایا جاتا ہے، اس لئے اسے ذرا اہمیت دے کر بیان کریں، اور اس کا تسلی بخش جواب دیں۔

یہ چند باتیں اس وقت ذہن میں آرہی ہیں، اب دیکھو اتنا لکھنے کے دوران متعدد لوگ اپنی اغراض کے لئے آچکے ہیں، حالانکہ مغرب بعد لکھ رہا ہوں، مگر ذہن کے انتشار کا پورا سامان موجود ہے، کسی طرح ذہن کو سمیٹ سمیٹ کر اتنا لکھا ہے، مفتی اشتیاق سلّمہٗ سے کہو کہ میری اس تحریر پر غور کرلیں، انھیں منتشر خیالات میں ان شاء اللہ مباحث اور عناوین مل جائیں گے، اور جب لکھنے بیٹھیں گے تو اضافے بھی ہوں گے، ان شاء اللہ۔ اس کے بعد مزید سوال پیدا ہو تو لکھو، کوشش کروں گا۔

میں الحمد للہ بخیر ہوں، تمہارے لئے دعا کررہا ہوں، مسلسل کررہا ہوں، پابندی کے ساتھ! شاید حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سن لی جائے، میرے لئے بھی دعا کرو، مفتی اشتیاق احمد سلّمہٗ سے سلام کہہ دو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲؍رجب ۱۴۱۹ھ

☆☆☆☆☆

میں نے اپنے کچھ احوال لکھ کر حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کئے تھے، یہ خط اسی کا جواب ہے، اس میں پہلی بات یہ تھی کہ:

(۱) میں اپنے دینی احوال میں پچھلے کچھ دنوں سے سخت ابتری پا رہا ہوں، طاعات کی توفیق بالکل نہیں ہو پا رہی ہے، بس آپ میرے لئے دعاء فرمائیں اور توجہ فرمائیں، نیز اس کیلئے جو ظاہری تدبیر مناسب ہو وہ فرمائیں، تاکہ کچھ وقت تو یکسوئی کے ساتھ خدا کو یاد کروں،

دوسری بات بیعت کے سلسلے میں تھی کہ

(۲) شیخ اور مرید کے درمیان ایسی مناسبت ہو کہ شیخ کے کسی فعل پر اشکال نہ ہو، اور میرا حال یہ ہے کہ آپ ہمارے سربراہ ہیں، اور میں آپ کا ماتحت ہوں، آپ کبھی کسی انتظامی مصلحت کی بنا پر ایک فیصلہ کرتے ہیں، اور مجھے اس پر اشکال ہوتا ہے، اور اشکال کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے، تو کیا یہ چیز محرومی کا سبب نہیں بن سکتی؟ اس مسئلہ پر بطور خاص تشفی فرمائیں،

تیسری بات اوراد ووظائف کے سلسلے میں تھی کہ

(۳) بیعت کے بعد جو اس کے لوازم ہیں، مثلاً اوراد ووظائف اور اس کے متقاضی اعمال، اگر ان میں سستی وکوتاہی ہو تو اس کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے اوراد وغیرہ پر استمرار نہیں حاصل ہو پاتا ہے، اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ جب بیعت کے تقاضے پورے نہ ہوں تو نری بیعت سے کیا فائدہ؟ (ضیاء الحق خیرآبادی)

عزیزم! وفقنی اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

(۱) جس حال کا تم نے تذکرہ کیا ہے، یہ لوازم طبیعت میں سے ہے۔ طبیعت کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی نشاط کی کیفیت ہوتی ہے، تو ہر چیز میں زندگی معلوم ہوتی ہے، کبھی انقباض کا رنگ ہوتا ہے، تو ایک بے دلی سی معلوم ہوتی ہے، ہم غلاموں کا کام ہے آداب غلامی بجالاتے رہنا، اللہ ورسول کی عبادت واطاعت مقصد زندگی ہے، خواہ ''منشط'' ہو یا ''مکرہ'' دعاء کرو، خواہ بے کیفی ہو۔ قیام اللیل کی کوشش کرتے رہو، خواہ دو ہی رکعت نصیب ہو، گرمی کا موسم ہے رات چھوٹی ہوتی ہے، میں اللہ سے دعاء کرتا

ہوں، توفیق انشاءاللہ سلب نہیں ہوئی ہے، صرف رنگ بدلا ہوا ہے۔

(۲) بیعت کا مدار دو باتوں پر ہے، ایک محبت اور دوسرے عقیدت، ان دونوں کے بعد یکسوئی، یعنی جس کے ساتھ محبت وعقیدت کا رشتہ ہے اس سے وابستگی میں یکسوئی ہو، میرے خیال میں یہ تینوں باتیں تمہیں حاصل ہیں، اس کے بعد بیعت کے ظاہری دستور ورسم کی ضرورت نہیں ہے۔

جس اختلاف اور اشکال کو تم نے ذکر کیا ہے، وہ کچھ مضر نہیں ہے، وہ اختلاف اور وہ اشکال مضر ہے جس سے محبت زائل ہو جائے، یا جس سے عقیدت وعظمت میں اضمحلال پیدا ہو جائے، رہا انتظامی مصلحتوں میں اختلاف نظر! تو یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے، اتنا ہو کہ دل میں جم کر روگ نہ بنے، اگر کبھی اشکال کی گرفت سخت ہو تو اسے دریافت کر لینا چاہیے۔ ورنہ محبت خود جواب فراہم کردے گی، اور آخری درجہ یہ کہ اپنا مقتدا یا شیخ بھی بشر ہی ہوتا ہے، فرشتہ نہیں ہوتا، عین ممکن ہے کہ واقعی اس کی غلطی ہو، مگر جب تک صریح گناہ نہ ہو اس سے بدظنی کا موقع نہیں ہے، اس لئے اس مسئلہ میں نہ الجھو۔ اللہ تعالیٰ خود توفیق وسعادت کی راہ کھولیں گے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے.........اس کا احسان ہے کہ ....اس طرح کے امور میں وسعت قلبی بخشی ہے،

رہی یہ بات کہ اوراد ووظائف پر استمرار ودوام نہیں ہو پاتا۔ تو اس سلسلے میں چند باتوں کا اہتمام کرلو۔ اول یہ کہ کوئی مختصر سا ورد اپنے ذمے لازم کرلو، اور وہ میرے خیال میں یہ ہے کہ صبح کو فجر کی سنت اور فرض کے درمیان **اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم** ابتداءً چالیس دن ۳۱۳ مرتبہ مسلسل اور پھر سو مرتبہ روزانہ پڑھ لیا کرو، اور اس کے بعد وہ پانچ دعائیں، جو ہمارے سلسلے میں معمول بہا ہیں، انھیں کرلیا کرو۔ (وہ دعائیں یہ ہیں، (۱) یا اللہ! اپنے اس اسم اعظم کی برکت سے مجھے اپنا خاص الخاص

مقرب بندہ بنا لیجئے، دونوں جہاں میں، (۲) یا اللہ! مجھے دونوں جہاں کی بھلائیاں نصیب فرمایئے، (۳) یا اللہ! دونوں جہاں کی برائیوں سے بچایئے، (۴) یا اللہ! دونوں جہاں میں مجھ سے راضی ہو جایئے (۵) یا اللہ! میرے اسلام، ایمان اور احسان کو کامل فرما کر خاتمہ بالخیر فرمایئے)

دوسرے رات کو بعد نماز عشاء درود شریف کچھ مقدار میں پڑھ لیا کرو، جتنا آسان ہو، تیسرے یہ کہ تلاوت خواہ کم ہی ہو، ضرور کرلیا کرو۔ بس اس کے علاوہ روزمرہ کے فرائض وسنن کافی ہیں، ان میں نیت اور اخلاص کا استحضار رکھو۔

باقی اوقات کو علم کی ترقی میں لگائے رکھو، مطالعہ کرنا، لکھنا، دینی مضامین پر غور کرنا، ہاں اس میں یہ اہتمام ضرور رکھو کہ جو کچھ پڑھو یا لکھو یہ سمجھ کر پڑھو لکھو کہ اللہ کے لئے کررہے ہو، شہرت وناموری کا قصد نہ ہو، ان شاء اللہ اتنے ہی سے کام کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ علم صحیح ونافع ہر عبادت سے بڑھ کر عبادت ہے۔

الحمد للہ تمھارے لئے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۸؍صفر ۱۴۲۳ھ یکشنبہ

☆☆☆☆☆

بنام حافظ عبدالقادر صاحب دربھنگوی

دربھنگہ کے رہنے والے، مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں پڑھتے تھے، وہیں مجھ سے ملاقات ہوئی، روزِ اول ہی سے انھوں نے اپنی خدمت گزاری اور بے عذر اطاعت وفرمانبرداری کا نقش دل پر بیٹھا دیا۔ زندگی کے بہت سے نیچے اونچے مرحلوں سے گزرے، مگر اندازِ وفاداری وہی رہا جو ابتداء میں تھا۔ بچپن میں مجھے ملے تھے اور بڑھاپے میں داخل ہورہے ہیں، مگر اطاعت وخدمت میں کچھ اضافہ ہی ہوا، کمی نہیں آئی۔ میرے شیخوپور آنے کے بعد یہ بھی یہیں آگئے اور مالیات کے انتظام میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں۔

عزیزم حافظ عبدالقادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے پاس بہار کا ایک طالب علم پڑھا کرتا تھا، مجھ سے اس کو بہت تعلق تھا، اور میں بھی اسے بہت چاہتا تھا، عرصہ تک میرے ساتھ رہا، پھر حالات کی مجبوری کی وجہ سے اس نے تعلیم ترک کر کے پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں نینی رہا اور میرے پاس آ کر میرے دل کا سکون بنتا رہا، پھر افضل المعارف میں پڑھانے لگا، وہاں سے بھی کبھی خود آ کر میری مسرت کا سامان بنتا، کبھی خط بھیج کر اپنی محبت سے معطر کر دیتا، مگر اب عرصہ سے نہ خود آیا اور نہ کوئی نامۂ و پیام بھیجا، نام اس کا عبدالقادر ہے، حافظ قرآن ہے، قلندر قسم کا آدمی ہے، میرے بہت کام کا ہے، اس کا پتہ کہیں ہو تو جلد مجھے مطلع کرو۔

لو! میاں عبدالقادر تم اتنے عرصہ کہاں تھے، اتنی بے اعتنائی کہاں سے سیکھ لی، تم تو ایسے نہ تھے، خیریت سناؤ، اپنے حالات بتاؤ، مجھ سے چھوٹ کر کیونکر تمہیں چین رہا۔ کیا تم ناراض ہو گئے ہو؟

اچھا یہ خط لو، حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کے نام، احتیاط سے ان کے پاس لے جاؤ اور مناسب موقع دیکھ کر میرا اسلام کہہ کر ان کی خدمت میں پیش کر دو اور کہہ دو کہ حضرت دعا فرما دیں جواب کی تکلیف نہ فرمائیں، تم حضرت کے احوال لکھ کر مجھے بتا دو، بس اس وقت لمبی گفتگو نہیں، دو مہمان منتظر بیٹھے ہیں اور میں تمہارا منتظر بیٹھا ہوں، دیکھوں کب دل شاد اور آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۷/ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ

* * *

عزیزم حافظ عبد القادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط کا انتظار تھا، سو مل گیا۔ تمہارے والد کی علالت کی کمی سے خوشی ہوئی، دعا کرتا ہوں کہ شفاء کلی حاصل ہو۔ فی الحال ابھی دکان کا بندوبست نہیں ہو رہا ہے تو پڑھانے کو اختیار کر لو اور دکان کے لئے بھی سعی کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں انھیں پر نظر رکھو، وہ سب فقر وفاقہ اور تنگدستی دور کر دیں گے اور سب چیزوں کا غیب سے انتظام فرما دیں گے، اطمینان رکھو۔ میں نے بتایا تھا کہ بعد نماز مغرب سورہ واقعہ پڑھ لیا کرو، نماز باجماعت اور تلاوت کی بہت پابندی رکھنا، اس میں گڑبڑ نہ ہو۔ میں تمہارے والد والدہ کے لئے بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں نماز کا پابند بنا دیں۔ بھائی کو نصیحت کا خط لکھو، ان شاء اللہ متاثر ہوگا، لیکن بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر رکھو اپنی محنت اور کوشش کو بھی کچھ نہ سمجھو۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں اور برابر کرتا رہوں گا ان شاء اللہ۔ تم راستے پر آ چلے تھے اور مجھے امید ہو گئی تھی، مگر کیا کریں تقدیرِ الٰہی کے سامنے چارۂ کار نہیں۔ بہر حال دینداری کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، اللہ تعالیٰ مدد فرمانے والے ہیں۔ دینداری کے ساتھ تھوڑا ملے تو بہت ہے اور بے دینی کے ساتھ بہت کچھ ملے تو کچھ نہیں۔ حرص وہوس سے بہت دور رہنا، قناعت اختیار کئے رہنا۔ یہاں بحمد اللہ ہر طرح خیریت ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۷؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ

◆◆◆◆◆

عزیزم حافظ عبدالقادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط کا مجھے شدت سے انتظار تھا، اور اس لئے مزید تھا کہ تمہیں میں نے مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کی خدمت میں بھیجا تھا، مولانا کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ خیر مولانا کے جواب کا تو مجھے انتظار نہ تھا، ہاں تمہاری پہونچ کی خبر کا منتظر تھا، لیکن تم نے تو ایسا طویل سکوت اختیار کیا کہ مجھے پریشانی محسوس ہونے لگی۔ کچھ روز کے بعد مولانا کا ٹیلی گرام جوابی آیا کہ میں بیمار تھا، اب اچھا ہوں۔ ٹیلی گرام جوابی تھا، سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب کیا دوں؟ ارادہ کیا کہ الہ آباد حاضر ہوجاؤں مگر اہلیہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور نہ جاسکا۔ ابھی اسی حیص بیص میں تھا کہ حضرت مولانا کا خط ایک صاحب لے آئے جس میں مولانا نے تمہارے پہونچنے کی اطلاع دی تھی، اور یہ کہ ایک خط مولانا نے اس کے جواب میں فوراً لکھا تھا مگر وہ خط مجھے نہ مل سکا۔ اس خط کے جواب میں فوراً میں نے مولوی انوار احمد صاحب کو الہ آباد بھیجا، جب مولوی انوار احمد صاحب الہ آباد سے آ لئے جب کہیں تمہارا خط ملا، خیر ملا تو۔

تم نے اپنا حال بہت خوب لکھا ہے، تمہارا قلب اچھا ہے، بہت جلد متاثر ہوتا ہے لیکن کمزور ہے، تاثر مٹ بھی جاتا ہے اسے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، جس چیز پر لگو مداومت کرو۔ شدتِ تاثر میں تحمل سے زیادہ بار اپنے اوپر نہ لادو۔ حدیث شریف میں ہے کہ تھوڑا عمل جو مستقل ہو خدا کو بہت پسند ہے، تم کچھ ذکر اپنے لئے مقرر کرلو اور چوبیس گھنٹہ میں کم از کم آدھ گھنٹہ مکمل تنہائی کا نکال لو، اس میں یکسو ہوکر روزانہ ذکر کیا کرو۔ ان شاء اللہ یہ تاثر پائیدار ہوتا چلا جائے گا۔

تم جہاں ہو وہیں رہو، میرے پاس کبھی کبھی آیا کرو۔ اس میں بہت فائدہ

ہوگا، محبت بڑھتی رہے گی، مستقل ساتھ رہنے میں بشریت کا حجاب کبھی کبھی محبت وتعلق کو چھپا دیتا ہے، اس کی جگہ پر انقباض وتکدر کی کیفیت آجاتی ہے۔ دور رہ کر محبت رکھنا اور محبت حاصل کئے رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ قریب رہا جائے اور کسی ایک جانب سے انشراح کا خاتمہ ہوجائے۔ سوچو! تم بھی بشر ہو، میں بھی بشر ہو۔ میرے پاس بشر ہی رہتے ہیں، پورے ماحول میں محبت کو نبھانا بہت مشکل ہے، ہاں اگر میں کہیں اس طور پر بیٹھتا کہ لوگ آکر رہا کریں تو مضائقہ نہ تھا، مگر موجودہ صورت حال میں جو کیفیت ہے وہی بہتر ہے، اور یہ بھی شدت تاثر ہی کا نتیجہ ہے، اس تاثر کو تم استقلال یوں عطا کر سکتے ہو کہ کم از کم مہینہ میں ایک خط مجھے لکھ دیا کرو اور میں جواب دے دیا کروں۔ ان شاء اللہ ربط باقی رہے گا، اور ملاقات کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں گی۔

تمہاری ہمشیرہ کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ صحت کاملہ نصیب فرمائیں۔

آسیب زدہ عورت کو تم نے کس مثلث کا نقش دیا تھا، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ عورتوں پر ترکیبیں مت آزمانا۔ یہ مخلوق بہت عجیب وغریب ہے، ہر امت کا فتنہ ہوتا ہے۔ اس امت کا فتنہ مال اور عورت ہے، عورتوں میں پچاسی فیصد مرض ہوتا ہے، انھیں گھر بیٹھے تعویذ دیدو، انھیں نہ اپنے پاس بلاؤ نہ ان کے پس جاؤ۔ مخلوقِ خدا کو فائدہ رسانی اس باب میں فریب ہے، آخر اپنا نفس بھی مخلوقِ خدا ہے یا نہیں، اس کا اس میں فائدہ ہے یا نقصان۔ مجھے نہ تو جن کو حاضر کرنا آتا، نہ غائب کرنا، نہ جلانا۔ میں ان امور سے بالکل کورا ہوں، بلکہ میں جن کے لئے تعویذ ہی نہیں دیتا، یہ کام مجبوراً بھی مت کرو۔ دوسروں کے حوالہ کردو، لوگوں کی صحت ومرض کے تم ذمہ دار کب سے بن گئے ہو، اللہ کی مخلوق ہے، چاہے وہ بیمار رکھیں چاہے صحت مند، ہم تم دم مارنے والے کون؟ ہاں دعاء صحت کردو، ایسی ترکیبیں کردو جو دائرۂ اباحت میں ہوں، اور ہر اس طریقے سے

بچو جو حرام و ناجائز ہو، یا ہو تو دائرۂ اباحت کے اندر لیکن حرمت کے اندر کھینچ کر پہونچا دیتا ہو۔ یہ طریقہ جو تم نے اختیار کیا ہے محض خرافات ہے، اس سے دور رہو۔ جنات کے اثر کے لئے ایک تعویذ تو وہ ہے جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم چوکور شکل میں لکھی ہوئی ہے، اور ایک حرزِ ابی دجانہ۔ یہ دونوں تعویذ دے سکتے ہو، باقی سب فضول ہے۔ ۳۱۷ اور ۳۱۹ کے نقش سے مریض کو جانچ لیا کرو، اور خود پاس جانے کی ضرورت نہیں تعویذ لکھ کر بھیج دو، میری یہ نصیحت مان لو ورنہ آخرت میں خسارہ اور دنیا میں رسوائی کا اندیشہ ہے۔

میں الحمد للہ خیریت سے ہوں، اہلیہ بھی بخیر و عافیت ہے۔ البتہ محمد عارف و محمد عادل کو میعادی بخار ہو گیا ہے۔ صحت کی دعا کرو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۷؍ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ

* * *

عزیزم حافظ عبد القادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا۔ ٹوپی میرے لئے نہیں ہے، بچوں کے لئے ہے۔ انھیں ان شاء اللہ ٹھیک ہوگی، قیمت امانت بھائی سے پوچھ لینا۔

ایک کام اور کرو، حافظ سرور کے یہاں جا کر مندرجہ ذیل کتابیں میرے حوالہ سے لیتے آؤ، ان سے بات چیت ہو چکی ہے۔

احیاء العلوم جلد اوّل میں قسط ۱۔۲۔۳ جلد دوم میں قسط اول
جلد سوم مکمل اور جلد چہارم مکمل تمام قسطیں
منہاج العابدین (اردو) مصنفہ امام غزالیؒ

بل بنوا کر لیتے آنا، قیمت تمہارے ہاتھوں بھیج دوں گا، یہ کام بہت ضروری ہے۔

ہاں شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ امانت بھائی کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے، تم نے ان کی اہلیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ تھانہ بھون جارہی تھیں۔ وہ شاید مولوی سعادت کی اہلیہ ہوں۔

مولانا عبد الرب صاحب ۲۹؍جنوری کو ریاض (سعودی عرب) جارہے ہیں، وہاں کوئی کورس تدریب المدرسین کا ہے، تین ماہ کا، اس کیلئے ان کی منظوری آچکی ہے۔

باطنی احوال منقلب ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس کی طرف التفات نہ کرو، البتہ معصیت سے بچنا بہت ضروری ہے، ظاہری و باطنی تمام معاصی سے ہر روز توبہ لازم ہے، پابندی سے استغفار کرو۔ باطنی احوال میں جو تغیر معاصی کی وجہ سے ہوتا ہے وہ بہت پُرخطر ہے۔ اور ذکر کا اہتمام بہت ضروری ہے، لا إلــه إلا الله کا ذکر اس طرح کرو کہ لا إلــه کہتے وقت یہ تصور کرو کہ غیر اللہ خواہ وہ محبوبات و مالوفات ہو یا مکروہات و مبغوضات، گناہ ہو یا ثواب سب کچھ دل سے نکل گیا، اور إلا الله کہتے وقت یہ تصور کرو کہ محض محبت الٰہی دل میں داخل ہو رہی ہے۔ پابندی اور اہتمام کرو، ذکر میں نگاہ اور دھیان دل پر مکمل رہے، چاہے پندرہ منٹ ہی ہو، لیکن خاص خلوت ہو، بالکل تنہائی ہو۔ ذکر کے بعد اور معصیت سے بچنے کے اہتمام کے بعد احوال خواہ کچھ ہوں مضائقہ نہیں، مدرسین کو نگاہ اور دل دونوں کا مرض لگ جاتا ہے۔ مدرسوں میں امارد کا اجتماع ہوتا ہے، نگاہ بھی آلودہ ہوتی ہے اور دل بھی ملوث ہوتا ہے، اس لئے بہت زیادہ اجتناب و اہتمام کی ضرورت ہے۔ خوب سمجھ لو۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۷؍ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

* * *

عزیزم حافظ عبدالقادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک خط رجسٹرڈ بھیج چکا ہوں، مل چکا ہوگا۔ مولانا عمار صاحب کو میرا خط دیدینا اور انھیں سلام کہہ دینا۔

شادی کے مسئلے سے طبیعت میں فکر پیدا ہوگئی۔ ان شاء اللہ برابر دعا کروں گا، سہولت اور عزت وآبرو کے ساتھ تمام امور کے انجام پانے کی، ان شائاللہ سہولت ہی رہے گی، مارچ سے پہلے شاید ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے۔

عرفان نے تمہاری کوشش اور محنت ومحبت کا ذکر کیا تھا، تم سے مجھے بالکل یہی توقع تھی۔ اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے میرے اور تمہارے دل میں باہمی سچی محبت ڈال دی ہے، ان شاء اللہ یہ محبت دنیا میں بھی کام آتی رہے گی اور آخرت میں بھی حق تعالیٰ اسے قائم ودائم رکھیں اور اسے بڑھاتے رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ تمہارے باطنی احوال میں تبدیلی پیدا ہوئی، مکمل تنہائی کے منتظر نہ رہو، مسجد ہی میں بیٹھ کر ذکر کرلیا کرو، تمہیں دل پر ضرب لگانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتنا خیال کرو کہ لا إلـٰه کہتے وقت دل سے تمام محبتیں نکل گئیں اور إلا الله کہتے وقت ایک خدا کی محبت سرایت کررہی ہے، اس سے زیادہ خود ہلکان کرنے کی حاجت نہیں ہے، البتہ اس میں عجلت نہ کرو، کم ازکم پانچ سو ایک ہزار تک روزانہ کیا کرو۔ جتنا وقت اس میں لگ جائے وہ مکمل کارآمد ہے۔ اسی طرح رات کو سویرے اٹھنے کی کوشش کرو اور مسجد میں جاکر تہجد کی چند رکعتیں پڑھ کر اس وقت بھی کچھ ذکر اور

کچھ تلاوت میں مشغول رہو۔

جس حالت کا تم نے ذکر کیا ہے یہ تلوّن کہلاتی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ راہ پر تم لگ گئے ہو، کثرت ذکر کے بعد استحضار مستقل ہو جائے گا، ابھی تو گاہے اِدھر اور گاہے اُدھر کا معاملہ رہے گا۔ لیکن اس سے گھبراؤ نہیں، کثرت ذکر میں لگے رہو، اپنی مشغولیات کا ایک جائزہ لے ڈالو، جتنا حصہ اس میں فضول محض ہو جس میں بجز لذت کے اور کچھ حاصل نہیں اسے مکمل حذف کر دو، اور اتنی یادِ الٰہی بڑھا دو۔ جتنا دنیاوی مشغولیات کم کرتے رہو گے یادِ الٰہی کا موقع زیادہ ملتا رہے گا اور کاموں میں برکت زیادہ ہوتی رہے گی، تجربہ کر لو۔ حضرت مصلح الامت سیّدنا و مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ وقدس سرہ کی کتابیں ضرور مطالعہ میں رکھو، بہت ہی اکسیر ہیں، روزانہ کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پڑھا کرو۔

جو اچھا حال حاصل ہو جائے اس پر خدا کا شکر ادا کرو، اور کسی سے تذکرہ بالکل نہ کرو، یہ احوال عموماً پردے میں آتے ہیں اور پردہ چاہتے ہیں، انھیں کھول دیا جاتا ہے تو فوراً رخصت ہو جاتے ہیں، اور جب زائل ہو جائیں تو انھیں دوبارہ لانے کی کوشش نہ کرو۔ بلانے سے نہیں آتے بس کام میں لگے رہو، احوال کا انتظار بھی نہ کرو، پھر خود بخود آجائیں گے۔ یہ گُر بہت بیش قیمت ہے خوب اچھی طرح سمجھ لو۔

پان کی حد تک تو غنیمت ہے، بشرطیکہ تمباکو کی مقدار بہت کم ہو، لیکن سگریٹ کی عادت تو بہت ہی بری ہے، اسے اول فرصت میں ترک کر دینا چاہئے۔ میں نے اس کیلئے آج حق تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کی ہے، خدا کرے قبول ہو۔

شادی کے سلسلے میں مخلوق کے سامنے دستِ سوال مت دراز کرنا، صرف حق تعالیٰ سے مناجات کرنا، ان شاء اللہ غیب سے دستگیری ہوگی، بعد نماز عشاء روزانہ اول

آخر تین تین درود شریف اور درمیان میں دعاء حضرت یونس علیہ السلام **لا إلـــه أنــت سبـحانک الخ** سو بار پڑھ کر حق تعالیٰ کے سامنے تضرع وزاری کرو اور پھر امدادِ غیبی کا تماشہ دیکھو۔

تمہاری کسی حالت پر غصہ آنے کا کیا معنی؟ میرا باطن تو خود انتہائی گندہ اور خراب ہے، تم لوگوں کے احوال پر تو شکر الٰہی بجالاتا ہوں کہ چند ایک ہی خرابیاں ہیں جو ادنیٰ محنت سے زائل ہوسکتی ہیں، اور میں تو ایسی بلاؤں میں مبتلا ہوں کہ نہ کسی سے کہہ سکتا ہوں اور نہ وہ زائل ہی ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ شرورِ نفس سے حفاظت فرمائیں۔ ہرگز ایسا گمان نہ کرنا، مجھے ذرہ برابر تکدر اور انقباض نہیں ہوتا، دل سے بہی خواہ ہوں اور قلبی محبت ہے۔ بالکل مطمئن رہو اور میری اصلاح کے لئے بھی دعا کرتے رہو، حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کی خدمت عالیہ میں سلام عرض کردو۔

حضرت قاری صاحب سے اگر ہمت نہیں پڑتی تو مت کہو، میری بھی ہمت نہیں پڑتی تھی، اس سے پہلے جب الہ آباد آیا تھا، تو ہمت کر کے دعاء کی درخواست کردی تھی، لیکن انھوں نے کچھ ایسا جواب دیا کہ ہمت بیٹھ گئی۔ اب تو شاید کبھی نہ کہہ سکوں، ویسے ان کے احسانات میرے اوپر بہت ہیں، اس لئے ہمیشہ ان کا ممنون کرم اور ہوا خواہ رہوں گا، اور کبھی انھیں تکلیف نہیں پہونچاؤں گا، بلکہ ان کے حقوق ڈھوتا رہوں گا، تم بھی یہی کرو۔

باقی الحمدللہ یہاں سب خیریت ہے۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

عزیزم حافظ عبد القادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ خط حضرت اقدس مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کی خدمت میں پیش کرنا، تم خود اپنے ہاتھ سے لے جا کر مناسب موقع دے کر پیش کرنا، کسی اور کے حوالے نہ کرنا اور یہ کہہ کر پیش کرنا کہ ”خط ذرا طویل ہوگیا ہے، حضرت کو جب موقع ہو ایک نگاہ فرمالیں۔“

حضرت کی معذوری اور کمزوریٔ صحت کی بنا پر اس قدر طویل خط پیش کرتے ہوئے بہت خوف محسوس ہوتا ہے، لیکن کیا کروں لکھنے بیٹھا تو باتوں کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا اور کتنی باتیں ابھی نہیں لکھیں، بہر کیف تم سمجھدار ہو، امید ہے کہ میری نادانی کو سنبھال لوگے، اور خط پانے کے بعد حضرت جو کچھ ارشاد فرمائیں اسے بلا تاخیر میرے پاس لکھ بھیجنا اور اگر حضرت جواب کا وعدہ فرمائیں تو تم حاصل کر کے بذریعہ رجسٹری میرے پاس بھیجنا، احتیاط ہی کی بنا پر میں بھی رجسٹری کر رہا ہوں، باقی یہاں سب خیریت ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

* * *

عزیزم حافظ عبد القادر سلّمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی روز سے میرا دل مسلسل تمہاری طرف لگا ہوا تھا، تمہارے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر حضرت مولانا مدظلہ بھی بہت شدت سے یاد آتے رہے، کئی بار جی میں

آیا کہ پھر ایک خط لکھوں، لیکن آج کل اسباق کی اتنی بھرمار ہے کہ بالکل فرصت ہی نہیں ملتی۔ نو اسباق آج کل چل رہے ہیں، جن میں سب سے ہلکا سبق کافیہ کا ہے، اور حضرت مولانا کو خط لکھنے کے لئے بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے، تاہم ہوسکتا ہے کہ اس خط کے پیچھے حضرت مولانا کے نام بھی خط پہونچے، جب غازی پور کی طرف آنا ہو دو روز پہلے حضرت مولانا کو اطلاع ضرور کردینا۔ تمہارا خط عین اس وقت ملا جب میں ہدایہ کے سبق کے لئے بیٹھ چکا تھا، طلبہ سب بیٹھے تھے، میں شدتِ اشتیاق میں اسی وقت خط کھول کر پڑھا، ماشاء اللہ، الحمدللہ تم نے آسودہ کردیا۔ حضرت مولانا سے متعلق جتنا کچھ تم نے لکھا تھا، وہ طلبہ کو سنایا، پھر طبیعت کا بند کھل گیا۔ میرے اوپر ایک بے خودی سی طاری ہوگئی، بہت دیر تک حضرت مولانا کا تذکرہ ہوتا رہا، پھر حضرت مولانا کی مناسبت سے حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن قدس سرہ کا ذکر چھڑ گیا، بس پھر کیا تھا، وقت بھی گوش برآواز تھا، تھوڑی دیر کے بعد گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پون گھنٹہ گزر چکا تھا، اس کے بعد سبق شروع کیا، اللہ تم کو جزائے خیر دے

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

حضرت مولانا کی عنایت ومحبت کا کیا پوچھنا، ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو بس کچھ نہ پوچھو ؎ ذکر اس پری وش کا پھر بیاں اپنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا پر استغراقی کیفیت زیادہ رہتی ہے، اس کا احساس مجھے اس وقت بھی ہوا تھا، جب میں اب کی بار حاضر خدمت ہوا تھا۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن قدس سرہ کا بھی یہی حال تھا۔

ایسے وقت بزرگوں کا التفات بڑا قیمتی ہوتا ہے، ایسے وقت خصوصیت سے ان کی توجہات میں جذباتِ الٰہیہ کا شمول ہوتا ہے اور ہر عنایت ایک نیا جذب بخشتی

ہے، ایسے وقت میں اگر یکسوئی قلب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری اور حضوری ہو تو بہت خوش نصیبی ہے، تم قریب ہو، اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو، حضرت مولانا کا رنگ متقدمین کا رنگ ہے۔

تم نے میرے خط کا صحیح اثر لیا، اس سے بہت مسرت ہوئی، حق تعالیٰ مدد فرمائیں۔ مجھے اپنے سب دوستوں سے قلبی محبت ہے، اور تم سے روز اول سے..... جبکہ پہلی ملاقات ہوئی تھی.....دل ملا ہوا ہے، اب اس میں جتنی تمہاری صلاحیت دینی اور تعلق مع اللہ بڑھتا جائے گا میرا دلی رابطہ بھی بڑھتا جائے گا۔ میں اپنے دوستوں کو خدا کی بارگاہ میں پڑا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، سب کچھ فنا کر کے آدمی انھیں کا ہو رہے، ''دست بکار، دل بیار'' کا مضمون رہے، حب مال، حب جاہ سب ان کے قدموں پر نثار، یاد ان کی، دھیان ان کا، طاعت ان کی، بس ایک ہی دھن ہو، بقول جگر مرحوم ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے ترے فکر سے تری یاد سے ترے نام سے

مجھے اسی کی دھن ہے، چاہتا ہوں کہ سب ایسے ہی ہو جائیں، تم ایسا بننا چاہتے ہو، اس لئے بار بار تمہاری محبت دل میں کشش پیدا کرتی رہتی ہے، جتنی اصلاحات تم نے اپنے اندر کیں سب بہت بجا اور عمدہ ہیں، میں استقامت کی دعا کرتا ہوں۔

نفس پر جب گرفت ہوگی تو وہ خاموش کیوں بیٹھے گا، لیکن تم بھی غافل نہ ہو، نفس کی ہر وہ خواہش جو گناہ ہو، شدت سے اس کے خلاف کرو، بالخصوص نگاہ اور زبان سے متعلق نفس کی خواہش ہرگز پوری نہ کرو۔ شروع میں بہت تکلیف ہوگی، مگر انجام کار ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی۔ پورے اخلاص سے محض اللہ واسطے اس سلسلے میں اللہ

تعالیٰ سے استقامت طلب کرو، ایک چھوٹی سی دعا لکھتا ہوں، ہر نماز کے بعد خشوع وخضوع سے یہ دعاء حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کیا کرو!

أَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا
أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا۔

اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عنایت فرمایئے، اور اس کو پاکیزہ بنادیجئے۔
آپ بہترین پاکیزہ بنانے والے ہیں۔ آپ اس کے مالک ومولیٰ ہیں۔

ان شاء اللہ نفس کی سرکشی ختم ہوجائے گی۔ اور ذکر کبھی مت چھوڑنا، نفس کا زور توڑنے کے لئے وہ بہترین معاون ہے۔ ہاں ایک بات اور کہوں، ذرا اپنے لقموں کا جائزہ لے ڈالو اور دیکھو کہ پیٹ میں فضول چیزیں کتنی جاتی ہیں اور ضروری غذا کا کتنا حصہ ہے، یہ فضول لقمے جو محض لذتِ ذائقہ کے لئے کھائے جاتے ہیں، یہ بھی نفس کی بڑی مدد کرتے ہیں، اگر ہمت کرکے ان میں بھی تقلیل کرلی جائے، تو کام آسان ہوجائے۔

آج کل محنت بہت پڑ رہی ہے، ویسے تعلیم میں بحمد اللہ برکت بھی خوب ہے، نو کتابیں صرف ساڑھے پانچ گھنٹے میں ہوجاتی ہیں، لیکن بہت تھک جاتا ہوں۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

◉◉◉◉◉

عزیزم وحبیبم! **عافاکم اللہ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ تو واقعہ ہے کہ زمانے کی ہوا کچھ ایسی ہی ہے کہ آدمی کا ایمان، اس کا زہد و تقویٰ، اس کی امانت و دیانت سب کچھ اس آگ برساتی فضا میں جھلس کر رہ جائے، جو وقت آتا ہے ایمان بالغیب کے لئے ایک نیا چیلنج لاتا ہے، اور غیب پر ایمان و یقین کی کیفیت جتنی ڈھیلی ہوتی جائے گی اسی کے بقدر آدمی گمراہی کے قریب تر ہوتا جائے گا، تاہم اگر ہمت و حوصلہ ہو، حق تعالیٰ کی محبت ہو، ان پر اعتماد و توکل ہو تو ان ہواؤں کا رخ پھیرا بھی جا سکتا ہے۔ دیکھو بھائی! دنیا کی معیشت میں ہونا وہی ہے جو حق تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے، اپنے حصہ سے ایک دانہ زیادہ نہ تم پا سکتے ہو نہ دنیا کا کوئی فرد پا سکتا ہے۔ اسی طرح جتنا تمہارے مقسوم میں لکھ دیا گیا ہے وہ اپنے وقت پر تم کو مل کر رہے گا، البتہ اس کا وقت مقرر ہے، وقت سے پہلے لاکھ کھینچنا چاہو، نہیں کھینچ سکتے۔ پھر دنیا کی حرص میں پڑ کر خود کو اور اپنے دین و ایمان کو کیوں داؤں پر لگایا جائے۔ کرتے رہو جو کرتے رہو، لیکن أَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ کو اصول بناؤ، یعنی طلب و کوشش میں اجمال پیدا کرو۔ اجمال کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مرنے کھپنے کا طریقہ نہ اختیار کرو۔ اجمال تفصیل کے بالمقابل ہے، تفصیل میں آدمی ایک جزئیہ کو نگاہ میں رکھتا ہے اور ہر ہر جز کی رعایت کرتا ہے۔ اجمال میں ایک اصول کو پکڑ لیتا ہے اور اس کی جزئیات کا زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ طلب و کوشش کا حاصل یہ ہے کہ رزقِ حلال حاصل ہو، وہ اجمالی کوشش سے حاصل ہو گیا، بس آرام سے اللہ کی یاد میں لگ جاؤ۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ روزانہ معمول بنا کر، فریضۂ زندگی بنا کر ایک خواہ وہ تھوڑا ہی ہو یادِ الٰہی کے لئے مختص کر لو اور اس وقت میں کوئی کام بجز یادِ پروردگار کے نہ کرو، اور یہ اس لئے نہیں کہ مال میں برکت ہو، بلکہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے اور اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور اس لئے کہ ایمان و عمل میں برکت ہو، اس میں

جان پڑے۔ مال و دولت میں کچھ لذت نہیں، فضولیات و خرافات، زہر قاتل ہیں۔ جتنا وقت یادِ الٰہی اور اطاعت خداوندی میں گزر جائے حاصل زندگی وہی ہے۔

میرے عزیز! مجھے تم سے بے حد محبت ہے، اور محض للّٰہ فی اللّٰہ محبت ہے۔ میں چاہتا ہوں، اور جی جان سے چاہتا ہوں کہ تم دنیا میں بھی خوشحال رہو، لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ چاہتا ہوں کہ پروردگار ہم سے، تم سے اور سب دوستوں سے راضی رہے، تا کہ یہ عارضی جدائی دنیا کی جو ہماری محبتوں کی راہ میں گرداڑاتی رہتی ہے جب ختم ہو، تو ہم لوگ ایک ایسی رفاقت و معیت پائیں جو لازوال ہو۔ اور یہ رفاقت جنت کی ہے، محبت کی بقاء و ترقی کا زمانہ وہی ہوگا، لیکن اس کے لئے ضروری ہے سب دوستوں کے سفر کا رخ ایک ہی ہو، سب رضاء الٰہی کی جانب قدم اٹھا رہے ہوں، سب کی سواریاں جنت کی طرف دوڑ رہی ہوں۔ اگر کوئی کمزور ہو رہا ہو تو دوسرا سہارا دیدے۔ اے کاش! یہی ہوتا۔ حق تعالیٰ کی ذاتِ رحیم و کریم سے آسرا تو یہی ہے کہ ان لولوں لنگڑوں کو پہونچا ہی دیں گے۔

خیر میاں! تم تو بلند حوصلہ رکھتے ہو، مضبوط طبیعت کے مالک ہو، جواں ہمت ہو، پھر کیوں دل چھوٹا کرتے ہو، مردانہ وار زندگی کے اس دریا میں تیرتے چلے جاؤ۔ اور ایسا تیرو کہ دریا کی طوفانی موجیں کو دبخود تمہیں کنارے تک پہونچا دیں۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کے یہاں جاؤ اور میرا سلام عرض کر دو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۰؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

◉◉◉◉◉

بنام مولوی عبدالرشید سمستی پوری

مدرسہ دینیہ کے قدیم طلباء میں ہیں۔ ضلع دربھنگہ کے کسی مدرسہ میں علم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ گاہے گاہے ملاقات ہوتی ہے۔ انھوں نے مشاجرات صحابہ بالخصوص جنگ جمل وصفین کے متعلق سوال کیا تھا۔

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تم مشاجراتِ صحابہ میں کہاں گھس پڑے، یہ لوگ خدا تعالیٰ کی جانب مغفور ہیں، ان کی مغفرت کا اعلان قرآن میں ہو چکا ہے اجمالاً، اور حدیث میں تفصیلاً۔ ان سے بظاہر جو گناہ صادر ہوتے ہوئے نظر آئیں، وہ بھی عین طاعت ہیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے کہ **اللہ اللہ فی أصحابی لاتتحذوھم من بعدی غرضاً**۔ یہاں قتل عمد کا کیا ذکر؟ صحابۂ کرام سے جو کچھ ہوا، وہ خطاء اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ اور جانتے ہو کہ اجتہاد میں مخطی بھی ایک ثواب کا مستحق ہوتا ہے، اور مصیب تو دوہرے ثواب کا۔ اس مقام پر عزت واحترام اور ادب واکرام کے ساتھ خاموشی ہی مناسب ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن　　　که جاہا سپر باید انداختن

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

واختلافے کہ درمیانِ اصحابِ پیغمبر **علیہ وعلیہم الصلوت والتسلیمات** واقع شدہ نہ از ہوائے نفسانی بود، چہ نفوس شریفۂ ایشاں تزکیہ یافتہ بودند، واز امارگی باطمینان رسیدہ، ہوائے ایشاں تابع شریعت شدہ بود، بلکہ آں اختلاف مبنی بر اجتہاد بود واعلائے حق، پس مخطیٔ ایشاں نیز درجۂ واحدہ دارد عند اللہ، ومصیب را خود دو درجہ است، پس زباں را از جفائے ایشاں باز باید داشت، وہمہ را بہ نیکی یاد باید کرد، **قال الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ : تلک دماء طهر الله عنها أيدينا فلنطهر عنها ألسنتنا**، (مکتوب ۸۰، دفتر اول)

ترجمہ: اور وہ اختلافات جو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کرام ؓ کے درمیان واقع ہوئے تھے، وہ نفسانی خواہشات کی وجہ سے نہیں تھے، کیونکہ ان کے پاکیزہ نفوس تزکیہ حاصل کر چکے تھے اور امارگی (کے درجہ) سے (نکل کر) اطمینان (کے درجہ) تک پہونچ چکے تھے، ان کی تمام خواہشات شریعت مقدسہ کے تابع ہو چکی تھیں، بلکہ وہ اختلاف اجتہاد اور حق بلند کرنے پر مبنی تھا، پس ان میں سے (اجتہادی) خطا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک درجہ رکھتا ہے، اور صحیح اجتہاد کرنے والے کو تو دو درجے (دوہرا ثواب) حاصل ہوتے ہیں، پس اپنی زبان کو ان کی شان میں گستاخی کرنے سے روکنا چاہئے، اور ان سب کو نیکی سے یاد کرنا چاہئے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

خلافے ونزاعے کہ درمیان اصحاب علیہم الرضوان واقع شدہ بود محمول بر ہوائے نفسانی نیست، در صحبت خیر البشر نفوس ایشاں بہ تزکیہ رسیدہ بودند واز امارگی آزاد گشتہ، ایں قدر می دانم کہ حضرت امیر دراں باب برحق ماندہ اند،

> ومخالف ایشاں برخطا بود، اما ایں خطائے اجتہادی است تا بحد فسق نمی رساند، بلکہ ملامت راہم دریں طور خطا گنجائش نیست کہ مخطی رانیز یک درجہ است از ثواب۔
>
> (مکتوب ۵۴، دفتر اول)
>
> **ترجمہ**: جواختلافات اور جھگڑے اصحاب کرام علیہم الرضوان کے درمیان واقع ہوتے تھے وہ نفسانی خواہشوں پر محمول نہیں ہیں (اس لئے کہ) حضرت سیّد البشر ﷺ کی صحبت (بابرکت) میں (رہ کر) ان کے نفسوں کا تزکیہ ہوگیا تھا، اور (ان کا نفس) امارہ پن سے آزاد ہوچکا تھا، میں اس قدر جانتا ہوں کہ اس معاملہ میں حضرت امیر (سیّدنا علی ؓ) حق پر تھے، اور ان کے مخالف (حضرت امیر معاویہ وغیرہ ؓ) خطا پر تھے، لیکن یہ خطا، خطائے اجتہادی ہے جو (ان کو) فسق کی حد تک نہیں پہونچاتی، بلکہ اس قسم کی خطا میں ملامت کی گنجائش بھی نہیں ہے، کیونکہ ایسی خطا کرنے والے کو بھی ثواب کا ایک درجہ حاصل ہے۔

عمداً کا مطلب تو یہ ہے کہ بغیر کسی تاویل شرعی کے گناہ سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر قتل کیا جائے، اور یہاں دونوں جانب اجتہادِ شرعی موجود تھا، پھر قتل عمد کا کیا معنی؟ اس باب میں حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد کو پیشوا بناؤ، اور اسی پر اکتفاء کرو اس سے زیادہ اس میں کاوش نہ کرو۔ صحابہ کی بلندیوں تک ہمارا طائر فکر پرواز ہی نہیں کرسکتا۔ ہم ان کے بارے میں کیا لکھیں، **رضی اللہ عنہم وأرضاهم عنه وغفر لنا بمحبتنا واکرامنا إياهم ولا نقول فيهم إلا ماقال الله ورسوله صلی اللہ علیہ وسلم**

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

یہ خط ایک عالم دین کو لکھا گیا، جنھیں حضرت مولانا سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

عزیزم! **السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ**

کل تمہارا خط ملا۔ اسے پڑھ کر دل پر ایک کیفیت طاری ہے۔ اس وقت سے اب تک مسلسل دعا کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے سے کر رہا ہوں، لیکن کل سے کچھ اور ہی رنگ ہے۔

سنو میاں! یہ جو سب کچھ تم دیکھ رہے ہو، اس کی شکایت نہ بان سے کرو نہ قلم سے، نہ دل میں اس کی کلفت محسوس کرو، اور نہ طبیعت کو متاثر ہونے دو، یہ مخلوق نہ کسی کو نفع پہونچا سکتی ہے نہ نقصان، تم کو کسی کے جملے نے زبردست دھوکہ نہیں دیا ہے، تم اپنی طبیعت مخلوق سے کیوں اُٹکاتے ہو، کیا مخلوق روزی رَساں ہے؟ کیا اسی لئے پڑھا لکھا ہے کہ تمہارے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو تو شکایات کا دفتر لے کر بیٹھ جاؤ۔ اور رنج وراحت کا سارا مدار مخلوق کو قرار دے بیٹھو، کیا تنخواہ کم ہوگی، تو تمہاری ہمت ٹوٹ جائے گی۔ کیا مدرسہ کی تنخواہ کو اپنے علم اور اپنی خدمت کا معاوضہ سمجھتے ہو؟ یہ تو عام دنیا داروں جیسی بات ہوئی، سنو! یہ سب اللہ کی طرف سے تمہاری تربیت کا انتظام ہے، تمہاری طبیعت میں اشتعال ہے، غصہ ہے، تلوّن ہے۔ اگر سمجھو تو یہ احوال انھیں کی طرف سے ہیں۔ اس لئے ہیں کہ یہ سانپ بچھو طبیعت سے نکل جائیں، مخلوق کیا کر سکتی ہے۔ یہ سب اللہ کی تقدیر سے ہے، اور تقدیر پر راضی رہنے کا سبق کس کے لئے ہے، کیا کمالات مشکلات میں پڑے بغیر حاصل ہو سکتے ہیں، عجیب بات ہے کہ اپنے مزاج کے خلاف بات آتی ہے تو سب کچھ پڑھا لکھا فراموش ہو جاتا ہے، اور دوسروں کیلئے سب کچھ یاد رہ جاتا ہے، جو دوسروں نے کیا اسے رہنے دو، تم کو دین کی۔ علم دین کی خدمت کرنی ہے۔ مخلوق کو نظر اعتبار سے ساقط کرو۔

تنخواہ کی قلت وکثرت کا ذکر ہم لوگوں کے لائق بات نہیں ہے، پڑھانے پر تنخواہ لینا بوجہ ضرورت کے جائز قرار دیا گیا ہے، ورنہ سچ پوچھو تو دین کی خدمت ہماری ذمہ داری ہے، اس پر دنیاوی تنخواہ کیسی؟ اس کا معاوضہ اللہ ہی دیں گے، لیکن انسان کی کمزوری پر نگاہ کر کے اسے گوارا کیا گیا ہے، تو ایسی ناگوار چیز، جو صرف ضرورۃً گوارا کی گئی ہے، اس کے سلسلے میں تو اپنے منہ سے کوئی بات نکالنی نہیں چاہئے، تم تو یہ کہو کہ چاہے مت دو۔ یا کم دو، مجھے کام کرنا ہے، اور جو تمہاری ضرورت ہے اس کا حل کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کیلئے دوسری ذات ہے، جو سب کی مشکلات کو حل کرتی ہے، اس سے کہو۔ اس سے ربط پیدا کرو۔ اب سے ہرگز تنخواہ کی بات مت کرنا، بھول جاؤ کہ تم کو کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ کتنی کٹتی ہے، کتنی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی جب نہیں دینا چاہیں گے، تو کون دے سکتا ہے۔ اور جب وہ دیں گے، تو کون روک سکتا ہے۔ یہ تو اتنی موٹی بات ہے کہ کبھی نگاہ کے سامنے سے ہٹنی نہیں چاہئے۔

تم علم کا اور دین کا کام اللہ ورسول کی خدمت سمجھ کر کرو۔ اور اتنی لگن اور محنت سے کرو کہ اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے۔ مشکلات آئیں۔ ناگواریاں آئیں۔ لوگوں کی حرکتوں سے اُلجھن پیش آئے، تو یہ سمجھ کر راضی رہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہی طرف سے ہے، سب کا دل ان کے قبضے میں ہے، وہی جدھر چاہتے ہیں پھیرتے ہیں، **امر بالمعروف ونہی عن المنکر** میں زیادہ جوش مت دکھانا۔ تم لوگوں کا یہ عمل بہت کچھ نفس کے شمول کے ساتھ ہوتا ہے، اور ہاں ایک بات کا بطور خاص خیال کرو، مدرسہ کے معاملات، مدرسہ کے لوگ، طلبہ واساتذہ پر کوئی تبصرہ نہ کرنا، ان کی اچھائی ہو، تو مناسب انداز میں کہہ سکتے ہو، لیکن ان کی برائیاں اور خرابیاں نہ بیان کرو، اور نہ سنو، تم نئے آدمی ہو، بہت سے لوگ تمہاری خیر خواہی میں آکر لوگوں کی برائیاں کریں

گے، بدخواہیاں ذکر کریں گے، لیکن اس طرح کی گفتگو کا دروازہ پوری قوت سے بند کردو اور خود اخلاق کا معاملہ اختیار کرو، اور اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا، زیادہ وقت اپنی دیکھ بھال میں گزارو، غصہ کی تو بالکل چھٹی کرو۔ تم لوگوں اصل مصیبت یہی ہے، یہی جب آتا ہے تو تم لوگ اپنا عیب نہیں دیکھ پاتے اور دوسروں میں سب عیب ہی عیب نظر آنے لگتا ہے، اور اگر یہی نہ ہو تو اپنے عیوب کھلنے لگیں۔

مدرسہ کے انتظامات میں حتی الامکان منتظمین کی مدد کرنا۔ ان کے ساتھ موافقت کرنا۔ اور اپنی رائے سے کبھی حکم نہ لگانا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے، بہت محتاط رہو۔ کام اتنی محنت سے کرو کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں تمہاری محبوبیت اور عظمت ڈال دیں۔ اور دیکھو کان کے کچے نہ بننا کہ، کسی نے کوئی بات سنائی اور تم اس کا یقین کرلو، اس سے متاثر ہوجاؤ۔ جب تک فریقین سے تحقیق نہ کرلو، کسی بات کو دل میں گھسنے نہ دینا۔ اس سے بہت خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اور کسی بات میں مبالغہ کی زبان نہ اختیار کرو۔ جیسے اسی خط میں تم لکھا ہے کہ زبردست دھوکہ ہوا۔ یہ مبالغہ کی زبان ہے، ’’بہت زیادہ‘‘ ’’ہمیشہ‘‘ ’’کبھی نہیں‘‘ ’’ہنگامہ‘‘ یہ سب مبالغہ کی زبان ہے۔ اس سے بہت اجتناب کرو۔ تم اس کے بچپن سے عادی ہو۔

میاں! مشکلات کہاں نہیں ہیں، ان کو اتنی مبالغہ آرائی سے بیان کرنے کا حاصل یہ ہے کہ تم اللہ سے ناراض ہو، اللہ کی تقدیر سے ناراض ہو، توبہ کرو، اور ہر حال میں تقدیر پر راضی رہو، جو ضرورت ہو اللہ سے کہو۔ مجھ کو دعا کیلئے لکھو۔ میں تمہارے لئے دعا کیا کروں گا، مگر اللہ کے واسطے شکوے کی زبان بند کرو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۰؍صفر ۱۴۱۶ھ

بنــــام

حاجی محمد بلال و حافظ عزیز الرحمٰن

حاجی محمد بلال میرے چچازاد اور حافظ عزیز الرحمٰن ماموں زاد بھائی ہیں، دونوں قریب قریب آگے پیچھے میری ہی عمر کے ہیں، بچپن سے ان دونوں کا ساتھ رہا ہے، دونوں سے بہت گہرا تعلق ہے۔

برادرانِ عزیز حافظ عزیز الرحمٰن و محمد بلال سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج امتحان ختم ہوا، کل ہی سے تم دونوں کی یاد بہت شدت سے دل میں آرہی ہے، ایسا جی چاہتا ہے کہ پھر آکر ملاقات کروں، مگر ظاہر ہے کہ اس تقاضہ پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ میرے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہے، کہ جن لوگوں کو مجھ سے کسی طرح کا تعلق ہے، رشتہ داری کا، یا شاگردی کا، یا ملاقات کا، ہر ایک کے بارے میں میری قلبی خواہش یہ رہتی ہے کہ وہ دنیا کے تقاضوں پر، اپنی خواہشات نفس پر، اور اپنی تمام ضروریات پر دین اور دینی باتوں کو مقدم رکھیں، اللہ کو راضی کرنے کی دھن ہمیشہ لگی رہے۔ عبادت سے، ذکر سے، اطاعت سے، اخلاق سے، غرض ہر اس طریقہ سے، جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔ آخر انھیں کے حضور ہمیں جانا ہے، انھیں نے پیدا کیا ہے، تمام احسانات انھیں کے ہیں، پھر ان سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہونا کتنی نازیبا بات ہے۔ اُس دن، رات میں گفتگو کے دوران میں نے کہا تھا کہ اگر اس دل میں اللہ کی محبت نہیں حاصل کی گئی تو سب کچھ لغو اور بیکار ہے، یہ دنیا کس کام کی ہے، جو بالآخر ساتھ چھوڑ دے گی، یہ مال کس کام کا جو عین ضرورت کے وقت دھوکا دیدے گا، ایک اللہ کی ذات ایسی ہے، جس سے کسی وقت اور کسی جگہ دھوکا نہیں، ایک اس کا نام ایسا ہے جس کے علاوہ کسی میں وفا نہیں، اس میں وفا ہے اور اس سے متعلق جو چیزیں ہیں ان میں وفا ہے۔ اس لئے ہر وقت اسی کی یاد میں، اسی کے دھیان میں انسان کو لگا رہنا چاہئے، دنیا کے کام بھی اس نیت سے کرے کہ اس کے ذریعے اللہ کی رضا کا حصول سہل ہوگا۔ مال کے اعتبار سے اطمینان ہوگا، تو دل بھی خدا کی یاد میں لگا رہے گا، ورنہ پریشان رہے گا۔ اس نیت سے اگر روزی حاصل کرنے کا

کام کیا جائے تو یہ بھی ثواب ہے، نیت ہمیشہ یہی رکھنی چاہئے، جب کام پر بیٹھو تو یہی سوچ کر، یہی کہہ کر کہ یا اللہ محض تیری رضا مقصود ہے، ضرورت کے لئے اس کام کو کرر ہا ہوں، روزی سہولت سے دینے والے آپ ہیں۔ اس نیت سے برکت ہوگی، اور سکون بھی رہے گا۔ اور جو کچھ پیسہ وغیرہ ہاتھ آئے، ہمیشہ یہ نیت رکھو کہ اس میں ایک حصہ غرباء و مساکین کا ہے، اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہ ہو، ہر وقت اللہ کا دھیان رہے ہی، لیکن جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ایک وقت الگ مخصوص کر کے یادِ الٰہی کیا کرو۔ مغرب بعد کا وقت تم نے بتایا تھا، وہ بہت مناسب ہے، کم از کم آدھ گھنٹہ، کوئی بھی ذکر کرلیا کرو۔ سب سے اچھا ذکر لاإلٰہ إلا اللہ ہے، آہستہ پڑھنا ہو تو اس طرح پڑھو کہ لاإلٰہ پر سوچو کہ ہر چیز کی محبت دل سے نکل گئی اور إلا اللہ کہتے وقت یہ خیال کرو کہ ایک اللہ کی محبت دل میں بیٹھ رہی ہے، خوب دھیان لگا کر یہ ذکر ہو گا تو بہت جلد فائدہ ظاہر ہوگا۔ اور ہر نو دس مرتبہ کے بعد ایک بار **محمد رسول اللہ** ﷺ کہہ لیا کرو، اور ہر کہتے وقت یہ دھیان کرو کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر چل کر مجھے اپنے پروردگار کو راضی کرنا ہے۔ یہ ذکر بہت ضروری کام ہے، اس دن میں نے اس پر خوب اچھی طرح روشنی ڈال دی تھی۔ آج پھر جی چاہا کہ اس کو دہرادوں، تاکہ تازہ ہو جائے۔

ذکر الٰہی کے ساتھ ساتھ اخلاق کی اصلاح بھی بہت ضروری ہے، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی وہ ہے، جس کا اخلاق عمدہ ہو، اور اخلاق کی عمدگی کی جڑ دو ہے۔ ایک تو، تواضع اور دوسرے ترکِ غضب، تواضع کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی سے افضل نہ سمجھے، افضلیت کا مدار اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی پر ہے، اور یہ معلوم نہیں کہ کس کا رتبہ خدا کے نزدیک کیا ہے؟ پھر کسی کا کیا منہ ہے کہ اپنے کو اچھا سمجھے، بڑائی صرف خدا کو زیب دیتی ہے، ساری بڑائی اور عظمت اس کے حوالے

کر کے خود سب سے چھوٹا بنا رہے، جتنی پستی ہوگی خدا تعالیٰ اسی قدر اس پر نگاہِ رحمت فرمائیں گے۔ ہر کجا پستی است آب آنجا رود، جہاں پستی ہوتی، نشیب ہوتا ہے، پانی وہیں جاتا ہے۔ ٹونٹی سے پانی لینا ہو تو لوٹے کو اس سے نیچا رکھنا ہوگا، اگر لوٹا اوپر ہوا، تو پانی سے محروم رہے گا۔ ہمیشہ اپنے عمل کو، اپنی نیت کو ناقص اور کھوٹا سمجھتے رہنا چاہئے، یہ کبھی نہ ہو کہ اپنی کسی نیت یا کسی عمل کی اچھائی دل میں بیٹھ جائے اور اس کی وجہ سے خود کو بڑا، اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے، کوئی آدمی ہمیشہ روزہ رکھتا ہو، اور رات بھر نمازیں پڑھتا ہو، چوبیس گھنٹے ذکر اللہ کے علاوہ کوئی کام اس کو نہ ہو، اور اگر خدانخواستہ اس کے دل میں یہ بات جم گئی کہ میں کچھ کر رہا ہوں، اسی وقت وہ حق تعالیٰ کی نگاہِ رحمت سے محروم ہو جائے گا۔ کرتے رہو، اور قصور کا اقرار بھی کرتے رہو، بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ جس قدر عالی ہے، کوئی آدمی اس کا حق ادا کر ہی نہیں سکتا، جتنی عبادت کوئی کرے گا، آخر یہ بھی تو اسی کا احسان ہوگا کہ اس نے توفیق بخشی، اگر توفیق نہ بخشے تو کوئی آدمی زبان سے اللہ کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ پھر بھلا سوچو، کہیں تصور ہو سکتا ہے کہ اس کی بندگی کا حق ادا کیا جا سکے۔ اس لئے بھائی! کرتے رہو اور روتے رہو۔ دیکھو حضور پاک ﷺ کی نماز کیسی کچھ ہوتی رہی ہوگی، حدیث میں نماز کو مومن کی معراج کہا گیا ہے، پھر حضور اقدس ﷺ کی نماز کس درجہ بلند معراج ہوتی رہی ہوگی، لیکن نماز کے بعد آپ استغفار پڑھتے تھے۔ آپ کے سامنے یہ حقیقت بالکل کھلی ہوئی تھی کہ عظمت الٰہی کے شایانِ شان کوئی عبادت ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے بجز معافی چاہنے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، جب محبوب رب العالمین ﷺ کا یہ حال ہو تو پھر کسی کے لئے کب جائز ہے کہ اپنے کسی عمل، کسی حال اور کسی خوبی پر اترائے، اس سے بہت پرہیز کرنے کی ضرورت ہے، اپنے کو ہمیشہ سب سے کمتر درجہ کا یقین رکھنا چاہئے تاکہ حق تعالیٰ کی نگاہِ

رحمت پڑتی رہے۔

اور ترکِ غضب یعنی غصے کو چھوڑ دینا، اس کو تو جانتے ہی ہو، اپنی گناہگاری اور اپنی حقارت کا احساس ہر دم رہے گا تو ان شاء اللہ غصہ خود بخود بھاگ جائے گا، اور اگر نہ بھاگے تو اس کے بھگانے کی کوشش میں لگے رہنا چاہئے۔

بہر کیف رضاء الٰہی مطلوب ہے، جان کی بازی لگا کر اس کو حاصل کرنا ہے، وہی انسان کامیاب ہے، جو مرنے سے پہلے اپنے رب کو راضی کر لے۔ بہت ہی عمدہ اور بہت ضروری کام ہے، اسی کی دھن لگی رہنی چاہئے۔

بات تو بہت ہے، لیکن کتنا لکھوں، اور کتنا تم لوگ پڑھوگے۔ اتنے ہی کو پڑھنے میں کافی دیر لگ جائے گی۔ ماموں اور ممانی جان سے سلام کہہ دینا، اب کی بار ایسی غلطی ہوئی کہ ممانی سے ملاقات بھی نہ کر سکا۔ دن میں تمہارے گھر پہونچنا ہی ہوا نہیں، اور رات میں موقع ملا نہیں، ایسے ہی بڑی والدہ سے بھی ملاقات نہ ہوئی۔ دونوں کی خدمت میں میرا سلام پہونچاؤ، اور میری جانب سے معافی چاہو، پھر آؤں گا تو ان شاء اللہ تلافی کر دوں گا۔ اب افسوس ہو رہا ہے۔ خیر دنیا ایسی ہی جگہ ہے، کبھی ملاقات ہے، کبھی جدائی ہے، کبھی خوشی ہے، کبھی رنج ہے، بعد مرنے کے ان شاء اللہ ہمیشہ ہمیش ملاقات رہے گی۔ اس دنیا میں ملاقات ہونے نہ ہونے پر زیادہ رنج نہیں کرنا چاہئے۔ تینوں ماموں اور شفیع الرحمٰن بھیا کو سلام کہہ دو۔ جی چاہے تو میرا یہ خط اور لوگوں کو بھی سنادو۔ عبد العظیم بھیا سے سلام کے بعد نماز کی تاکید کر دینا۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۲۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مفتی عطاء اللہ صاحب کوپا گنجی

کوپا گنج ضلع مئو کے رہنے والے، دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل، مجھے ریاض العلوم گورینی میں اس وقت ملے جب وہاں شعبہ افتاء میں داخل تھے۔ ذی استعداد، مطالعہ اور تحریر کا ذوق رکھنے والے ایک کامیاب مدرس ہیں۔ کافی عرصہ تک مدرسہ معروفیہ میں مدرس رہے، اور اب مدرسہ امداد العلوم کوپا گنج میں صدر مدرس ہیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

عزیزم مولوی عطاء اللہ سلّمہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا، تم نے عملیات کے بارے میں دریافت کیا، کہ انھیں تم عمل میں لانا چاہتے ہو تو سنو! کہ یہ بات ایک ایسے شخص کے لئے جو عالم دین ہو، خدا ورسول پر ایمان رکھتا ہو، اللہ پر بھروسہ رکھتا ہو، ہرگز زیبا نہیں ہے، عملیات ایک فتنہ ہے، اس میں پڑ کر آدمی بسا اوقات اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، کتابوں میں جو کچھ اس پر سبز باغ نظر آتے ہیں، جب کرنے لگو گے تو معلوم ہوگا کہ محض سَراب ہیں، اور ان تک پہونچنے کے لئے نہ جانے اپنا کتنا قیمتی سرمایہ برباد کرنا ہوگا، ہرگز اس کے درپے نہ ہو، عملیات نہ کرو، اعمال حسنہ پر کاربند رہو۔

عملیات کا حاصل یہ ہے کہ آدمی خدا کی کائنات کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتا ہے، یہ خدا کی جناب میں گستاخی ہے، انسان کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ خود خدا کی مرضی کا تابع بن جائے، پھر اگر ان کو منظور ہوگا تو دنیا کی بہت سی چیزوں کو اس کے تابع بنائیں گے۔

عملیات کا عامل نہ کوئی نبی اور رسول ہوا، اور نہ سلف صالحین! یہودیوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام رکھا تھا کہ وہ عامل تھے، ساحر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی، اور فرمایا وما کفر سلیمٰن، (سلیمان نے کفر نہیں کیا)۔

ہاروت وماروت کے بارے میں راجح قول یہی ہے کہ وہ فرشتے تھے، ان پر بھی سحر کا علم اتارا گیا تھا، مگر وہ سحر سفلی نہ تھا۔ آج کل کی اصطلاح کے مطابق ”رحمانی عمل“ تھا، مگر تاثیر کے اعتبار سے وہ بھی عجائبات کا مظہر تھا، اسی لئے اسے بھی سحر کہہ دیا جاتا ہے، یہ علم درحقیقت سفلی سحر کو ختم کرنے اور اس کے علاج کے لئے نازل کیا گیا تھا، تاہم

اس میں بھی خطرات واندیشے اسی طرح کے تھے جیسے سحر میں ہوا کرتے تھے، اسی لئے جب کوئی شخص اس فن کو حاصل کرنا چاہتا تو وہ یہ کہہ کر منع کرتے تھے کہ **إنما نحن فتنة فلا تكفر**، یہ عمل بذاتِ خود کفر نہیں ہے، لیکن نتیجۃً یہ بسا اوقات کفر تک جا پہونچتا ہے۔

ایک بزرگ (۱) سے ایک نوجوان نے دست غیب کا عمل معلوم کرنا چاہا، تو انھوں نے دیر تک اسے سمجھایا، اور آخر میں ایک بہت بلیغ بات ارشاد فرمائی، فرمایا:

> ”بیٹا! کامل بنو، عامل نہ بنو، عامل وہ ہے، جو خدا کو اپنی منشا کے مطابق چلانا چاہتا ہے، اور کامل وہ ہے، جو خود خدا کی مرضی کے مطابق چلنا چاہتا ہے“

تسخیر قلوب اللہ کی شان ہے، **واعلموا أن الله يحول بين المرء وقلبه**، تم کو کیا ضرورت ہے، اس شان خداوندی میں شرکت کرنے کی۔ اس خیال کو دل سے نکال دو، عملیات میں نہ پڑو، اللہ کے ذکر میں لگو، اس کی رضا جوئی کے ڈھب نکالو، یہی اصل کام ہے، باقی سب فضول۔ تم کو زیادہ اشتیاق معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس پر مفصل گفتگو کر دی، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۵؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

(۱) یہ بزرگ صوبہ سندھ کے مشہور عالم اور سلسلۂ قادریہ کے نامور شیخ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی علیہ الرحمہ تھے۔ حضرت موصوف، استاذی مدظلہ کے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم کے شیخ ہیں، استاذی مدظلہ نے حضرت مولانا حماد اللہ صاحبؒ کی ایک مبسوط سوانح ”تذکرۂ شیخ ہالیجوی“ کے نام سے لکھی ہے، جو پہلے کراچی سے شائع ہوئی، اور دو سال قبل فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہو چکی ہے، اور پڑھنے کی چیز ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

☆☆☆☆☆

استاذ محترم مدظلہٗ کے ایک ’’فاضل شاگرد‘‘ جو ایک مدرسہ میں مدرس تھے، اپنے گھریلو حالات اور معاشی تنگیوں کی وجہ سے حد درجہ پریشان اور آزردہ تھے، ابتداء تو حالات کی دشواریوں کا مقابلہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ کیا، مگر ناموافق حالات کی مسلسل یورش سے ان کا پیمانۂ صبر ایک بار لبریز ہوکر چھلک پڑا! اورنھوں نے نہایت کرب انگیز اور دردناک خط لکھا، جوان کے شکست دل کی آواز تھی، یہ تحریر اسی خط کا جواب ہے، جو رضا بالقضا اور اعتماد علی اللہ کے مضمون پر مشتمل ہے۔

(ضیاء الحق خیرآبادی)

عزیزم! **عافاک اللہ من جمیع البلایا والمصائب**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا دردانگیز اور کرب خیز خط ملا، اس کو پڑھ کر میں ہل گیا، صدموں نے تمہارے دل کو چور کردیا ہے، یہ خط نہیں شکست دل کی آواز ہے، جس کرب و بے چینی کے حال میں تمہارے قلم سے یہ غم آلود الفاظ ٹپکے ہیں، اس کا اندازہ کرکے میں بے چین ہوگیا، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک سید المرسلین ﷺ کے صدقے میں تمہارے مصائب و آلام کا خاتمہ فرمائیں اور سکون قلب و فراغ خاطر نصیب فرمائیں۔

اب میری ایک بات سنو! حالات سے لڑنا، ان سے برسرپیکار رہنا، عزم و ہمت اور حوصلہ کی علامت سمجھا جاتا ہے، اور بلند پرواز شاعروں نے اس کے بڑے فضائل بیان کئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ غلط رخ پر آدمی کو دوڑانا اور تھکا کر اسے مار ڈالنا ہے، اس کے حوصلہ کو توڑ دینا ہے۔ حالات کیا ہیں؟ کیا خود سے پیدا ہوتے ہیں؟ کیا یہ حالات اپنے اختیار سے آتے ہیں؟ کیا ان کے اوپر ظالم ہونے کا اطلاق

صحیح ہے؟ اگر ذرا غور کرو گے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں سے کسی کا جواب اثبات میں نہیں ہے، پھر ان حالات کو کون پیدا کرتا ہے؟ ظاہر ہے خالق ایک ہی ہے، وہی حالات کو پیدا کرتا ہے، پھر ظالم کا اطلاق کس پر ہوا؟ آدمی حالات سے لڑتا ہے، مگر کامیاب نہیں ہوتا اس کے نتیجے میں وہ جھنجھلاہٹ، غم وغصہ، شکایت ویاس، اور حسرت وفریاد کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی فریاد اور شکایت کا نام وہ ہمت وحوصلہ رکھتا ہے، اور سمجھ لیتا ہے کہ میں حالات سے لڑ رہا ہوں، حالانکہ یہ تو اس کی شکست ہے، جب اس نے حالات کی شکایت کی تو گویا ہزیمت کا شکار ہوا۔

تم حالات سے بہت لڑ لئے، اپنا سارا دم خم صرف کر دیا۔ لیکن بات وہیں کی وہیں رہی، جہاں پہلے تھی، معلوم ہوا کہ کوئی اور غیبی طاقت ہے جو تم کو وہیں رہنے پر مجبور کر رہی ہے، جہاں تم ہو۔ اس لئے اب میری قطعی رائے یہ ہے کہ تم لڑائی سے دستبردار ہو جاؤ، صلح کر لو۔ اور غیبی طاقت نے جہاں تم کو پہونچا دیا ہے، اس پر دل سے راضی ہو جاؤ۔ والدین نے تم کو الگ کر دیا، اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، یہ مصیبت نہیں ہے، عین مقصود ہے۔ یہ تو پہلے ہی ہو جانا چاہئے تھا، تمہاری تقدیر کو کوئی تم سے الگ نہیں کر سکتا۔ تنخواہ قلیل ہے، التفات ہی نہ کرو۔ روزی آدمی کی، مدرسے کی طرف سے نہیں ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ روزی کا سوال اللہ سے کرو۔ الحاح وزاری سے کرو، حالات کے خالق وہی ہیں۔ نہ حالات سے لڑو، نہ خالق حالات سے ناراض ہو۔ بس ان کی خوشامد کرو۔ غیب کی کنجیاں انہیں کے ہاتھوں میں ہیں، جو بھی حال ہو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کرو۔ اگر پسند نہ ہو تو انہیں سے فریاد کرو۔ آخر صبر اور رضا بالقضا کی تعلیم کس کے لئے ہے؟ تنخواہ کی کمی دیکھتے ہو، اور اللہ کی رزاقیت کو نہیں دیکھتے، جن کی تنخواہیں زیادہ ہیں، وہ صرف گننے کیلئے زیادہ ہیں، کام ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا،

جتنا مدرسے کی قلیل تنخواہ سے ہوجاتا ہے۔ تم تو دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ محض اللہ کی رضا کیلئے علم دین کی خدمت کرو۔ اور مخلوق سے کوئی سوال نہ کرو، نہ ہی اس کی شکایت کرو، مخلوق کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بس دعا کرو۔ دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں سنتے ہیں۔ اور شکایت سے ناراض ہوتے ہیں، کچھ فائدہ نہیں حالات سے ناراض ہونے کا۔ بس دل سے راضی ہوجاؤ اور خوش مزاجی سے کام کرو، اپنے قلبی اور باطنی احوال کو درست کرو۔ اخلاق کی اصلاح کرو۔ مخلوق کو نفیاً واثباتاً دل میں جگہ نہ دو۔ پھر دیکھتے جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کیسا حالات کو بدلتے ہیں، اس سلسلے میں میری تصدیق کرو۔ اور کوئی وسوسہ دل میں نہ لاؤ۔ میں نے تمہارے حالات سے متأثر ہوکر مولانا رومؒ سے مشورہ کیا کہ کیا جواب دینا چاہئے۔ مثنوی شریف کھولی، تو یہ اشعار نکلے۔

ایں جہاں چوں خس بدست بادِ غیب　　عاجزی پیشہ گرفت از دادِ غیب
گہ بلندش می کند گاہیش پست　　گہ درستش می کند گاہے شکست
گہ یمینش می برد گاہے یسار　　گہ گلستانش کند گاہیش خار
گہ بہ بحرش می برد گاہیش بر　　گاہ خشکش می کند گاہیش تر
دست پنہاں وقلم بیں خط گزار　　اسپ در جولاں وناپیدا سوار
تیر پرّاں بیں وناپیدا کماں　　جانہا پیدا وپنہاں جانِ جاں
تیر را مشکن کہ ایں تیرِ شہی ست　　نیست پرتابی زشست آگہی ست
مَا رَمَیْتَ إِذْ رَمَیْتَ گفت حق　　کارِ حق بر کارہا دارد سبق
خشم خود بشکن تو مشکن تیر را　　چشم ِخشمت خوں شمارد شیر را
بوسہ دہ بر تیر و پیشِ شاہ بر　　تیر خوں آلودہ از خون تو تر

آنچہ پیدا عاجز وبستہ زبوں　　　وآنچہ نا پیدا چنیں تند و مروں
ماشکاریم ایں چنیں دامے کراست　　　گوئے چوگانیم وچوگانے کجاست
می درد، می دوزد ایں خیاط کو　　　می دمد ،می سوزد ایں نفاط کو

(**ترجمہ**) یہ دنیا، غیبی ہوا کے ہاتھ میں ایک تنکے کی طرح ہے، وہ عالم غیب کے سامنے بالکل بے دست وپا ہے☆ وہ ہوا کبھی اسے بلند کرتی ہے، اور کبھی پست، کبھی اسے درست کر دیتی ہے اور کبھی توڑ دیتی ہے☆ کبھی اسے دائیں کبھی بائیں لے جاتی ہے، کبھی گلشن بنا دیتی ہے، کبھی کانٹا بنا دیتی ہے☆ کبھی تری میں کبھی خشکی میں لے جاتی ہے، کبھی اسے خشک بنا دیتی ہے، اور کبھی بھگو دیتی ہے☆ ہاتھ پوشیدہ ہے اور قلم کو لکھتا ہوا دیکھو! گھوڑا دوڑ رہا ہے اور سوار پوشیدہ ہے☆ تیر اڑ رہا ہے اور کمان نظر نہیں آتی، جان ظاہر ہے اور جانِ جاں مخفی ہے☆ تیر کو مت توڑو! یہ شاہی تیر ہے، یہ اٹکل سے تم پر نہیں چلا ہے، علم وآگہی سے تم پر آیا ہے☆ مَارَمَیْتَ إِذْ رَمَیْتَ حق تعالیٰ کا فرمان ہے، دنیا کے کاموں سے پہلے اللہ کا ارادہ ہوتا ہے☆ اپنے غصہ کو توڑ دو تیر کو مت توڑو، تمہاری غصہ آلود نگاہ دودھ کو خون سمجھ رہی ہے☆ تیر کو بوسہ دو اور بادشاہ کے پاس لے جاؤ، اس تیر کو جو تمہارے ہی خون سے تر بتر ہے☆ جو کچھ ظاہر ہے وہ عاجز وبے بس ہے، اور جو پوشیدہ ہے وہ زور آور وتند ہے☆ ہم شکار ہیں، اور ایسا جال کس کا ہے؟ ہم بلے کی گیند ہیں اور بلاّ کہاں ہے؟☆ پھاڑتا ہے، سیتا ہے، یہ درزی کون ہے؟ پھونکتا ہے، جلاتا ہے، یہ مشعلچی کون ہے☆

اور سنو فرماتے ہیں!

ساعتے کافر کند صدیق را　　　ساعتے زاہد کند زندیق را
زانکہ مخلص در خطر باشد مدام　　　تا زخود خالص نگردد او تمام
زانکہ درراہیست ورہزن بیحدست　　　او رہد کو در امان ایزدست
آئینہ خالص نگشت اومخلص ست　　　مرغ رانگرفتہ است اومقنص ست

چونکہ مخلص گشت مخلَص باز رست   در مقام امن رفت و برد دست
ہیچ آئینہ دگر آہن نہ شد   ہیچ نانِ گندمی خرمن نہ شد
ہیچ انگورے دگر غورہ نہ شد   ہیچ میوہ پختہ با کورہ نہ شد
پختہ گرد واز تغیر دور شو   رَو چو برہانِ محقق نور شَو
چوں زخود رستی ہمہ برہاں شدی   چونکہ گفتی بندہ ام سلطاں شدی

(**ترجمہ**) کبھی وہ صدیق کو کافر بناتا ہے، اور کبھی زندیق کو زاہد بناتا ہے☆ مخلص ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے، جب تک وہ اپنی خودی یعنی خواہشات اور ارادے سے پاک نہ ہوجائے☆ کیونکہ ابھی وہ راہ میں ہے، اور رہزن بہت ہیں، نجات وہی پاسکتا ہے جو خدا کے حفظ وامان میں ہے☆ آئینہ ابھی صاف نہیں ہوا ہے، وہ صاف کررہا ہے، پرندہ ابھی شکار نہیں ہوا ہے، ابھی کررہا ہے☆ جب وہ پاک اور صاف ہوگیا، تو اس نے نجات پالی، مقام امن میں پہونچ گیا، اس نے میدان جیت لیا☆ پھر آئینہ بن جانے کے بعد دوبارہ کوئی لوہا نہیں بنتا، گیہوں کی روٹی بن گئی تو، اب وہ کھلیان نہیں بن سکتی☆ انگور پک کر پھر کچا نہیں ہوتا، کوئی بھی پکا ہوا پھر کچا نہیں ہوسکتا☆ تم بھی پختہ ہوجاؤ اور تغیر سے دور ہوجاؤ، جاؤ برہان الدین محقق کی طرح سراپا نور بن جاؤ☆ جب تم نے خودی سے نجات پالی، تو مجسم برہان الدین بن گئے، جب تم نے اپنی غلامی کا اقرار کرلیا، تو بادشاہت حاصل کرلی۔

یہ مضمون جسے مولانا رومؒ نے سمجھایا ہے، اسے رضا بالقضا کہتے ہیں۔ ایک مومن کی بڑی سعادت یہی ہے کہ **اللہ تعالیٰ** کی طرف سے جو حالات پیش آئیں، مخالف ہوں یا موافق، ان پر دل سے راضی رہے، اور اس سلسلے میں اللہ کا جو حکم ہوا سے پورا کرے، لیکن اپنے نفس کے واسطے نہ پورا کرے، اس میں دھوکہ ہوتا ہے، مثلاً کوئی حال ایسا ہے کہ اس میں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا شریعت کی طرف

سے حکم ہے، تو اسے اپنے نفس کے جوش سے نہ کرے بلکہ شریعت کے حکم کی تعمیل میں کرے، دونوں میں فرق یہ ہوگا کہ اگر شریعت کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، تو حدود شریعت کی رعایت کرے گا، اور نفس کے واسطے کرے گا، تو حدود شریعت کی رعایت نہیں ہو گی۔ اثرات بھی دونوں کے الگ الگ ہوں گے۔ اگر حکم شریعت کی تعمیل میں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کیا ہے، اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوا، یعنی جس کو امر و نہی کی ہے، اگر اس نے اس کی تعمیل نہیں کی، تو بھی وہ مطمئن رہے گا کہ میں نے اللہ کا حکم پورا کر دیا۔ اور جو نفس کے واسطے کرے گا وہ اس صورت حال سے دل گرفتہ ہوگا۔ اپنے کو ناکام سمجھے گا۔

بس یہ خیال کرو، جس وقت جو حالت ہو، اس پر دل سے راضی رہو، اور اس وقت کیلئے اللہ کا جو حکم ہو، اسے پورا کرو، اور مطمئن رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۹/ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆

بنـــام

مولانا محبوب عالم صاحب فیض آبادی

مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گورینی کے باصلاحیت اور ذی استعداد طلبہ میں تھے، ابتداءً گورینی سے فراغت حاصل کی، پھر دار العلوم دیوبند میں دوبارہ دورۂ حدیث پڑھا۔ کافی دنوں تک پٹن صوبہ گجرات میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڈھ اور جامعہ شرقیہ لونیا ڈیہہ میں رہے۔ اب مدرسہ بیت العلوم سرائمیر میں پڑھا رہے ہیں۔ یہ خط حضرت مولانا نے دوسرے سفر حج سے واپسی کے بعد ان کو لکھا، اس وقت وہ گجرات میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

عزیزم !   حفظک اللّٰہ

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ

الحمد للہ حرمین شریفین سے بعافیت تمام ۱۸؍محرم کو واپسی ہوئی، اس سفر کی برکات کا کیا پوچھنا، سچ پوچھو تو یارائے تحریر نہیں، البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس زمین پر سر کے بل چل کر پہونچنا چاہئے، وہاں ایک خطا کار وگناہگار بندہ اپنے ناپاک قدموں سے چل کر بخیریت واپس آ گیا، تو یہ اس رب کریم کی غایت درجہ نوازش اور اس ناچیز بندہ کی اعلیٰ درجہ کی کرامت ہے۔ کہاں وہ پاک ومقدس سرزمین جہاں جبرئیل امین بھی ادب سے سر جھکائے ہوئے آتے ہوں، اور کہاں یہ حقیر مشتِ خاک جسے اٹھنے بیٹھنے تک کا سلیقہ نہ ہو، مگر یہ واقعہ ہوا، زمانہ کا حیرتناک واقعہ! کہ ایک نالائق بندہ اپنے اسی ناپاک وجود کے ساتھ گیا اور پھر بغیر کسی سزا میں مبتلا ہوئے بخیریت واپس آ گیا۔ یہ محض رب رحمان کی شانِ رحمت کا کرشمہ ہے، ایسی رحمت! جسے دیکھ کر گنہگاروں کو بھی حوصلہ ہو جاتا ہے کہ ان شاء اللہ جس طرح آج سر بازار رُسوائی سے محفوظ رکھا گیا ہے، کل بروز قیامت بھی ان شاء اللہ نوبت رسوائی کی نہیں آئے گی۔ الحمد اللہ یہ سفر گزشتہ سفر سے زیادہ بابرکت ثابت ہوا، تحریر کی گنجائش کہاں؟ آ ؤ گے تو زبانی سن لوگے، یا طبیعت متوجہ ہوئی تو اس کی روداد بھی قلمبند ہو کر سامنے آ جائے گی، ابھی تو زبانی بیان کر کے اور خود یاد کر کے حلاوت حاصل کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائیں۔

تم نے دیارِ حرم کی حاضری کی جو تدبیر سوچی ہے، گوکہ میں نے پہلے ہلکا سا مشورہ بھی دیا تھا، تاہم میرا دل اس سے متفق نہیں ہے، مکہ شریف یا مدینہ شریف کی بات ہو تو خیر گنجائش ہے، مگر ریاض سے تو اعراض ہی مناسب ہے، وہاں جا کر بندگانِ خدا طعمۂ دنیا بن کر رہ جاتے ہیں۔

حدیث کی تدریس کا جذبہ نہایت قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ اب سوالات کے جواب سنو!

(۱) جمعہ کے موضوع پر تمہاری رائے سے متفق ہوں، میرا مضمون ’’بحث ونظر‘‘ (پٹنہ) کے جلد نمبر۲، شمارہ نمبر۱۱ (ربیع الاول، ربیع الآخر، جمادی الاول ۱۴۱۱ھ) میں شائع ہوا ہے، تمہارے مدرسہ میں پہونچا ہوگا، دیکھ لو۔

(۲) لفظ ’’ؓ‘‘ کوئی شرعی لفظ نہیں، ایک اصطلاحی لفظ ہے، اور اس میں اتنا عموم نہیں ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہی اصطلاح ہو، پھر اگر لغوی طور پر کوئی استعمال کرے تو کچھ حرج نہیں ہے۔

(۳) جمعہ کی اذان دوم کا جواب دینا، مولانا عبدالحی صاحب نے ہدایہ کے حاشیہ میں اس کا جواز ذکر کیا ہے، اور درمختار میں ذکر کردہ مسئلہ کی تغلیط کی ہے، دیکھو باب **صلوٰۃ الجمعۃ واذا صعد الامام المنبر** کا حاشیہ۔

(۴) ابن ماجہ کے لئے حاشیہ ’’**انجاح الحاجۃ**‘‘ کا تو مجھے علم ہے، نسائی شریف کی ایک عربی شرح مدینہ طیبہ میں دیکھی تھی، اس وقت نام یاد نہیں ہے، اور ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی ہے، چند جلدیں چھپی ہیں، اسی دور کے کوئی عالم لکھ رہے ہیں اور اچھی لکھ رہے ہیں، مدینہ خط لکھ کر معلوم کروں گا۔

(۵) یوم عاشورہ کی فضیلت کے متعلق معلومات کرنا چاہتے ہو، یا واقعۂ کربلا کے متعلق! اول کے کے لئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب ’’**ماثبت بالسنۃ**‘‘ کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور دوسرے کے متعلق سب رطب ویابس ہیں، کس کو لکھوں۔

(۶) جنگ آزادی کے متعلق ایک تو ’’نقش حیات‘‘ مصنفہ حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، اور دوسرے ’’کاروانِ احرار‘‘ جو پاکستان سے شائع ہوئی ہے، جانباز

مرزا کی لکھی ہوئی۔ آخری کتاب بہت مفصل ہے، آٹھ جلدوں میں۔

(۷) تحقیق ہو تو مسائل کے بتانے میں کچھ حرج نہیں، اس کیلئے اصطلاحی مفتی ہونا ضروری نہیں۔

(۸) بزرگوں کے احوال وواقعات کے لئے عربی میں ”**حلية الاولياء**“ ”**صفة الصفوة**“ فارسی میں ”تذکرۃ الاولیاء“ ”اخبار الاخیار“ ”انفاس العارفین“ اور اردو میں بزرگوں کے تذکرے سیرت وسوانح کی کتابیں، جواب بہت سی شائع ہوچکی ہیں، ان کا دیکھنا مفید ہے، خصوصیت کے ساتھ حاجی امداد اللہ صاحب اور سیّد احمد شہید قدس اللہ سرہما اور ان کے متوسلین ومنتسبین کے تذکرے۔

(۹) دعا تعویذ کا فن حاصل کرنا مناسب نہیں ہے، اگر کوئی ضرورت مند آئے تو کچھ پڑھ کر دم کردو، کچھ لکھ کر دیدو، خدا کو منظور ہوگا تو فائدہ ہوجائے گا۔ غالباً یہی علم ہے جو ہاروت وماروت کے ذریعے دنیا میں اتارا گیا تھا، جس کے سکھانے سے پہلے وہ **إنما نحن فتنة فلا تكفر** کہا کرتے تھے، یہ فن واقعی کفران کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے بطور فن کے اسے سیکھنا ہرگز مناسب نہیں، بالخصوص جو لوگ علمی مشغلہ رکھتے ہوں ان کے لئے تو یہ سخت مضر ہے۔

(۱۰) جناتوں کو مسخر کرکے کام لینا بہت خطرناک ہے، اور اس کا جواز بھی محل نظر ہے، حاضرات کا عمل محض ایک خیالی چیز ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۱۱) رسول اللہ ﷺ کا عمل یہی ہے کہ آپ نے بال رکھے ہیں، لیکن بال رکھنا ”سنن ہدیٰ“ میں سے نہیں ہے، ہمارے اکابر نے بال رکھنے کو جو ناپسند کیا ہے، وہ بچوں اور طالب علموں کے لئے، کیونکہ ان میں زینت کا جذبہ مخفی ہوتا ہے، خوبصورت بننے کا شوق ہوتا ہے، پھر آدمی بناؤ سنگار میں ہی رہ جاتا ہے، نیز لڑکے اس سے

دوسروں کی نظر میں جاذب نظر ہوجاتے ہیں، کتنی نگاہیں صرف اس لئے گنہگار ہوجاتی ہیں کہ کوئی شخص بن ٹھن کر سامنے آجاتا ہے، جب یہ خرابیاں ختم ہوجاتی ہیں تو پھر ہمارے اکابر نے اسے ناپسند نہیں کیا ہے، بلکہ بال رکھے ہیں۔ تو یہ ناپسندیدگی آفات سے حفاظت کی خاطر ہے، اور یہ کچھ انہونی بات نہیں ہے، اگر کسی مفید وجائز عمل میں مضر اور ناجائز چیزوں کا انضمام ہوجائے، اور وہ مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو تو اسے ترک کرنا ضروری ہوجاتا ہے، تو بال رکھنا کون سے مقاصد شرعیہ میں سے ہے، پھر جبکہ تجربہ کی بنا پر اَمارِد اور طالب علم کے لئے اس میں بہت سی آفات ہیں، تو لاریب انھیں روکنا ضروری ہوا۔

(۱۲) بیع ہو یا نکاح، عربی میں دونوں کیلئے ایجاب وقبول کا لفظ ماضی ہونا چاہئے، کیونکہ مضارع کا صیغہ مستقبل کا بھی محتمل ہوتا ہے، اس لئے اس میں وعدہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے، بنابریں وہ انشاء کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہدایہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ نکاح میں ایک طرف سے مستقبل یعنی امر کا صیغہ ہو اور دوسری جانب سے ماضی کا، تو یہ بھی جائز ہے، تو اس کے سلسلے میں سمجھ لو کہ امر کا صیغہ مثلاً زَوِّجْنِیْ جو کہا گیا ہے، یہ نہ ایجاب ہے اور نہ قبول، یہ توکیل ہے، اس لفظ سے دوسرا آدمی وکیل بن گیا۔ اب جبکہ وہ کہتا ہے کہ زَوِّجْتُکَ فَلَانَةً، یا کہتا ہے تَزَوَّجْتُکِ، تو جانبین سے یا ایک جانب سے وکیل بن کر یہ کلام کرتا ہے، شخص واحد نکاح میں جانبین سے وکیل یا ایک جانب سے وکیل اور خود اپنی طرف سے اصیل ہوسکتا ہے، کیونکہ نکاح میں دونوں طرف سے وکیل بننے میں کوئی تمانع نہیں ہے، نکاح میں وکیل صرف معبر اور سفیر ہوتا ہے، اس پر لینے دینے کے حقوق نہیں عائد ہوتے، اس کے برخلاف بیع میں اگر کسی نے کہا بع ھٰذا المتاع منی، تو یہ بیع کا حکم تو ہوا، لیکن نہ ایجاب ہوا اور نہ قبول! پھر جب

دوسرے نے کہا کہ **بعت منک** تو اب ایجاب پایا گیا، اور بیع میں شخص واحد کا کلام ایجاب وقبول دونوں بن جائے، ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ ایک ہی شخص بائع اور مشتری دونوں نہیں ہوسکتا، ورنہ حقوق میں تمانع لازم آئے گا، وجہ یہ ہے کہ بیع کے حقوق مباشر کی جانب عائد ہوتے ہیں، خواہ وہ اصیل ہو یا وکیل، تو اس جگہ صرف ایجاب پایا گیا قبول نہیں، ہوا۔ اس لئے آدھا رکن ہوا، اور اس سے ظاہر ہے کہ بیع کا انعقاد نہیں ہوسکتا ہے، مختصر لکھا ہے، سمجھدار ہو، سمجھ جاؤ گے، اگر اشکال ہو تو پھر لکھو۔

(۱۳) مسلمان کی ملکیت میں شراب مال متقوم نہیں ہے، اسے اگر کوئی ضائع کردے تو ضمان واجب نہیں ہوگا۔

(۱۴) جن لوگوں نے اخذ بالید کو مصافحہ قرار دیا ہے، وہ احادیث کے ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک ہاتھ سے مصافحہ کو سنت قرار دیتے ہیں، حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی روایت اس باب میں صریح ہے کہ حضور ﷺ نے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا ہے، بہر حال روایات کے مجموعہ پر اگر سرسری نظر سے غور کیا جائے تو دونوں کا مسنون ومعمول بہ سمجھ میں آتا ہے، لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو دونوں ہاتھ سے مصافحہ کو ترجیح ثابت ہوتی ہے، تفصیل کا وقت فی الحال نہیں ہے، بہر حال معاملہ میں گنجائش ہے، طعن وتشنیع اور عناد کی کارفرمائی ہے، ورنہ اس سے بڑے بڑے مسائل میں اختلاف ہے، جس کے نزدیک جو راجح ہو، اس پر عمل کرنا چاہئے، ان مسائل میں وسعت ہے، تنگی نہیں ہے۔

(۱۵) تنقیص انبیاء بلاشبہ کفر ہے، مگر تنقیص کے مصداق، اس کے درجات اور اس کی نیت وارادہ میں اختلاف کی وجہ سے معاملہ ہلکا ہوجاتا ہے، مثلاً ایک عبارت کو ایک شخص اس کے دوررَس نتائج وعواقب یا پس منظر اور پیش منظر کے لحاظ سے تنقیص سمجھتا

ہے، مگر دوسرا اسے سادہ سی بات قرار دے کر بے ضرر بات خیال کرتا ہے، یا ایک شخص کھلم کھلا توہین کرتا ہے، اور دوسرا تاویلات کی پناہ لیتا ہے، یا کسی سے کوئی بات جو موہم اہانت ہے بلا ارادہ یا بہ نیت نیک ...... گو تاویلاً ہی ہو...... صادر ہوگئی، تو اسے اس کے حق میں معصیت نہیں قرار دیا جائے گا، لیکن اگر یہی بات کسی دوسرے کے پاس پہونچے گی جو اس صورتحال سے واقف نہیں ہے، تو اسے کفر سمجھ لے گا، ایسے ہی کسی شخص کی مجموعی زندگی دین وایمان کے زیر اثر رہی ہے، وہ اسلام کے حق میں مخلص بھی ہے، لیکن اس سے نادانی یا کم علمی یا اور کسی وجہ سے کوئی ایسی بات صادر ہوجائے جو موہم کفر ہو، تو اسے کفر نہیں قرار دیا جائے گا، اس کی کوئی تاویل کی جائے گی، کیونکہ اس کی پوری زندگی کا حال اس کفر وانحراف سے ابا کرتا ہے۔ مودودی صاحب میں ہزار خرابیاں سہی، مگر وہ اسلام کے حق میں مخلص تھے، وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا بول بالا چاہتے تھے، ان سے غلطیاں ہوئیں، وہ غلطیاں متعدی تھیں، اس لئے شدومد سے ان کی مخالفت کی گئی۔ تاہم نوبت کفر تک نہیں پہونچی ہے۔ ان کے کام اور خدمات کو دیکھو تو کیا ہمت ہوگی کہ انھیں کافر قرار دیا جائے۔ ایسی جگہ پر تاویل واجب ہے، اور یہی وہ محل ہے جہاں امام اعظم علیہ الرحمہ کا اصول ڈھال بن جاتا ہے کہ جس بات میں سو احتمال ہوں، ایک ایمان کا باقی کفر کا، تو ایمان والے احتمال ہی کو اختیار کرو، اور اس شخص کو کافر نہ قرار دو جس سے وہ بات سرزد ہوئی ہو۔

(۱۶) ۴۸؍میل ایک تقریبی تحدید ہے، احادیث میں اس کی صراحت نہیں ہے، احادیث میں تین دن کی مسافت کا ذکر ہے۔

ابھی کاموں کا ہجوم ہے، لکھنے کی عادت بھی ایک عرصہ سے متروک ہے، اس لئے مختصر مختصر لکھ دیا ہے، خدا کرے تشفی ہوجائے۔

شرح عقائد کی شرح کے سلسلے میں، میں گومگو میں ہوں، مجھے یہ کتاب پسند نہیں ہے، خالص فلسفیانہ طرزِ فکر کی کتاب ہے، دوراز کار بحثیں، کمزور دلائل اور بے اصل دعاوی کا مجموعہ، اوراس کا نام شرح عقائد، پھر علامہ تفتازانی کا پیچیدہ اورالجھا ہوا بیان! اورتم نے اس میں مغزماری کا ارادہ کیا ہے، اگر طالب علموں کے افادہ کا ارادہ کیا ہے، یا اس بات کا قصد ہے کہ الجھی الجھی باتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا سلیقہ آجائے تو خیر، ورنہ بے فائدہ امر ہے، تاہم **لن يصلح العطار ماأفسد الدهر** کے مصداق اگراس کے مشکل مباحث کو آسان کرنا چاہو گے تو قابو نہ پاؤ گے، جتنی تحریر تم نے بھیجی ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ تحریری نہیں بالمشافہہ مشورہ کی ضرورت ہے۔

میری ایک رائے اور ہے، اگر شرح عقائد پر کام کرنا ہی ہے، تو اس کی شرح نہ لکھو، نہ اس کا ترجمہ کرو، اس کے مباحث کو سامنے رکھ کر اپنی زبان میں ذرا تسہیل کے ساتھ لکھ دو۔

الحمدللہ خیریت سے ہوں۔ مولوی محمد سالم سلّمہٗ اور مولوی نورالہدیٰ سے سلام کہہ دو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۷/محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹/اگست ۱۹۹۱ء

* * *

بعض لوگ نمازوں کے بعد کچھ پڑھ کر انگشت شہادت پر دم کرکے آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ فلاں عالم اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔ اس کا حکم کیا ہے، اس کے جواب میں یہ مکتوب تحریر کیا گیا ۔ ضیاء الحق خیرآبادی

عزیزم! **السلام علیکم ورحمة الله وبركاتهٗ**

حدت بصر (نگاہ کی تیزی) کے لئے کسی دعا کو پڑھ کر انگلیوں پر دم کرکے

آنکھوں پر پھیرنا خواہ نماز کے بعد ہو، کسی طرح بدعت نہیں ہوسکتا۔ آخر معوذتین پڑھ کر ہاتھوں پر دم کر کے بدن پر پھیرنا تو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، پھر کیا یہ اسی کے مثل نہیں ہے، اس پر بدعت کا اطلاق کرنا بدعت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

بدعت کہتے ہیں کسی کام کو ثواب سمجھ کر مقصوداً اسے عمل میں لانا، اس تعریف میں خاص بات ثواب کے حصول اور مقصودیت کی ہے، ثواب کے حصول کی غرض سے جو کام بھی کیا جائے گا وہ عبادات کے ذیل میں آئے گا اور مقصودیت کی قید سے وسائل وتمہیدات خارج ہوجائیں گے۔ کوئی کام محض ذریعہ اور وسیلہ سمجھ کر بہ نیت ثواب کیا جائے بشرطیکہ وہ فی نفسہ مباح ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، گو وہ حدیث وقرآن سے براہ راست ثابت نہ ہو اور وسیلہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی کو خواہ مخواہ اس پر اصرار نہ ہو، حالات واوقات کے لحاظ سے اس میں تغیر وترمیم کو قبول کیا جاتا رہے، مثلاً لڑائی کے مختلف طریقے، تعلیم وتعلم کے متنوع انتظامات یہ قرآن واحادیث سے صراحۃً منصوص نہیں ہیں، مگر چونکہ مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود جہاد اور تعلیم وتعلم ہے اور یہ اس کے وسائل وذرائع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہمیشہ ترمیم وتنسیخ ہوتی رہتی ہے، پس یہ بدعات نہیں ہیں، ہاں اگر کسی کو کسی ذریعہ وطریقہ پر اس طرح اصرار ہو کہ اس کے علاوہ کو کسی حال میں قبول نہ کرے یا اسے کافی نہ سمجھے تو البتہ اس میں بدعت کی دراندازی ہوجائے گی۔ اسی طرح کوئی عمل ایسا ہے کہ اس کو کرنے والا دین کا کام یعنی عبادت اور باعثِ ثواب سمجھ کر نہیں کرتا تو اس پر بدعت کا اطلاق کرنا کم فہمی ہے، مثلاً یہی آنکھ والا عمل یہ تو ایک علاج ہے اور وہ بھی جسمانی علاج، جس کا عبادت مقصودہ سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے اس کو بدعت کہنا آج کل کی سطحی غیر مقلدیت اور وہابیت کا شاخسانہ ہے، حدیث سے ”رُقیہ“ کی اباحت ثابت ہے، یہ دیکھ لینا چاہئے کہ

''رُقیہ'' میں کوئی لفظ غیر مشروع نہ ہو، بس کافی ہے۔ یہ بھی ایک ''رُقیہ'' ہے، جس سے آنکھ کی روشنی کی حفاظت ہوتی ہے، اگر کوئی شخص ہر ہر ''رُقیہ'' اور اس کے ہر ہر طریقہ کے لئے دلیل طلب کرے تو اس کا یہ جنون ہے، ایسے لوگ ہر ہر فقہی جزئیہ کے لئے قرآن وحدیث سے صراحت پیش کردیں، تب سمجھا جائے، کہ یہ مطالبۂ دلیل میں مخلص ہیں۔

اس طرح کے اعمال جن کا تعلق جھاڑ پھونک اور ''رُقیہ'' سے ہے یہ علاج ومعالجہ کی ایک قسم ہے، جس طرح ظاہری دواؤں سے علاج ہوتا ہے اسی طرح کلمات وحروف اور اعداد ونقوش سے بھی ہوتا ہے، اس کو عوام کی اصطلاح میں روحانی علاج کہا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت اس کا روحانیت سے تعلق نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جو آیات برائے ''رُقیہ'' پڑھی جاتی ہیں، ان پر تلاوت کا ثواب مرتب نہیں ہوتا، ہر چیز کو اس کی حیثیت پر رکھنا چاہئے، جاہلوں نے جھاڑ پھونک کو بزرگی اور تقرب خداوندی کا شعبہ سمجھ رکھا ہے، اور خشک غیر مقلدین نے اسے بدعت قرار دے دیا ہے، یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں، یہ منجملہ مباح ذرائع علاج کے ایک ذریعہ ہے اور بس! ''رُقیہ'' کے مباح ہونے پر احادیثِ صحاح دلیل ہیں، انھیں بخاری شریف وغیرہ میں دیکھ لو۔ (۱)

حضور ﷺ کی سیرت کو بیان کرنے کے لئے محافل ومجالس کو منعقد کیا جائے تو بابرکت امر ہے، اور ۱۲؍ربیع الاول کو آپ کی پیدائش اور وفات دونوں سے چونکہ تعلق ہے، اس لئے اگر اس میں قدرے اہتمام کیا جائے تو اس سے روکنا مناسب نہیں ہے، البتہ جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکلنا، غلط مضامین پر مشتمل نعتیں پڑھنا، جھنڈا اٹھانا، اودھم مچانا معصیت ہے۔ (۲)

ہاں ایک بات رہ گئی، تم نے پہلے سوال میں تبلیغی جماعت کے بعض اعمال کا

ذکر کیا ہے، ان پر بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، تبلیغی جماعت کا طریقہ کار اشاعت دین کا محض ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے، لیکن ان وسائل کو اتنی سختی اور پابندی کے ساتھ برتا جاتا ہے کہ ان میں کسی طرح کا ردوبدل گوارا نہیں کیا جاتا، اور انھیں اصول کا نام دے کر بالکل مقاصد کی طرح ان کی بجا آوری کی جاتی ہے، اور ہر ایک کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، اور ان کے خلاف کرنے والوں، یا ان کے طریقہ سے الگ رہنے والے کو موردِ ملامت بنایا جاتا ہے، حالانکہ وسائل وذرائع کی یہ شان ہرگز نہیں ہوتی، یہ شان تو عباداتِ مقصودہ کی ہوتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ مخصوص اعمال واشغال جو جماعت میں برتے جاتے ہیں، انھوں نے مقاصد کا درجہ اختیار کر رکھا ہے، اور بذاتِ خود انھیں کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں ان کے بدعت ہونے خیال ہوتا ہے، آنکھوں پر انگلی پھیرنا تو بدعت نہیں ہے، لیکن یہ امورِ تبلیغیہ جنھیں عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف کو خواہ اس میں کتنی ہی مصلحت ہو تو گوارا نہیں کیا جاتا، اگر انھیں بدعت کہا جائے تو بجا ہے، اچھی طرح غور کرلو۔

حدیث کے اسباق شروع ہوگئے، اس سے بڑی خوشی ہوئی، حدیث کا سبق شروع کرنے سے پہلے سات یا گیارہ مرتبہ درود شریف رسول اللہ ﷺ پر دلی توجہ سے پڑھ لیا کرو، اور جب حدیث کے الفاظ کی قرأت کی جائے تو سراپا گوش ہو کر ادب سے بیٹھ کر سنو، اور یہ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد خود آپ کی زبان سے سن رہے ہو، ان شاء اللہ اس کی وجہ سے غیبی فیضانِ رحمت سے مستفید ہوگے، اور عجب نہیں کہ جب یہ کیفیت بڑھے تو دیدار سے مشرف ہو جاؤ۔ تمام احباب کو سلام کہہ دو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲؍ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ

---

(۱) اس موضوع پر تفصیلی معلومات کیلئے مؤلف کا رسالہ ''تعویذات وعملیات کی شرعی حیثیت'' دیکھئے۔

(۲) مکتوب الیہ نے سوال کیا تھا کہ ''عید میلاد النبی'' یا جلسۂ سیرت النبی کے نام سے ماہِ ربیع الاول میں مجالس ومحافل منعقد کرنا بغیر رسم مروّجہ کے اہتمام والتزام کے یعنی خرافات وغیرہ کا ارتکاب نہ کیا جائے، کیا تب بھی اس پر پابندی لگانا مناسب ہے؟

☆☆☆☆☆☆

عزیزم ! **السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ**

تمہارا مکتوبِ محبت ملا۔ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، تمہاری بے ساختہ محبت سوچتا ہوں تو بے حد فرحت ہوتی ہے۔ عزیزم! ہر شخص محبت کا بھوکا ہوتا ہے، خواہ وہ اسے کہیں سے ملے۔ چھوٹے سے ملے، بڑے سے ملے، مجھے الحمد للہ بڑوں سے بھی محبت ملی ہے، برابر والوں سے بھی ملی ہے، اور چھوٹوں سے بھی! اور جب مجھے محبت کی یہ سوغات ملی، تو کیوں نہ میں بھی اپنے محبین سے محبت کروں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ اپنے دوستوں کی محبت سے سرشار ہوں، مجھے کبھی کبھی اپنی حقیقی اولاد اور تم لوگوں کی محبت کے درمیان امتیاز کرنا دشوار ہوجاتا ہے، بلکہ بعض اوقات اولاد سے زیادہ تم لوگوں کی محبت محسوس ہوتی ہے، یہ کچھ میرا کمال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری طبیعت ایسی بنائی ہی ہے، مجھے لفظ ''محبت'' سے محبت ہے، اور دیوانگی کی حد تک محبت ہے، طالب علمی کے زمانے میں مجھے ایسا جنون تھا کہ ایک ڈائری میں ہر وہ شعر نوٹ کرلیتا تھا جس میں لفظ ''محبت'' آیا ہو، سینکڑوں اشعار جمع ہوگئے تھے، لیکن بعد میں نہ جانے وہ ڈائری کہاں گم ہوگئی۔ میں اس محبت کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت اور وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کی کامل محبت عطا فرمائے۔

اسلام اور مسلمانوں کے حق میں تمہارا جذبۂ دل اور دردمندئ قلب نہایت

مبارک ہے، اللہ تعالیٰ اس آگ کو اور بھڑکائے، اور اس سے وہ کام لے، جو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا سبب ہو۔ بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے محمد علی (۱) کا تذکرہ......ادھورا ہی سہی...... پڑھ لیا۔ عجب مرد مجاہد تھا، آخر عمر میں تو وہ اپنے اس شعر کا مصداق بن کر رہ گیا تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اس کا پہلا حصہ دارالمصنفین میں بھی ''دولت نایاب'' ہے، ورنہ کہیں سے نظم کرتا۔ ۲۵/شعبان کے بعد میرے گھر آؤ تو خیرآباد کی ایک لائبریری میں دیکھا تھا، وہاں شاید پہلا حصہ مل جائے۔

۲۸/فروری کو ہمارے یہاں امتحان ختم ہوگا۔ ۴/۵/ مارچ کو گورکھپور حضرت مولانا افضال الحق صاحب مدظلہٗ کے مدرسہ میں جلسہ ہے، اگر وہاں چل سکو تو مولانا بھی بہت خوش ہوں گے، تم کو یاد کرتے ہیں۔ اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ تم ۳/ مارچ کو اعظم گڈھ شہر آجاؤ، اتوار کا دن ہوگا، روڈویز پر اتر کر ٹمپو کے ذریعہ پرانی کوتوالی کے پاس اتر جاؤ، ٹمپو والوں میں یہ جگہ معروف ہے۔ پرانی کوتوالی سے بجانب مغرب تھوڑے فاصلے پر جامع مسجد ہے، وہاں میرے درس قرآن میں شرکت کرو۔ رات کو مولوی محمد عارف صاحب (سابق ناظم مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور) کے یہاں رہیں، اور صبح گورکھپور کے لئے روانگی ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مولوی محمد عارف صاحب بھی ساتھ ہوں، گورکھپور سے مجھے ہنسور اور بارہ بنکی جانا ہے، تم کو تمہارے گھر کے قریب تک پہونچادوں گا۔ یا اگر تمہیں موقع ہوگا، تو ہنسور تک چلے چلنا، جیسی سہولت ہو۔ اگر گورکھپور چلنے کا موقع نہ ہو تو پھر ۶/ مارچ کو ہنسور میں ملو، قاری عبدالسلام صاحب کے

یہاں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ۲۵؍ شعبان کے بعد گھر ملوں گا۔ انشاءاللہ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۱۹؍ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

(۱) مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تاثرات کو دو جلدوں میں ’’محمد علی ذاتی ڈائری‘‘ کے نام سے لکھا، جو دارالمصنفین سے ۱۹۵۰ء کے آس پاس شائع ہوا تھا، اس کی بے پناہ مقبولیت کے بعد بھی اس کا دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت نہ آسکی۔ مکتوب الیہ نے اس کا دوسرا حصہ پڑھا تھا، اسی کے متعلق یہ سطریں ہیں۔ ابھی حال میں صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے اس کتاب کا کمپیوٹرائز عمدہ ایڈیشن شائع کیا ہے، اور دونوں حصوں کو ایک ہی جلد میں کر دیا ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

* * * * *

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**

تمہارے خط کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ ہمارے یہاں امتحان ششماہی ۷؍ ربیع الاوّل کو ختم ہوا، اور اسی روز میں بہار کے ایک طویل المیعاد سفر پر روانہ ہو گیا، ۱۳؍ دن کے بعد آج واپسی ہوئی ہے، تو ڈاک کا انبار تھا، اس میں تمہارا خط بھی ملا، پہلے اسی کو پڑھا، تمہاری علالت سے رنج ہوا، اور صحت یابی سے خوشی! اور مزید خوشی یہ کہ میری تحریر سے تمہیں تشفی ہوگئی، اور تمہارا یہ جذبہ کس قدر قابل قدر ہے کہ میری ضرورت پر تم بے تکلف لبیک کہنے کو تیار ہو، مجھے اپنے دوستوں پر قطعی اعتماد ہے، ان کی محبت سچی ہے اور ان کا تعلق مخلصانہ ہے، ان کا جذبہ والہانہ ہے۔ حق تعالیٰ اسے باقی ودائم رکھیں، اور میرے لئے بھی اور میرے دوستوں کیلئے بھی اسے مثمر اور بارآور بنائیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

تم نے آج کل کے احوال پر جس اضطراب و بے چینی اور درد و کرب کا اظہار

کیا ہے، عزیزم! کیا بتاؤں کہ یہ میرے دل کا ناسور ہے، ہمیشہ تڑپتا ہوں، پریشان ہوتا ہوں، لیکن ابھی تک اس سلسلے میں براہ راست اقدام کی کوئی راہ مجھ پر نہیں کھولی گئی ہے، حرمین شریفین کی حاضری میں اس ارادہ کا بھی بہت دخل رہا ہے کہ شاید وہاں سے کچھ عمل اور اقدام کا راستہ ملے، مگر میں آنکھ کا اندھا اور کان کا بہرہ اور دل کا بے بہرہ کیا ادراک کر پاتا، جیسا گیا تھا ویسا ہی لوٹ آیا۔ ان حالات میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا، جس کے بعد منزل اور دور ہو جائے، ان حالات میں میرا کام صرف ایک ہے، وہ یہ کہ میں مردم سازی کرتا رہوں، یعنی ایسے لوگ تیار کر دوں جو دین پر مر مٹنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، تمہارے عزم وارادے کو معلوم کر کے مجھے نہایت فرحت حاصل ہوئی کہ یہ وہی جذبہ ہے جسے میں اپنے ہر دوست میں دیکھنا چاہتا ہوں، تم اس جذبہ کو ایک مناسب انداز میں اپنے شاگردوں میں منتقل کرو، اور جب تک راست اقدام کی صورت نہیں نکلتی اپنی توانائی اسی میں کھپاؤ، اگر اسی میں مر گئے تو دین کی جدوجہد میں مرو گے، اور اگر کوئی راستہ منجانب اللہ تمہارے اوپر کھول دیا گیا تو مجھے بھی بتانا کہ یہی میرے دل کی بھی آرزو ہے۔

ہاں ایک بات کو خیال رکھو، قوم کو یا لیڈرانِ قوم کو زبان یا قلم سے کچھ نہ کہو، یہ تنقید وتبصرہ مضر ہے، اس سے تمہارے حوصلوں میں پستی آجائے گی، قوم کیا کرتی ہے، زعماء قوم کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں، اس پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالنی ہو کہ ہم اس مجموعی کاروبار جہد وعمل میں اپنا قدم کس طور پر اٹھا سکتے ہیں، اگر اس حیثیت سے ہے، تو قوم اور زعماء قوم کے اعمال وکردار کا بنظر غائر مطالعہ کرو، اور اگر صرف ان کی تحقیر وتذلیل کا جذبہ ہو یا اپنے غصے کی آگ بھڑکانا مقصود ہو تو یہ بہت زیادہ پُر خطر ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **من قال هلك الناس فهو أهلكهم**

(جس نے کہا لوگ ہلاک ہوگئے، وہ سب سے زیادہ ہلاکت میں ہے) بس اپنے پر نگاہ رکھو، اپنے نفس کو تقویٰ کی لگام دو، پھر جب نفس کا تزکیہ ہوجائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی پسندیدہ راہ کھولیں گے۔

اجمالاً اتنا لکھ دیا ہے، تفصیل کے لئے دفتر درکار ہے، جس کی اس وقت فرصت نہیں ہے، ابھی بہت سے خطوط کے جواب لکھنے ہیں، میں تمہارے لئے دل وجان سے دعا کرتا ہوں، اورتم سے بھی دعاؤں کا امیدوار ہوں۔ **والسلام**

اعجاز احمد اعظمی

۱۹؍ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم ! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**

بہت انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ کتابیں جو پڑھانے کو ملی ہیں، ان پر راضی رہنا مناسب ہے، حدیث شریف پڑھانے کا شوق مبارک ہے، مگر اس سے پہلے دوسرے ضروری علوم میں درک ہوجانا ضروری ہے، بالخصوص فقہ اور اصول فقہ میں۔ اس لئے دلگیر نہ ہو، مجھے دیکھو کہ اتنا عرصہ ہوگیا پڑھتے پڑھاتے مگر ابھی تک اس فن شریف کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ انتظار اور تیاری ضروری ہے، یہ سب امور منجانب اللہ ہیں، جو بات ادھر سے ہو اسی میں خیر ہے۔

جنات کے بارے میں تم نے عجیب وغریب سوال کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اتنی موٹی اور بدیہی بات تمہارے ذہن میں نہیں آئی۔ سوچو تو سہی دنیا دار الاسباب ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے دنیا کے ہر مقصد کو اس کے اسباب کے ساتھ مربوط کردیا ہے، زیادہ تر اسباب ظاہرہ کے ساتھ اور بعض غیر معمولی حالات میں اسباب

خفیہ کے ساتھ بھی! جنات ہوں یا ملائکہ یا اور کوئی غیبی مخلوق، ان سے کام لینے کا تعلق اسباب خفیہ میں سے ہے۔ مسلمانوں پر جو ابتلاء و آزمائش کا معاملہ حق تعالیٰ کی جانب سے جاری ہے، یہ نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ از روئے اسباب کچھ انہونی چیز ہے، اس ابتلاء و آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں کچھ اصول اور ضابطے ارشاد فرمائے ہیں۔ ان کو اگر برتا جائے اور حالات غیر معمولی پیدا ہو جائیں تو جنود الملائکہ سے مدد ہوتی ہے، لیکن یہ مدد بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اہل حق کو کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔ انھیں اپنی کوشش پوری کرنی پڑتی ہے، یہ غیبی مخلوقات بھی مشیت الٰہی کی پابند ہوتی ہیں، پھر یہ بھی تو غور کرو کہ جنات کو خلقی طور پر انسانوں سے حسد ہے، اور ان میں شر بمقابلہ خیر کے اس تناسب سے کہیں زیادہ ہے جو انسانوں میں پایا جاتا ہے، پھر وہ کیوں انسانوں کے لئے کڑھنے لگیں۔ انھیں تو اور خوشی حاصل ہوتی ہوگی، رہا عاملین کا معاملہ اور ان کا اجنہ کو اپنے قابو میں کرنے کا قصہ! تو اس میں حقیقت بہت کم ہے۔ ایسا کون ہے جس کے قبضے میں جن ہو، اور اگر کسی کے قبضے میں کوئی جن ہوا بھی تو وہ اپنی برادری میں ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے، پھر اگر اس سے عامل کوئی کام لینا چاہے بھی تو دوسرے اجنہ اس میں مزاحم ہوں گے، اور اگر بالفرض کوئی نیک جن...... جن کی تعداد اجنہ میں بہت قلیل ہے...... کسی کام کے لئے اٹھے بھی تو اشرار اسے چلنے کب دیں گے، جیسا کہ تم انسانوں میں مشاہدہ کرتے ہو، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ کچھ نہ کرتے ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ خاص ہنگامی حالات میں جب مسلمان کمزور پڑنے لگتے ہیں تو اچانک غیبی طور پر ان میں غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں فرشتوں کے ساتھ کیا معلوم کہ اجنہ کا بھی دخل ہوتا ہو۔ ویسے عاملین کے یہاں یہ بات مسلّم ہے کہ اجنہ کا قابو

ان لوگوں پر نہیں چلتا جو اہل حکومت ہوتے ہیں، کیونکہ اہل حکومت کی امداد کیلئے باطنی طور پر بہت سے لشکر متعین ہوتے ہیں، جن میں فرشتے بھی ہوتے ہیں اور صاحب خدمت انسان بھی ہوتے ہیں۔ وہاں جنات بے بس ہوتے ہیں۔

بہر حال ان معاملات کا تعلق حکمت الٰہی سے ہے، ان میں اپنی طاقت اور اپنی خواہش سے کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ نہ فرشتے، نہ جن اور نہ کوئی غیبی مخلوق! جہاں خدا کا اذن ہوگا وہیں یہ جا سکتے ہیں، ورنہ کیا کمی تھی، تنہا جبرئیل یا تنہا عزرائیل سب کام کر سکتے ہیں، مگر اس سے حکمت الٰہی باطل ہوتی ہے۔ اگر یہ حکمت نہ ہوتی تو نبی ﷺ کو تکلیفیں نہ اٹھانی پڑتیں۔ جہاد میں اور غزوات میں زخمی نہ ہونا پڑتا۔ سب کچھ آپ سے آپ ہو جاتا، اس حکمت کی معرفت علم الاسرار کی بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے قلب کو کھول دے، یہی اصل علم ہے۔ باقی اس کے اعتبار سے ذرائع و وسائل ہیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی ۱۳/ ذوقعدہ ۱۴۱۲ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند روز قبل، مجھے نہایت شدت کے ساتھ تمہارے خط کا انتظار تھا، کیونکہ جو خط تم نے رمضان میں اور گھر کے پتے پر بھیجا تھا، وہ اس وقت ملا جب تم گجرات جا چکے ہو گے، جوابی لفافہ پر گھر کا پتہ درج تھا، وہاں نہیں لکھا گجرات والا پتہ تلاش کیا تو نہیں ملا، بہت پریشان ہوا۔ سوچتا رہا کہ کیسے رابطہ قائم ہو، بارے اب خط آیا تو طبیعت کو اطمینان ہوا۔ گجرات والی جگہ تو مناسب ہے، لیکن اب مجھے خود تمہاری ضرورت محسوس ہو رہی ہے، جس مدرسہ میں میں ہوں ابتداءً تو عربی سوم تک تعلیم کا انتظام ہوا۔ مگر اب

عربی پنجم کے طلبہ بھی آگئے ہیں۔ مولوی سفیان کو اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ مگر وہ سعودیہ کے لئے رخت سفر باندھے ہوئے ہیں، اب بار بار تمہاری طرف خیال جاتا ہے لیکن تم بھی ایک اچھی جگہ لگے ہوئے ہو، کیا تدبیر ہو۔ یہاں کی جگہ ویسی تو نہیں ہے، جہاں تم ہو، مگر مدرسہ کی ترقی ان شاءاللہ جلد ہوگی۔ اور کام چل نکلے گا۔ اچھے لوگ ہیں۔ اگر حالات اجازت دیں تو یہاں کی نیت دل میں رکھ لو۔ اصرار نہیں میرے نزدیک تمہاری مصلحت میری ضرورت اور خواہش پر مقدم ہے۔ مولوی سفیان کل آئے تھے، آج گئے ہیں وہ ۱۷ کو بمبئی جائیں گے۔ ان سے میں نے کہا ہے کہ تمہارے لئے کوئی تدبیر کریں۔ ایسے تم تو پڑھنے کے لئے جاؤ۔ کمانے کی لغویت میں ہرگز نہ جاؤ، بالکل جاہل ہو کر رہ جاؤ گے۔ سفیان میری مرضی کے بغیر جارہا ہے، مجھے سخت ناپسند ہے۔ لیکن پڑھنے کے لئے جانا ہو تو خیر، ورنہ نیت ترک کرو۔

اس سے خوشی ہوئی کہ تم کو شرح عقائد ملی ہے، محنت سے سمجھو اور سمجھ کر پڑھاؤ۔ معلوم نہیں تمہارے مخاطب کچھ سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اب اپنے سوالوں کے جواب سنو!

(۱) عقل کی تعریف امام غزالی یہ کی ہے **الوصف الذی یفارق الانسان به سائر البهائم وهو الذی استعدبه لقبول العلوم النظریة و تدبیر الصناعات الخفیة الفکریة . و هو الذی اراد الحارث بن اسد المحاسبی حیث قال فی حد العقل انه غزیرة یتهیأ بها ادراک العلوم النظریة و کانه نور یقذف فی القلب به یستعد لا دراک الاشیاء** (احیاء العلوم، ص: ۸۵، ج:۱)

عقل کی اس تعریف پر غور کرو، یہ عقل حیوانات کے اندر نہیں پائی جاتی، اور سچی بات یہ ہے کہ جو عقل حیوانات میں محسوس ہوتی ہے، اس کا نام عقل نہیں۔ وہ ان

کے طبعی ادراکات ہیں۔ وہ جسمانی چیز ہے، اور عقل روحانی امر ہے، جانور کو جو کچھ حاصل ہے بالفعل حاصل ہے، اس پر اسے اضافہ کی صلاحیت نہیں ہے، اس کے برخلاف انسان کے علوم میں اضافہ اس میں تحلیل وترکیب اور اخذ نتائج کی صلاحیت ہے، یہی عقل مابہ الامتیاز ہے۔ میرے خیال میں اتنی بات کافی ہے۔ مزید کچھ اشکال ہوتو لکھو۔

(۲) جسم آٹھ اجزاء سے مرکب ہونے کی صورت یہ ہے کہ اتنی بات تو جانتے ہو کہ جسم میں تین بعد پائے جاتے ہیں۔ طول، عرض، عمق۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ سطح میں طول اور عرض دونوں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں عمق نہیں پایا جاتا۔ عمق کے تحقق کے لئے ایک دوسری سطح بھی درکار ہوگی تاکہ اس سطح سے اُس سطح تک ایک عمق پایا جائے۔ گویا ایک سطح نیچے ہوگی اور ایک اوپر ہوگی۔ مثلاً یہی کاغذ جس پر میں لکھ رہا ہوں۔ اس کی ایک سطح تو یہ ہے، جس پر یہ حروف لکھے جارہے ہیں اس سطح میں طول اور عرض ہے، مگر عمق نہیں ہے، عمق کے تحقق کے لئے اس کے نیچے کی سطح کو بھی شامل کرو تو عمق ہوجائے گا اب غور کرو کہ جسم کی ترکیب اجزاء لایتجزیٰ سے ہے، اور جسم میں یہ دونوں بعد پائے جانے چاہئیں، اور یہ تینوں بعد ابوعلی جبائی کے خیال میں زوایا قائمہ پر متقاطع ہونے ضروری ہیں، تو اس کے لئے سطح اول پر چار اجزاء ہونے ضروری ہیں اس کی صورت یہ ہوگی زاویہ قائمہ کی صورت یہ ہوتی ہے یہ چار زاویہ قائمہ ہیں۔ اس سطح اول میں دو بعد ہیں طول اور عرض، ظاہر ہے کہ ان دونوں بعدوں کے حصول کے لئے کم از کم چار جز ضروری ہوں گے۔ ورنہ اگر دو جز ہوئے تو صرف طول ہوگا۔ اور تین ہوئے تو دونوں بعد کا زاویہ قائمہ پہ تقاطع حاصل نہ ہوگا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف ایک سطح کے حصہ سے نہ تو جسم تیار ہوگا اور نہ اس میں عمق پایا جائے

گا۔ پس عمق کے تحقق کے لئے ان چاروں اجزاء کے ٹھیک اوپر چار اور اجزاء ماننے ضروری ہوں گے تاکہ عمق حاصل ہو پھر اس عمق کی جانب بھی زاویہ قائمہ بنے گا۔ پس زاویہ قائمہ پر عمق کا تقاطع ہوا۔ اس طرح سے آٹھ اجزاء سے کی ترکیب ہوئی۔

غور کرو گے تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ ورنہ پھر مشافہۃً سمجھانے کی ضرورت ہوگی۔ شرح عقائد کیلئے نبراس کے علاوہ اور کوئی شرح میں نے دیکھی ہی نہیں۔ وہ اچھی ہے مگر اس میں طول بہت ہے۔ زائد باتیں حذف کر کے محض شرح دیکھو تو وہی کافی ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔

نوٹ: جب تک چار جز نہ مانے جائیں گے، طول وعرض کا تقاطع زوایا قائمہ پر نہ ہو سکے گا، دو جز کی صورت میں طول ہوگا مثلاً: اور تین جز کی صورت میں مثلث بنے گا، اس میں زاویۂ حادّہ بنے گا مثلاً یہ صورت اور چار جز مانو تو چار زاویہ قائمہ بنیں گے، اور دونوں بعد کا تقاطع ہو جائے گا، جیسا کہ اوپر کے نقشے میں تم نے دیکھا

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۶؍ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

تمہارا خط ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم کو میری تحریر پسند آئی، اور تمہارے اشکالات دور ہو گئے۔ **فللّٰه الحمد والمنة۔**

اب الحمد للہ تم لوگوں کی دعاؤں سے طبیعت بالکل ٹھیک ہے، اب تکلیف باقی نہیں ہے، اس وقت مشغولیت بہت ہے، ایک مدرس مولوی ابوالخیر بیمار ہو کر گھر گئے ہوئے ہیں، ان کے نہ ہونے کی وجہ سے نو کتابیں پڑھانی پڑ رہی ہیں، اور سب طالب

مشقت! اس کے علاوہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب محدث اعظمی قدس سرہٗ کی تصانیف پر کچھ کام شروع کر رکھا ہے، اس کے لئے ہر جمعرات کو مئو جاتا ہوں۔ ایک رات اور ایک دن وہاں مشغولیت رہتی ہے، سنیچر کی شب میں وہاں سے واپسی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، دعا کرو کہ ملتی رہے۔

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی تفصیلی تاریخ اردو میں میرے علم میں بہت کم لکھی گئی ہے، مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی ایک کتاب بہت مفصل تاریخ ہند کے نام سے بہت پہلے چھپی تھی، وہ مل جائے تو اس موضوع پر کافی ہوگی، ویسے آب کوثر، موج کوثر، رود کوثر، شیخ محمد اکرام کی اگر مل جائے تو انھیں پڑھو، بہت کچھ معلومات ان سے فراہم ہو جائیں گی۔

عربی پر قدرت کے لئے عربی میں مضامین لکھنا ضروری ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عربی کا مضمون لو، اسے بغور پڑھ کر شستہ اور رواں اردو میں اس کا ترجمہ کر لو، پھر اصل کتاب ہٹا کر اپنے طور پر اس اردو کا عربی میں ترجمہ کرو، پھر اس ترجمہ کو اصل سے ملا کر اصلاح کر لو، روزانہ اسی طرح مشق کرو تو جلد قابو مل جائے گا، دوسرے اسی طرح بولنے کی بھی مشق کرو، الحمد للہ خیریت سے ہوں، دعاء کرتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا ایک خط پہلے ملا تھا، خیال ہوا کہ داخلہ کی اطلاع مل جائے تو خط لکھوں، الحمد للہ کہ اس کی اطلاع تمہارے خط سے ملی، اللہ مبارک کرے، میری دلی

خواہش تم نے پوری کردی۔ حق تعالیٰ نے تمہیں دار العلوم دیو بند پہونچا دیا ہے، تو موقع غنیمت سمجھو۔ ایک سال کے لئے خود کو علمی اعتکاف میں ڈال دو، بجز پڑھنے لکھنے، مطالعہ و مذاکرہ کے کسی چیز سے واسطہ نہ رکھو، سیر و تفریح موقوف، مجلس بازی ختم، اِدھر اُدھر کی فضولیات پر تین حرف، مطالعہ کرو اور حاصل مطالعہ کی کاپی تیار کرو، اور جو کچھ کرو عربی زبان میں کرو، اردو مطالعہ بند تو نہیں البتہ بہت کم، عربی کو اعصاب پر سوار کرلو۔ شرح محض عربی کی دیکھو، اردو شروح کو ہاتھ نہ لگاؤ، تکرار کا مشغلہ بھی رہے تو خوب ہے، لیکن صرف تکرار کی حد تک، دوستی کی حد تک نہیں، اس وقت جتنا وقت علم و مطالعہ میں لگ جائے گا نفع ہی نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے علم و عمل میں برکت دیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

یکم ذوقعدہ ۱۴۰۸ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم شفاک اللہ وعافاک من کل داء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو تین روز ہوئے تمہارا خط ملا، مجھے شدید انتظار تھا اور تعجب ہو رہا تھا کہ خیریت ملنے میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے، ارادہ ہوا کہ دریافت احوال کے لئے خود میں ہی خط لکھوں، مگر ابھی نوبت نہیں آئی تھی کہ تمہارا خط لطف و محبت کے بیکراں جذبات سے بھرا ہوا ملا، خط کا ابتدائیہ تم نے اتنا زوردار اور کیف آور لکھا ہے کہ میں سوچنے لگا کہ اس خط کا مخاطب میں ہوں یا کوئی اور عظیم شخصیت! لیکن تم خط لکھتے وقت اس درجہ سرشار تھے کہ میری اصل شخصیت اس سرشاری میں کچھ سے کچھ نظر آنے لگی،

اور جیسا تم دیکھتے گئے لکھتے گئے، بعض مرتبہ کوئی شئ فی نفسہ بھونڈی اور پھوہڑ ہوتی ہے، مگر مصور اس خوبصورتی سے اس کا پیکر اتارتا ہے کہ وہ خوبصورت اور بہت خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے، تم نے اپنے خیالی پیکر کو بہت خوبصورت رنگ تحریر دیدیا ہے، میں بھی بہت محظوظ ہوا، میرا اندازہ ہے کہ میں ایسا ہوں یا نہ ہوں مگر حق تعالیٰ نے تمہارے اندر ایسی استعداد رکھی ہے کہ اس خیالی پیکر کو واقعی صورت میں ڈھال سکتے ہو، اور اس وقت واقعی محبوب خلائق ہو جاؤ گے۔

مشہور عالم ومحدث اور صوفی حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی ایک تصنیف غالباً ''عہود محمدیہ'' (یہ کتاب ''ہم سے عہد لیا گیا'' کے نام سے حال میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی ہے) میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''ہم سے عہد لیا گیا ہے ہم اپنے اساتذہ ومشائخ کو علم وفضل اور بزرگی کے منتہائے کمال پر ہونے کا اعتقاد رکھیں، اگر ہم ایسا کریں گے تو جہاں تک ہم نے حسن ظن رکھا ہوگا حق تعالیٰ کی ذات عالی سے امید ہوگی کہ اس درجہ تک ہماری رسائی ہو جائے گی''۔ یہ بات تجربہ کی رو سے سو فیصد صحیح ہے، میں نے خوب تجربہ کیا ہے کہ جو طالب علم اپنے استاذ کا جس درجہ معتقد ہوتا ہے اور جو مرید اپنے شیخ کے بارے میں جس درجہ حسن ظن رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی کے بقدر اسے نوازتے ہیں، فی زمانہ اساتذہ کے بارے میں ایسا حسن ظن تو مشکل ہے، لیکن طالب علم کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے کوئی ایک ہی استاذ ایسا مل جائے جس کے ساتھ وہ اس درجہ کا اعتقاد نباہ سکے تو ان شاء اللہ وہ وہاں تک پہونچ جائے گا بشرطیکہ وہ دوسرے اساتذہ کا احترام بجالاتا ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم کو ایک ایسا شخص نصیب ہوا قطع نظر اس سے کہ وہ خود کچھ ہے یا نہیں؟ بڑے اساتذہ اور بڑے مشائخ کے یہاں زیادہ باکمال لوگ اسی لئے تیار ہوتے ہیں کہ ان کے تلامذہ ومتوسلین ان

کے ساتھ انتہا درجہ کا اعتقاد رکھتے ہیں، پھر ہر شخص اپنے اعتقاد کے مطابق نوازا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں ہم نے حضرت مولانا نانوتوی و گنگوہی سے لے کر حضرت تھانوی اور حضرت مدنی تک اس بات کا خوب تجربہ کیا ہے، تمہارے حسن اعتقاد اور حسن ظن سے بیحد خوشی ہوئی، کیونکہ یہ تمہارا سچا حال ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے خیال کے مطابق مجھ کو اور حال کے مطابق تم کو نواز دیں تو بڑا کرم ہو جائے، اور ہم دونوں کا کام بن جائے۔

عراق اور امریکہ کے بارے میں تمہاری رائے بہت درست ہے، میں بھی اسی خیال پر ہوں۔ سال نو کی مبارکباد خواہ عیسوی سن کے لحاظ سے ہو، خواہ ہجری کے لحاظ سے، محض انگریزوں کی تقلید ہے، ہمارے یہاں اس کی شرعی حیثیت صرف یہ ہے کہ ایک فضول عمل اور غیروں کی نقالی ہے، اس لئے اس سے اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

تمہاری علالت کی اطلاع سے بہت دکھ ہوا، اسی وقت سے تمہاری صحت وسلامتی کے لئے بجان ودل دعا کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ پوری صحت اور توانائی عطا فرما کر اپنے دین کے کام میں لگائے رکھیں اور تم علم دین کی خدمت میں بیش از بیش مشغول رہو، میری یہ دلی آرزو ہے، میں اپنے دوستوں کو ''جنود اللہ'' کی صف میں دیکھنے کا متمنی ہوں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۶؍رجب ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا عبداللہ خالد خیرآبادی

خیرآباد کے رہنے والے ہیں، وہیں مدرسہ منبع العلوم میں متوسطات تک تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند گئے اور فراغت کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور اور مدرسہ فیض العلوم شیرواں میں تدریسی خدمات انجام دیں، اب جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں ماہنامہ مظاہر علوم کے ایڈیٹر ہیں۔ عربی کی کتابیں بھی پڑھاتے یں، میرے بہت عزیز دوست مولانا فضل حق صاحب عارفؔ خیرآبادی کے صاحبزادے ہیں۔ انھوں نے موقوف علیہ کے سال شرح عقائد پڑھتے وقت کچھ اشکالات پیش کئے تھے، درج ذیل مکتوب اسی کے جواب میں لکھا گیا۔

عزیزم!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج تمہارا خط ملا، تم نے چند سوالات کئے ان کے جواب لکھ رہا ہوں۔

(۱) اللہ کو خواب میں دیکھنا ممکن ہے، لیکن دیکھنے والے نے اگر کسی خاص صورت میں اللہ کو دیکھا ہے، تو وہ صورت نہ اللہ ہے نہ اللہ کے مثل ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ قطعی مثل سے پاک ہے، بس دیکھنے والے کے ذہن میں ایک خیال تھا جو متشکل ہوگیا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص صورت تراش لے، تو جہاں تک خدا کی یاد کا تعلق ہے وہ خدا ہی کو یاد کررہا ہے، مگر وہ صورت جو اس کے خیال نے تراش رکھی ہے وہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے، اسی طرح خواب دیکھنے والے نے جو صورت دیکھی ہے وہ صورت اللہ نہیں ہے، لیکن یاد رہے کہ اس صورت والے خواب کا حال نہایت مشتبہ ہے، یا پھر یہ کہ وہ محتاجِ تعبیر ہے، مشتبہ اس لئے کہ یہ شیطان کا تصرف بھی

ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ضعیف الاعتقاد کو کوئی صورت خواب میں دکھا کر اسے باور کرائے کہ یہی اللہ ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی خاص صورت میں اللہ کو دیکھا ہے تو اس سے اللہ مراد نہ ہو، بلکہ اس کی کوئی مخصوص تعبیر ہو، مثلاً یہ کہ کسی نے اللہ تعالیٰ کو کسی خاص صورت میں دیکھا، یا اللہ کا مثل دیکھا، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والا جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ پر تہمت لگانے والا اور بدعتی ہے، اسے توبہ کرنی چاہئے

اللہ کو خواب میں دیکھنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ دیکھنے والے کو کوئی خاص شکل نظر نہیں آئی، وہ عرشِ الٰہی کو دیکھتا ہے یا کرسی کو دیکھتا ہے، اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ کی زیارت کر رہا ہو، اس سے بات کر رہا ہو، اس کو سارے عالم پر محیط محسوس کرتا ہے، دیکھنے والے سے کوئی صورت پوچھو تو اسے کچھ نہیں معلوم! امام ابوحنیفہ یا امام احمد بن حنبل **رحمہما اللہ** نے اللہ تعالیٰ کو جو خواب میں دیکھا، اس میں اس کی صراحت ہے کہ انھوں نے کسی خاص صورت پر نہیں دیکھا تھا، ایک بار میں نے بھی اللہ کو خواب میں دیکھا تھا، یوں محسوس ہوا جیسے میدانِ قیامت میں ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا تختِ جلال موجود ہے اور میں عرش کا پایہ تھام کر حق تعالیٰ کے حضور کچھ عرض نیاز کر رہا ہوں، مگر صورت کچھ نہیں، بہر حال حق تعالیٰ صورتوں سے پاک ہیں، جسم ایک مخلوق ہے، مخلوق کی رسائی خالق کی ذات تک کیونکر ہوسکتی ہے، اگر خدا تعالیٰ کے لئے جسم مانا جائے تو اسے مخلوق بھی ماننا پڑے گا، اور یہ محال ہے۔

(۲) خدا تعالیٰ کا مثل کیا ممکن ہے؟ اگر اسے ممکن مانو، تو بے شک خدا تعالیٰ اس کے پیدا کرنے پر قادر ہیں، لیکن سوچ لو کہ جب وہ مخلوق ہوا تو خدا تعالیٰ کا مثل نہ رہا، اس لئے کہ خدا تعالیٰ مخلوق نہیں ہے پس سرے سے مثل محال ہے، اور محالات تحت القدرت نہیں ہوتے، اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی کمی ہے، قدرت تو کامل

ہے مگر محال میں مقدور ہونے کی صلاحیت ہی نہیں، خدا کی صفت خلق **علیٰ وجہ الکمال** ہے، مگر محال میں مخلوق ہونے کی صلاحیت ہی نہیں، کیونکہ اگر وہ مخلوق ہو گیا تو محال نہیں رہا۔ دیکھو انسان کی نگاہ کامل ہے لیکن مبصرات ہی کو دیکھ سکتی ہے، ہوا کو نہیں دیکھ سکتی، تو کیا اس کے کمال میں کوئی نقص ہے، تو بعض چیزیں اپنی تاثیر میں کامل ہوتی ہیں، لیکن ان کی تاثیر وہیں ظاہر ہوتی ہے جہاں اس کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، خدا کی قدرت بے شک کامل ہے مگر محالات میں اس قدرت کی تاثیر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں، یہ تعبیر نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنے مثل کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، اس سے وہم ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کا مثل تو ہو سکتا ہے مگر اللہ کو اس پر قدرت نہیں، یہ تعبیر ادب کے بھی خلاف ہے اور موہم فساد بھی ہے، یہ کہو کہ اللہ کا مثل محال ہے اور محالات میں تاثیر قدرت اور تاثیر خلق کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

(۳) جہتوں کا تعلق عالم خلق سے ہے، یہ مخلوقات کی صفت ہے، اور اللہ تعالیٰ مخلوقات کی صفت سے پاک ہے، اس بنا پر ان کے لئے کسی جہت کا اثبات ممکن نہیں، اب رہا سوال یہ کہ آیاتِ قرآنیہ میں جہت کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً پاک کلمے اسی کی طرف چڑھتے ہیں، واقعہ معراج میں نبی ﷺ کا رب العالمین سے ملاقات کے لئے جانب فوق جانا، تو یہ اشکال واقعی محسوس ہوتا ہے، لیکن سوچو کہ قرآن کی آیات ہی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے کوئی خاص جہت نہیں ہے، مثلاً **أینما تولوا فثم وجه الله**، اور **إن الله بكل شئ محيط**۔ اور حدیث میں ہے کہ نمازی اپنے آگے نہ تھوکے، اس لئے کہ اس کے سامنے اللہ ہے، اور اس کے علاوہ بہت سی روایات وآیات ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت اور سمت سے پاک ہیں، اس لئے ایسی توجیہ کرنی چاہئے کہ دونوں طرف کی آیتوں اور روایتوں میں تطبیق

ہو جائے۔ اس وقت کتابیں دیکھنے کی فرصت نہیں ہے جو کچھ میرے ذہن میں ہے اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاب فرمایا ہے، اور خطاب کرنے والا ظاہر ہے کہ اپنے مخاطب کی رعایت سے کلام کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی رعایت برتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں اس کو ذکر کیا ہے، کہ بندے جن چیزوں کو سمجھتے بوجھتے ہیں، جو ان کے درمیان مسلمات ومشہورات ہیں، اور جو ان کے برتنے کی چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انھیں چیزوں کو بیان کیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنی ذات وصفات کا بیان اللہ تعالیٰ نے اسی رعایت سے کیا ہے، جس کو بندگانِ خدا سمجھ لیں جو ان کے محاورات ومسلمات کے مطابق ہے، تاکہ ان کو حق تعالیٰ سے ایک جذباتی وابستگی اور تعلق پیدا ہو۔ صفات کا تفصیل سے بیان اللہ تعالیٰ نے اسی مصلحت سے کیا ہے کہ نفس انسانی کی اصلاح ہو اور اسے خدا تعالیٰ سے صحیح رابطہ حاصل ہو۔ اس لحاظ سے دیکھو تو اللہ جو کہ غیب الغیب ہے، اس کے علوئے مرتبہ اور عظمت شان کو جب بیان کرنا ہوگا اور وہ بھی انسان سے، جو کہ خوگر محسوسات ہے تو بجز اس کے اور کیا صورت ہے کہ علوئے مکان سے اسے تعبیر کیا جائے، تم دیکھ لو کہ انسان اپنی تعبیرات میں عموماً علوئے مرتبہ کو علوئے مکان سے ظاہر کرتا ہے، حق تعالیٰ نے بندوں کی رعایت میں وہی تعبیر اختیار فرمائی اور جہاں اصل حقیقت بیان فرمائی ہے وہاں بھی بندوں کی فہم کی رعایت میں اجمال ہی کو اختیار فرمایا ہے اور **لیس کمثلہٖ شیٔ** کہہ کر ہر قسم کی مشابہت کے عقیدے کی جڑ کاٹ دی ہے، پس بندوں کے لئے جب جہت ہے تو لازم ہے کہ حق تعالیٰ اس جہت کے تصور سے پاک ہوں، اور جن آیات سے علوئے مکان معلوم ہوتا ہے وہ یا تو علوئے مرتبہ پر دلالت کرتی ہین،

یا یہ بات ہے کہ بعض بعض مخلوقات حق تعالیٰ کی تجلی خاص کا مہبط ہوتی ہیں، جیسے عالم دنیا میں خانہ کعبہ، بیت المقدس، کوہِ طور وغیرہ، اور عالم آخرت میں عرشِ الٰہی، کرسی اور سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ، ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص نسبت حاصل ہے، ان کی طرف پہونچنے والا بے اختیار یہی تعبیر کرتا ہے کہ وہ اللہ کے پاس پہونچ رہا ہے، اعمال صالحہ اور کلم طیب، سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچتے ہیں، رسول اللہ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگئے گئے، سدرۃ المنتہیٰ کا جانب فوق ہونا متعین ہے تو یہ جہت اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہے بلکہ اللہ سے خصوصی نسبت رکھنے والی مخصوص مخلوقات کے لئے ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس مختصر گزارش سے اطمینان خاطر ہوجائے گا، اگر کوئی خاص اشکال محسوس ہوتو لکھو، مگر اللہ کی ذات وصفات کی بحث نازک ہے، اور تحریر میں لانا نازک تر، اس کے لئے اجمال ہی مناسب ہے، عالم شہود کا خوگر عالم غیب کی گرہ کشائی نہیں کرسکتا، پس یہی کافی ہے کہ آمنت باللہ کما ھو باسمائہ وصفاتہ، عقائد کیلئے عقیدۃ الطحاویہ پڑھو، اس کی شرح بھی غنیمت ہے، مگر مکمل قابل اعتماد نہیں ہے۔

علامہ شبلی کی ''الکلام'' کے بجائے مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی ''علم الکلام'' دیکھو۔ میں الحمدللہ خیریت سے ہوں، تمہارے لئے دعا کرتا ہوں، البتہ اس کا خیال رکھو کہ ایک خط میں ایک ہی سوال لکھو تو جواب میں سہولت رہے گی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۵؍محرم ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

مکتوب بنام مولانا ثناء اللہ صاحب جون پوری

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں جن طلباء سے اختصاص رہا، ان میں ایک ممتاز نام مولوی ثناء اللہ کا ہے۔ یہ مانی کلاں کے قریب ایک گاؤں ''سونگر'' کے رہنے والے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، کچھ عرصہ گورکھپور اور بھدوہی میں خدمت دین کرتے رہے۔ اب اپنے گاؤں میں مقیم ہیں۔ زمانۂ طالب علمی سے اب تک انھوں نے مجھ سے رابطہ قائم رکھا ہے۔

عزیزم! **السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ**

تمہارا خط الحمد للہ خوش کُن ثابت ہوا۔ حق تعالیٰ کو خوش رکھو، اسی میں سارے جہاں کی خوشی ہے، خدا کو ناراض کرنے والوں نے ایک لحظہ حقیقی خوشی نہیں پائی ہے، اور جس چیز کو وہ اپنی خوشی سمجھتے ہیں یا دنیا والے اسے ان کے حق میں مسرت وشادمانی سمجھتے ہیں وہ ان کی بے حسی اور مردہ دلی ہے۔ ورنہ مالک ومولیٰ کو ناراض کرنے کے بعد انسان کا قلب کانٹوں پر لوٹتا ہے، اور خدا کو خوش کرلینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، خوشی کی سب سے بڑی چیز تو ہر مسلمان کو حاصل ہے، یعنی ایمان اس سے تو کوئی مومن خالی نہیں ہے، بس ضعف وقوت کا فرق ہے اور ضعف بھی زیادہ تر اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی دنیا بھر کے کاموں، غلط صحبتوں اور لایعنی مشغولیات خواہ ذہنی ودماغی ہوں یا عملی، ان میں پڑ کر اسے اپنے ایمان کی جانب التفات نہیں رہتا۔ اگر ذرا بھی اسے التفات ہوتا، اور ہر ہر معاملے پر یا کم از کم ہر عجیب وقوعہ پر یا کسی خوشی وراحت یا رنج ومصیبت پر آدمی خدا سے تجدید تعلق اور تجدید ایمان کرتا رہے تو زیادہ دن نہ گزریں گے کہ اس کے ایمان میں قوت پیدا ہوجائے گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ایسی بات ظاہر ہو، جو دل میں حیرت واستعجاب یا خوشی ومسرت یا رنج وغم کی لہریں دوڑائے تو بجائے

اس کہ کے اسبابِ عادیہ کی طرف اس کو منسوب کریں، اور اس کی عام علت کے ساتھ اسے مربوط کریں۔ اس کو خالص خدا کے حضور پہنچا کر اس کی توجیہ کریں، یہ اسباب جن پر آدمی اپنی نگاہ محدود کر لیتا ہے یہ خود دوسرے اسباب وعلل سے ناشی ہوتے ہیں، آخری علت حق تعالیٰ کا تصرف وارادہ ہے، اگر کوئی آدمی اول وہلے میں وہیں پہونچ جائے تو اس کے ایمان میں ہر وقت اضافہ ہوتا رہے۔ یہی وہ تفکر ہے جس کے بارے میں حدیث میں وارد ہے کہ یہ ستر برس کی عبادت سے بڑھ کر ہے، البتہ اس میں ایک شرط ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، اس کے تصرفات پر اعتراض وانکار نہ ہو اور اس یقین کے ساتھ ان پر غور کرے کہ جو کچھ ہے وہ اس کارخانۂ عالم کے عین مطابق اور حکمت الٰہیہ کے عین موافق ہے۔ تم کہو گے کہ دنیا میں بہت سے وقائع ایسے سرزد ہوتے رہتے ہیں جن کی کوئی معقول توجیہ نہیں ہوتی میں کہوں گا کہ اس وقوعہ کو پوری کائنات کے ماحول میں رکھ کر جب دیکھو گے تو اس کی مصلحت وحکمت اسی طرح روشن نظر آئے گی، جس طرح آفتاب نصف النہار چمکتا ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ میری اور تمہاری نظر قاصر ہے، کائنات کے پورے ماحول کا چونکہ یہ احاطہ نہیں کر پاتی، اسلئے ہر وقت کوئی نہ کوئی جز فوت ہی رہتا ہے، جس کی وجہ سے آدمی کو خلش ہوتی ہے۔ تم سوچو خالق کائنات جس کی نگاہِ عام میں اس عالم کا اول وآخر اور ذرہ ذرہ سب روشن ہے، ہم اس کی حکمتوں کا کب احاطہ کر سکتے ہیں پس یہی کافی ہے کہ صدق دل سے اس کی حکمت وقدرت پر ایمان رکھیں، تو اس کی برکت یہ ہوتی ہے۔۔۔ اور مجھے اس کا بارہا تجربہ ہے۔۔۔ کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا علم کھول دیتے ہیں جن پر اس کی حکمت کا سمجھنا موقوف ہے، یہ تو تم کو بار بار تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ ہماری عقل ایسی ناتمام ہے جو نہ ماضی کے وقائع کو ٹھیک سے یاد رکھتی ہے نہ مستقبل سے ذرہ بھر سروکار رکھتی۔ صرف

حال کی محدود اور مختصر سی معلومات رکھتی ہے، بھلا وہ لامحدود علوم الٰہیہ میں پھیلے ہوئے وقائع کا احاطہ کیونکر کرسکتی ہے بس یہ ایمان کی برکت ہوتی ہے کہ ہر چیز **کماھی علیہ** کی علت سامنے آجائے، اگر اسی نقطۂ نظر سے علوم کی تحصیل کرو تو عجائب علوم منکشف ہوں، اور ترتیب بھی یہی ہے کہ پہلے ایمان ہو۔ حق تعالیٰ کا ذکر ہو۔ اس کے بعد تفکر ہو تو اہل عقل کہلائے اور اگر ترتیب اُلٹ دیں تو اول درجہ کی بے عقلی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُوْلِی الْاَلْبَابِ ، اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰماً وَقُعُوْداً وَعَلیٰ جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات و دن کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کیلئے، جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے، اور آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور وفکر کرتے ہیں) یہ ترتیب فطری ہے، اس کے برخلاف جب تفکر پہلے آتا ہے تو آدمی خطرے میں پڑجاتا ہے۔ پس اپنے ایمان کو سنبھال کر رکھو، اس کو ہر وقت تازہ غذا پہونچاتے رہو، عمل ایمان کا غلام ہے اور راحت ومسرت اس کا فطری نتیجہ ہے، وہ حاصل ہے تو سب حاصل ہے ورنہ فریب ہی فریب رہتا ہے، بات سمجھے؟

اللہ تعالیٰ تم کو، مجھ کو اور میرے تمام دوستوں کو اپنی سچی محبت اور صحیح تفکر نصیب کرے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی،
۵؍ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا سراج احمد صاحب بستوی

ضلع بستی کے رہنے والے، مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں حضرت مولانا سے تعلیم حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں عرصہ تک صدر مدرس رہے، اور اب مدرسہ بیت العلوم سرائمیر میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے حجرِاسود کے متعلق سوال کیا تھا کہ کیا وہ جب جنت سے آیا تھا تو سفید تھا؟ اس سلسلے میں کوئی روایت ہو تو نشاندہی فرمائیں، ان کا ایک سوال بندوں کے صاحب اختیار ہونے اور نہ ہونے کے متعلق تھا، اور آخری سوال یہ تھا کہ اگر کسی اجنبی عورت کی لاش ملے تو اسے دفن کیا جائے گا یا جلایا جائے گا۔ (مرتب)

عزیزم! السلام علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، حسب معمول جواب فوراً لکھا جاتا مگر حجر اسود کے متعلق جو سوال تم نے کیا ہے، وہ مشہور تو بہت ہے مگر مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے، اتنا تو روایات سے ثابت ہے کہ وہ جنت سے آیا ہے، چنانچہ ابھی چند روز ہوئے نسائی شریف میں یہ روایت نظر سے گذری ہے، لیکن یہ کہ وہ سفید بھی تھا اس سلسلے میں کوئی روایت یاد نہیں ہے، سوچا تھا کہ کتابیں دیکھ کر لکھ دوں گا، اس وجہ سے تاخیر ہوگئی، اب فرصت ملی ہے تو مولوی مقبول صاحب ہتورا چلے گئے ہیں، وہاں تبلیغی جلسہ ہے، اس وقت مجبوری ہے اس لئے اس کے متعلق روایات کی تحقیق یا تو خود کرلو......تاریخ مکہ سے متعلق جو کتابیں ہیں ان میں یہ بات مل جائے گی...... یا پھر بعد میں میں ہی لکھ دوں گا۔

پہلا سوال تم نے جبر واختیار کے متعلق کیا ہے، یہ سوال ابتدائی حالت میں تو سادہ ہے، مگر اس کی تدقیق اسے پیچیدہ بنادیتی ہے، اس لئے اسے اس کی ابتدائی حالت ہی میں رہنے دو۔ دو باتیں ساری عالم میں مسلّم ہیں، انھیں ہر شخص خواہ عاقل ہو خواہ نادان، سب تسلیم کرتے ہیں، اول یہ کہ حق تعالیٰ ساری کائنات کے مالک ہیں، عالم کے ذرہ ذرہ میں ہر وقت ان کا تصرف ہے، اس میں کسی دو شخص کو اختلاف نہ ہوگا بشرطیکہ منکر خدا نہ ہو............اور ایسے کتنے آدمی دنیا میں ملیں گے............ دوسری بات یہ ہے کہ انسان ہی کیا ہر جانور اپنے ارادہ وعمل اور حرکت وسکون میں خود کو ہمہ وقت بااختیار تصور کرتا ہے، کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا جو عامۃً اپنے ارادوں میں خود کو ایسا مجبور خیال کرتا ہو جیسے رعشہ والا اپنے رعشہ پر مجبور ہوتا ہے، حتیٰ کہ اکراہ کی حالت میں بھی جو عمل صادر ہوتا ہے وہ بھی اختیار ہی سے ہوتا ہے، یہ اختیار بالکل بدیہی ہے، اور سارے عالم کے لئے بدیہی ہے، اور بدیہیات کا انکار ابلہی ہے۔ یہ دونوں اپنی جگہ

پر مسلم ہیں اور دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے۔ انھیں الگ الگ دائروں میں دیکھوتو کوئی الجھن نہیں ہے، لیکن دونوں کو خلط ملط کر دو گے تو الجھن پیدا ہوگی، اور اگر دونوں کو ایک دائرہ میں دیکھنا ہی چاہو تو تعبیر یوں کرو کہ بندہ با اختیار ہے لیکن یہ اختیار چونکہ خدا کا عطا فرمودہ ہے اس لئے حصول اختیار میں تو وہ با اختیار نہیں ہے، باقی اعمال وارادت اسی اختیار کا نتیجہ ہیں، اور اختیاری اعمال پر مواخذہ ہونا بالکل برحق ہے، پس انسان من وجہٍ مختار ہے اور من وجہٍ مختار نہیں ہے، جس جگہ اختیار ہے وہیں مواخذہ ہے اور جس جگہ اختیار نہیں ہے وہاں مواخذہ بھی نہیں ہے۔ البتہ جبر کا لفظ نہ بولو، اس کے بجائے ''جبل'' کا لفظ پسندیدہ ہے، اسی سے ''جبلت'' ماخوذ ہے۔ حاصل یہ کہ انسان اپنے اختیار پر ''مجبول'' ہے، اور دیگر اعمال میں صاحب اختیار ہے۔ انسان کو مجبورِ محض کہنا بداہت کے خلاف ہے، اور مختارِ مطلق ماننا سراسر حماقت ہے، مسلک حق دونوں کے درمیان ہے، اور مواخذہ بھی علی الاطلاق نہیں ہے، امید ہے کہ اس اجمالی توضیح سے تسلی ہو جائے گی۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ لاوارث عورت کی شناخت کی اگر کوئی صورت نہ ہوگی تو جہاں وہ پائی گئی ہے وہاں کے باشندوں کے تابع ہوگی، کفار کی آبادی ہو تو کافرہ، مسلمانوں کی آبادی ہو تو مسلمان، اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر وہیں کسی مفتی سے تحقیق کرلو۔ فقہی سوالات کا جواب دینا مفتیوں کا منصب ہے، میری نظر فتاویٰ کی کتابوں پر زیادہ نہیں ہے اور تحقیق کی فرصت نہیں ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۹؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

بنام قاری عبدالستار صاحب فتح پور

مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں جب میں تدریس کے لئے پہونچا تو دورۂ حدیث کے ممتاز طلباء میں ان کا شمار ہوتا تھا، بہت شریف النفس، نیک اور ذی استعداد اور بہت عمدہ قاریٔ قرآن۔ نمازوں میں امامت بھی کرتے تھے، نعتیں بھی خوب پڑھتے تھے۔ تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے۔ آغازِ ملاقات ہی سے مجھ سے مناسبت ہوگئی تھی۔ متعدد باران کی فرمائش پر میرا فتح پور جانا ہوا۔ اپنے قصبہ ہی میں مدرسہ ضیاء الاسلام میں مدرس اور جامع مسجد کے امام وخطیب ہیں، نعتیں کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، خوش بیان واعظ بھی ہیں۔

عزیزم!　　　　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ خیریت سے ہوں، البتہ پاؤں میں گھٹنے کے اوپر خارش پریشان کئے ہوئے ہے۔

باہمی خلاف وشقاق کے نتائج یہی ہوتے ہیں، امورِ ضروریہ کی توفیق گھٹ جاتی ہے اور فضولیات بلکہ معاصی میں ابتلا ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں۔

بندۂ مومن جس طرح راحت وآرام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اور مسرور ہوتا ہے، اسی طرح تکلیف واذیت کو بھی خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اور اسے خدا کی خصوصی توجہ سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے، دنیا اور دنیا کے لوگ کیا ہیں، کٹھ پتلیاں ہیں، ان کو حرکت دینے والا ہاتھ کوئی اور ہے، اور وہ صاحبِ حکمت بھی ہے اور صاحبِ رحمت بھی! ان کٹھ پتلیوں کو نظر انداز کرکے اپنے رب کو جس کی مختلف شانیں ہیں، دیکھتا رہتا ہے اور غور کرتا رہتا ہے کہ میرے اندر کون سی خامی ہے جس کی اصلاح اس تربیت سے کی جارہی ہے، یا اس تربیت شدیدہ کے نتیجے میں کون سے معائب کھلتے جارہے ہیں، تاکہ ان کی اصلاح کی فکر ہوسکے، خوب سمجھ لو کہ اللہ نے انبیاء کے اوپر بھی دشمن مسلط کئے تھے جن کی ایذا رسانیوں سے یہ تنگ آ آجاتے تھے، لیکن بالآخر دشمن خائب وخاسر ہوئے، یہ بھی پروردگار کی تربیت کا ایک انداز ہے! تاکہ طبیعت خوب تجربہ کرکے پختہ ہوجائے، دوست دشمن کی تمیز ہوجائے۔ کوئی کیسی ہی صورت لے کر آئے اس سے دھوکہ نہ ہو، اور اس لئے بھی تاکہ عوام الناس، دوست احباب اور دشمن وبد اندیش سب کی حقیقت کھل جائے کہ کون کتنا ساتھ دے سکتا ہے، یا کہاں تک دشمنی کرسکتا ہے؟ سب کی طاقتیں محدود وناپائیدار ہیں۔ ایک ہی ذات ہے جس کی محبت، جس کی نصرت اور جس کی معیت پائیدار اور باقی ہے، سب ناتمام ہیں، بس وہی اول

وآخر سہارا ہے، تو اسی سے جڑے رہیں، اسی کی رضا کی فکر کریں، اسی سے دعا کریں، میں نے دعائے حزب البحر پڑھنے کو کہا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کو شروع نہیں کیا ہے، ورنہ بہت سی بلاؤں سے نجات رہتی۔ باستحضار معنی دن اور رات میں کئی بار پڑھو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۹؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۲ھ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

عزیزم! **عافاکم اللہ من جمیع البلایا والآفات**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط سے طبیعت بہت خوش ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کیفیات میں اور اضافہ فرمائے، اور انھیں دوام بخشے، حال کو مقام بنادے۔ آمین

جو معمولات ہیں انھیں جاری رکھو، تہجد کی نماز کا اہتمام بہت کرو، اور اگر کبھی ناغہ ہوجائے، تو زوال سے پہلے اس کی قضا کرلو۔

حاسدوں اور دشمنوں کے لئے کوئی وظیفہ نہ پڑھو اور نہ کوئی عمل از قبیل عملیات کرو، یہ اللہ تعالیٰ کا انتظامِ تربیت ہے، تجربہ اور تربیت کی بھٹی میں پکا کر اللہ تعالیٰ جھاگ کو اور میل کچیل کو دور فرما کر خالص اور نکھرا ہوا سونا باقی رکھتے ہیں، اس جگہ رضا بالقضا اور تفویض الی اللہ کو دہراتے رہو، یاد کرتے رہو، مشق کرتے رہو، اللہ کو منظور نہیں ہے کہ کسی نبی کو دشمنوں اور حاسدوں سے خالی رکھیں، **كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا الخ** پر غور کرو۔ دل کے اندر اطمینان رکھو، اور اطمینان توکل میں ہے، باہر کی تشویشات دل کے اندر نہ آنے دو، اگر آنے لگیں تو اللہ سے رجوع کرو، ان کی پناہ مانگو،

بہت پریشانی محسوس ہوتو دعائے حزب البحر مکرر سہ کرر پڑھ لیا کرو، بس!

تہجد کی نماز کے بعد استغفار پڑھا کرو، کم از کم دس منٹ، اور اس میں استغفار کے مختلف صیغے باستحضارِ قلب پڑھو! اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰـہَ إِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ کُلَّهَا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّی عَبْدٌ مُذْنِبٌ وَاَنْتَ رَبٌّ غَفُوْر۔ اور سیّد الاستغفار (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ إِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَایَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَاصَنَعْتُ) اور نماز کے آخر میں جو دعا رسول اللہ ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تلقین فرمائی تھی، یعنی اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ الخ، ان سارے صیغوں کو حضورِ قلب کے ساتھ بارگاہِ حق میں پیش کیا کرو، ہر غم کا مداوا ہے۔

اللہ تعالیٰ حامی وناصر ہیں، انھیں راضی رکھنے کی دُھن ہو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں، ایمان پر، صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرمائیں، ہر طرح کے شرور وفتن سے امن وعافیت عطا فرمائیں، تادمِ مرگ اسلام پر، اسلام کے تقاضوں پر عمل کراتے رہیں، اور وقت آخر ہو تو کلمۂ ایمان آخری بولی ہو۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، آمین یارب العالمین

اعجاز احمد اعظمی

۱۷/رجب ۱۴۲٦ھ

* * *

بنام مولانا قمرالحسن مہراج گنجی

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں مشکوٰۃ شریف تک تعلیم حاصل کی، دورۂ حدیث کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی۔ باصلاحیت نوجوان اور صالح دین ہیں، مدرسہ تعلیم الاسلام (جامع مسجد) اعظم گڈھ میں استاذ ہیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

یہ مکتوب موصوف کو ان کے اُس خط کے جواب میں لکھا گیا، جو انھوں نے دارالعلوم دیوبند جاتے ہوئے حضرت مولانا کو لکھا جس میں انھوں نے لکھا کہ ’’حضرت! یہاں سے جانا ہے، جگہ غیر مانوس ہے، اور لوگ اجنبی ہیں، اس لئے ہمیں کوئی گُر کی بات بتائیے جس پر عمل کرنے سے ہم ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں، اور ہماری ایک شان ہو‘‘۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

عزیزم!　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

شان کی ضرورت نہیں ہے، بڑے بننے کی ہوس سے خود کو پاک کرو، غلام کو شان سے کیا مطلب؟ **تدین**، **اخلاق** اور **لغویت سے اعراضِ کریمانہ**، یہ تین اوصاف ایسے ہیں، جن پر استقامت حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ دارین میں سرخروئی عطا فرمائیں گے۔

تدین کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے احکام شریعت کا پابند رہے، ظاہری احکام مثلاً نماز، تلاوت، درس کی پابندی، مدرسے کے قواعد کی رعایت، کسی کے مال میں خیانت نہ کرنا۔ باطنی احکام مثلاً دل میں کینہ کپٹ کا نہ ہونا، تکبر سے پاک ہونا، دل میں ہر ایک کے لئے جذبۂ ہمدردی رکھنا، یہ تمام تفصیلات **تدین** کے مختصر سے لفظ میں سمٹے ہوئے ہیں۔

اخلاق یہ ہے کہ کلام میں نرمی اور دل میں تواضع ہو، اگر کسی پر غصہ بھی آئے، تو اس کا اظہار زبان سے یا حرکات وسکنات سے نہ ہو، ادب واحترام دل میں راسخ ہو، چاہے کوئی

چھوٹا ہی ہو اس کا ادب دل سے کیا جائے۔ باادب آدمی ہر جگہ ہر ماحول میں عزت پاتا ہے، کسی کو کسی موقع پر ذلیل نہ کرو، اور نہ کسی کی تذلیل میں کسی کا ساتھ دو، بلکہ مناسب طریقے پر اس کا دفاع کرو، اور کسی مجبوری کی وجہ سے دفاع نہ کر سکو، تو خود اس جگہ سے دفع ہو جاؤ۔

لغویت سے اعراض تو واضح ہے، اجتماعی معاشرہ میں فضول کام، فضول کلام اور فضول تفریح والعاب کا بہت رواج ہو جاتا ہے، ان فضولیات کے ارتکاب کرنے والوں پر عام مجمع میں، یا جو لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں، ان کے سامنے تبصرہ بھی مت کرو اور نہ انھیں تحقیر کی نظر سے دیکھو، کیونکہ یہ بھی فضول ہے، اعراضِ کریمانہ یہی ہے، خود لغویتوں میں مشغول نہ ہو، لیکن جو لوگ لغویت میں لگے ہوئے ہیں ان سے نہ الجھو، اور نہ ان کی تحقیر کرو، اپنے کام سے کام رکھو، اسی طرح فضول ٹہلنے گھومنے سے بچو، طلبہ آئے دن دلی، سہارن پور وغیرہ جاتے رہتے ہیں، محض لغو اور بیکار! دیوبند میں رہ کر اگر تم دیوبند کا بازار اور گلیاں تک نہ دیکھ سکو، تو بہتر ہے، اپنی ضروریات سمیٹ کر اتنی محدود کر دو کہ بازار میں داخل ہونے کی نوبت ہی نہ آئے، طبیعت کی ہوس کا اعتبار نہ کرو کہ عظیم ترین اور مشکل ترین لغویت یہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ **تدین**، **اخلاق** اور **لغویت سے اعراضِ کریمانہ**، ان تین باتوں کو ہر دم مستحضر رکھو، اور کوئی بھی کام ہو غور سے دیکھو کہ وہ ان تین امور میں سے کس کے تحت آتا ہے، انشاء اللہ خود بخود تینوں باتیں روشن ہوتی چلی جائیں گی۔

آخری بات یہ ہے کہ اپنے احوال کی اطلاع خط کے ذریعے مہینہ میں کم از کم ایک بار اور بہتر یہ ہے کہ دو بار دیا کرو، میں دعا کرتا ہوں کہ ان تینوں امور پر استقامت رہے۔ میں تہہ دل سے تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶؍ رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ

بنام مولانا سلمان احمد اعظمی

حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب جونپوری نوراللہ مرقدہٗ کی صاحبزادی مرحومہ کے نواسے ہیں۔ مدرسہ ریاض العلوم گورینی میں زیرتعلیم تھے، کسی مصلحت سے میرے پاس تعلیم حاصل کرنے آگئے، پھر محبت اور تعلق میں اس درجہ اضافہ اور رسوخ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد بجائے کسی اور شعبے میں داخلہ لینے کے والدین سے اجازت لے کر سال بھر میرے ساتھ سفر اور حضر میں رہے، اور خدمت کا حق ادا کرتے رہے۔ بہت ذی استعداد، صالح اور سلیقہ مند فاضل نوجوان ہیں۔ اب مدرسہ شیخ الھندانجان شہید، ضلع اعظم گڈھ میں درس وافادہ میں سرگرم ہیں، حق تعالیٰ علمی اور روحانی ترقیات سے نوازیں۔ آمین

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے پچھلے خط میں چند باتیں لکھی تھیں، انھیں حافظہ کی مدد سے پھر لکھتا ہوں۔

(۱) میں چھوٹا آدمی ہوں۔ اسے تواضع پر محمول نہ کرنا، میں واقعی بہت چھوٹا ہوں، اور تمہاری نسبت بہت بڑی ہے، تو کیا تم نسبت کی اس بڑائی کو رکھنے کے باوجود ایک بہت چھوٹے آدمی کے سامنے اس سے چھوٹا بننے کا حوصلہ رکھتے ہو، اور یہ معلوم ہے کہ چھوٹا ہوئے بغیر کچھ حاصل کرنا مشکل ہے۔

(۲) میری چھوٹائی ہی کا اثر ہے کہ میرے پاس ان لوگوں کا مجمع رہتا ہے جن کو عرف عام میں چھوٹا سمجھا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ میرے پاس اہل بہار کافی تعداد میں رہتے ہیں اور میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں، اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھے، تو کیا اس خیال ونظریہ اور عمل میں تم میرا ساتھ خوش دلی سے دے سکتے ہو، اگر دے سکتے ہو تو بہت خوب! اور اگر انقباض کے ساتھ رہوگے تو ضرر ہے۔

(۳) تم یہاں صرف سلمان بن سفیان رہوگے، اپنے آپ کو نمایاں اور ممتاز کرنے کا ارادہ کبھی نہ کرنا، تمہارا علم، تمہارا عمل تمہیں نمایاں کردے وہ اور بات ہے، مگر تم کبھی اس کا ارادہ نہ کرنا۔ تمہاری نسبت تمہارے منہ سے نہ جانی جائے۔ تم ایک عام طالب علم بن کر رہو، تمہاری نسبت نہیں، تمہاری محنت اور تمہارا اخلاق تمہیں خاص بنائے۔

(۴) نگاہ ہمیشہ پست رکھو، بے ضرورت عادۃً اِدھر اُدھر نہ دیکھو، بالخصوص کسی شخص کو بغور نہ دیکھو، ضرورت کے بقدر دیکھو اور پھر نگاہ نیچی کرلو، تاکہ قلب میں طہارت اور پاکیزگی رہے۔ اس کا نہایت اہتمام کرو، اللہ تعالیٰ تم کو علم، عمل، تقویٰ اور سلامت

قلب سے نوازیں۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی
۱۰؍ شوال ۱۴۲۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بعافیت ہوں۔ مجھے جب بھی تمہارا خط ملا ہے، اہتمام سے اس کا جواب تحریر کیا ہے، غالباً ششماہی کے موقع پر ایک خط ملا تھا، اس کا جواب میں نے ساتھ ساتھ لکھا تھا۔

رات میں پڑھنے کی مشغولیت رہتی ہے، تو دیر ہونے میں مضائقہ نہیں، لیکن کسی شخص کو اپنے اوپر مسلط کردو کہ وہ تمہیں جگا کر چھوڑے، اور جونہی تمہاری آنکھ کھلے بستر چھوڑ دو، اور اگر فضول گپ شپ میں دیر ہوتی ہے تو اسے یکلخت ترک کرو، میں نے سب سے زیادہ نحوست کی چیز یہی فضول کلامی پائی ہے۔ اس سے دل بالکل بجھ کر رہ جاتا ہے، توفیق سلب ہوجاتی۔ یہ چیز بعض آثار کے اعتبار سے گناہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی ہے، یہاں تک پہونچا ہوں تو میرا پورا وجود ہل گیا۔ اس فضول کلام کی نحوست سے اپنے ابتدائی دور میں مَیں برسوں تہجد کی نماز سے محروم ہوگیا تھا، وہ وقت یاد آگیا تو تھرتھرا گیا ہوں۔ کیسی سخت محرومی تھی، توفیق ملتی نہ تھی، اور شرمندگی وہ تھی کہ کسی سے کہہ بھی نہیں پاتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس نحوست سے خلاصی عطا فرمائی۔ **فالحمد للہ**

ذرا اللہ کی محبت کو دل میں جگہ پکڑنے کا موقع تو ملے، پھر آنکھ سے ان شاء اللہ آنسو کا قطرہ نہیں دریا بہے گا۔ محبت ہی آنسوؤں کا سرچشمہ ہے، لوگوں نے دل کو فضول

محبتوں کا گہوارہ بنا رکھا ہے، اس لئے خدا کی محبت کے احساس سے محرومی ہے، اور محبتیں ہٹیں تو اس محبت کا جلوہ ظاہر ہو، پھر آنسوؤں کا آبِ حیات ابلے گا، اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو اپنی محبت کا آشیانہ بنائیں اور مظاہر ومجاز کی محبت سے نجات عطا فرمائیں، یہ کمبخت خدا کی جگہ میں گھس جاتے ہیں، تو قلب کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما کر **فاولئک یبدل سیئاتھم حسنات** کا مصداق بنائیں، آمین یارب العالمین۔ میں دل وجان سے دعا کرتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
الحمد للہ بخیر ہوں۔

یہ فاسد خیالات تمہارے حق میں شیطانی وسوسہ اندازی ہے، جس کی طرف تمہیں التفات نہ ہونا چاہئے، اور نہ اس کے مقتضی پر عمل ہونا چاہئے، شیطان رہزنی کرتا ہے تاکہ انسان کو کوئی فائدہ نہ پہونچ جائے۔

خدا تعالیٰ کی عظیم الشان طاقت کا استحضار ہر دم کہاں رہتا ہے؟ شیطان بھی ہے، نفس بھی ہے، جسم کی ضروریات بھی ہیں، ماحول ومعاشرہ بھی ہے، ان سب کا مجموعی اثر غفلت ہے، بس یہیں سے انسان کا رخ بدلتا ہے۔ ان سب چیزوں کا دباؤ دل پر سے ختم ہو اور حق تعالیٰ کی شانِ عالی کا استحضار ہو، تو گناہ سے پیچھا چھوٹے۔ اس کا طریقہ کثرت ذکر، اصحابِ نسبت کی صحبت اور خلوت مع اللہ ہے۔ ابھی تم کو ان امور

کا موقع نہیں ہے، کتابوں میں لگے رہو اور جو وقت ملے میرے پاس کبھی کبھی آ کر بیٹھا کرو۔ مجمع کی پروا مت کرو۔

جو چیز خلافِ نفس ہوتی ہے اور نفس اس سے گرانی محسوس کرتا ہے، جب نفس کو اس کی مرضی کے خلاف اس کا خوگر بنایا جاتا ہے، تو پھر وہ موافقت اور مطاوعت کرنے لگتا ہے، اس کے لئے مجاہدہ درکار ہوتا ہے، وقت بھی لگتا ہے مگر آدمی ہمت نہ ہارے، اس گرانی کو برداشت کرتا رہے، پھر وہ گرانی عادت بن جاتی ہے، پھر اس میں لذت ملنے لگتی ہے اور وہ لذت رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بہت تیزی سے انسانوں کو ترقی کی منزلوں پر پہونچاتی ہے۔ دیکھو فرشتوں کے لئے طاعات وعبادات میں کوئی مجاہدہ نہیں ہے، کیونکہ وہ نفس کی طاقت سے خالی ہیں، تو ان کا ایک مقام متعین ہے، اس سے انھیں عروج نہیں ہوتا، اس کے برخلاف انسان کے لئے سخت مجاہدے ہیں، کیونکہ ہر قدم پر نفس رکاوٹ ڈالتا ہے، آدمی زور لگاتا ہے، تو رکاوٹ ہٹتی ہے، لیکن وہ اسی زور لگانے میں بہت آگے نکلتا ہے، انسان تازندگی نفس کے دباؤ میں رہتا ہے، اسی لئے وہ ہمہ دم مجاہدے کی کشمکش میں ہوتا ہے اور ہر آن وہ آگے بڑھتا رہتا ہے، اسی لئے میں نے کہا تھا کہ ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کرو۔ اس میں بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ نے بڑی مصلحتیں رکھی ہیں، سلیقے سے آدمی چلتا رہے تو وقت وقت پر مصلحتیں کھلتی رہتی ہیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۶؍محرم ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تم نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے، انسان کی طبیعت میں یا اس کے معمولات میں انقلاب آتا ہے، تو بعض کاموں میں اسی طرح تعطل آجاتا ہے، بعض چیزوں سے طبیعت اکھڑ جاتی ہے، بعض حالات بظاہر ایسے بگڑ جاتے ہیں جنھیں بگڑنا نہیں چاہئے، اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد پھر مزاج کا جو رنگ بنتا ہے، اس میں پچھلی بعض چیزیں رخصت ہوجاتی ہیں، کسی کسی میں دوبارہ استقامت حاصل ہوجاتی ہے، یہ انسانی احوال کی ایک فطری رفتار ہے جس پر تم چل رہے ہو، مطالعہ کا ذوق نہیں رہ گیا ہے، مضائقہ نہیں، پھر ہوجائے گا۔ اللہ کو جب منظور ہوگا قلم ہاتھ میں دیدیں گے، درسیات میں محنت کرتے رہو، خارجی کوئی کتاب پڑھنی ہو تو مجھ سے پوچھ لیا کرو، بس یہ ہے کہ وقت ضائع نہ ہو۔

نماز، تکبیر اولیٰ اور صف اولیٰ کا اہتمام بہت مبارک مبارک، اللہ تعالیٰ اس پر دوام واستقامت نصیب فرمائیں۔ سو بات کی ایک بات ہے! والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بعافیت ہوں۔

انسان اور انسانی قلب یونہی خطرات واحوال کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ قلب کی نگاہ کا مرکزِ نظر ایک ہی ہونا چاہئے، اسے کبھی نہ بھولو، یہی جادۂ مستقیم ہے، دل محبت کا گہوارہ ہے، اس گوارہ میں اللہ ورسول کی محبت کی پرورش کرو، باقی سب ہیچ ہے۔ فانی چیزیں لائق اعتناء نہیں ہیں۔

دل میں یقین کو جماؤ، توہمات وتفکرات کا خیمہ اکھڑ جائے گا۔ مستقبل خدا کے حوالے کرو، **خیر ما وقر فی القلوب الیقین**۔ اللہ بس باقی ہوس

عزیزم! نگاہ اور کان کی حفاظت کرو، دل کے حوض میں یہ دو نالیاں ایسی گرتی ہیں، جن سے خس وخاشاک اور گندگی کے پہونچنے کا امکان ہوتا ہے، اور اس کے لئے نامناسب صحبت سے دور رہنا ضروری ہے۔ اپنے اوپر جبر کرو، خود کو روکو، پھر اللہ کی مدد دیکھو، اولاً مجاہدہ شرط ہے، پھر مشاہدہ لازمی نتیجہ ہے، مجاہدوں سے نہ گھبراؤ۔

پڑھنا لکھنا تو لازمۂ زندگی ہے، غذائے روح ہے، شفائے قلب ہے، بھلا اس سے اچاٹ ہونا کیا معنیٰ؟ میں دعا کرتا ہوں، تم سرگرم کار رہو۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲ محرم ۱۴۲۵ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیر ہوں اور تم لوگوں کے لئے دعا گو ہوں۔

کوتاہیوں اور سستیوں کا علاج یہ ہے کہ ہمت سے کام لو، مخالف ماحول سے تمہیں لڑنا ہے، جم کر لڑو، غافلوں کی بھیڑ ہے اس سے تاثر فطری ہے، تم اپنے ارادے سے اس ہجوم کے خلاف جمو۔

اپنے آپ کو دینی ضرر سے بچانا ضروری ہے، اس کے لئے اگر عام ماحول سے اور اس ماحول کے مشاغل سے الگ رہنا پڑے، اور اس الگ رہنے کے نتیجے میں طعن وتشنیع کی ناگواریاں سہنی پڑیں، خواہ اپنی ذات کے بارے میں یا اپنے بڑوں کے بارے میں، سب سہہ لینا چاہئے، اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ألا أخبركم بخير الناس ؟ رجل ممسک بعنان فرسه فی سبیل الله ، ألا أخبرکم بالذی یتلوه رجل معتزل فی غنیمة له یودی حق الله فیها (مشکوة شریف: باب افضل الصدقة ،الفصل الثانی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمبر ایک پر بہتر آدمی وہ ہے جو ہر وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار ہو، اور اس کی تیاری میں لگا ہو۔ دوسری نمبر پر وہ جو اپنی چند بکریوں کو لے کر الگ تھلگ ہو، اور ان میں اللہ کا حق ادا کرتا ہو۔

اجتماعی ماحول کا فتنہ بہت سخت ہے، نمبر چاہے کم ہو یا زیادہ، دل ودماغ اور مزاج وطبیعت کا رجحان بگڑ جاتا ہے، نہ نمبروں کی فکر کرو نہ گستاخیوں کی! میری حیثیت ہی کیا ہے کہ میرے حق میں گستاخی کا تحقق ہو، وہ کام کرو جس سے علم میں رسوخ ہو، مجھے خوب تجربہ ہے کہ طلبہ کی یہ انجمنیں جنھیں تم شاید لائبریری کہہ رہے ہو بگاڑ کا گھر ہیں، اس لئے میں اپنے حکم پر قائم ہوں، تم حکم عدولی کروگے اور اس کی اچھی سی تاویل کروگے تب بھی حکم یہی رہے گا۔ یہ سب ہوس پرستیاں ہیں، جن پر نفس بھی اکساتا ہے اور شیاطین الانس والجن بھی ترغیب دیتے ہیں، اور رہا مسئلہ نمبروں کا تو یہ کچھ نہیں ہے، نہ امتحان کا اعتبار ہے نہ ان کے نمبروں کا، اعتبار اس کا ہے کہ علم کا استحضار رہے، دینداری میں رسوخ رہے، محنت پوری کرو اور نمبروں سے آزاد ہوکر کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام نمبروں کی بنیاد پر نہیں لیتے، تدین اور تقوی کی بنیاد پر لیتے ہیں، آج کل کے امتحانات میں جہاں اللہ جانے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں، نمبر لانے کا کچھ حاصل نہیں ہے، اس کی فکر چھوڑو، ہاں محنت میں کوتاہی نہ کرو، یہ مسائل جاہ کے ہیں، جن سے اجتناب کرنا دین کے لوازم میں سے ہے۔

چند دن اس بھیڑ بھاڑ میں رہنا ہے، پھر سب اپنا اپنا کیا دھرا لے کر اپنے

گھروں کو لوٹ جائیں گے اور اس کی کوئی پوچھ نہ ہوگی کہ آپ انجمن میں کیا تھے، وہاں تو آپ کی دینداری، تقویٰ، حس اخلاق، حسن معاملات، پابندئ عہد وفا دیکھی جائے گی۔

مجھے تم پر اعتبار ہے، میں تمہیں کھیل تماشوں میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، چاہتا ہوں کہ خدمت دین وایمان کے لئے اللہ کے یہاں تمہارا انتخاب ہو جائے، سنتے ہو؟ مجھے بحمد اللہ مدح وذم سے کوئی مطلب نہیں ہے، کان میں آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ''**قلت لایعنینی**'' کہہ کر گذر جاتا ہوں، یہی طریقہ آزماؤ۔

دعا کرتا ہوں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۵؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بعافیت ہوں، مگر زندگی بے ترتیبی کے ساتھ مشغول ہے، ترتیب پر قدرت نہیں ہوتی، بڑے لوگ اٹھ گئے، تو چھوٹوں پر ہجوم ہونے لگا، بس **اتخذوا روؤساً جهالا** کا منظر ہے، اللہ تعالیٰ رحم وکرم فرمائیں۔

کسی چیز کی تعمیر کے لئے اس میں لگے رہنا شرط ہے، جتنا صاحب جلالین نے سمجھا دیا ہے اس کے آگے اپنا حوصلہ ہے، تفسیر کی طولانی کتابیں تمہارے مقصد کے لئے بہت زیادہ مفید نہیں ہیں، مطالعہ کے لئے ساری زندگی پڑی ہے، ابھی تو استعداد درست ہو رہی ہے۔

میں جب پڑھ کر فارغ ہوا تھا، تو میں نے اپنے والد ماجد مدظلہٗ سے عرض کیا

تھا کہ آپ مجھے اللہ کے لئے، اللہ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کردیں، انھوں نے ایسا کردیا اور پھر پلٹ کر کبھی دنیا اور مالِ دنیا کے لئے میری طرف نہیں دیکھا، اور میں اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا، گونامرادی ہی ہاتھ لگی مگر یکسوئی میں کوئی خلل نہیں آیا، اور اس یکسوئی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا کرم محسوس ہوتا ہے۔ تم غور کرلو کہ یہ بات تم کو حاصل ہوسکے گی؟ اور اگر حاصل ہوگئی تو ملامتوں اور طعنوں کے جو غول چلیں گے ان کو برداشت کرلوگے؟

جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا اس کے لئے موقع نہیں ملا، اور جب ملا تو یاد نہیں رہا، عجب اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے، مشغولیات بہت ہیں مگر بھول جاتا ہوں، تو خود بخود کم ہوجاتی ہیں۔ تمہارے خط کے بعد ارادہ کررہا ہوں کہ لکھوں، تمہارا یہ خط کل رات میں ملا ہے، آج صبح پہلا کام کررہا ہوں کہ جواب لکھ رہا ہوں، تھوڑی دیر میں مغل سرائے جانا ہے۔ سامنے بخاری شریف پڑھنے والے بیٹھے ہیں، ایک آدمی پانی پر دم کرانے کے لئے بیٹھا ہوا ہے، حاجی صاحب ایک صاحب کے ساتھ مشغول بتکلم ہیں، منشی جی چائے سے پاپے کھارہے ہیں اور میں قلم چلارہا ہوں۔ سوچو اس ماحول میں علم کا کباڑا ہوگا یا نہیں؟

موقع ملا، اور یاد رہا تو خط لکھوں گا۔ آج رات میں لوٹوں گا، امتحان آج سے شروع ہے۔ تین دن مدرسے میں رہنے کا ارادہ ہے، دیکھو پورا ہوتا ہے یا نہیں، جمعہ کو گورکھپور جانا ہے، پھر سوموار کو اپنی پرانی جگہ دیوگھر ڈُمکا جانا ہے۔ اسی بے ترتیبی میں زندگی ہچکولے کھارہی ہے، بس ایک چیز ہے جو مسلسل برقرار ہے، وہ ہے اللہ کے حضور عجز و نیاز، بندگی وانابت، اسی میں دل مطمئن رہتا ہے، نہ کتاب، نہ مطالعہ، نہ تحریر نہ تصنیف، موقع ملتا ہے تو زبان سے نام لیتا ہوں ورنہ دل تو لگا ہی رہتا ہے، یہی

لگا رہے تو سب ٹھیک ہے، مگر یہ کمبخت اونگھنے لگتا ہے، اور جب اونگھتا ہے تو اوٹ پٹانگ خواب بھی دیکھتا ہے، لیکن بہر حال ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

دیکھو طبیعت کی رَو چلی تو کیا اوٹ پٹانگ لکھنے گا۔ معاف کرو۔

فقط والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا محمد عابد صاحب

یہ خطوط حضرت مولانا مدظلہ کے لائق وہونہار صاحبزادے مولانا محمد عابد صاحب کو اس وقت لکھے گئے جب وہ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔ موصوف کا سال ولادت ۱۹۸۱ء ہے، پرائمری، حفظ اور ابتدائی عربی سے لے کر جلالین شریف تک تعلیم مدرسہ شیخ الاسلام میں حاصل کی۔ ۱۴۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند گئے، وہاں مشکوٰۃ شریف اورس کے بعد دورۂ حدیث شریف پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ دو تین سال مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس وقت مدرسہ شیخ الہند انجان شہید ضلع اعظم گڈھ میں مدرس ہیں۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

فرزند عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی، انتظار تھا، اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو کامیاب کرے۔ یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو، اپنا کوئی امتیاز بنانے کا رادہ مت کرنا۔ گمنام ہوکر رہو، کوشش کرو کہ میرے واسطے سے تعارف نہ ہو، شہرت مصیبت ہے۔ کسی طرح کے اجتماعی کام میں شریک نہ ہونا، اپنی کوئی مجلس نہ بنانا۔ تمہاری مجلس صرف کتابیں ہیں، انھیں کی صحبت میں رہنا، جو مقدر ہوگا تمہاری محنت وکوشش سے علم

حاصل ہو جائے گا۔ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے دشمنی، ایک مسلمان جیسا تعلق سب سے رہے۔ جس استاذ سے مناسبت معلوم ہو کبھی کبھی ان کے یہاں چلے جانا۔ اسباق کی پابندی بہرصورت ہوتی رہنی چاہئے، اس کی برکت بہت ہے۔

یہاں بھی سب خیریت ہے، تمہاری اماں کی طبیعت کچھ خراب ہو جایا کرتی ہے، دعا کرو کہ صحت مند رہے۔

تم لوگوں کی کمی یہاں بھی محسوس ہوتی ہے، بالخصوص مجھے تو کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ بہرکیف ایک بڑے مقصد کیلئے نکلے ہو، اس لئے تسلی رہتی ہے۔

حاجی (عبدالاحد) صاحب یہیں ہیں، تم لوگوں کے لئے بہت دعا کرتے ہیں، سلام کہہ رہے ہیں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۲/ ذوقعدہ ۱۴۲۱ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط ملا۔ تم لوگوں کے سفر کے سلسلے میں میرے دل پر بھی دباؤ تھا، اور سفر والے دن، رات ہی سے میں مسلسل تم لوگوں کی طرف متوجہ تھا، اور دعائیں کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور تم لوگوں کا سفر آسان ہوا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک

ابھی نئی جگہ ہے، نیا ماحول ہے، اس لئے ذہنی انتشار معلوم ہوتا ہے، بس اتنا ہے کہ تعلقات نہ بڑھاؤ۔ خلوت میں رہنے کی کوشش کرو اور کتابوں میں زیادہ لگے رہو، جو خالی وقت ہو اس میں کتب خانہ چلے جایا کرو۔ پڑھنے کے ساتھ حاصل مطالعہ

لکھنے کا آغاز کرو، جو کچھ درسی کتابوں میں پڑھتے ہو اس کا خلاصہ جو ضروری ہو کاپی پر نوٹ کر لیا کرو۔ اور غیر درسی کتابوں میں بھی یہی عمل رکھو۔ لکھنے میں یکسوئی زیادہ ہوتی ہے۔ بس اپنے کو علم میں مشغول رکھو۔

یہاں بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ مفتی محمد راشد صاحب سے سلام عرض کرو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یکم محرم ۱۴۲۲ھ

☆☆☆☆☆

فرزندِ عزیز! سلمکم اللہ تعالیٰ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط دو تین روز قبل ملا۔ نمبر اچھا آنے پر دلی خوشی ہوئی، اللہ کا شکر ادا کیا، خدا کرے آگے اور اچھا نمبر آئے۔ محنت وکوشش کرو، عامر سلّمہٗ کے لئے بھی دلی دعا نکلی، خداوند تعالیٰ تم دونوں کو اچھا طالب علم بنائے۔

تمہاری صحت کے لئے دعا کرتا ہوں، شاید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھل جاتی ہو، یہ عارضی احوال ہیں فکر نہ کرو۔ عصر کے بعد کچھ ٹہل لیا کرو، روزانہ ہلکا پھلکا غسل کر لیا کرو۔ باقی دعا میں گریہ وزاری کرو، صحت ومرض کے مالک اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ وہی جو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے کام لیتے ہیں، اور جس کام سے چاہتے ہیں ہٹا دیتے ہیں۔ تمہارے باپ نے صحت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا، جو غذا میسر آگئی کھالی، اور جو دوا آسانی سے مل گئی استعمال کر لی، اور بحمد اللہ کام کے لائق صحت ہمیشہ رہی، بدن کی فکر کیا کرنی اسے تو مٹی میں ملنا ہے، بس اس کی فکر اتنی ہونی چاہئے کہ روح برباد نہ

ہو۔ گھر پر بحمد اللہ سب خیریت ہے۔

عامر سلّمہٗ کو بھی یہی مضمون ہے، میں تم لوگوں کے لئے دل سے دعا کرتا رہتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

☆☆☆☆☆

فرزندِ عزیز! سلمکم اللہ تعالیٰ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارے خط میں ۲۷؍ ربیع الاول کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ یاد نہیں مجھے کب ملا، غالباً سفر سے واپسی کے بعد ملا ہے۔

تعلیم میں اپنی صحت وقوت کے لحاظ سے محنت کرتے رہو، اس میں کوتاہی نہ ہو۔ مجھے نمبروں سے دلچسپی نہیں، مجھے علم اور اخلاق سے دلچسپی ہے، اس میں کھرے اترو۔ نمازوں میں کوتاہی بالکل نہ کرو، یہی تو مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ میری صحت الحمد للہ اچھی ہے۔ عادل نے پڑھائی سے عدول کیا، میرے اور تمہاری اماں کے حج کے آثار نظر آرہے ہیں، عادل بھی ساتھ ہو جاتا تو اپنی اماں کی خدمت کرتا، اس کے لئے خاص طور سے دعا کرو۔ میں تم لوگوں کیلئے دعا کرتا رہتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۶؍ ربیع الآخر ۱۴۲۳ھ

☆☆☆☆☆

فرزندِ عزیز! سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خط جس روز شام کو ملا، اسی دن فون پر بات بھی ہوئی، خط سے جو خوشی ہوئی تھی فون کی گفتگو سے وہ ختم ہوگئی۔

فرزندِ عزیز! یہ راہ مجاہدے کی راہ ہے، اس میں ہمت مردانہ چاہئے، اگر طبیعت سے مغلوب ہوگئے تو کوئی چیز حاصل نہ ہو سکے گی۔ طبیعت کے غلام نہ بنو، طبیعت پر غالب رہو، طبیعت کا گھبرانا، نہ لگنا عارضی چیز ہے، اس سے صرفِ نظر کرو، اس کی طرف توجہ نہ دو، کام میں لگے رہو، تو یہ خود بخود پلٹ جائے گی۔ تعلیم کے ایک سبق کا بھی نقصان ناقابل تلافی ہے، اساتذہ کی نگاہ سے طالب علم کو گرا دیتا ہے۔ ماں باپ گھر دُوار سب مل جائیں گے، مگر جو اسباق استاذ کے پاس سے چھوٹ گئے وہ کب ملیں گے، اور اپنی والدہ سے اس طرح کی بات فون پر مت کرو، عورتیں کمزور طبیعت کی ہوتی ہیں، ان پر بہت زیادہ اثر ہوجاتا ہے، اب تمہارے اسی فون کے بعد تمہاری ماں مستقل اضطراب کی شکار ہے۔ بس وہ چاہتی ہے کہ بھاگ کر آ ہی جاؤ، مگر تم ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدمت ماں کی کرو، اطاعت باپ کی کرو۔ آج پھر تم سے بات ہوئی، اللہ جانے تم نے کیا کہا ہوگا، مگر ابھی اسے پورا سکون نہیں ہوا ہے، فون کرکے، خط لکھ کر مطمئن کرو۔

میں الحمد اللہ خیریت سے ہوں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

☆☆☆☆☆

مولانا نعیم الظفر و مولانا افتخار سالک (مالیگاؤں)

یہ دونوں نوجوان عالم مالیگاؤں کے رہنے والے ہیں۔ مولانا نعیم الظفر صاحب مشہور بزرگ عالم مولانا محمد حنیف ملی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے ہیں، اور مولوی افتخار سالک مولانا مرحوم کے شاگرد ہیں، مالیگاؤں میں ان دونوں سے بہت قربت ہوئی تھی۔

عزیزانِ گرامی قدر مولوی نعیم الظفر و مولوی افتخار سالک سلمہما!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب (شیخ الحدیث مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں) کے نام ایک خط لکھ چکا ہوں، اس میں تم دونوں عزیزوں کو سلام لکھا ہے، لیکن تم دونوں کی محبت وخدمت اور تعلق خاطر کا تقاضا ہے کہ تمہیں الگ سے خط لکھوں، مجھے صرف اتنے سے تسکین نہیں ہوئی کہ واسطوں سے سلام پہونچادوں، اور بس۔

مولوی نعیم الظفر تو میرے عزیز ہیں، قریب ہیں، پہلے سے انھیں جانتا ہوں، محبت رکھتا ہوں، قدر کرتا ہوں، میرے وطن جاچکے ہیں، ان سے جو محبت تھی، ملاقات سے اس میں تازگی آئی، اضافہ ہوا، ان کے انگریزی اسکول میں جانے سے غصہ آیا، سوچتا رہتا ہوں کہ اس سے نکل کر خالص دینی اور علمی حلقوں میں ترقی کریں، ہماری اچھی صلاحیتیں کیوں ہمارے ہاتھ سے نکل کر دنیاوی چہ بچوں میں گرجاتی ہیں، مالیگاؤں والوں نے دین اور دنیا کا آمیختہ تیار کرنا چاہا ہے، اس کا اثر وہاں علماء پر، طلباء پر، مدارس پر، دیکھ آیا ہوں۔ انگریزی تہذیب کی گردن میں اسلامی تہذیب کا کرتا، یا

اسلامی تہذیب کے پاؤں میں انگریزی تہذیب کا پتلون پہنانے کی کوششیں میں نے وہاں دیکھی ہیں، وہی رنگ ظاہر وہی رنگ باطن، دونوں شیر وشکر تو ہو نہیں سکتے، دونوں اپنا اپنا امتیاز سنبھالے، اپنا اپنا تشخص باقی رکھنے کے لئے کوشاں ہیں، عجیب ملغوبہ تیار کیا گیا ہے، اس کی تفصیل میں جاؤں تو بات پھیل جائے گی۔

میں ایک ٹھیٹھ ملا ہوں، ظاہر بھی میرا ملا ہے، باطن بھی میرا ملا ہے، ایک رنگ رکھتا ہوں، دوسرا رنگ میں نے قبول کرنا سیکھا ہی نہیں، اس لئے اجنبی اجنبی سا لگتا ہوں، کیونکہ عام طور پر دورنگ کا ماحول بن گیا ہے، مگر مجھے یہ **مخلصاً له ديني** (۱) کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اس لئے دورنگ کا آمیزہ دیکھ کر مجھے وحشت سی ہوتی ہے، تمہارے یہاں میں کچھ نہ کہہ سکا، کیونکہ دوروز کا مہمان تھا، ہاں رات کے جلسے میں اشارات کئے تھے، خیر میں یہ سب کیا کہنے لگا، مجھے تو تم لوگوں کی محبت وخدمت کا شکریہ ادا کرنا تھا، مولوی افتخار سالک سے نئی ملاقات تھی، نئی محبت تھی، مگر منماڑ کی سات گھنٹے کی متواتر رفاقت نے اس میں پختگی پیدا کردی، اب میرے نزدیک نعیم الظفر اور افتخار سالک یہ دونوں شعر محبت کے دو مصرعے ہیں، دونوں میں کس کے حسن وخوبی کی داد دوں، سبحان اللہ وماشاء اللہ، دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، اللہ تعالیٰ تم دونوں کو خوش رکھیں، اور اپنا اور اپنے دین کا مخلص بنا کر رکھیں۔ (**علیٰ رغم أنفسكم**) کچھ سمجھے؟

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

(۱) **قل إنى أمرت أن أعبد الله مخلصاً له ديني۔**

(آپ کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اسی کیلئے اپنے دین کو خالص کرکے)

☆☆☆☆☆

اس خط کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ کس کے نام لکھا گیا۔ (مرتب)

عزیزم! عافاکم اللہ عن سائر الشرور والفتن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرصہ کے بعد تمہارا محبت نامہ موصول ہوا، خوشی ہوئی کہ دارالافتاء میں داخل ہو، آج کل کے علماء کے لئے اس شعبے کی مشق وتمرین ضروری ہے، اس کے بغیر مسائل کا ذوق پیدا ہونا تو درکنار، مولوی صحیح مسئلہ بھی نہیں بتا پاتا، اس لئے اس شعبہ میں جتنی محنت کر سکتے ہو، کرو، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ بیس سال کے بعد صحیح مسئلہ بتانے والے لوگ نہیں ملیں گے، یہ بات آج بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ پرانے بعض علماء اور مفتیانِ کرام بھرم باقی رکھے ہوئے ہیں، ورنہ ہم جیسے کاہل اور آرام پسند لوگوں نے تو لٹیا ہی ڈبو رکھی ہے، فتاویٰ کی کتابوں بالخصوص شامی، بدائع الصنائع اور بحرالرائق کا بالاستیعاب مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ ذوق پیدا ہو جائے، صرف اتنا نہیں کہ کوئی مسئلہ آ گیا تو اس کے متعلقات دیکھ لئے اور بس۔ اس سے ناقص ونا تمام علم حاصل ہوگا، جو بعض اوقات کیا بسا اوقات مضر ثابت ہوتا ہے۔

تم نے استقلال کے فقدان کے سلسلے میں دریافت کیا ہے، اس سلسلے میں یاد رکھو کہ یہ طبیعت کی عدم پختگی سے ناشی ہے، استقلال ایک دم سے نہیں حاصل ہوتا، بعض طبائع فطرۃً اتنی پختہ ہوتی ہیں کہ انھیں یکسوئی، استقلال اور استقامت کے حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوتی، مگر ایسی طبائع آج کل کے طبعی حالات اور خارجی اثرات کی وجہ سے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، اب تو استقلال کو کسب سے حاصل کرنا چاہئے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام بھی شروع کیا جائے، شوق وہمت سے کسی قدر کم شروع کیا جائے اور پھر طبیعت پر جبر ڈال کر، خواہ کتنا ہی سستی اور کسلمندی

کی جانب مائل ہو اسے مجبور کر کے اس کام کے پورا کرنے پر لگایا جائے ، رفتہ رفتہ طبیعت اس کی خوگر ہو جائے گی ، لیکن یہ خوگری ہفتہ دو ہفتہ میں قائم نہ ہوگی ، اس کے لئے ایک مدت درکار ہے ، اہم تدبیر یہی ہے ، ابتداءً جب کسی کام کا شوق نو آموز طبائع میں پیدا ہوتا ہے تو اس کی دھن میں آدمی بہت آگے بڑھ جاتا ہے ، پھر جب طبیعت پلٹتی ہے تو یکا یک سرد ہو جاتا ہے ۔ لِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةٌ ، اسی لئے میں نے لکھا ہے کہ جس قدر شوق ہو ، اس سے کم کام سے شروع کیا جائے ، پھر رفتہ رفتہ اس کو ترقی دی جائے ۔

رہی یہ بات کی دین کی محبت کی راہ میں حوادث اور حالات کیوں روڑا بن جاتے ہیں ، تو میرے عزیز! یہ عین فطرت ہے ، دنیا موافق حالات سے عبارت نہیں ہے ، ناموافق حالات اس میں بکثرت ہیں ، اتنی بہتات سے ہیں کہ اگر نظر غور سے دیکھو تو ناموافق حالات کے ہجوم میں موافق حالات شاذ بلکہ معدوم محسوس ہوں گے ، کوئی موافق حال تمہیں ایسا نہ ملے گا جس کے دامن کا گوشہ کسی ناگوار تلخی کے ساتھ بندھا ہوا نہ ہو ، یہ دنیا عدم سے ابھر کر وجود میں آئی ہے اور پھر دوسرے سرے پر عدم کی ظلمات اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ، بھلا جس کی نمود عدم سے ہو اور دوبارہ عدم کی گود میں پہونچنے والی ہو ، اس کے وجود کی ناپائیداری محتاجِ بیان ہے؟ بس اعدام کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو وجودِ انسانی پر گذرتا رہتا ہے ، اسی سلسلۂ کارزار میں رہ کر انسان کو اپنی دائمی حیات کے لئے جدوجہد کرنی ہے ، یہی ابتلاء ہے ، اسی کا نام امتحان ہے ، یہ امتحان حق تعالیٰ نے انسان کے اوپر مقرر کیا ہے ، اب جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے وہ ان اعدام سے منہ موڑ کر وجود مطلق کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے ، یعنی اس نے سب سے صرفِ نظر کر لیا خواہ وہ موافق حالات ہوں یا ناموافق ، بس ایک خدا کی جانب دل

کی نگاہ جمالی، اس تدبیر سے وہ اعدام کے متواتر حملوں سے بچ گیا، ورنہ ساری دنیا اسی وجود وعدم کے جھولے میں ہچکولے کھا رہی ہے، اس کی تدبیر کثرتِ ذکر ہے، جس کی تمہیں ابھی فرصت نہیں ہے، تاہم اپنا کچھ وقت فارغ کر کے روزانہ خلوت میں یادِ الٰہی کرنی چاہئے۔

حاصل زندگی صرف وہی لمحہ ہے جو پروردگار کی یاد میں گذر جائے، جو وقت علم کی تحصیل میں صرف ہوتا ہے، وہ بھی بالواسطہ ذکر ہی میں گذرا، لیکن بالواسطہ ہونے کی وجہ سے اس میں دوسرے خرخشے بھی شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ چوبیس گھنٹہ میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ ایسا وقت بھی مقرر کیا جائے جو بلا واسطہ ذکرِ الٰہی اور یادِ محبوب میں صرف ہو۔ دنیا کی سب مشغولیات فانی ہیں، دنیا خود فنا کے گھاٹ اترنے والی ہے، پھر ہر وہ چیز جو اس سے نسبت رکھتی ہے وہ باقی کیونکر رہ سکتی ہے، اور ذاتِ خداوندی ازل وابد کو محیط ہے، اس پر فنا کا کوئی شعبہ طاری نہیں ہے، وہ وجودِ مطلق ہے، وہ حی وقیوم ہے، وہ قائم ودائم ہے، **لاتاخذہ سنۃ ولا نوم** ہے، پھر جس چیز کو اس کے ساتھ نسبت ہو جائے گی اس کے باقی ودائم رہنے میں کیا شک ہے؟ پس انسان اگر بقائے دوام چاہتا ہے تو اپنی ساری مشغولیت کی نسبت دنیا سے منقطع کر کے اسی ذاتِ حی وقیوم کے ساتھ جوڑ لے، پھر کوئی چیز اسے باقی رہنے سے روک نہیں سکتی، اس کی موت بھی زندگی کا نیا عنوان ثابت ہوگی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پس میرے عزیز! حالات موافق ہوں یا مخالف، ہوا تند وتیز ہو یا نرم، صحت وتندرستی ہو یا امراض واسقام، مصائب وآلام ہوں یا راحت وآرام، ہر حال میں دل کا

تعلق اسی ذات سے وابستہ رہنا چاہئے، یہ تمنا کہ حالات موافق ہو جائیں فضول ہے، خود کو حق تعالیٰ کی موافقت و متابعت پر آمادہ رکھنا چاہئے، ہمارا نفس ان کی مخالفت نہ کرے، پھر خواہ حالات کتنی ہی مخالفت کریں، پرواہ نہیں۔

عزیزم! یہ میرے منتشر خیالات ہیں، انھیں پڑھ لو، ممکن ہے کوئی کام کی بات نکل آئے، مجھے بس یہی سبق یاد ہے، یہی سبق اپنے لوگوں پڑھاتا ہوں، اسی پر خود رہنا چاہتا ہوں، اور دوستوں کو بھی اسی پر قائم دیکھنا چاہتا ہوں اور بس، دنیا، متاعِ دنیا اور مناصب دنیا ہیچ در ہیچ ہیں، قطعاً قابل اعتبار نہیں، خدا کی رضاء، جنت کا حصول، جہنم سے نجات یہی اصل ہے، اور اس کی کنجی متابعت شریعت وسنت ہے اور محبت وعشق الٰہی، اور کیا عرض کروں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۹ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

یہ مکتوب مدرسہ شیخ الاسلام کے ایک طالب علم کے نام لکھا گیا
جو اس وقت دار العلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔

عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ جانے تمہارا یہ خط کب کا میرے پاس رکھا ہوا ہے، تم نے بھی کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، ابھی اچانک میری نظر پڑی، تو سوچا تاخیر سے سہی جواب تو لکھ دوں۔ سنو! تمہاری طبیعت میں انفعال تو بہت ہے، مگر استقامت اور قرار نہیں ہے، اور محض انفعال مفید نہیں، جب تک انفعالی تاثر پر قرار نہ ہو، مثلاً غلطی پر ندامت تمہیں جلد ہوتی ہے مگر ندامت کے تقاضے پر یعنی اس غلطی کے ترک کرنے پر قوت اور استقامت کے

ساتھ عمل نہیں ہو پاتا، یہ کمزوری ایسی ہے کہ کسی حال میں طبیعت کو قرار نہیں حاصل ہوگا، کوشش کرو کہ جس بات کا ارادہ کرو اسے مضبوطی اور استقلال کے ساتھ عمل میں لاتے رہو، ورنہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھے تم سے جو الجھن رہی، اسی بے ہمتی اور کمزوری کے باعث رہی، جو بھی کام کرو استقلال کے ساتھ کرو، ہمت ہارے تب بھی استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دو، بس ہمت بہت ضروری ہے۔ اور سنو! لفاظی مت کرو، مجھے خط لکھنے میں ادب نہ جھاڑو، بڑوں سے ایسی لفاظی بے ادبی ہے، اور اس میں غلطیاں بھی بہت ہوتی ہیں، اس لئے عبارت سیدھی سادی لکھو، میں نے پچھلی غلطیاں جو مجھ سے متعلق رہی ہیں سب دل سے معاف کر دی ہیں، ان کی فکر نہ کرو، اور اللہ کے حضور سچی توبہ کرو، اور جان بوجھ کر ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو، اگر غلطی سے ہو جائیں، تو توبہ کرنے میں تاخیر مت کرو، اور اپنی طبیعت کا اتنا تفصیلی جائزہ مت لو۔ اجمالاً اللہ کے سامنے توبہ کر لو اور اپنے کام میں لگو، اس خط کے ملنے کے بعد پھر مجھے خط لکھو اور لفاظی سے برکنار اپنا حال لکھو۔ دعا کرتا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۹؍ رجب ۱۴۲۶ھ

☆☆☆☆☆

ایک طالب علم نے مجھ سے سوال کیا کہ وہ کون سے طریقے ہو سکتے ہیں جن کو اختیار کرنے کے بعد ہمارے اندر بھی حصول علم کا جوش و جذبہ اور عزم و ولولہ پیدا ہو جائے جو ہمارے اسلاف عظام کا طرۂ امتیاز تھا؟ یہ سوال پڑھ کر میں سخت متحیر ہوا کہ آخر اس کا کیا جواب دوں؟ اس لئے کہ جن ریاضات و مجاہدات اور یکسوئی و انہماک کی ضرورت ہے، اس کو صرف الفاظ میں کیونکر سمجھاؤں، خاص طور سے اس علم کش ماحول

میں جہاں طالب علم مدرسہ میں داخل ہونے کا مقصد بھی کماحقہ، نہیں سمجھتے، آخر اس کا ذکر حضرت الاستاذ مدظلہ، سے کیا، تو انھوں نے وہ سوال کا پرچہ مجھ سے لے لیا، اور اس کا درج ذیل جواب مرحمت فرمایا۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کچھ کتابوں کے مطالعہ کے بعد تم نے جو تاثرات لکھے ہیں، عزیزم مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ کے واسطے سے ان کا مطالعہ میں نے کیا، اور ساتھ ہی میں نے ان سے کاپی مانگ لی کہ اس کا جواب میں لکھتا ہوں۔

عزیزم! تم نے لکھا کہ ’’لیکن جب میں اکابر کے زمانۂ طالب علمی کا حال پڑھتا ہوں، اور اپنی طالب علمی کے زمانے کو دیکھتا ہوں تو زمین و آسمان کا فرق دیکھتا ہوں، کافی کوششوں کے بعد بھی کتابوں کے ساتھ وہ محبت اور لگاؤ نہیں پیدا ہو رہا ہے، اس کا کیا طریقۂ کار ہے؟‘‘

میرے عزیز! تمہاری بات صحیح ہے، جن اکابر کا تذکرہ تم نے پڑھا ہے، ان کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بہت فرق ہے، ان کے دور میں علم مطلوب تھا، ہمارے زمانے میں معاش مطلوب ہے، وہ لوگ کمال کے جویا تھے، اب لوگ مال کے جویا ہیں، اس وقت طالب علموں کا عام ماحول علمی سرگرمیوں کا تھا، تو جتنے لوگ حصول علم کی طلب میں نکلتے تھے، ان میں کامیاب لوگوں کا تناسب زیادہ تھا، یہ دور معاشی سرگرمیوں کا ہے، طلبۂ علم، علمی میدان میں پچھلا تناسب کھو چکے ہیں۔

اس مخالف ماحول میں، اس ناموافق دور میں اکثریت طالب علموں کی بجھی بجھی سی رہتی ہے، نہ دلوں میں حوصلہ ہوتا، نہ آرزوؤں میں گرمی پیدا ہوتی، پھر دار الاقاموں کے عجیب وغریب مرکب اور پیچیدہ ماحول نے طالب علموں کو بہت سے

لایعنی اور مہمل، بلکہ ذہن ودماغ کے لئے خطرناک حد تک مضر مشغلوں میں مبتلا کردیا ہے پھر علم کا اور کتابوں کا ذوق بنے تو کیونکر بنے۔

یہ حالات بڑے مایوس کن ہیں، لیکن تم دیکھو کہ انھیں مایوس کن حالات میں کچھ قابل قدر اور لائق تقلید علماء مدرسوں کے افق سے طلوع ہورہے ہیں یا نہیں؟ اگر تم یہ کہو کہ اب کوئی نہیں ہورہا ہے تو یہ خلافِ واقعہ بات ہے، اور اگر تم کہو کہ اب بھی قابل قدر علماء کا ظہور ہورہا ہے........... گوایسے لوگ قلیل ہیں........... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس زمانہ میں بھی اچھے علماء کو تیار کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اس حال میں تم یہ غور نہ کرو کہ زمانہ ناموافق ہے، پہلے یہی زمانہ آسمان پر تھا، اب زمین پر ہے، بلکہ دیکھو کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے تحصیل علم کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کا کتنا حصہ تم نے اہتمام سے استعمال کیا ہے، ان اکابر کی تاریخ اور ان تذکروں کے پڑھنے سے خود احتسابی کا سبق ملتا ہے، زمانہ کی رفتار نہ دیکھو اپنے اوپر نگاہ رکھو، اور پھر جہاں کوتاہی اور خامی نظر آئے، ان کی اصلاح اور تلافی کرو۔

تم نے نظام الاوقات کی بات کی ہے، تم اس الجھن میں نہ پڑو، تمہارا نظام الاوقات صرف پڑھنا ہے، سارا وقت پڑھنے کے لئے ہے، درمیان میں بشری ضروریات حائل ہوتی رہتی ہیں، انھیں بقدر ضرورت ان کا حق عطا کرو اور بس پڑھنے میں لگو۔ نماز تلاوت یہ سب مقاصد میں داخل ہیں، کھانا، سونا، تفریح کرنا ضروریات وحاجات میں ہیں، ان کے ساتھ بقدر ضرورت والا معاملہ ہو، پڑھنا اور مکرر پڑھنا، ذہن میں محفوظ رکھنا، سوچنا تو علم کو سوچنا، بات ہو تو علم کی بات، فضول کلام، ہنسی کھیل، گپ شپ سے احتراز بنیادی بات ہے، جتنی طاقت اللہ نے دی ہے اس کے استعمال کے مکلّف ہو، تم نے استعمال کیا؟

وقت کے ضائع ہونے کی بھی تلافی ہے، وہ یہی کہ ایک دھن لگا لو، ہر کام تمہارا پڑھنا بن جائے، اس میں بڑی رُکاوٹ مختلف المزاج طلبہ کا اجتماع ہے، جن اکابر کے احوال تم نے پڑھے ہیں، ان کے پاس یہ اجتماع نہ ہوتا تھا، اب اس اجتماع کے بغیر کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا، بس انھیں میں ہم خیال ساتھیوں کو منتخب کرو اور ان کے ساتھ پڑھنے میں جان کی بازی لگاؤ، بات نہ کرو، مطالعہ کرو۔ حضرت مولانا صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں اور مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامؔی دونوں مدتوں ایک چوکی پر بیٹھ کر گھنٹوں کتاب کا مطالعہ کیا کرتے تھے، مگر کلام کی نوبت شاید کئی کئی دن تک نہیں آتی تھی، اب دو طالب علم ایک جگہ ہوں اور دونوں فضول بک بک نہ کریں شاید ایسا ہوتا ہی نہیں، اپنے کو قابو میں کرو، تم نے قابو کیا، دوسرے نے کیا، چند ایک نے کیا، اسی طرح ایک ماحول بن جائے گا، کچھ سمجھے؟

خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) یہ بات ہر وقت مستحضر رکھو کہ تمہیں پڑھنا ہے، اس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں ہے، یہی اصل اور بنیادی کام ہے۔

(۲) ہمت اور حوصلہ سے کام لو، کسی کام کو مشکل نہ سمجھو، پڑھنے سے متعلق جو بھی کام ہو حوصلہ مندی کے ساتھ اس میں لگ جاؤ، طبیعت گھبرائے اور اکتائے، تو تھوڑا بہت، بہت تھوڑا سا دم لے کر پھر کام میں لگ جاؤ۔

(۳) ہمت ہی کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ طبیعت میں استقلال اور ثبات قدمی پیدا کرو۔ کوئی چیز یاد کرنی ہے تو مسلسل لگ کر اسے یاد کرو، کوئی کام جو مناسب نہ تھا، اسے چھوڑ دیا ہے تو طبیعت کا خواہ کتنا ہی تقاضا ہو اسے چھوڑے ہی رہو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ ایک دن بہت کر لیا، دوسرے دن بالکل ترک کر دیا، ترتیب کے ساتھ روزانہ تھوڑی

تھوڑی محنت بہت زیادہ مثمر نتائج ہے۔

(۴) ساتھیوں سے اختلاط بقدرِ ضرورت، اور علم سے اور کتاب کے ساتھ مشغولیت بقدرِ مقصد ہو۔

(۵) بری صحبت سے قطعی اجتناب، مگر دوسروں کو حقیر ہرگز نہ سمجھنا اور نہ نفرت کرنا، ایسا نہ ہو کہ بری صحبت قرار دیکر کسی کو حقیر سمجھنے لگو، اپنے نفس کے علاوہ کسی کو حقیر نہ سمجھو۔

(۶) جو کتاب پڑھو، ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رکھ مت دو، بلکہ بار بار پڑھو، منتخب مضامین کو اتنی مرتبہ پڑھو کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔

(۷) اللہ کے حضور بالحاح وزاری دعاء کیا کرو۔

اس طریقۂ عمل سے انشاء اللہ وہ بات حاصل ہو جائے گی، جو تم چاہتے ہو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

☆☆☆☆☆

ایک طالب علم نے خط میں مولانا مدظلہٗ کے آداب والقاب میں غلو سے کام لیا تھا، مولانا نے اس پر ٹوکا اور لکھا، کہ ان مبالغہ آمیز باتوں پر اگر کل بروزِ قیامت پرسش ہوگئی تو کوئی جواب بن نہ پڑے گا۔ حدیث میں ہے کہ آدمی کے شر کے لئے یہی بہت ہے کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے، اشاروں پر یہ مواخذہ ہے، تو مبالغہ وغلو پر کتنا مواخذہ ہوگا، اس پر انھوں نے اس مشہور حدیث سے اشکال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل، اور تمام ملائکہ اور پھر تمام اہلِ زمین کو اس سے محبت کا حکم جاری فرماتے ہیں۔ اور اس طرح اس کی محبت عام ہو جاتی ہے، تو اگر مواخذہ ہی ہونا ہے، تو یہ قبولیتِ عامہ کیوں ہے؟ اسی اشکال کے جواب میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میاں تم نے تو مناظرہ ٹھان دیا، سامنے کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ حدیث جس کا تم نے حوالہ دیا ہے اس میں محبت اور قبول کا ذکر ہے، یعنی وہ بندہ لوگوں کے درمیان اور خدا کے نزدیک محبوب ومقبول ہوجاتا ہے، قلوب میں اس کی محبت جاگزیں ہوجاتی ہے۔ اس کے برخلاف جس حدیث کا میں نے حوالہ دیا تھا، اس میں اشارہ بالاصابع اور مدح وتعریف میں غلو واغراق کا مفہوم ہے، ان دونوں میں کوئی تخالف نہیں ہے، بالکل ظاہر ہے کہ محبوبیت عامہ اور مشار الیہ ہونے میں کوئی تلازم نہیں ہے، کتنے لوگ محبوب ہوتے ہیں، مگر گمنام، اور کتنے مردود ومطرود ہوتے ہیں، لیکن ان کی شہرت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ میں نے جو لکھا کہ تمہاری محبت سے میرا دل لبریز ہے۔ اس میں بڑے القاب پر کیا دلیل ہے، مومن صالح کی محبت تو خود محبت کرنے والے کی خوش نصیبی ہے، اس کا بڑے آداب والقاب سے کوئی تعلق نہیں، اور یہ نہ سمجھو کہ کوئی بندہ مقبول ہوجائے گا تو خدائے بے نیاز کی پرسش وسوال سے بچ جائے گا۔ آخر انبیاء سے بڑھ کر مقبولیت کس کی ہے، لیکن سورۂ مائدہ کا آخری رکوع پڑھو اور دیکھو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کتنا سخت سوال ہوگا۔ اور تفسیروں میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس وقت کیا عالم طاری ہوگا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ہیبت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہر بنِ مو سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑے گا۔ شہرت و سربلندی صرف خدا کو زیب دیتی ہے، اس وصف خاص میں کوئی اور شریک ہو تو اس کے لئے خطرہ ضرور ہے۔ خواہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے وہ خطرہ بالکلیہ دور فرمادیں، یا کسی قدر احساس دلا کر اسے بخش دیں یا پھر مبتلائے قہر وغضب کریں۔ وہ ہر طرح مالک ومختار ہیں۔ اسی طرح مدح وثنا، حمد وکبریائی بھی اسی ذات عالی صفات

کے ساتھ مخصوص ہے، قرآن کی پہلی ہی آیت نے حمد کے ہر فرد کو **رب العالمین** کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، اس لئے ایسا کوئی لقب جو عظمت و کبریائی پر دلیل ہو مناسب نہیں۔ البتہ ہر ایسا لقب جو انس و محبت کی ترجمانی کرے عین مرضی ہے، مثلاً کسی باہمی ربط کا حوالہ دے کر یا کسی رشتۂ خاص کی بنیاد پر **استاذنا المحترم** وغیرہ، اور مجھے وہی القاب پسند آتے ہیں، جن کے پڑھنے سے کاتب و مکتوب الیہ کا رشتۂ باہمی ظاہر ہو، اس میں اپنائیت و محبت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، باقی ایسے الفاظ جو محض عظمت پر دال ہوں، لیکن باہمی تعلق کو ظاہر نہ کرتے ہوں ان سے شرم آتی ہے۔ امید ہے کہ اب بات سمجھ گئے ہوگے۔ اس باب میں اپنی طبیعت سے زیادہ میری طبیعت کی رعایت کرو، ہر وہ لفظ قبول ہے، جس سے تعلق و محبت پر روشنی پڑتی ہو۔ اللہ کا شکر ہے، اچھا ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۲۶؍صفر ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

باب چہارم

علمی مباحث

بنـــام

مولانا اختر امام عادل صاحب

مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں ایک کمسن مگر بہت ذہین وفطین طالب علم سمستی پور بہار کا رہنے والا داخل ہوا۔ میں جب وہاں سے غازی پور منتقل ہوا تو یہ بھی میرے ساتھ مدرسہ دینیہ میں آگیا۔ اس طالب علم کے والد ایک نقشبندی بزرگ اور صوفی ہیں۔ ہدایہ، جلالین تک تعلیم حاصل کر کے یہ طالب علم دارالعلوم دیوبند پہونچا۔ وہاں سے فراغت حاصل کی اور افتاء کی تکمیل کی۔ بعد میں ایک ذی استعداد عالم اور مصنف کی حیثیت سے علمی حلقوں میں معروف ہوا۔ یہ ہیں مولانا اختر امام عادل سلّمہٗ جو اپنی بستی منوروا شریف میں ایک دینی ادارہ جامعہ ربانی کے بانی اور مہتمم ہیں اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف!

انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں براہین قاطعہ مؤلفہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری علیہ الرحمہ اور اس کے کسی جواب کا مطالعہ کیا، اور امکانِ کذب کے مسئلے پر اشکال ہوا، وہ اشکال انھوں نے میرے پاس لکھا۔ ان کے نام کے تمام خطوط اسی مسئلے کی تفصیلات پر ہیں۔ (اعجاز احمد اعظمی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم! وفقکم اللہ وإیای حسن التوفیق

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل تمہارا خط ملا، اس سے پہلے بھی ایک خط ملا تھا، اس وقت غالبًا میں آشوبِ چشم میں مبتلا تھا، یا اس کے بعد ہو گیا تھا۔ جواب لکھنے کا ارادہ تھا مگر بیماری سے نجات ہوئی تو گھر جانا ہو گیا، اور امروز و فردا میں تمہارا دوسرا خط آپہونچا، کل پھر ایک سفر ہے اس لئے عجلت میں لکھ رہا ہوں، کہ اگر رہ گیا تو پھر رہ ہی جائے گا۔

عزیزم! امکانِ کذب کا مسئلہ اصلاً مختلف فیہ نہیں ہے، خلف وعید کے وقوع کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ خلف وعید کا امکان کیا، وقوع بھی اہل سنت کے نزدیک ثابت ہے۔ اسی کے ذیل میں امکان کذب کا مسئلہ نزاع بن کر داخل ہو گیا، ورنہ تو یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اس پر شور و غوغا ہونا کسی طرح مناسب نہیں، اور جن لوگوں نے امکان کذب کا مسئلہ گھڑا ہے اور اس کے انکار پر تلے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت فلاسفہ کی گود میں جا پہونچے ہیں، **ولکن لا یعلمون**۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے اطاعت شعار اور عبادت گزار بندوں کے لئے انعام و اکرام کا وعدہ فرمایا ہے، اور گناہ گار و بدکردار بندوں کو عذاب شدید کی وعید سنائی ہے، اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ وعدے جو کئے گئے ہیں وہ سب پورے ہوں گے، فرق ہے تو یہ ہے کہ اہل سنت ان وعدوں کی تکمیل باری تعالیٰ کی جناب میں واجب و لازم نہیں جانتے، بلکہ **الکریم إذا وعد وفیٰ** کے تحت یہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبرعاً اپنے ذمے لازم فرمالیا ہے، انھیں ہر آن اختیار ہے کہ اس کے خلاف کریں، لیکن خلاف کریں گے نہیں۔ اور معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ان

وعدوں کی تکمیل حق تعالیٰ شانہ کے ذمہ لازم وواجب ہے، اس کے نتیجے میں وہ کن خرابیوں میں پڑتے ہیں، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، پھر کسی صحبت میں دیکھا جائے گا۔

البتہ وعیدوں کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا ان کی تکمیل بھی ضرور ہوگی، یا اس کے خلاف بھی ہوسکتا ہے؟ اس سلسلے میں معتزلہ تو اپنی سابقہ روش پر قائم ہیں، یعنی جس طرح وعدوں کی تکمیل ضروری ہے اسی طرح وہ وعیدوں کی تکمیل کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر ایسا نہ مانا جائے، تو کلام خدا میں کذب لازم آئے گا، لیکن اہل سنت نے قرآن وحدیث کی صدہا نصوص میں دیکھا کہ گناہوں پر جو وعیدیں ہیں وہ برحق ہیں، لیکن یہ بھی برحق ہے کہ حق تعالیٰ بہتوں کے گناہ بغیر کسی سزا کے محض اپنے فضل سے یا کسی کی شفاعت سے بخش دیں گے۔ درحقیقت یہ وعیدیں وعدے نہیں ہیں بلکہ افعال شنیعہ کی خاصیات ہیں، لہٰذا اگر ان کے خلاف کہیں عمل درآمد ہوتو اسے کذب نہیں کہا جاسکتا، بلکہ فضل اور بخشش کا نام دیا جائے گا، جو قابل مدح اور لائق شکر ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں، تو اہل سنت جو خلف فی الوعید کے قائل ہوئے، اس میں شائبہ کذب ہے ہی نہیں، کیونکہ کذب وہاں ہوتا جہاں وعدہ ہوتا، اور وعیدیں وعدہ نہیں خاصیاتِ افعال کی خبریں ہیں، اور بالکل برحق ہیں، لیکن اس خاصیت کے ہوتے ہوئے اگر رحمت حق دستگیری فرمادے تو اس میں کذب کا کام ہی کیا ہے؟ آخر اگر سزا نہ دی جائے اور اس سے کسی کا حق نہ مارا جائے تو اس کو کون ظلم کہہ سکتا ہے، ہاں وعدۂ انعام اگر ایک طرف افعال حسنہ کی خاصیتوں کا بیان ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک محکم وعدہ بھی ہے، اور وعدہ کا خلاف نقص اور عیب ہے، اس لئے اس کے خلاف کرنا ذاتِ خداوندی کو عیب لگائے گا۔ بہرکیف خلف فی الوعید غایت رحمت ہے، اور خلف فی الوعد نقص اور عیب ہے، اور حق تعالیٰ نقص اور عیب سے پاک ہے۔ اس تفصیل

سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ خلف فی الوعید کے امکان یا وقوع کی وجہ سے اہل سنت کے نزدیک امکان کذب کا مسئلہ زیر بحث آتا ہی نہیں، البتہ معتزلہ اپنے اصول کے ماتحت خلف فی الوعید کو کذب کے ماتحت لاتے ہیں، اور یہی مسئلہ شیعہ اور خوارج کا بھی ہے۔ اس لئے اہل سنت کو تو اس مسئلہ میں گھسنا ہی نہیں چاہئے، مگر اہل معقول کو چونکہ علوم دینیہ میں کافی درک نہ تھا اور وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے، اس لئے شور مچادیا، حالانکہ انھیں خبر نہیں کہ اس طرح وہ کہاں جاپہونچے، اس کی حقیقت عنقریب آگے واضح ہوگی۔ **ان شاء اللہ**

چلو اب خالص امکانِ کذب کا مسئلہ لو! کذب کی حقیقت کیا ہے؟ واقعہ کے خلاف کوئی کلام بولنا، اصطلاحی لفظ میں یوں کہو کہ **عقد قضیہ غیر مطابق للواقع،** اور صدق کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے برعکس واقعہ کے مطابق کلام بولنا، یعنی عقد قضیہ مطابق للواقع، جو لوگ کہتے ہیں کہ کذب تحت القدرۃ نہیں ہے، ان کے کہنے کا حاصل یہی ہے نا کہ حق تعالیٰ کو **عقد قضیہ غیر مطابق للواقع،** پر قدرت حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ عیب ہے، اور عیب حق تعالیٰ کی شان میں لزوماً ممتنع ہے۔

اس بات میں غور کرنے سے پہلے ایک عقلی قاعدہ مسلمہ بدیہیہ عند العقل پر غور کرو۔ کسی اہل عقل کو اس میں مجال اختلاف نہیں ہے کہ دو متقابل چیزیں جو آپس میں علاقہ تضاد کا یا عدم وملکہ کا رکھتی ہوں، ان میں سے اگر ایک پر کسی کو قدرت اور اس کا اختیار تسلیم کیا جائے تو ضروری ہے کہ جانب مقابل کو بھی زیر تصرف واختیار مانا جائے۔ اسی طرح ایک جانب اضطرار ہوگا تو دوسری جانب بھی اضطرار ہوگا، آدمی اگر حرکت پر قادر ہے تو سکون پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ رعشہ والا سکون پر قدرت نہیں رکھتا تو کوئی نہیں کہتا کہ وہ حرکت پر قادر ہے۔ مرد کو اگر عورت بننے کا اختیار نہیں تو مرد ہونا

بھی اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے، غرض ضدین میں سے اگر ایک کو اختیار میں لاتے ہو تو دوسرے کو بھی لاؤ، اور ایک میں اضطرار تسلیم کرتے ہو تو دوسرے میں بھی خود بخود اضطرار داخل ہو گیا۔ اب غور کرو کہ **عقد قضيه مطابق للواقع**، ایک فعل ہے، اس کے بالمقابل **عقد قضيه غير مطابق للواقع**، اس کی ضد ہے۔ اب اگر کوئی شخص مدعی ہے کہ اول تحت القدرۃ ہے، تو گویا اس نے خود اقرار کر لیا کہ ثانی بھی تحت القدرۃ ہے، اور اگر کوئی کہتا ہے کہ ثانی تحت القدرۃ نہیں ہے تو گویا اس نے یہ مان لیا کہ اول بھی تحت القدرۃ نہیں۔ بالفاظ دگر اگر کذب اضطراراً حق تعالیٰ سے منتفی ہے تو صدق بھی اضطراراً ہی اس کے لئے لازم و ثابت ہوگا، ورنہ اس کا کوئی مطلب نہیں کہ صدق کو تحت تصرف و اختیار مانو اور کذب کو اختیار سے خارج کر دو۔ اور تم جانتے ہو کہ کلام منحصر ہے خبر اور انشاء میں، اور خبر منحصر ہے صدق اور کذب میں، پھر جب صدق و کذب دونوں کو قدرت کے دائرے سے خارج کر دیا تو خدا کا اختیار محض انشاء پر رہا، اور کلام کا ایک بڑا حصہ قدرتِ خداوندی سے نکل گیا، **نعوذ بالله منه**۔ اس سے زیادہ تو خود بندوں کو قدرت حاصل ہے، سوچو تو سہی، خدا کو کذب سے بچانے کی کوشش میں اتنی دور نکل گئے کہ حق تعالیٰ کو محض بے بس اور مجبور بنا کر رکھ دیا۔ یہ طریقہ درحقیقت فلاسفہ اور معتزلہ کا ہے، فلاسفہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے افعال سب اضطراری ہیں، اور معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ قبائح کا صدور حق تعالیٰ کی قدرت میں ہے ہی نہیں، اور اس اصول کی جو بنا ہے وہ اور زیادہ فاسد ہے، تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ وہ بھی لکھ دیتا۔ ان کی دلیل بعینہٖ وہی ہے جو تم نے نقل کی ہے، اگر امکان تسلیم کر لیا جائے تو وقوع محتمل ہوگا، اس طرح قبائح کا صدور محتمل ماننا پڑے گا، لہٰذا اسے ممکن ہی نہ قرار دو۔ چلو چھٹی ہوئی، لیکن یہ نہ سوچا کہ احتمال وقوع سے چھوٹے تو اضطرار میں

جا پڑے، اور جبر واضطرار تو ایسا دھبہ ہے جو کسی طرح **إن الله علیٰ کل شئ قدیر** کے ہوتے ہوئے زیب نہیں دیتا۔ اور ایک لطیفہ سنو! حق تعالیٰ تو **إن الله علیٰ کل شئ قدیر** فرمائیں، اور یہ لوگ فرمائیں کہ نہیں فلاں فلاں امور قدرت سے خارج ہیں، حالانکہ ان کا تعلق امکانیات سے ہے، تفصیل آگے آئے گی۔ تو اگر یہ سچے ہیں تو نعوذ باللہ خدا کے کلام میں انھوں نے کذب کو بالفعل تسلیم کرلیا۔ کہاں تو چلے تھے امکان کذب کی نفی کرنے اور پھنس گئے وقوع وصدور کذب میں۔ **فر من المطر وقر تحت المیزاب**، اسی کو کہتے ہیں، یا یوں کہو کہ ''چاہ کن راچاہ درپیش۔

ایک معقولی عالم نے لکھا کہ **وهو (الكذب) محال لانه نقص والنقص عليه تعالیٰ محال**۔ اس پر ایک جامع المعقول والمنقول نے یہ لکھا، اسے بغور پڑھو!

> ''اگر مراد از محال ممتنع لذاتہ است کہ تحت قدرت الٰہیہ داخل نیست، بس لانسلم کہ کذب مذکورہ محال بمعنی مسطور باشد، چہ عقد قضیہ مطابق للواقع والقاء آں برملائکہ وانبیاء خارج از قدرت الٰہیہ نیست وإلا لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرت ربانی باشد، چہ عقد قضیہ غیر مطابق للواقع والقاء آں بر مخاطبین در قدرت اکثر افراد انسانی است، کذب مذکور آرے منافی حکمت اوست، پس ممتنع بالغیر است، ولہذا عدم کذب را از کمالات حضرت حق سبحانہ می شمارند واورا جل شانہ بآں مدح می کنند بخلاف اخرس وجماد کہ ایشاں را کسے بعدم کذب مدح نمی کند وپر ظاہر است کہ صفت کمال ہمیں است کہ شخصے قدرت بر تکلم بکلام کاذب می دارد وبنا بر رعایت مصلحت ومقتضائے حکمت تنزہ از شوب کذب، تکلم بکلام کاذب نمی نماید ہماں شخص ممدوح می گردد بسلب عیب کذب واتصاف بکمال صدق، بخلاف کسیکہ لسان او ماؤف شدہ

> باشد وتکلم بکلام کاذب نمی تواند کرد، یا شخصے کہ ہرگاہ کلام صادق می گوید کلام مذکور ازو صادر می گردد، وہرگاہ کہ ارادۂ تکلم بکلام کاذب می نماید، آوازِ او بند می گردد، یا زبانِ او ماؤف می گردد، یا کسے دیگر دہن اورا بند می نماید یا حلقوم اورا خفہ می کند، یا کسے کہ چند قضایائے صادقہ را یاد گرفتہ است واصلاً بر ترکیب قضایا دیگر قدرت نمی دارد وبناءً علیہ کلام کاذب ازو صادر نمی گردد، ایں اشخاص مذکورین نزدِ عقلاء قابل مدح نیستند
>
> بالجملہ عدم تکلم کلام کاذب ترفھاً عن عیب الکذب وتنزھاً عن التلوث بہ از صفات مدح است وبنا بر عجز از تکلم بکلام کاذب ہیچگونہ از صفات مدائح نیست یا مدح آں بسیار ادون است از مدح اول"

خلاصہ یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے کذب ممتنع اور محال ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ وہ قدرت ہی میں نہیں ہے، حق تعالیٰ اس سے عاجز ہیں، بلکہ اس لئے کہ حق تعالیٰ قادر تو صدق وکذب دونوں پر ہیں، لیکن کذب خلاف حکمت ہے، اور حکیم خلاف حکمت کام نہیں کرتا، اس لئے نہیں کہ خلاف حکمت پر قادر نہیں، اس پر اگر قدرت ہی نہ ہو تو کاہے کو حکیم ہوگا، بے شک خلاف حکمت پر قادر ہے مگر ایسا کرتا نہیں، اس لئے صدور کذب اس سے ممتنع ہے۔ اور یہ تو اہل سنت کا اجماعی مسئلہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ذمے کوئی چیز واجب نہیں ہے، اگر وہ چاہے تو اہل ایمان کو مبتلاء عذاب کرے اور کفار ومشرکین کو بخش دے، ظاہر ہے کہ تعذیب مومن اور تنعیم کافر پر قدرت کا ماننا کذب پر قدرت ماننے سے کسی طرح کم نہیں ہے، اگر یہ خلاف حکمت ہے تو وہ بھی خلاف حکمت ہے، اور اگر یہ خلاف حکمت ہونے کی وجہ سے قبیح ہے، تو وہ بھی خلاف حکمت ہی ہونے کے سبب سے قبیح ہے، پھر ایں چہ معنی دارد کہ تعذیب مومن پر قادر مانو، تنعیم کافر پر قادر مانو، اور نہ مانو تو کذب پر قادر نہ مانو، بلکہ اگر بنظر غور

دیکھو تو تعذیب مومن پر قادر ماننا مستلزم ہے کذب پر قدرت کو، کیونکہ خبر صادق تو یہ ہے کہ مومن مستحق رحمت ہے، پھر اگر اس کے عذاب پر خدا کو قادر مانا تو کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہے کہ اس خبر صادق کے خلاف پر اسے قدرت حاصل ہے، اور خبر صادق کے خلاف کو کیا کہو گے؟

تم نے اپنے خط میں واجب بالذات و بالغیر اور محال بالذات و بالغیر سے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے، تمہارا ذہن صحیح پہونچا، لیکن اس کی تشریح مجھ سے سن لو، تا کہ بصیرت حاصل ہو جائے۔

اتنی بات تو جانتے ہو کہ موضوع اور محمول کے مابین نسبت حمل کی ہوتی ہے، یعنی محکوم بہ محکوم علیہ پر محمول ہوتا ہے، اب تم غور کرو کہ موضوع و محمول کے درمیان قطع نظر حمل کے کیا تعلق ہے؟ اس کی چند صورتیں ہیں۔ کبھی یہ تعلق عینیت کا ہوگا، یعنی محمول موضوع کا عین ہوگا، ذات میں بھی اور مفہوم میں بھی۔ مثلاً **الانسان انسان** ، کبھی ایسا ہوگا کہ موضوع و محمول میں علاقہ جزئیت کا ہوگا، یعنی محمول اپنی ذات کے لحاظ سے موضوع کا جز ہوگا، جیسے **الانسان حیوان**، اور کبھی یوں ہوگا کہ محمول اپنی ذات کے لحاظ سے موضوع کی ماہیت کے لئے لازم ہوگا، جیسے **الاربعۃ زوج**، اور کبھی تینوں سے الگ عرض مفارق کا علاقہ ہوگا، عقلاً یہی چار صورتیں ہوسکتی ہیں، ذرا تعمق کرو گے تو حمل کی کیفیت تمہیں سمجھ میں آجائے گی۔ پہلی صورت میں موضوع و محمول عین واحد ہیں لہٰذا حمل لازم ہوگا، ورنہ **الانسان لیس بانسان** کہنا ممکن ہوگا، جو بداہۃً محال ہے۔ دوسری صورت میں محمول چونکہ ذات موضوع کا جز ہے، لہٰذا یہ حمل بھی لازم ہے کیونکہ جب **الانسان حیوان** کہا گیا تو انسان کے ضمن میں حیوان بھی مذکور ہوا، گویا اس میں بھی **الحیوان حیوان** ضمناً مذکور ہوا۔ تیسری صورت میں چونکہ

محمول موضوع کے لئے لازم ماہیت ہے، اور لازم اپنے ملزوم سے ناشی اور صادر ہوتا ہے، جیسے روشنی سورج سے ناشی اور صادر ہے، اور ظاہر ہے کہ ناشی اور صادر کا مصدر اور منشاء میں پایا جانا ضروری ہے، اس لئے یہ حمل بھی قطعی اور لازمی ہے، اس کی نفی کرنے سے ذات ملزوم میں تغیر وتبدل لازم آئے گا، اس لئے **الاربعة زوج** کا حمل ضروری ہے۔ یہی تینوں محمولات واجب بالذات ہیں، اور ان کے نقائض ممتنع بالذات ہیں، اور یہی امور ہیں جو تحت القدرت نہیں آتے، یعنی ان میں مقدور ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، کیونکہ قدرت خود انھیں کی فرع ہے، اگر ذات ہی مفقود ہو یا لازم ذات مفقود ہو جس کے نتیجے میں ذات کا فقدان یقینی ہے، تو ظاہر ہے کہ قدرت کا وجود کہاں؟ اور یہ جانتے ہی ہو کہ اصل اپنی فرع کے تحت نہیں آیا کرتا، اس لئے یہ تینوں امور تحت القدرت آ ہی نہیں سکتے، البتہ موضوع اور محمول میں جب نسبت عرض مفارق کی ہو، تو وہ حمل ممکن ہوگا، خواہ کسی اور وجہ سے اس میں وجوب یا امتناع پیدا ہو جائے۔ مثلاً **الانسان ضاحک** اس حمل میں اگر کسی سبب سے وجوب یا امتناع پیدا ہو تو اسے واجب بالغیر یا ممتنع بالغیر کہا جائے گا۔

اب دوسری بات سنو! صفات، باری تعالیٰ سب یکساں نہیں ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حقیقیہ محضہ جیسے حیات اور وجود۔ دوسرے حقیقیہ اضافیہ جیسے علم اور قدرت وغیرہ، کہ ہیں تو یہ ذات کی حقیقی صفات لیکن ان کا عمل اور ان کی تاثیر دوسری چیزوں پر ظاہر ہوتی ہے، مثلاً علم کا تعلق معلوم سے ہوتا ہے، قدرت کا تعلق مقدور سے ہوتا ہے۔ تیسرے اضافیہ محضہ جیسے معیت قبلیت وغیرہ۔

صفات حقیقیہ وہ ہیں جن کا مبدأ ذات باری تعالیٰ ہے، البتہ حقیقیہ کی دونوں قسموں میں اس قدر فرق ہے کہ حقیقیہ محضہ میں اضافت الی الغیر قطعاً نہیں ہے، نہ

مرتبہ تعقل میں اور نہ ترتب آثار میں، دوسرے لفظوں میں اسے صفت لازم سمجھ لو۔ اور حقیقیہ اضافیہ مرتبۂ تعقل میں تو بے شک اضافت الی الغیر سے بری ہوتی ہے، مگر درجۂ تحقق میں اضافت الی الغیر اس میں ہوتی ہے، مثلاً علم کے تحقق کے لئے اضافت الی المعلوم ہوگی، اور قدرت کے تحقق میں اضافت الی المقدور ہوگی۔ اور اضافیہ محضہ وہ ہے جس کا مبدأ ذات باری تعالیٰ نہ ہو، مثلاً معیت یا قبلیت اس کا مبدأ ذات باری تعالیٰ نہیں ہے بلکہ جس کے ساتھ یا جس کے پہلے ہے، وہی اس معیت اور قبلیت کا منشاء ہے۔ دوسری مثال سے سمجھو! تم کسی کے دائیں ہو، تو دایاں ہونے کا منشا تمہاری ذات میں نہیں ہے، بلکہ اس کی ذات میں ہے جو تمہارے بائیں بیٹھا ہے، اور اگر اٹھ کر وہ تمہارے داہنے آجائے تو اب تم بائیں ہوگئے، اس کا بھی منشاء تمہاری ذات میں نہیں ہے، ورنہ تم تو ایک ہی جگہ بیٹھے ہو، پھر دائیں بائیں کا اختلاف کیوں؟ معلوم ہوا کہ اس کا منشاء دوسرا شخص ہے، یہی بات ہر جگہ ہوگی، غرضیکہ اضافیہ محضہ کا تعقل وتحقق دونوں، موصوف سے جدا دوسری جگہ پایا جاتا ہے۔

بغور ملاحظہ کرو! صفات حقیقیہ محضہ تو عین ذات واجب الوجود ہیں، لہٰذا ان کا واجب بالذات ہونا شبہ سے بالاتر ہے، ان میں کسی طرح کا تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ اور صفات حقیقیہ اضافیہ میں دو جہتیں نکل آئیں، ایک مبدأ کی جہت اور دوسرے اضافت الی الغیر کی جہت، مبدأ تو ان کا ذات باری تعالیٰ ہے، لہٰذا ان میں تغیر وتبدل محال، وہ لازم ذات ہیں، اور اضافت الی الغیر کے لحاظ سے چونکہ ان کا تعلق غیر کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً علم کا تعلق معلوم سے اور قدرت کا تعلق مقدور سے، اور ظاہر ہے کہ معلومات اور مقدورات محل تغیر ہوسکتی ہیں، بلکہ باستثنائے واجب بالذات سبھی معلومات اور بلا استثناء تمام مقدورات محل تغیر ہوتی ہیں، اس لئے ان تعلقات میں بھی

تغیر وتبدل کی گنجائش ہوگی اور اضافیہ محضہ میں مطلقاً تغیر درست ہے، یہ تفصیل شرح مواقف میں مذکور ہے۔ طوالت کے خوف سے عبارت نقل نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ صفات حقیقیہ محضہ میں اگر تغیر کی گنجائش مان لی جائے، تو ذات باری میں تغیر لازم آئے گا، کیونکہ وہ عین ذات ہیں، اس لئے ان کا سلب محال بالذات ہے، صفات حقیقیہ اضافیہ کا مبدأ ومنشاء چونکہ ذات باری تعالیٰ ہے، اس لئے باعتبار مبدأ کے ان میں تغیر مانا جائے، تو ذات میں تغیر لازم آئے گا، کیونکہ یہ صفات باعتبار مبدأ کے لازم ذات ہیں، اور لازم کے انتفاء سے ذات کا انتفاء ضروری ہے، البتہ ان کا تعلق جو معروضات ومضاف الیہ کے ساتھ ہے وہ قابل تغیر ہے، اس عروض وتعلق کو حادث ماننا ضروری ہوگا۔ مثال درکار ہو تو بغیر تشبیہ کے یوں سمجھو کہ سورج کے لئے روشنی صفت حقیقیہ اضافیہ ہے، روشنی کا مبدأ تو سورج ہے مگر روشنی کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اشیاء عالم پر عارض ہوتی ہے، تو باعتبار مبدأ کے روشنی سورج کے لئے لازمِ ذات ہے، اگر روشنی کی نفی کردو تو سورج ہی معدوم سمجھو، ہاں عروض اس کا قابل تغیر ہے، یہی وجہ ہے کہ زمین پر تشکلات مختلف ہوتے رہتے ہیں، اور دن میں ہوتی ہے، رات میں غائب ہوجاتی ہے، حالانکہ ذات کے اندر وہ موجود ہے۔ اس مثال کے بعد پھر مقصد کی جانب آؤ، باری تعالیٰ کی صفات فعلیہ یعنی وہ صفات جو فعل اور تاثیر پر دلالت کرتی ہیں، اور جن کے اطلاق میں کسی فعل کا صدور ملحوظ ہوتا ہے جیسے تخلیق، ترزیق، احیاء واماتت وغیرہ، انھیں اشاعرہ تو حادث مانتے ہیں، لیکن ہم لوگ جو ماتریدی ہیں انھیں قدیم کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باعتبار مبدأ قدیم ہیں، البتہ باعتبار تعلق بالمضافات الیہا حادث ہیں، گویا صفات فعلیہ حضرات اشاعرہ کے نزدیک اضافیہ محضہ ہیں، اور ماتریدیہ کے نزدیک حقیقیہ

اضافیہ ہیں، بالفاظ دیگر یوں کہہ لو کہ صفات فعلیہ مثلاً خلق وارزاق وغیرہ کے دو رخ ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ کی ذات عالی کے ساتھ یہ چیزیں قائم ہیں، اوراس میں ان امور کی قدرت پائی جاتی ہے، اس لحاظ سے یہ صفات قدیمہ ہیں، دوسرے یہ کہ ان صفات کی تاثیر وفعلیت کسی شئے کے اندر ظاہر ہو، اس اعتبار سے یہ افعال ہیں تو صفات بالمعنی الاول قدیم اور واجب بالذات ہیں اور افعال بالمعنی المذکور حادث اور ممکن بالذات، کیونکہ ان کے تغیر وتبدل اور ایجاب وسلب سے ذات باری میں کوئی تغیر نہیں ہوگا، کیونکہ مبدأ اپنی جگہ ثابت وقائم ہے، مثلاً حدیث میں ہے کہ **کان اللہ ولم یکن معہ شئ**، یعنی اللہ تھا، اوراس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی، اور ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب فعل خلق کا ظہور نہ تھا، تو صفت خلق یعنی قدرت تخلیق تو حق تعالیٰ کے ساتھ ہمیشہ برقرار ہے، مگر فعل خلق بعد میں ہوا، اور ظاہر ہے کہ بعد میں ہونے والی چیز حادث نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی، بالکل بدیہی امر ہے۔

تیسری بات یہ سمجھو کہ کلام باری تعالیٰ دو معنوں میں مستعمل ہے، اول صفت حقیقی واحد بسیط جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اوراس کے مغائر نہیں ہے، اسے کلام نفسی سے تعبیر کرتے ہیں، دوسرے وہ کلام جو منزل علی الرسول ﷺ ہے، یہ کلام لفظی ہے لیکن ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس لئے ہم کلام نفسی بالمعنی الاول ہی مراد لیتے ہیں، کلام نفسی فی نفسہ بسیط ہوتا ہے، اس میں صدق وکذب اور خبر وانشاء کی گنجائش نہیں ہوتی، البتہ تعلقات مخصوصہ کے باعث اس کو خبر وانشاء وغیرہ سے بھی تعبیر کردیں تو مضائقہ نہیں، دوسرے لفظوں میں کلام نفسی کو مبدأ کلام بھی کہہ سکتے ہو۔ شرح مواقف میں ہے: **وکلامه تعالیٰ واحدة عندنا لما مر فی القدرة وأما إنقسامه إلی الامر والنهی والخبر ولاستفهام والنداء فانما هو بحسب**

التعلق فذٰلک الکلام الواحد باعتبار تعلقه بشئ مخصوص یکون خبراً وباعتبار تعلقه بشئ آخر یکون امراً وکذا الحال فی البواقی۔

بہرحال یہ ثابت ہے کہ کلام نفسی صدق وکذب اور خبر وانشاء وغیرہ تقسیمات سے بری ہے، کیونکہ وہ بسیط ہے اور بسیط کو صادق وکاذب کیونکر کہا جاسکتا ہے، دیکھو لفظ جب تک مفرد ہوتا ہے، صدق وکذب کا احتمال نہیں رکھتا، لیکن یہ صفت جب تنزل کرکے درجۂ فعل میں آتی ہے اور کلام کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے تو اب یہ بسیط نہیں رہا مرکب ہوگیا، کیونکہ الفاظ مرکبہ کے ساتھ ان کا تعلق قائم ہوگیا، یہی کلام لفظی ہے، کلام لفظی نہ قدیم ہوتا نہ واجب نہ بسیط ہوتا، اور نہ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم کلام نفسی کی مثال ایسی سمجھو جیسے روشنی جو سورج کے ساتھ قائم ہے، اور کلام لفظی کی مثال ایسی سمجھو جیسے دھوپ جو اشیاء عالم پر پڑتی ہے، اس میں خبر وانشاء کی گنجائش ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ کلام نفسی صفت حقیقی ذاتی ہے، اس میں صدق وکذب کی گنجائش نہیں ہے، اس اعتبار سے اگر کہا جائے کہ صدق وکذب مقدور باری تعالیٰ نہیں ہے تو مجازاً کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جب وہ صدق وکذب کا محل نہیں تو صدق وکذب کی نفی کرنا گو حقیقۃً صحیح نہ ہو، مگر مجازاً درست ہے، صدق وکذب کا تعلق حقیقۃً کلام لفظی سے ہے اور کلام لفظی از قبیل افعال ہے، اور گزر چکا ہے کہ افعال باری تعالیٰ حادث ہیں، **کل یوم ھو فی شان** میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اور حادث قائم بذاتہ تعالیٰ نہیں ہوتا ورنہ ذات باری تعالیٰ میں حدوث لازم آئے گا، اس بنا پر اس کا مقدور ہونا بھی یقینی اور قطعی ہے، اور صدق وکذب چونکہ کلام لفظی کی صفات ہیں لہٰذا اس کے تابع ہوکر ان کا بھی ممکن بمعنی مقدور ہونا ثابت ولازم ہوگا۔

ہاں باری تعالیٰ کی جناب میں کذب ممتنع ہے، لیکن ممتنع بالذات نہیں، صدق

واجب ہے مگر واجب بالذات نہیں، واجب بالذات اس وقت ہوتا جبکہ وہ عین ذات ہوتا، یا جزء ذات ہوتا، یا لازم ذات ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ وہ صفت حقیقیہ محضہ ہوتا یا صفت حقیقیہ اضافیہ باعتبار مبدأ یعنی لازم ذات ہوتا، اور ثابت ہو چکا کہ کلام لفظی از قبیل افعال ہے جو حادث اور مقدور ہوتے ہیں، تو صدق واجب بالذات کیونکر ہوگا، اور پھر کذب محال بالذات کیوں ہوگا، ہاں کذب خلاف حکمت ہے اور خلاف حکمت ہونا عیب ہے اور عیب سے پاک ہونا لازم ذات ہے، لہٰذا ان دو واسطوں سے حق تعالیٰ کا عیب کذب سے پاک ہونا ضروری ہے، تو کذب ممکن بالذات محال بالغیر ہوا، اور محال بالغیر اپنی اصل کے اعتبار سے ممکن اور حادث ہوتا ہے، لہٰذا اس کا مقدور باری تعالیٰ ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔

ایک بات یہاں اور سمجھ لو وہ یہ کہ صدور قبائح اور چیز ہے، اور قدرت علی القبائح دوسری چیز، دونوں میں زمین وآسمان کا فاصلہ ہے، صدور قبائح بری اور قابل نفرت چیز ہے، اور قدرت علی القبائح صفات عالیہ میں سے ہے۔ دیکھو انبیاء قادر علی القبائح ہوتے ہیں، مسلوب الاختیار نہیں ہوتے، ہاں صدور قبائح سے پاک ہوتے ہیں، اسی لئے وہ قابل مدح ہیں۔ اگر دونوں ایک درجے کی چیز ہوں تو انبیاء قابل مدح کیونکر ہوں؟ اسی طرح یہ بھی سمجھ لو کہ قدرت دو معنوں کے درمیان مشترک ہے، اور یہ دونوں اس کے حقیقی معنی ہیں، ایک تو وہ قدرت جو فعل کی علت تامہ ہوتی ہے جس کے ساتھ فعل کا وجود ضروری ہے، اگر فعل نہیں ہے تو یہ قدرت بھی نہیں، اسی کو قدرت حقیقیہ کہا جاتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ احکام تکلیفیہ کے لئے یہ قدرت معتبر نہیں ہے، دوسرے قدرت کا وہ معنی جو عرف عام میں بولا جاتا ہے جس کے مقابلے میں عجز آتا ہے یعنی کسی کام کے انجام دینے کی طاقت وصلاحیت کا ہونا، یہی قدرت احکام تکلیفیہ

کیلئے شرط ہے، خدا تعالیٰ جس قدرت کے ساتھ موصوف ہے وہ قدرت بالمعنی الثانی ہے، قدرت بالمعنی الاول تو افعال کے مقارن ہوتی ہے، اگر وہ قدرت خدا تعالیٰ کے اندر مانی جائے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قدرت صفت قدیمہ نہیں ہے، قدرت کے دونوں معنی حقیقی ہیں، مجاز ان میں سے کوئی نہیں ہے، حقیقی صرف نام ہے، حقیقت ومجاز سے اس کا کچھ علاقہ نہیں ہے، اب تم نے جو عبارت نقل کی ہے اس کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کرو!

> ’’پھر یہ کہ قدرت باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو قدرت حقیقیہ حاصل ہے نہ کہ قدرت مجازی، اور قدرت حقیقیہ کا مطلب وقوع قدرت ہے جیسے قدرت خلق قبل خلق حاصل ہے، حقیقی طور پر خلق کا محتاج نہیں، کلام اس کی صفت قدیمہ ہے، تو وہ کسی مخاطب اور سامع کا محتاج نہیں اور کلام کا بھی محتاج نہیں، بلکہ وہ قبل کلام متکلم ہے، اسی طرح کذب جو کہ محال تحت قدرت ہے تو گویا حقیقۃً قدرت ہے اور اس کا وقوع ہو چکا ہے تو خدا تعالیٰ سے کذب بالفعل کا صدور لازم آئے گا، پس یہ محال کو مستلزم ہے اور مستلزم محال کو محال ہوتا ہے، تو کذب باری تعالیٰ محال ہوا نہ کہ ممکن۔‘‘

معلوم نہیں یہ الفاظ تمہارے ہیں یا صاحب بوارق کی عبارت تم نے نقل کی ہے، صرف یہ ٹکڑا نہیں بلکہ پوری عبارت ناسمجھی کا کرشمہ ہے۔ پہلی غلطی تو اس میں یہ ہے کہ قدرت کے دو معنوں میں ایک کا نام حقیقی دیکھ کر دوسرے کو مجازی قرار دے لیا، اور پھر بزعم خود حقیقی معنی کو خدا تعالیٰ کے ساتھ متعلق کر دیا، حالانکہ اس میں چند در چند خرابیاں ہیں، یہ دوسری غلطی ہے، تم جان چکے ہو کہ قدرت کا یہ معنی حق تعالیٰ کی صفت قدیمہ نہیں ہے بلکہ معنی ثانی اس کی صفت قدیمہ ہے۔

اب تیسری ناسمجھی دیکھو! قدرت حقیقیہ کا مطلب ’’وقوع قدرت‘‘ بیان کیا ہے، اس کی مراد واضح نہیں ہے، اگر ’’وقوع قدرت‘‘ سے مراد قدرت کا تحقق ووجود

ہے تو معلوم نہیں قدرت علی الکذب میں کیا استحالہ ہے، اور اگر اس سے مراد ’’صدور مقدور‘‘ ہے، تو کون کہتا ہے کہ کذب کا صدور ہوا، آخر ابھی سن چکے ہو کہ قدرت اور صدور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح لکھا ہے کہ ’’قدرت خلق قبل خلق حاصل ہے، حقیقی طور پر خلق کا محتاج نہیں‘‘ اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟ اسی کے ساتھ یہ عبارت بھی دیکھ لو ’’اور کلام کا بھی محتاج نہیں، بلکہ وہ قبل کلام متکلم ہے‘‘ یہ دونوں عبارت مؤلف نے محض کم فہمی کے باعث لکھا ہے، قدرت خلق قبل خلق، متکلم قبل کلام جب کہا گیا تو گویا مصنف نے خود تسلیم کرلیا کہ کلام ہو یا خلق دونوں دو معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ صفت خلق کے بغیر خالق ہونا، اور صفت کلام کے بغیر متکلم ہونا محال ہے، ورنہ **الخالق لیس بخالق** اور **المتکلم لیس بمتکلم** کہنا پڑے گا۔ معلوم ہوا کہ ایک خلق پہلے ہے اور ایک خلق بعد میں، اور ایک کلام پہلے ہے اور ایک کلام بعد میں، اگر دونوں کو بالمعنی الواحد قرار دو تو قبلیت و بعدیت کا کیا معنی؟ ناچار یہی کہنا پڑے گا کہ پہلا خلق اور کلام صفت حقیقیہ قائم بذاتہ تعالیٰ ہے، اور قدیم ہے۔ اور دوسرا خلق اور کلام فعل باری تعالیٰ ہے جس کا نمبر بعد میں آیا، اور چونکہ یہ افعال مسبوق بالعدم ہیں جیسا کہ مؤلف نے ’’قبل خلق اور قبل کلام‘‘ کہہ کر اس کا اقرار کیا ہے، لہٰذا وہ حادث اور ممکن ہیں، لہٰذا وہ مقدور باری تعالیٰ ہیں، اور صدق و کذب چونکہ فعل کلام کی صفات ہین لہٰذا وہ بھی مقدور باری تعالیٰ ہیں۔ آگے پھر عبارت دیکھو

’’پھر یہ کہ تمام صفات و افعال خدا تعالیٰ قدیم ہیں اور ان کا عدم و زوال محال ہے‘‘

بے چارہ مؤلف ابتدائی عقل سے بھی محروم ہے اور اپنے کلام کا مطلب بھی نہیں سمجھتا، آخر خلق قبل خلق جب کہہ چکے تو اس دوسرے خلق کو قدیم کہنے کا کیا معنی؟ جس چیز کو بعدیت کے ساتھ موصوف کر چکے ہیں، اس میں قدم کہاں سے آیا، اس کو تو

خود حادث کہہ چکے پھر اپنی بات کو پلٹ دینا اہل بدعت ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ صراط مستقیم چھوڑ کر آدمی یونہی سرگرداں اور حیران ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ افعال کے مبادی ومناشی جو صفات حقیقیہ ہیں وہ قدیم ہیں، خود افعال قدیم نہیں ہیں، ورنہ مخلوقات کا قدیم ہونا لازم آئے گا، مثلاً فعل خلق اگر قدیم ہے تو اس کا مفعول بھی قدیم ہوگا، کیونکہ مؤلف بے چارہ تو ہر جگہ قدرت حقیقیہ مراد لے گا، اور فعل کے ساتھ بہرحال قدرت حقیقیہ ہوتی ہے، اس لئے جس آن فعل ہوگا اسی آن اس کے مفعول کا وجود بھی ضروری ہوگا، ورنہ اگر فعل اور مفعول میں تخلف ہوا تو قدرت کہاں ہوئی، مثال سے سمجھو کہ حق تعالیٰ کا فعل خلق آسمان سے متعلق ہوا تو دو صورت ہے، یا تو اسی وقت آسمان کا وجود ہوا یا نہیں؟ اگر ہوگیا تو چونکہ بقول مصنف فعل خدا قدیم ہے، لہٰذا آسمان بھی قدیم ہے، اور اگر کہو کہ اس وقت آسمان کا وجود نہیں ہوا تو قدرت کدھر گئی، اور نصوص صریحہ سے ظاہر ہے کہ آسمان کا وجود بہت بعد کا ہے، لہٰذا عرصۂ دراز تک قدرت سے خدا کا خالی ہونا لازم آئے گا، نعوذ باللہ۔ بہرحال دونوں شق باطل ہے، لہٰذا افعال کا قدیم ہونا بھی باطل ہے۔

اصل حقیقت جس پر کوئی استحالہ نہیں، یہ ہے کہ صفت خلق قدیم ہے وہ فعل خلق کی محتاج نہیں ہے، اور فعل خلق حادث ہے، زید آج پیدا ہوا تو فعل خلق اس کے حق میں پایا گیا، افعال باری تعالیٰ کو قدیم کہنا بداہت کے خلاف ہے۔

تم نے شارح مواقف کی عبارت **یمتنع علیه الکذب اتفاقاً** نقل کی ہے، اس کے آگے کی عبارت بھی دیکھ لو، فرماتے: **أما عند المعتزلة فلوجهین الاول أنه الکذب فی الکلام الذی هو عندهم من قبیل الافعال دون الصفات قبیح وهو سبحانه لایفعل القبیح وهو بناءً علیٰ اصلهم فی**

اثبات حکم العقل بحسن الافعال وقبحها مقیسة إلی اللّٰہ تعالیٰ وستعرف بطلانه۔

اس سے کیا سمجھے؟ یہ کہ کذب حق تعالیٰ کے حق میں بالاتفاق محال ہے، معتزلہ کے نزدیک بھی اور ہمارے نزدیک بھی، معتزلہ اس کو اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ کلام ان کے نزدیک محض کلام لفظی کو کہتے ہیں، کلام نفسی کے وہ منکر ہیں، اور کلام لفظی کا از قبیل افعال ہونا ظاہر ہے، اور کذب اس میں قبیح ہے، اور کوئی قبیح ان کے زعم کے مطابق تحت القدرۃ نہیں ہے، لہٰذا کذب بھی مقدور باری تعالیٰ نہیں ہے، یہ طریقۂ استدلال معتزلہ کا ہے جس کا بطلان آگے چل کر شارح مواقف کریں گے، اس استدلال کو مؤلف نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اپنے واسطے نقل کر دیا۔

حقیقت وہی ہے جو میں نے پہلے لکھا کہ کلام کے دو معنی ہیں، کلام نفسی اور کلام لفظی۔ کلام نفسی از قبیل صفات حقیقیہ ہے، اس میں صدق وکذب کا احتمال نہیں، اور کلام لفظی از قبیل افعال ہے اور افعال حادث ہیں، لہٰذا از قبیل ممکنات ہیں، اور اس کا صدق وکذب بھی از قبیل ممکنات **بمعنی کونها تحت القدرة** ہے۔

دوسرے اس طور پر بھی غور کرو کہ صفات حقیقیہ ذاتیہ تو تحت القدرۃ ہو ہی نہیں سکتیں، اب ان کے بعد اس دنیا میں بچا کیا بجز افعال باری تعالیٰ کے، چنانچہ ظاہر ہے کہ تمام ممکنات ومخلوقات **بجمیع افرادها و اجزاءها** حق تعالیٰ کے افعال کے مظاہر ہیں۔ اب اگر افعال بھی قدیم اور قائم بذاته تعالیٰ مان لو اور انھیں بھی دائرۂ قدرت سے خارج کر دو تو یہ بتاؤ کہ قدرت جو ایک صفت کمال ہے اس کا ظہور کہاں ہوگا، اس طرح تو کوئی چیز دائرۂ قدرت میں باقی نہیں رہ جاتی، پھر یہ پڑھ چکے ہو کہ ضد میں سے ایک پر اختیار ماننا دوسرے کے اختیار کو مستلزم ہے۔ اور افعال کی دو قسمیں

ہیں، حسن یا قبیح۔ ان دونوں میں نسبت تضاد کی ہے۔ اب اگر قبیح پر قدرت نہ ہو تو حسن پر قدرت آپ سے آپ ختم ہوگئی، تو صفات تو پہلے قدرت سے خارج تھیں، افعال بھی نکل گئے، لو میدان ہی صاف ہوگیا، اب کہنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کو محض نام کے لئے قادر کہا گیا تھا، ورنہ اس میں قدرت کا نام ونشان نہیں، یہ بعینہٖ فلاسفہ کا مسلک ہے، دیکھو بات کہاں سے کہاں جا پہونچی۔ نعوذ بالله من هٰذه الخرافات وأعاذنا الله من سوء الفهم وثبتنا الله على الصراط المستقيم

ہاں اگر کوئی صاحب دلیل سے ثابت کردیں کہ احد الضدین پر قدرت ضد آخر پر قدرت کو مستلزم نہیں ہے تو ہم بھی شوق رکھتے ہیں، ذرا دیکھیں تو سہی۔ کوئی صاحب اتنا ہی ثابت کردیں کہ افعال ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں، اور اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی تو ہم بھی اس کے مشتاق ہیں، البتہ اس دوسری صورت میں انھیں کذب کے ساتھ صدق کو دائرۂ قدرت سے خارج کرنا پڑے گا، کیونکہ ذاتیات سب کے سب واجب بالذات ہوتی ہیں، انھیں زیر قدرت لانا کسی کے بس میں نہیں، اس طرح خدا کو حقیقی معنی کے لحاظ سے صادق کہنا ممکن ہی نہ ہوگا۔

مکتوب طویل ہوگیا، لیکن سوچا کہ کسی قدر تفصیل کردی جائے تو اطمینان ہوجائے گا، بغور پڑھو، ان شاء اللہ سمجھ جاؤ گے، اگر کہیں شبہ ہو تو پھر لکھو، کئی جگہ میں نے طوالت کے خوف سے بعض امور کو ترک کردیا ہے، ان شاء اللہ اتنے ہی سے تشفی ہوجائے گی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۰؍صفر ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

﷽

عزیزی وحبیبی! زادکم اللہ علماً وعملاً ورزقکم فہماً وصلاحاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل تمہارا خط اذانِ عشاء کے بعد ملا، اس وقت ایک نگاہ طائرانہ ڈال لی تھی، آج دوبارہ بغور پڑھا، بہت خوشی ہوئی کہ تم نے خط کے مضامین سمجھ لئے، مجھے آں عزیز سے یہی توقع تھی، اور اسی لئے قدرے بسط سے میں نے کام لیا تھا، خدا تعالیٰ تمہیں علم نافع اور عمل صالح نیز فہم سلیم کی دولت سے سرفراز فرمائے۔

اب تم اپنے اشکالات کے جواب سنو! اپنے خط کی نقل تو رکھے ہوگے، اس لئے تمہارے سوالات نقل نہیں کرتا محض جواب پر اکتفاء کروں گا۔

براہین قاطعہ کی جس عبارت سے تمہیں اشکال ہوا وہ شروع سے میرے ذہن میں تھا، لیکن اس وقت کتابوں کی طرف رجوع کی فرصت نہ تھی، محض ایک کتاب سامنے تھی، بہت عجلت میں خط تحریر کیا تھا، اس لئے یہ اشکال زیرِ تحریر نہیں آیا، اب تم نے سوال کیا تو میں نے فتاویٰ شامی اور شرح عقائد کی جانب مراجعت کی، اب حقیقت سنو!

براہین قاطعہ کی عبارت اور میری عبارت میں جو تضاد معلوم ہوتا ہے وہ درحقیقت مسئلہ کا تضاد نہیں ہے، تعبیر کا اختلاف اور تشریح وعید کا اختلاف ہے، وعید کی جو تشریح میں نے کی ہے وہ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذری۔ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے بعض مواعظ میں اور قرآن وحدیث کے بعض الفاظ کی تفسیر وشرح کے ذیل میں اس کی جانب اشارہ موجود ہے، اگر تم چاہو گے تو بعد میں ان اشاروں کی تفصیل بتاؤں گا۔ ابھی اصل مدعا پر گفتگو ضروری ہے، البتہ جو تشریح کتابوں میں نظر سے گذری، اس کی بنا پر خلف فی الوعید کا مسئلہ زیرِ بحث آجاتا ہے، اس تشریح کے لحاظ

سے وعید بھی درحقیقت وعدہ کی ایک قسم ہے اور اس کے خلاف کرنا خلف فی الوعید ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ خلف فی الوعید ممتنع ہے ورنہ کلام باری تعالیٰ میں کذب لازم آئے گا، معتزلہ اپنے اصول بلکہ اپنے اوہام باطلہ کے لحاظ سے قبائح پر قدرت باری تعالیٰ تسلیم نہیں کرتے، اور اسی بنا پر بندوں کے افعال اختیاریہ کا خالق وہ خود بندوں کو گمان کرتے ہیں۔

حضرات اشاعرہ کے نزدیک خلف فی الوعید نہ صرف یہ کہ تحت القدرۃ ہے، بلکہ اس کا وقوع وظہور بھی ثابت اور جائز ہے، اس سلسلے میں اگر کذب کا شبہ پیش کیا جائے تو وہ حضرات اسے کذب تسلیم نہیں کرتے، بلکہ فرماتے ہیں کہ خلف فی الوعید بخشش وکرم اور رحمت وعنایت ہے، بھلا اس کو کذب کیسے کہا جاسکتا ہے، یہ تو خوبی اور کمال ہے، اسی کو علامہ تفتازانی نے نقل کیا ہے کہ: **زعم بعضهم أن الخلف فی الوعید کرم فیجوز من الله تعالیٰ**، پھر اس کے آگے لکھتے ہیں کہ: **والمحققون علیٰ خلافه کیف وهو تبدیل للقول وقد قال الله تعالیٰ : مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ**، یہ محققین جن کا قول علامہ تفتازانی نے نقل کیا ہے، حضرات ماتریدیہ ہیں۔ دونوں جماعتیں زمرۂ اہل سنت میں داخل ہیں، شوافع اکثر اشاعرہ ہیں، اور احناف اکثر ماتریدی ہیں۔ اسی اختلاف کی جانب براہین قاطعہ میں اشارہ موجود ہے، میں نے جہاں تک ان دونوں نظریات پر غور کیا ہے، میری ناقص رائے میں یہ اختلاف حقیقی نہیں ہے، محض اختلاف لفظی ہے، اس اختلاف سے امکان کذب بمعنی **کونه مقدوراً لله تعالیٰ نفیاً و اثباتاً** کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

تفصیل سنو! اتنی بات تو دونوں فریق کے نزدیک ثابت اور مسلم ہے کہ حق تعالیٰ نے افعال واعمال اور کلمات واقوال کی جو خاصیات وتاثیرات براہ راست

قرآن میں اور بالواسطہ احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی لسان فیض نشان پر ظاہر فرمائی ہیں، ان کی وہ خاصیات وتاثیرات انمٹ اور لازوال ہیں، ان میں تبدیلی پیدا کرنا غیر ممکن ہے، مثلاً زنا کو فاحشہ اور سبب مقت فرمایا ہے، تو اب ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ زنا فی نفسہٖ سبب مقت ہونے کے بجائے سبب رضا بن جائے، یا کم از کم یہی کہ وہ مقت کی تاثیر سے خالی ہوجائے، مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ، میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

دوسری بات یہ بھی فریقین کے نزدیک مسلم ہے کہ عُصاۃ مومنین جو بلاتوبہ مر گئے، ان کی مغفرت ہونی نہ صرف یہ کہ ممکن ہے، بلکہ اس کا وقوع بھی صحیح احادیث کی روشنی میں ثابت ہے، ہاں البتہ کسی کافر کی مغفرت نہیں ہوسکتی۔

پھر یہ بھی بروئے نصوص صریحہ مسلّم عند الفریقین ہے کہ وعدے اور وعیدیں دونوں کی دو دو قسمیں ہیں، وعدۂ عام اور وعدۂ خاص، نیز وعید عام اور وعید خاص۔ مثلاً ایک وعدہ تو یہ ہے کہ اہل ایمان جنت میں ہوں گے، من قال لاالہ إلا اللہ دخل الجنۃ، اس مضمون کی بے شمار نصوص سے قرآن وذخیرہ احادیث لبریز ہے، یہ وعدے عام ہیں، کسی شخص خاص سے متعلق نہیں ہیں، جو ان صفات کے ساتھ متصف ہوگا ان بشارتوں کا مورد ہوگا۔ دوسرے مثلاً یہ کہ ابوبکر جنتی ہیں، عمر جنتی ہیں، ابوبکر جنت کے ہر دروازے سے بلائے جائیں گے، حضرت عائشہؓ کے لئے قرآن میں جنت اور رزق کریم کا وعدہ ہے، یہ وعدے خاص ہیں جو مخصوص افراد یا مخصوص جماعتوں سے کئے گئے ہیں، ٹھیک اسی طرح وعیدیں بھی دو طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ کفر وشرک یا فلاں فلاں صفات کا جو حامل ہوگا وہ ناری ہے، یہ عام وعیدیں ہیں جو مخصوص صفات سے متعلق ہیں، کوئی شخص معین اس کا مورد نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ابوجہل جہنمی ہے، ابولہب کے بارے میں سیصلیٰ ناراً ذات لھب وارد ہے، طلحہ اور

زبیر کے قاتلین جہنمی ہیں، حضرت علی کا قاتل جہنمی اور بدبخت ہے، یہ وعیدیں مخصوص افراد سے متعلق ہیں۔

اب تم غور کرو، مخصوص وعیدیں جن کا تعلق افرادِ خاصہ سے ہے، ان میں خلف فی الوعید کا قائل کوئی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ان میں اس خلف کا قائل ہونا در حقیقت مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ، کا منکر ہونا ہے، اس لئے مخصوص وعیدات میں خلف غیر ممکن ہے، یہ معنی نہیں کہ خلاف پر حق تعالیٰ قادر نہیں ہیں، حاشا وکلا، وہ سارے کافروں کو جنت میں بھیج دیں اور تمام مومنین کو جہنم میں ڈال دیں، کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ، بلکہ یہ کہ جو بات کہہ دی گئی، پتھر کی لکیر ہے، اس کے خلاف نہ کریں گے اور اپنے ارادہ سے نہ کریں گے۔

پس خلف فی الوعید کا تعلق کا تعلق محض وعیدات عامہ سے رہ گیا، مثلاً ایک شخص ہے جس نے کفر وشرک کے علاوہ ہر گناہ کا ارتکاب کیا ہے، یہ شخص بروئے وعیدات عامہ مستحق نار ہے، مگر رحمت حق آتی ہے اور اس کے تمام گناہوں سے صرف نظر کر کے اسے جنت میں پہونچا دیتی ہے، اب بظاہر چونکہ یہ عمل وعیدات عامہ کے خلاف ہوا ہے، اس لئے حضرات اشاعرہ اسے خلف فی الوعید کا نام دیتے ہیں، اور اسے انھوں نے بخشش وکرم فرما کر شائبۂ کذب سے بچا لیا۔ حضرات ماتریدیہ فرماتے ہیں کہ گو یہ شخص وعیدات عامہ کے تحت مستحق نار تھا، اور یہ بھی ہے کہ یہ معاصی اپنی اپنی تاثیر علیٰ حالہ رکھتے ہیں، لیکن شخص مذکور اس عام میں مخصوص تھا، ہمیں اس تخصیص کا علم نہ تھا، حق تعالیٰ کا علم ازلاً ابداً سب کو محیط ہے، اس لئے اس عام سے اس کی تخصیص ابتداء ہی سے ثابت تھی، اور ان تخصیصات کو حق تعالیٰ نے اجمالاً وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ میں بیان فرما دیا ہے، اس لئے حقیقۃً یہ خلف فی الوعید نہیں ہے،

اب تم خود دیکھ لو ان دونوں نظریوں میں کوئی تعارض ہے؟ نتیجہ پر دونوں متفق ہیں کہ عُصاۃ مومنین کی نجات بلا توبہ بھی واقع ہے۔ ایک جماعت ظاہر وعید پر نگاہ کرکے اسے خلف تسلیم کرتی ہے، دوسری جماعت حقیقت پر نظر کرکے خلف تسلیم نہیں کرتی، تناقض کے لئے وحدت محل شرط ہے، یہاں دونوں کا محل الگ الگ ہے، لیکن بہرحال اتنی بات مسلم ہے کہ حضرات اشاعرہ ہوں یا ماتریدیہ وقوع کذب کی جانب کسی کا ذہن نہیں گیا، اس لئے میں نے کہا تھا کہ اہل سنت کے اصول کے مطابق خلف فی الوعید سے امکان کذب یا وقوع کذب کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا، البتہ معتزلہ چونکہ حسن وقبح اور عذاب وثواب کے لئے حکم اور فیصل عقل انسانی کو مانتے ہیں، اس لئے عُصاۃ مومنین کو عذاب نہ ہو تو ان کی عقل کے خلاف ہے، کیونکہ وعیدات عامہ کے خلاف ہے اس لئے وہ کسی تخصیص کی گنجائش تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ عقل نے ان تخصیصات کا ادراک نہیں کیا ہے، اگر عُصاۃ مسلمین کو عذاب نہ ہو تو خلف فی الوعید حقیقۃ لازم آئے گا اور باعتبار نتیجہ کے کلام خداوندی میں کذب ثابت ہوگا، وہ اس وعید عام میں تو تخصیص کے قائل نہیں ہیں، البتہ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ کو مخصوص بالتوبہ جانتے ہیں جو معلوم ہے، اور یہ ان کی کج فہمی بلکہ ہٹ دھرمی کی دلیل ہے، اور وہ تو اس سے آگے کی بات کہتے ہیں کہ مرتکب کبائر مومن رہتا ہی نہیں، اس لئے کہ ایمان پر جنت کی بشارت ہے، پھر اگر اسے مومن مانا جائے تو ضروری ہے کہ وہ جنت میں جائے، کیونکہ اگر جنت میں نہ جائے تو خلف فی الوعد لازم آئے گا، اور اگر جائے تو خلف فی الوعید کا قائل ہونا پڑے گا اور کافر مانا جائے تو کبھی اس کی مغفرت نہ ہوگی، اور ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہے گا تو یہ بھی خلف فی الوعد ہوگا، کیونکہ نصوص صریحہ سے ثابت ہے کہ اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے بعد مرتکب کبیرہ جنت میں جائے گا، اب اسے مومن

کہیں تو غلط، اور کافر کہیں تو غلط، دونوں جانب اندھیرا ہے، اب انھوں نے اپنی نارسائی فہم کو تو سمجھا نہیں، جھٹ ایک اور درجہ ایمان وکفر کے درمیان تسلیم کرلیا اور اپنی دانست میں خلف کی دونوں خرابیوں سے نجات پالی، حالانکہ اس کے نتیجے میں بے شمار نصوص صریحہ کا انھیں انکار کرنا پڑا، اور بغیر کسی دلیل کے محض اپنے اوہام کی بنا پر منزلۃ بین المنزلتین کی خرابی بھی اپنے سر مول لینی پڑی۔ **والقصة بطولها**

خلاصہ یہ کہ بلاشبہ خلف فی الوعید کا سراغ قدماء کی عبارتوں میں ملتا ہے، اور ان کے درمیان نزاع بھی واقع ہوئی ہے، لیکن نزاع محض لفظی ہے، میں نے جب اس پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ سرے سے کوئی نزاع ہی نہیں ہے، اس لئے یہ تعبیر بدل دینی چاہئے تاکہ نزاع لفظی اور اختلاف صوری بھی اٹھ جائے، اور اصل حقیقت سامنے آجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ وعیدات عامہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ انھیں اشخاص سے متعلق نہ کیا جائے، بلکہ صرف بیان خاصیات پر محمول کیا جائے، مثلاً ہماری زبان میں ایک طبیب کہتا ہے کہ ''تم اگر زہر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے'' اس کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ زہر میں تاثیر موت ہے، اب فرض کرو کہ اس شخص زہر کھالیا اور نہیں مرا تو کیا وہ طبیب جھوٹا ہے، یا یہ خلف فی الوعید ہے ہرگز نہیں۔ زہر کی تاثیر تو بلاشبہ وہی ہے، مگر اس شخص میں تاثیر سے مانع کوئی چیز موجود ہوگی، جس کی وجہ سے زہر کا اثر ظاہر نہیں ہوا، اسی طرح سمجھ لو کہ وعیدات عامہ کے پیرایہ میں اعمال وافعال کی کچھ خاصیات بیان کی گئی ہیں، اگر کوئی شخص ان افعال قبیحہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور پھر اس کے باوجود اس کی مغفرت ہوجاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان افعال کی خاصیت تبدیل ہوگئی، بلکہ یہ ہے کہ افعال قبیحہ کا اثر بوجہ کسی مانع کے ظاہر نہیں ہوا، خواہ وہ مانع توبہ ہو یا

شفاعت ہو یا کسی بڑی نیکی کا وجود ہو، یا محض رحمت الٰہی ہو، اگر افعال قبیحہ کی تاثیر بدلتی تو ضرور **مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ** کے خلاف ہوتا، گو حق تعالیٰ تبدیل خاصیات پر بھی قادر ہیں، لیکن چونکہ ایک خاصیت کی خبر دے چکے ہیں، اگر اس کی وہ خاصیت تبدیل کریں گے تو کذب پھر بھی لازم نہ آئے گا، کیونکہ مالک کو اپنی مملوکات میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہے اور تبدیلی خاصیت ظاہر ہے کہ ایک قسم کا تصرف ہی ہے، اسے کذب نہیں کہہ سکتے البتہ نسخ کہنا چاہو تو مضائقہ نہیں، لیکن اگر اس نسخ کی اطلاع نہ دیں تو یہ بندوں کے حق میں ظلم ہوگا، کیونکہ بندے تو اس خیال سے کہ فلاں فعل خاص میں فلاں خاصیت قبیحہ ہے، اس سے اجتناب کا اہتمام کئے ہوں گے، اور حق تعالیٰ نے چونکہ خاصیت تبدیل کر کے مثلاً اسے فرض کر دیا ہے، اور اس سلسلے میں ان سے مواخذہ فرماویں تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ تکلیف مالایطاق اور ظلم ہے، اسی لئے کے **مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ** کے بعد **وَمَآأَنَابِظَلَّامٍ لِلْعَبِیْدِ** فرمایا، یعنی ظلم کی نفی فرمائی کذب کی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبدیلی قول ظلم ہے کذب سے اس کا تعلق نہیں، اور اس سے یہ بھی دریافت ہوا کہ علامہ تفتازانی نے محققین کے نظریہ کے لئے **مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ** سے جو استدلال کیا ہے، وہ دعویٰ عدم خلف پر راست نہیں آتا، **والعاقل تكفيه الاشارة** ....غرض میری تعبیر و تشریح نے خلف فی الوعید کا لفظ ہی درمیان سے اٹھا دیا، جس کی بنیاد پر نزاع کا امکان تھا، اور اسے ختم ہونا ہی بہتر ہے، کہ خواہ مخواہ ایک غلط بات کا ایہام ہوتا ہے، اور ہر ایسے لفظ سے احتیاط کرنی چاہئے جو موہم غلط ہو، اسی طرح امکان کذب کے لفظ سے بھی پرہیز کرنا ہی بہتر ہے، کیونکہ امکان کے معنی جہاں تحت القدرۃ ہونا ہے، وہیں امکان کا معنی یہ بھی ہے کہ کسی شئے کی نفی ضروری نہ ہو، اور اس کا وجود محال نہ ہو، بلکہ یہ دوسرا معنی ہی زیادہ عام فہم اور اس

سے خواہ مخواہ باری تعالیٰ کے کلام میں احتمال کذب پیدا ہوتا ہے، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ صدق وکذب دونوں تحت القدرۃ ہیں تو عنوان کی وحشت نا کی ختم ہوجاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب براہین قاطعہ اور میری عبارت میں تعارض کا جو شبہ واقع ہوا تھا وہ دور ہوگیا ہوگا، مطلب یہ ہے کہ گو مولانا خلیل احمد صاحب کی عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ وہ خلف فی الوعید کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اور اس کی فرعیت میں امکان کذب کو بھی لاتے ہیں، اس کے برخلاف بندہ کی تشریح کے مطابق اولاً تو خلف فی الوعید کا ثبوت ہی نہیں اور اگر ہو تو امکان کذب کا مسئلہ اس کی فرع نہیں، بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ نظر بظاہر اشاعرہ خلف فی الوعید مانتے ہیں اور پھر گو کہ اسے کرم اور بخشش کا نام دے کر کذب سے یکسو کرتے ہیں لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ خواہ بخشش وکرم ہو لیکن ہے خلاف خبر، اس لئے اسے کذب ہی کہیں گے، مستقبح نہ سہی کذب مستحسن سہی، لیکن نفس کذب کا صدق تو اس پر ہوا۔ اس اعتبار سے امکان کذب خلف فی الوعید کبھی فرع قرار پاتا ہے، لیکن یہ سب بظاہر نظر ہے، اصل حقیقت کی تنقیح کے بعد یہ دونوں باتیں ھباءً منثوراً ہوجاتی ہے، مولانا علیہ الرحمہ کا موضوع اس موقع پر تنقیح حقیقت نہیں ہے بلکہ سرسری طور پر اس کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے نظر بظاہر جو کچھ تھا اس کی طرف محض اشارہ کر دیا، اس طرح تعارض دفع کرلو۔ اور اگر اب بھی دفع نہ ہو تو یوں سمجھ لو کہ معتزلہ نے خلف فی الوعید کا انکار امکان کذب ہی کی بنیاد پر آیا تھا، اس لئے ہمارے لوگوں نے بھی تسامحاً اس کو اسی کے ساتھ جوڑ دیا، ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

(۲) تمہارا دوسرا اشکال میری سمجھ میں نہیں آیا، شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام تمام تر خبروں ہی پر مشتمل ہے، اس میں انشاء ہے ہی نہیں، اگر یہی مطلب

ہے تو میرا گمان یہ ہے کہ خبروں کی اصل حقیقت تمہارے ذہن میں نہیں ہے، اور میرے اس گمان کی بنیاد یہ ہے کہ ایک جگہ تم نے لکھا ہے کہ ''انشاء سے مراد عدم سے وجود بخشنا ہے،'' اور خبر کو حکایت واقعات ماضیہ میں تم نے منحصر کیا ہے، پھر دوسری جگہ بطور احتمال ثانی کے انشاء سے مراد کلام غیر مفید غیر محتمل صدق وکذب لکھا ہے، یہ تینوں باتیں غلط ہیں، مرکب غیر مفید کلام ہی نہیں ہوتا، تا بانشاء چہ رسد؟ اور عدم سے وجود بخشنا از قبیل الفاظ ہے ہی نہیں، تا بہ کلام چہ رسد؟ خبر نام ہے حکایت واقعہ کا، خواہ وہ ماضی سے تعلق رکھتا ہو یا حال سے یا مستقبل سے، اور انشاء نام ہے ایسے کلام کا جو مفید تو ہو مگر کسی واقعہ کی حکایت نہ ہو، مثلاً امر ونہی وغیرہ۔ حق تعالیٰ کے کلام میں دونوں چیزیں بکثرت ہیں، ایک جگہ تم نے لکھا ہے کہ ''کلام تو خود نحو میں جملہ مفیدہ کو کہتے ہیں تو انشاء کا دخول اس میں کیونکر ممکن ہے'' اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تم انشاء کو مرکب مفید سے خارج سمجھتے ہو، یہ غلط ہے، مرکب مفید کی دو قسمیں ہیں، خبر اور انشاء۔

(۳) تیسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ شئ کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر بالفعل ارادہ کا وقوع ہو، بلکہ اس کا مطلب محض اسقدر ہے کہ وہ تعلق ارادہ کی صلاحیت رکھتا ہو، خواہ ارادہ اس کے ایجاد واصدار کا ہو، یا اعدام وسلب کا، ارادہ کا تعلق دونوں جانب سے ہوتا ہے، تو کذب کے صدور کا نہ سہی عدم صدور کذب کا ارادہ تو ضرور ہوگا، پھر جب عدم صدور کذب تحت القدرۃ ہے تو اس کی نقیض بھی لازماً تحت القدرۃ ہوگی۔ مسئلہ ارادہ صدور کذب کا نہیں ہے، تحت القدرۃ ہونے کا ہے۔ صفات حقیقیہ محضہ اور صفات حقیقیہ اضافیہ باعتبار مبدأ ہی دو چیزیں ایسی ہیں، جو تحت القدرۃ نہیں ہیں، باقی ان کے علاوہ تمام امور تحت القدرۃ ہیں خواہ وہ از قبیل محاسن ہو یا از قبیل مساوی، سب ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر کے تحت ہیں۔

(۴) چوتھے شبہ جواب تو تم نے خود لکھ دیا ہے، البتہ معتزلہ کا مسلک نہ سمجھنے کی وجہ سے خلجان پیدا ہو گیا ہے، بات یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک کلام نفسی کوئی چیز نہیں ہے، وہ خدا تعالیٰ کو متکلم بالغیر مانتے ہیں، بلکہ انھوں نے خدا تعالیٰ کی توحید قائم رکھنے کے لئے تمام صفات کا انکار کر دیا، ان کے خیال میں کلام اللہ کا اطلاق اس پر ہے جو لوح محفوظ میں ہے، جو جبرئیل علیہ السلام نے پڑھ کر حضور ﷺ کو سنایا، جو بین الدفتین مکتوب ہے، جسے ہم تم پڑھتے ہیں، خود حق تعالیٰ کی ذات عالی میں بذات خود کوئی کلام موجود نہیں ہے، اس لحاظ سے دیکھو تو حق تعالیٰ میں سرے سے تکلم موجود ہی نہیں، اور جس کو کلام باری کہتے ہیں وہ باری تعالیٰ سے علیحدہ منفصل چیز ہے، اور ظاہر ہے کہ ذات باری تعالیٰ سے جو چیز منفصل اور جداگانہ ہے وہ حادث اور مخلوق ہے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہتے ہیں ٹھیک اسی قیاس پر ان کے نزدیک قرآن کلام اللہ ہے، اور جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام باوجود کلمۃ اللہ ہونے کے مخلوق ہیں، یونہی قرآن کلام بھی مخلوق ہے۔

اس کے برخلاف اہل سنت قرآن کو اصالۃً حق تعالیٰ کی صفت قرار دیتے ہیں، یعنی کلام اللہ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اس مرتبہ میں وہ واحد و بسیط ہے، نہ حرف وصوت کا محتاج ہے اور نہ ترکیب وافراد کی وہاں گنجائش ہے، اس میں امر و نہی محض اعتباری اور ملحوظ ذہنی ہے، پھر جب حق تعالیٰ نے لوح و قلم کو پیدا فرمایا تو اسی کلام نفسی نے الفاظ و حروف اور کلمات و تراکیب کی صورت میں تجلی فرمائی، اور لوح محفوظ نے اس کے نقوش کو محفوظ کیا، پھر اسی کی قرأت جبرئیل کے ذریعے نبی اقدس ﷺ تک پہونچی، تو کلام اللہ تو غیر مخلوق اور غیر حادث ہے، البتہ ہم تم جو کچھ اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں وہ حرف وصوت حادث ہیں، لیکن تم جانتے ہو کہ دوسرے کی بات چیت

نقل کی جاتی ہے اس کو نقل کرنے والا کبھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا، اصل قائل کی جانب منسوب کرتا ہے، اور اپنے کو محض ناقل سمجھتا ہے، مثلاً تم علامہ اقبال کا کوئی شعر پڑھو تو نہ تمہیں یہ وسوسہ ہوگا اور نہ کسی دوسرے کو یہ شبہ ہوگا کہ یہ کلام تمہارا ہے، بلکہ ہر ایک جانتا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے، تم اسے پڑھ رہے ہو، اور اس کے ناقل ہو، پس تم قاری وحاکی تو ضرور ہوئے، لیکن اس کلام کے متکلم نہ ہوئے، اسی طرح سمجھو کہ کلام اللہ جو **بین الدفتین** ہے وہ اصل کلام اللہ جو کہ کلام نفسی ہے اور صفت قائمہ بالذات ہے، اس کی نقل اور اس پر دال ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہم تم اسے پڑھیں یا قلم سے اس کی کتابت کی جائے ہر صورت میں اسے کلام اللہ ہی کہا جائے گا، ہم تم اس کے متکلم نہیں، ہاں قاری اور تالی ضرور ہیں ہم پر متکلم بالقرآن کا اطلاق درست نہیں ہے، البتہ قاری قرآن کا اطلاق صحیح ہے۔ امام بخاری نے **لفظی بالقرآن حادث** فرمایا تو مبتلاء آلام ہوگئے، حالانکہ ان کی بات بالکل حق تھی، لیکن اس میں ایہام تھا جس سے معاندین نے فائدہ اٹھایا، اگر یوں فرماتے کہ **قرأتي للقرآن حادثة** تو کوئی مسئلہ نہ تھا، غرض کلام باری تعالیٰ اصالۃً تو کلام نفسی ہی ہے اور حق تعالیٰ کا تکلم اسی کے ساتھ ہے، کلام نفسی مرتبۂ ذات میں مطلق ہے اور تجلی ونزول کے بعد مقید ہے، بندہ کی رسائی مرتبۂ اطلاق تک ہرگز نہیں ہے، یہ خود محدود ومقید ہے، تو اس کے لئے مقید چیزیں ہی مناسب ہیں، مثال سے سمجھو کہ روشنی جب تک سورج میں ہے مطلق ہے، اگر اس کے بالمقابل کوئی چیز نہ ہو تو علی الاطلاق رہے گی مگر جب اس کا تقابل زمین سے ہوتا ہے اور زمین چمک اٹھتی ہے تو اب وہ مقید ہے، پھر اگر وہ مختلف روشندانوں سے گزر کر گھر میں آئی، تو ہر روشندان کی شکل میں متشکل ہو کر آئے گی، ظاہر ہے کہ مبدأ کے لحاظ سے تو واحد اور بسیط ہے، البتہ باعتبار تجلی للارض کے اس کی بساطت ختم ہوگئی

اور وحدت واطلاق بھی زائل ہوگیا، لیکن وہ روشنی پھر بھی سورج ہی کی کہلائے گی، روشندان یا زمین کی نہ کہلائے گی، اسی طرح اگر وہ آئینہ میں منعکس ہوکر کسی دیوار وغیرہ پر پڑے جب بھی اسے آئینہ کی روشنی نہ کہیں گے سورج ہی کی روشنی ہوگی، اگرچہ آئینہ سے ہوکر آئی ہے، اور جب وہ سورج ہی کی روشنی ہے، تو وہی واحد وبسیط مراد ہوگی جو اصل مرتبہ ذات میں تھی، ان مقید روشنیوں کو اس کی شیونات کہیں گے، پس اب مسئلہ واضح ہے کہ قرآن جو بین الدفتین ہے ہماری تمہاری زبان سے ادا ہوتا ہے، وہ بحیثیت تقید بین الدفتین اور بحیثیت مقروء الانسان ہونے کے ضرور مقید ومحدود ہے، لیکن اس کا لحاظ عرف عام میں ہرگز نہیں ہوتا، وہ درحقیقت کلام اللہ ہی ہے ہم اس کے حاکی وقاری ہیں۔ اس لئے اسے نہ مخلوق کہنا جائز ہے اور نہ حادث! اور اگر کہا جائے تو بات حضرت ذات تک پہونچ جائے گی جو بغایت قبیح ہے، اس کے برخلاف معتزلہ حضرت ذات میں صفت کلام کو تسلیم ہی نہیں کرتے، وہ یہی ہماری تمہاری قرأت کو کلام اللہ قرار دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ بدیہی البطلان ہے، اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ قرآن کو مخلوق وغیر مخلوق ماننے کی نزاع اصل نہیں ہے فرع ہے، اصل یہ ہے کہ حضرت ذات کے لئے صفات کا ثبوت ہے یا نہیں، معتزلہ منکر ہیں اور اہل سنت مثبت، اور قرآن واحادیث کی صریح نصوص اس کی شاہد، اب دونوں مسلکوں کا فرق واضح ہوگیا، باللہ التوفیق۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۳۰ر صفر ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملا، اشکالات سے خوشی ہوئی کہ تلاش وتحقیق کا مادہ الحمد للہ کہ بدرجۂ اطمینان تمہارے اندر ہے، البتہ میرے خط کے مندرجات پر غور کم کیا ہے، اگر ذرا صبر وتامل سے اپنے اشکالات کو ذہن میں رکھ کر میرا خط بار بار پڑھتے تو جواب کے اشارات تمہیں مل جاتے، لیکن یہ بھی اچھا ہے کچھ اور باتیں زیر تحریر آ جائیں گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ میں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے قول کی تصحیح اور ان کی وکالت کا قصد ہی نہیں کیا ہے کہ تم مجھ سے اس کا مطالبہ کرو، یہ کام تو مناظر کا ہے۔ مجھے تو مسئلۂ کذب کی مقدوریت ثابت کرنی تھی، اسی سلسلے میں میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ مسئلہ خلف فی الوعید کے ضمن میں اہل سنت کے اصول کے مطابق آتا ہی نہیں، ہاں معتزلہ کے زعم کے مطابق آتا ہے۔ تم نے اس پر اشکال کیا کہ علماء اہل سنت تو اسے خلف فی الوعید کی فرع تسلیم کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں خود خلف فی الوعید کی جانب ذہن منتقل ہوا، تو محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ بھی علماء اہل سنت کے اصول کے مطابق جس مقام پر آیا ہے وہاں نہیں آتا، ہاں معتزلہ نے اولاً اس کا ذکر کیا ہے اور انھیں کے یہاں سے ہمارے یہاں آیا، اور اسی بنا پر میں نے گزشتہ مکتوب میں لکھا تھا کہ حقیقت الامر کے لحاظ سے خلف فی الوعید کا مسئلہ ہمارا نہیں ہے معتزلہ کے یہاں سے نقل ہو کر برائے جواب آیا ہے، گویا جو کچھ کتب کلام میں منقول ہے وہ علیٰ سبیل التسلیم ہے، اور جو کچھ بندہ نے لکھا ہے وہ علیٰ سبیل التحقیق ہے، اور مآل دونوں کا احقاق حق ہے، اگر قدماء نے کوئی دلیل کسی مسئلہ کی یا تفصیل ذکر نہ کی ہو تو کیا بعد والوں کو اس کی اجازت نہ ہوگی، پھر یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ کسی نے یہ تحقیق نہیں لکھی ہے، ہماری تمہاری نظر کتب عقائد پر کتنی ہے ہی۔

اب اس کی شرح سنو! اعتراضات کے مورد مولانا خلیل احمد صاحب نہیں

ہیں، انھوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے، انھوں نے تو محض عبارت نقل کی ہے، اگر اعتراض ہوگا تو اصل علماء متکلمین پر، لیکن درحقیقت ان پر بھی کوئی اعتراض نہیں، مسئلہ خلف فی الوعید ہو، یا مسئلہ امکان کذب ہو، ہماری کتابوں میں اصالتاً اور ابتداءً نہیں آیا ہے بلکہ معتزلہ کے ایک مسئلہ کے جواب میں معرض بحث میں آیا ہے، اور اعتراض وجواب کے ذیل میں جو مسائل آجاتے ہیں وہ عموماً بالاستقلال موضوع بحث نہیں بنتے، ہاں اگر ایسی کوئی ضرورت متقاضی ہوتی ہے تو پھر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ تم نے اس پر نہیں غور کیا کہ خلف فی الوعید کا مسئلہ ہماری کتابوں میں آیا کہاں سے؟ سلف میں اس بات پر کبھی اختلاف نہیں ہوا کہ حق تعالیٰ علی العموم جس گناہ کی اور جس شخص کی مغفرت چاہیں اس پر قادر ہیں، اسی طرح جس کو عذاب دینا چاہیں اس پر بھی علی الاطلاق قادر ہیں، اس میں کسی عمل اور کسی شخص کی تخصیص نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض کی مغفرت اور بعض کی تعذیب موعود ہے، اور حق تعالیٰ خلاف وعدہ کام نہیں کریں گے، لیکن خلاف وعدہ نہ کرنا اختیار سے ہوگا قدرت مسلوب نہیں ہے، اس کے متعلق اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ پر کوئی حق واجب نہیں ہے، یعذب من یشاء ویرحم من یشاء، اسی شان قدرت وبے نیازی کا اثر ہے کہ جن لوگوں کو معرفت الٰہیہ میں جس قدر رسوخ ہوتا ہے وہ اسی حساب سے لرزہ براندام رہتے ہیں، سلف کے بعد معتزلہ اور خوارج کا ظہور ہوا، انھوں نے شریعت میں اور قرآن میں اپنی رائے کو داخل کرنا شروع کیا، انھوں نے کہا کہ گناہِ کبیرہ بلا توبہ پر عذاب دینا، اور ایمان وعمل صالح پر ثواب عنایت فرمانا حق تعالیٰ کے ذمہ حق واجب ہے، مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے خلاف پر قادر نہیں ہے، انھوں نے بطور دلیل کے یہ کہا کہ اگر مغفرت عاصی بغیر توبہ یا تعذیب مطیع کو مقدور باری تعالیٰ مان لیا جائے تو وعدوں اور

وعیدات میں خلف لازم آئے گا، اور اس کے نتیجے میں کذب ضرور لازم آئے گا، اور پہلے خط میں تم پڑھ چکے ہو کہ معتزلہ منکر صفات ہیں، وہ باری تعالیٰ کے لئے محض افعال ثابت کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اصول کے لحاظ سے مقدور ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ درجۂ فعلیت میں ہو، مطلب یہ ہے کہ قدرت ان کے نزدیک کوئی صفت نہیں ہے کہ صدور فعل کے لئے ایک اور درجہ تسلیم کرنا پڑے، قدرت اور مقدوریت دونوں فعل ہیں، تو اگر مغفرت عاصی بلا توبہ مقدور ہو تو گویا وہ درجۂ فعلیت میں ہے، پھر وہ قول خداوندی کے خلاف ہوگی، اس لئے قول میں کذب لازم آئے گا، اس طرح خلف وعید ہو یا مسئلہ کذب ہو، دونوں معتزلہ کے اصول کے باعث لازم آئیں گے، اور اس نزاع کی اصل یہاں نہیں مسئلہ صفات میں ہے کہ وہ منکر صفات ہیں اور ہم مثبت صفات ہیں۔ قدرت ہمارے نزدیک منجملہ صفات کے ہے اور اس درجہ میں اس کا تعلق محاسن اور قبائح سب سے ہے، اور ان کے نزدیک قدرت منجملہ افعال کے ہے، اس لئے اس کا تعلق وہ قبائح سے نہیں مانتے۔

بہر کیف مسئلہ صفات ہی کی یہ فرع ہے، اب شرح مواقف کی اس عبارت پر غور کرو اور دیکھو کہ میں نے جو کہا ہے کہ یہ دونوں مسئلے ہمارے یہاں ابتداءً نہیں آئے ہیں، بلکہ ضمناً آ گئے ہیں، اور یہ کہ ہمارے اکابر نے جواب علیٰ سبیل التسلیم دیا ہے، اس عبارت سے نکلتا ہے یا نہیں۔

> ”وأما العقاب ففيه بحثان :۔ الاول أوجب جميع المعتزلة والخوارج عقاب صاحب الكبيرة إذامات بلا توبة ولم يجوزوا أن يعفوالله عنه بوجهين ، الاول :۔ أنه تعالیٰ أوعد بالعقاب على الكبائر وأخبر به أی بالعقاب عليها فلولم يعاقب على الكبيرة وعفا لزم الخلف فی وعيده والكذب فی خبره وأنه محال ، والجواب غايته

> وقوع العقاب فاين وجوبه الذى كلامنا فيه اذلا شبهة فى أن عدم الوجوب مع الوقوع لايستلزم خلفاً ولا كذباً لايقال: انه يستلزم جوازهما وهو ايضاً محال لانا نقول: استحالته ممنوعة كيف وهما من الممكنات التى تشملهما قدرته تعالىٰ۔

اور سنو!

> ”النظامية اصحاب ابراهيم بن سيار النظام وهو من شياطين القدرية طالع كتب الفلاسفة وخلط كلامهم بكلام المعتزلة قالوا لايقدر أن يفعل بعباده فى الدنيا مالا صلاح لهم فيه ولا يقدر أن يزيد فى الآخرة أو أن ينقص من ثواب وعقاب لاهل الجنة والنار وتوهموا أن تنزيهه تعالىٰ من الشرور والقبائح لايكون الابسلب قدرته عليها، فهم فى ذٰلک كمن هرب من المطر إلى الميزاب (شرح مواقف)

پہلی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اگر بالفرض امکان خلف وعید یا امکان کذب لازم آتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے، آخر یہ دونوں ممکنات ہی سے ہیں جن کو حق تعالیٰ کی قدرت شامل ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات معتزلہ کا مفروضہ تسلیم کر کے کہی گئی ہے، بس اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں ہے، اور مختلف مواقع پر یہی بات نقل کی گئی ہے، ہمارے اکابر کے دور میں مسئلہ امکان کذب بمعنی مقدوریت کذب متنازع فیہ بنا اور اہل معقول نے اس پر غل مچایا تو اور باتوں کے ساتھ یہ بات بھی ذکر کی گئی کہ قدماء میں خلف فی الوعید کا مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے، اور اسی کے باعث امکان کذب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، اس لئے اس پر طعن کرنا درحقیقت قدماء پر طعن کرنا ہے اور قدماء میں خلف فی الوعید کے سلسلے میں شرح عقائد کی عبارت دیکھ چکے ہو، یہ خلف فی الوعید بھی علی التسلیم ہے، اور محققین کی جانب سے صاحب شرح عقائد نے جو دلیل نقل کی ہے، وہ اس مقام پر بہت کمزور ہے، اس کی جانب میں دوسرے خط میں اشارہ کر چکا ہوں۔

جو کچھ اس قاصر العقل نے لکھا ہے، اسکا تعلق مسئلہ کی اصل لم سے ہے، میری ذات کو کوئی مانے یا نہ مانے، مسئلہ خلاف مسلک نہ ہو، اور دلیل غیر معقول نہ ہو، بس اتنا کافی ہے، اگر کوئی رد کرے تو دلیل سے رد کرے، دلائل کے رد کرنے میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہ دلیل، یا مسئلہ کی یہ وضاحت کسی نے نہیں لکھی ہے، ہاں اصل مسلک کا خلاف کروں تو ضرور قابل رد ہے، اور تم جان چکے ہو کہ محققین کے نزدیک خلف فی الوعید جائز الوقوع نہیں ہے، اور میں نے دلیل سے ثابت کر دیا ہے کہ وعیدات عامہ میں خلف فی الوعید متصور ہی نہیں، لہٰذا اس کا امکان ہی ختم ہو گیا، اس سے محققین کا مسلک اور پختہ تر ہو گیا، اب رہیں وعیدات خاصہ تو خلف ان میں بھی مقدور و ممکن ہے، لیکن باری تعالیٰ باختیار خود ان کے خلاف نہ کریں گے، وہ ممکن بالذات اور محال بالغیر ہیں، تم نے لکھا ہے کہ:

> ”اور وعیدات عامہ میں خلف فی الوعید کا قائل کون ہوتا، اس لئے کہ خلف تو اس وقت ہوتا جبکہ اطلاع نہ ہوتی، اور یہاں جب اطلاع کر دی گئی تو پھر خلف فی الوعید کا قول حماقت و بلادت ہی معلوم ہوتا ہے، لہٰذا خلف فی الوعید کا امکان صرف وعیدات خاصہ سے متعلق رہا، اور اسی میں علماء متقدمین کے درمیان باہم اختلاف ہوا۔“

یہ بات درست نہیں ہے، میں ذکر کر چکا ہوں کہ خلف فی الوعید کا لفظ ابتداءً معتزلہ کی زبان پر آیا اور ایک خاص تشریح کے ساتھ آیا، اور دیکھ چکے ہو کہ اس کا تعلق وعیدات خاصہ سے نہیں ہے، اسی تشریح کے ساتھ ہمارے یہاں منتقل ہوا، اور کچھ لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ عاصی جو بلا توبہ مر گیا ہو، اس کی مغفرت خلف فی الوعید کے دائرہ میں آتی ہے اور یہ جائز ہے، کیونکہ وہ کرم محض ہے، لیکن محققین نے اسے رد کیا، ان کا مطلب یہ ہے کہ اسے خلف فی الوعید کے دائرہ میں لانا ہی غلط ہے،

وعیدات خاصہ کے خلف وقوعی کا اہل سنت میں کوئی قائل نہیں ہے اور نہ اس میں اختلاف ہے، اور مقدوریت اور امکان میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تم نے چوتھے اشکال میں جواز و امکان کو مترادف قرار دیا ہے، بلاشبہ یہ صحیح ہے اور کتب کلامیہ میں اس طور پر استعمال ہوا ہے، لیکن امکان کے دو پہلو ہیں، ایک امکان عام یعنی سلب ضرورت من جانب واحد کہ جس میں ایک جانب سے ضرورت کی نفی ہوتی ہے، دوسری جانب ضرورت، عدم ضرورت اور امتناع تینوں کا احتمال رہتا ہے، اور دوسرا امکان خاص جس میں ضرورت کی نفی دونوں جانب سے ہوتی ہے، اس میں نہ ضرورت کا احتمال ہوتا اور نہ امتناع کا۔ میں نے جہاں جہاں امکان کا لفظ استعمال کیا ہے وہ امکان عام کے معنی میں ہے، اور جہاں جواز کا لفظ استعمال کیا ہے وہ یا تو وقوع کے معنی میں ہے یا امکان خاص کے معنی میں، جواز متکلمین کا کوئی اصطلاحی لفظ نہیں ہے کہ اس سلسلے میں اصطلاح خاص کی پابندی کی جائے، ہاں امکان ان دونوں معنوں کے لحاظ سے مصطلح ہے۔

شرح عقائد کی عبارت **فيجوز من الله** میں جواز سے وقوع مراد ہے، ورنہ اگر امکان بمعنی مقدوریت مراد ہوگا تو اس میں خلف فی الوعید ہی کیا خلف فی الوعد بھی مقدور ہے، اور محققین جو اس کے خلاف ہیں وہ وقوع خلف ہی کے خلاف ہیں، یہ وقوع امکان عام اور امکان خاص دونوں سے الگ ہے، جسے اصطلاح میں بالفعل کہتے ہیں، اور قضیہ اس سے مطلقہ عامہ بنتا ہے، یعنی خلف فی الوعید **واقع بالفعل أي في المستقبل**، چنانچہ حاشیہ میں ہے: **قوله كرم، قالوا ان الخلف في الوعيد لايعد نقصاً بل يعد كرماً يمدح به الباري تعالىٰ بخلاف الخلف في الوعد فانه يعد نقصا يجب تنزيه الله تعالىٰ عنه إذا تخلف بالكرم لا**

یلیق بالکرم القادر علیه والحق أن الخلف جائز عقلاً مطلقاً لکنه غیر واقع فی الکتاب والسنة والاجماع۔

اس عبارت میں **جائز** بمعنی مقدور ہے، اور **غیر واقع، فیجوز** کے جواب میں ہے۔

نیز **بعضهم** پر حاشیہ دیکھو، لکھتے ہیں: **هٰذا هو مذهب الاشاعرة ومن یحذو حذوهم**، اس معلوم ہوا کہ **بعضهم** سے مراد مطلقاً اشاعرہ ہیں بعض نہیں، اور محققین سے مراد دوسرے لوگ ہیں۔ علامہ تفتازانی علیہ الرحمہ کے بارے میں مجھے تحقیق نہیں ہے کہ وہ شافعی ہیں یا کیا ہیں؟

اب خلاصہ سن لو!

معتزلہ اور خوارج حق تعالیٰ کے لئے قدرت علی القبائح تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا خلف خواہ فی الوعد ہو یا فی الوعید، اور کذب اور اسی طرح دوسری قبیح چیزیں سرے سے تحت القدرۃ آتی ہی نہیں۔

اہل سنت کے نزدیک قدرت علی المحاسن والقبائح سب ثابت ہے، اس لحاظ سے قبائح ممکن و مقدور ہیں، لیکن ان کا وقوع و صدور چونکہ منافی حکمت ہے، اس لئے حق تعالیٰ باختیار خود ان معائب سے بری اور پاک ہیں، قدرت ہونا عیب نہیں ہنر ہے، قدرت نہ ہونا خود عیب ہے، کذب ہو یا خلف، دونوں از قبیل افعال ہیں، لہٰذا مقدور و ممکن ہونا قطعی اور یقینی ہے، ہاں ان کا وقوع و صدور غیر ممکن ہے۔

ہاں یہ بات خوب سمجھ لو کہ کتب عقائد میں امکان، جواز، وقوع، امتناع، محال وغیرہ کے جو الفاظ آتے ہیں تو ہر جگہ ان کا معنی ایک نہیں ہوتا، ورنہ پھر نا قابل حل اشکالات پیش آئیں گے، کہیں امکان بمعنی امکان عام ہوتا ہے، کہیں بمعنی امکان

خاص، اور جواز کہیں بمعنی امکان عام یا خاص ہوتا ہے اور کہیں بمعنی وقوع اور امتناع، کہیں بالذات ہوتا ہے اور کہیں بالغیر، کہیں امکان بمعنی مقدور ہوتا ہے۔

میری عبارتوں میں عموماً امکان بمعنی مقدوریت آیا ہے، اور جواز بمعنی وقوع، الفاظ کے ان معانی نظر پر ضرور رکھو، تمہارے خط کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں تم امکان کو کسی معنی میں لے رہے ہو اور کہیں کسی معنی میں، اور اس کی وجہ سے اشکال پیدا ہوتا ہے، حالانکہ میں نے بالتصریح مقدوریت کا ذکر کیا ہے۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارے سابقہ مکتوب میں مسئلہ صفات کا تذکرہ تھا۔ اس سلسلے میں ذکر اس کا تھا کہ معتزلہ صفاتِ باری تعالیٰ کے منکر ہیں یا معترف، تم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ بھی صفات کے معترف ہیں، اختلاف جو کچھ ہے، وہ تعبیر وتشریح کا ہے، لیکن میرے خیال میں وہ صفات کے سرے سے منکر ہیں، چنانچہ علم کلام کی کتابوں میں عموماً یہی مذکور ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کا تم نے ذکر بھی کیا ہے کہ قرآن وحدیث میں تو بہت وضاحت کے ساتھ حق تعالیٰ کے لئے صفات کا اثبات ہے، پھر اس کے انکار کی گنجائش انھیں کیونکر ملی؟

یہ سوال واقعی اہم ہے، اور اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ معتزلہ اپنے تمامتر نظریات کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں، اب نہ وہ عقلی موشگافیوں کا دور باقی رہا، جس سے اس وقت امت دوچار تھی، اور نہ وہ عقلی وساوس باقی رہے جن

کی بنیادوں پر فلاسفہ ومعتزلہ اپنے نظریات وافکار کی عمارتیں اٹھایا کرتے تھے۔ اب واقعی تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان کہلانے کے باوجود، انکارِ صفات کی ہمت وہ کیونکر کرتے تھے۔

لیکن اگر کچھ دیر کے لئے اپنے اس دور سے............جس میں ہم تم ہیں، اور جس کی تعمیر صدیوں میں ہوئی ہے، اور جس کی بنیادوں میں محدثین، فقہاء، متکلمین اور صوفیہ ہر ایک کا خونِ جگر شامل ہے، تھوڑی دیر کے لئے اس دور سے..........ہٹ کر، اس سے نکل کر اس عہد ماضی میں لوٹ جاؤ، جب دین اسلام اپنی حدود مملکت کو آفاقِ عالم میں وسیع کر رہا تھا، اور اقوامِ سابقہ کی جاہلیتیں علمی، ذہنی اور سوفسطائی ہتھیاروں سے لیس کر کے اسلامی عقائد وافکار کے مقابلے میں یکے بعد دیگرے اپنی فوجیں اتار رہی تھیں، اور ہر ایک اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بنی آدم میں مختلف استعدادوں کو جذب کر رہی تھیں، تو تعجب ایک حد تک کم ہو جائے گا۔

اس وقت حدیث کی تدوین کا کام ابتدائی دور میں تھا۔ تمام حدیثیں یکجائی طور پر سفینوں میں دستیاب نہ تھیں، اساتذہ کے سینے ان کے امین تھے، اسی دور میں یونانی فلسفہ کا ریلا بھی سیلاب کی طرح آیا، عجمی اَذہان پہلے سے اس کی استعداد رکھتے تھے، انھوں نے اسلام کی ہیبت سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقے میں آنا تو قبول کر لیا تھا، مگر جو ذہنیت پہلے سے بت کی طرح دل میں جمی بیٹھی تھی، اسے وہ نکال باہر نہ کر سکے تھے، اب جو فلسفی علوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہونے لگا تو اس کی بھاری بھرکم اصطلاحات سے مرعوب ہو کر کچھ لوگ جو علم میں کم اور ذہانت کے تیز تھے، اور جنھیں اتباع سے زیادہ اختراع وابتداع محبوب تھی، اس پر ٹوٹ پڑے، اور انھوں نے فلسفی علوم کو اصل قرار دے کر علم نبوت کے اندر انکار، ترمیم اور توجیہ وتاویل کا دروازہ کھول دیا، جیسا کہ ایک عرصہ سے ہم یورپین علوم کے سلسلے میں یہی تماشا دیکھ رہے ہیں، اس

طرح اہل اسلام کا ایک گروہ اسلام کی آغوشِ رحمت سے نکل کر فلاسفہ کی وادئ تیہ میں جا پہونچا، انھیں میں بعض قدریہ، بعض جہمیہ، بعض معتزلہ، بعض کرامیہ اور بعض مرجیہ کہلائے، اور پھر چونکہ انسانی ذہانتوں میں تضاد وتخالف بہت ہے، اس لئے ہر ایک کے اندر مختلف ٹولیاں بنتی رہیں۔ ایک معتزلہ میں ابوالحسین بصری، ابوعلی جبائی، ابوہاشم اور نظام بغدادی وغیرہ مستقل الگ الگ نظریات کے حامل ہیں، بلکہ شرح مواقف میں تو معتزلہ کے بیس فرقے مذکور ہیں، اور سب باہم دست وگریباں ہیں، اور ہر ایک اپنی عقل کے بل بوتے پر اچھل کود رہا ہے، ہر ایک نے اپنی عمارت الگ بنائی، لیکن جیسے جیسے احادیث کی تدوین کا کام بڑھتا گیا، فلسفہ کی گرفت اذہان وقلوب سے ڈھیلی پڑتی چلی گئی، اس کے لئے حضراتِ محدثین **كثر الله أمثالهم وقدس أسرارهم** کو قربانیاں بھی بہت دینی پڑیں، اور بالآخران قربانیوں نے اپنا لازوال اثر پیدا کیا، ایک امام احمد بن حنبلؒ کے یادگار زمانۂ ابتلاء وآزمائش نے معتزلہ وجہمیہ کے پاؤں پر ایسی ضرب لگائی کہ پھر یہ جماعت کبھی کھڑی نہ ہوسکی، احادیث کی صاف وصریح تعلیمات نے بالآخران کے تمام عقلی تکے اور ذہنی وساوس ختم کردئے، اور اب تو وہ وقت ہے کہ معتزلہ کی کوئی ایسی کتاب نہ پاؤ گے، جس میں ان کے تمام افکار ونظریات اور دلائل کی تشریح کی گئی ہو، جو کچھ متکلمین نے ان کے نظریات رد وابطال کے سلسلے میں جمع کردئے ہیں، بس وہی چیزیں مل جاتی ہیں، گویا معتزلہ تو اپنے نظریات کی حفاظت جمع وتدوین کے راستے سے بھی نہ کر سکے، اس کے لئے انھیں اپنے مخالفین کا ممنونِ کرم ہونا پڑا۔

خلاصہ یہ ہے کہ معتزلہ نے فلاسفہ کی پیروی کی، اور جہاں جہاں وہ سرگرداں ہوئے وہاں وہاں یہ بھی پہونچے، لیکن چونکہ یہ صاحب ایمان کہلاتے تھے، اس لئے

نصوصِ صریحہ سے بالکل صاف دامن بھی چھڑا نہ سکتے تھے، اس لئے تشریح وتعبیر میں ترمیم کا کام دونوں جانب قدرے فرق کے ساتھ کرتے رہے، اکثر جگہ تو نصوص کی تشریح میں ترمیم کی اور کہیں کہیں مجبوراً فلاسفہ کی تعبیر بدلی، اس طرح ایک نیا مجموعہ دینی افکار ونظریات کا تیار کر دیا جسے نہ فلاسفہ قبول کر سکتے تھے، اور نہ اہل اسلام کو اس پر اطمینان ہوسکتا تھا۔ اور بے شمار اعتراضات وایرادات کا دروازہ کھل گیا، یہ صریح گمراہی تھی۔ ان کے ردوابطال کے لئے متکلمین اسلام کا گروہ اٹھا، یہ حضرات فلاسفہ ومعتزلہ کے تعاقب میں ہر اس جگہ پہونچے جہاں ان کی کوئی معمولی سے معمولی پناہ گاہ تھی، اور ہر ایک کو اُجاڑ ڈالا، ان حضرات کا کام صرف ان گمراہوں کی عمارتوں کا ڈھانا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے وہی ہتھیار استعمال کئے جو اہل ضلال استعمال کیا کرتے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں انھیں اصطلاحوں کی بنیاد پر عقائد کی تشریح وتعبیر کی ایک اور عمارت کھڑی ہوگئی، جو متکلمین کی جانب منسوب ہوئی اور چونکہ اس میں بھی وہی گارا پانی استعمال ہوا تھا، جو فلاسفہ اور معتزلہ کے یہاں رائج تھا اس لئے متکلمین کے مسائل ودلائل بھی بہت کم اعتراض وایراد سے خالی رہے، اور بظاہر بہت سی جگہ ان کا پلہ کمزور معلوم ہوتا ہے، مثلاً جزء لایتجزیٰ کے اثبات کے لئے متکلمین کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، لیکن چوک یہیں ہوئی کہ انھیں عقائد کا شارح مان لیا گیا، یہ حضرات عقائد کے شارح نہیں ہیں، گمراہوں کے سرکوبی کرنے والے ’’جنودِ الٰہیہ‘‘ ہیں، انھوں نے زائغین کی تمام عمارتیں انھیں کے اوزاروں سے ڈھادیں۔ اب رہا ایمان واعتقاد کا مسئلہ اس کے سلسلے میں جتنا کچھ قرآن وحدیث میں بیان کر دیا گیا ہے وہ بہت کافی ہے، اس پر اضافہ کرنا، اس سے زیادہ اس میں خوض کرنا ممنوع ہے، حدیث میں **تفکر فی الخالق** سے منع کیا گیا ہے۔ **ولنعم ماقیل**:

وأما السلف والأئمة فلم يدخلوا مع طائفة من الطوائف فيما ابتدعوه من نفى أو إثباتٍ، بل اعتصموا بالكتاب والسنة ورأوا ذٰلک هو الموافق لصريح العقل ، فجعلوا كل ماجاء به الكتاب والسنة من أسمائهٖ وصفاتهٖ حقاً يجب الايمان به ، وإن لم تعرف حقيقة معناه وكل لفظٍ أحدثه الناس فأثبته قوم ونفاه آخرون فليس علينا أن نطلق إثباته ولا نفيه حتىٰ نفهم مراد المتكلم ، فإن كان مراده حقاً موافقاً لما جاء ت به الرسل والكتاب والسنة من نفى أو إثباتٍ قلنابه وإن كان باطلاً مخالفاً لما جاء به الكتاب والسنة من نفى أو إثباتٍ منعنا القول به ورأوا أن الطريقة التى جاء بها القرآن هى الطريقة الموافقة لصريح المعقول وصحيح المنقول وهى طريقة الانبياء والمرسلين۔

(فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:٦،ص:٣٦)

تم نے فلاسفہ، معتزلہ اور متکلمین کا اکھاڑا شرح عقائد میں دیکھ لیا ہوگا۔ ہر ایک اپنی اپنی طاقت کے مطابق زور آزمائی کررہا ہے، اس اکھاڑے میں فلاسفہ اور معتزلہ مدعی ہیں، اور متکلمین منکر ہیں، جب تک وہ انکار پر قائم رہتے ہیں، ان کا پہلو غالب رہتا ہے اور جب وہ خود مدعی بن کر سامنے آجاتے ہیں تو فلاسفہ واخوانہم انھیں اعتراضات کا نشانہ بنالیتے ہیں، اور نتیجہ کے طور پر متکلمین مغلوب معلوم ہونے لگتے ہیں، خوب سمجھ لو کہ علم کلام کا موضوع تشریح عقائد نہیں ہونا چاہئے، بلکہ تردید ضلالت ہونا چاہئے، تشریح میں خوض وتفصیل ممنوع ہے، اس میں اجمال پر اکتفا ضروری ہے، میری یہ بات گو کہ انھوتی معلوم ہو، مگر انکار میں جلدی نہ کرنا، حقیقت یہی ہے، کہ علم کلام کی اکثر تفصیلات اعتراض سے مملو ہیں، شرح عقائد سے بڑا اکھاڑا دیکھنا ہوتو

شرح مواقف میں دیکھو، کم کوئی مسئلہ ایراد سے خالی پاؤ گے۔ اس میں اور دوسرے پہلوان بھی زور آزمائی کرتے نظر آئیں گے۔

اس تمہید کے بعد سنو! کہ علم الٰہیات میں گمراہ ترین فرقہ فلاسفہ کا ہے، انھوں نے تمام صفات الٰہیہ کا یکسر انکار کر دیا ہے، ان کا اصول یہ ہے کہ **الواحد لا یصدر عنه إلا الواحد** اس بنیاد پر انھوں نے نعوذ باللہ حق تعالیٰ سے صرف عقل اول کو صادر مانا ہے اور بس، اور وہ بھی اضطراراً، اختیاراً نہیں، اس سلسلے میں مزید بصیرت کے لئے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مکتوبات قدسی آیات کا یہ اقتباس دیکھو!

> ”اگر عقل دریں امر کفایت می کرد، فلاسفۂ یونان کہ مقتدائے خود عقل را ساختہ اند، در تیہ ضلالت نمی ماندند، وحق سبحانہ را از ہمہ بیش می شناختند وحال آنکہ جاہل ترین مردم در ذات وصفات واجبی جل سلطانہ اینہا اند کہ حق را سبحانہ بیکار ومعطل دانستہ اند وغیر از یک چیز وآں ہم بایجاب نہ باختیار باو تعالیٰ مستند نہ ساختہ عقل فعال از نزد خود تراشیدہ حوادث را از خالق سمٰوات وارض باز داشتہ باو منسوب می دارند واثر را اثر موثر حقیقی جل سلطانہٗ منع نمودہ آں را اثر منحوت خود می دانند............(مکتوب: ۲۳، دفتر سوم، ص: ۳۲۲)

ترجمہ: اگر عقل اس (معرفت الٰہی) کے معاملے میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدا بنا رکھا ہے ضلالت وگمراہی کے میدان میں حیران وسرگرداں نہ رہ جاتے، اور حق تعالیٰ سبحانہ کو (دوسروں کے مقابلے میں) سب سے زیادہ پہچانتے، حالانکہ ذات وصفات واجبی جل سلطانہ کے بارے میں سب سے زیادہ جاہل یہی لوگ ہیں کہ انھوں نے حق سبحانہ وتعالیٰ کو بیکار ومعطل جان لیا ہے، اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے کسی چیز کو اس تعالیٰ کی طرف

منسوب نہیں کرتے اور وہ بھی ایجاب واضطرار کے طور پر نہ کہ اختیار کے ساتھ، انھوں نے یہ عقل فعال اپنی طرف سے تراشی ہے، اور حوادث کو خالق سمٰوات وارض سے بے تعلق رکھ کر اس (عقل فعال) کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور اثر کو مؤثر حقیقی جل سلطانہ سے ہٹا کر اس کو اپنا تراشیدہ اثر جانتے ہیں۔

پھر آگے چل لکھتے ہیں:

”کفار دار الحرب باوجود بت پرستیہا ازیں جماعۃ احسن حال اند کہ بحضرت حق سبحانہ جل وعلا در تنگی التجا دارند، اکثر احکام ایشاں سیما در الٰہیہات کہ مقصد اسنی است کاذبہ اند ومخالف کتاب وسنت، اطلاق حکماء بر اینہا...... کہ سراسر جہل مرکب نصیب شان است...... بکدام اعتبار نمودہ آید، مگر بر سبیل تہکم استہزاء گفتہ شود یا از قبیل اطلاق بصیر بر اعمٰی شمردہ آید (مکتوب: ۲۳، دفتر سوم، ص: ۳۲۳)

ترجمہ: دار الحرب کے کفار اپنی بت پرستی کے باوجود اس جماعت (فلاسفہ) سے بہتر حال میں ہیں، کیونکہ وہ حضرت حق سبحانہ جل وعلا کے سامنے تنگی اور تکلیف کی حالت میں التجا کرتے ہیں اور بتوں کو اس تعالیٰ کے حضور میں شفاعت کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک جماعت ان بے وقوفوں کو حکماء کہتی ہے اور ان کو حکمت کی طرف منسوب کرتی ہے، حالانکہ ان کے اکثر احکام خصوصاً الٰہیات میں جو ان کا اعلیٰ اور روشن مقصد ہے، وہ جھوٹے ہیں اور کتاب وسنت کے مخالف ہیں (ایسے لوگوں پر) حکماء کا اطلاق کرنا جن کے نصیب میں سراسر جہل مرکب ہے کس اعتبار سے درست ہے، ہاں اگر استہزاء اور مذاق کے طور پر (ان کو حکماء) کہا جائے یا جس طرح

کورکو بینا کہہ دیتے ہیں تو زیبا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

”عجب معاملہ است عقل ناقصۂ فلاسفہ گویا در طرف نقیض طور نبوت افتادہ است ، ہم در مبدأ وہم در معاد واحکام آنہا مخالف احکام انبیاء است علیہم الصلوات والتسلیمات ، نہ ایمان باللہ درست کردہ اند ، نہ ایمان بآخرت ، بقدم عالم قائل اند وحال آنکہ اجماع ملیین است برحدوث عالم بجمیع اجزاء خود۔

ترجمہ: عجب معاملہ ہے کہ فلاسفہ کی ناقص عقلیں مبدأ میں بھی اور معاد میں بھی طرزِ نبوت کی نقیض ومقابل ہیں ، اوران (فلاسفہ) کے احکام انبیاء علیہم الصلوات والتسلیم کے احکام کے مخالف ہیں ، ان کا ایمان نہ اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ درست ہے اور نہ ہی آخرت کے ساتھ ، وہ عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں ، حالانکہ تمام اہل مذاہب کا اس بات پر اجماع ہے کہ عالم مع تمام اجزاء کے حادث ہے۔ (مکتوب:۲۳، دفتر سوم ، ص:۳۲۴)

معتزلہ نے دیکھا کہ فلاسفہ تمام صفات کے یکسر منکر ہیں ، اور قرآن وحدیث کی نصوص صراحۃً صفات پر دلالت کرتی ہیں ، اب یا تو وہ فلاسفہ کے خیمہ میں جائیں ، یا اسلام کے دامن میں پناہ لیں۔ انھوں نے دونوں سے اپنا رشتہ باقی رکھنا چاہا ، اس کے لئے انھوں نے یہ راہ اختیار کی کہ نہ تو حق تعالیٰ کے لئے صفات کا اثبات کیا ، اور نہ فلاسفہ کی طرح خدا کو معطل مانا ، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اور چیز ثابت کی ، اس کا نام ”حال“ رکھا۔ ان کے خیال میں اگر صفات کو ثابت کیا گیا تو ”تعدد قدماء“ لازم آئے گا ، اور اس سے توحید میں خلل پڑے گا۔ جس طرح فلاسفہ ایک خیالی توحید کے بانی ہیں ، اسی طرح معتزلہ بھی ایک خیالی توحید پر نازاں ہیں۔ احوال کے سلسلے میں

مواقف کی عبارت دیکھو۔ (ان عبارتوں میں میں نے اختصار سے کام لیا ہے، کہیں کہیں سے حذف کر دیا ہے)

الحال هو الواسطة بين الموجود والمعدوم ، وقد أثبته امام الحرمين اولا والقاضى منا وابوهاشم من المعتزلة فانه اول من قال بالحال وبطلانه ضرورى لما عرفت أن الموجود ماله تحقق والمعدوم ماليس كذٰلک ولاواسطة بين النفى والاثبات فى الشئ من المفهومات ضرورةً۔

(المقصد السابع من المراصد الاول من الموقف الثانى)

شرح مواقف میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

يوصف به أى بالقدم ذات الله تعالىٰ اتفاقاً...... ويوصف به ايضاً صفات الله عند الاشاعرة ومن يحذوحذوهم فانهم أجمعوا على أن لله سبحانه صفات موجودة قديمة قائمة بذاته تعالىٰ، وأما المعتزلة فانكروه لفظاً ولكن قالوا به معنى ، فانهم أثبتوا له احوالاً أربعة لااول لها، هى الوجود، والحيوة، والعلم، والقدرة، أى الموجودية والحيئة، والعالمية والقادرية فانها احوال ثابتة لله سبحانه ازلاً، قال الامام الرازى وفيه نظر لان القدم موجود لااول له وهٰذه الامور التى أثبتوها احوال لايوصف عندهم بالوجود، فلايكون قديمة إلا أن يراد بالقديم ثابت لااول له، لكن الكلام فى المعنى المشهور (شرح مواقف،ص:۱۷۹)

مواقف کے مرصد رابع میں لکھتے ہیں:

فی الصفات الوجودية فيه مقاصد ثمانية الاول فی اثبات الصفات لله تعالیٰ، ذهبت الاشاعرة إلیٰ أن له صفات موجودة قديمة زائدة علیٰ ذاته فهو عالم بعلم قادر بقدرة، مريد بارادة وعلیٰ هٰذا القياس ، وذهبت الفلاسفة والشيعة إلیٰ نفيها أی نفی الصفات الزائدة فقالوا هو عالم بالذات قادر بالذات، والمعتزلة لهم فی الصفات تفصيل ياتی فی كل مسئلة من مباحثها۔

آگے کچھ دور چل کر لکھتے ہیں:

واحتج المعتزلة والشيعة بوجوه ثلٰثة، الاول مامر أن اثبات القدماء كفر وبه كفرت النصاریٰ والجواب مامر، وايضاً أن الكفر إثبات ذوات قديمة لاذات واحدة وصفات، الثانی عالمية وقادرية واجبة فلا يحتاج الی الغير، والجواب أن العالمية عند نا ليست امراً وراء قيام العلم به فيحكم عليها بانها واجبة فالمراد بوجوبها إن كان امتناع خلو الذات عنها فذٰلک لايمنع استنادها إلی صفة اخریٰ واجبة ايضاً بهٰذا المعنی أعنی صفة العلم فانه المتنازع فيه بيننا إذ نحن نجوزه وانتم لاتجوزونه وإن اردتم أنها أی العالمية واجبة لذاتها فبطلانه ظاهر، الثالث صفته صفة كمال فيلزم ان يكون هونا قصا لذاته مستكملاً بغيره وهو باطل اتفاقاً، والجواب إن اردتم باستكماله بالغير ثبوت صفة الكمال الزائدة علیٰ ذاته لذاته فهو جائز عند نا، وهو المتنازع فيه وإن اردتم غيره فصوروه اولاً نفهمه ثم بينوا لزومه لما ادعينا۔ *ان تینوں اقتباسات پر غور کرو۔*

پہلی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حال موجود اور معدوم کے درمیان ایک واسطہ ہے، جسے موجود کہہ سکتے اور نہ معدوم، امام الحرمین بھی اولاً اسی کے قائل تھے، بعد میں اس سے رجوع کرلیا تھا، چنانچہ شرح مواقف میں ایک جگہ ان کے رجوع کی تصریح ہے، اس سلسلے میں صاحب مواقف نے ان کی دو دلیلیں بھی نقل کی ہیں، اور ان کی تردید بھی کی ہے، اس قت مقصد کی بات صرف اتنی ہے کہ قائلین حال کے نزدیک موجود اور معدوم دو ہی باتیں نہیں ہیں، ایک تیسری بات بھی ہے، جسے ’’حال‘‘ کہتے ہیں۔

دوسری اور تیسری عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ حق تعالیٰ کے لئے چار احوال ثابت کرتے ہیں، اور چاروں ازلی ہیں، ایک موجودیت، دوسرے حییت، تیسرے عالمیت، چوتھے قادریت۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل حق کے نزدیک حق تعالیٰ کے لئے سات یا آٹھ بنیادی صفات ثابت ہیں، اور وہ یہ ہیں، حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام، ماتریدیہ نے ان پر تکوین کا اضافہ کیا ہے، معتزلہ نے دیکھا کہ یہ سب ذات کے اوپر زائد اور قدیم ہیں، اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے، تو انھوں نے خدا تعالیٰ کے لئے ان اوصاف کو ثابت نہیں مانا، البتہ احوال کو ثابت مانا، اور انھیں ازلی کہا، یعنی خدا تعالیٰ قادر ہے بغیر قدرت کے، عالم ہے بغیر علم کے، حی ہے بغیر حیات کے، موجود ہے بغیر وجود کے، یعنی حق تعالیٰ نعوذ باللہ ان اوصاف سے خالی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے لئے عالمیت، قادریت وغیرہ احوال ثابت ہیں، اس طرح وہ اپنی دانست میں تعدد قدماء کی خرابی سے بچ گئے، کیونکہ یہ احوال موجود تو ہیں نہیں، موجود تو ذات واحد ہے، البتہ اس کے لئے ایسی چیزیں ثابت ہیں جو وجود وعدم دونوں سے خالی ہیں، اور ان کو وہ ازلی اور قدیم مانتے ہیں، وہ اپنے اس خیال میں خوش ہیں کہ ہمارے اصول پر بھی گوکہ تعدد قدماء کا لزوم ہوتا ہے، لیکن یہ قدماء ایسے

ہیں جو شائبۂ وجود سے بھی محروم ہیں، پھر ہوا کرے، کیا حرج ہے، موجود ہوتے تو خرابی ہوتی، اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ موجود نہیں تو ان میں قدامت آئی کہاں سے؟ کیونکہ قدیم تو **موجود لااول لہ** کو کہتے ہیں، اسی لئے شارح مواقف نے کہا کہ یا تو انھیں قدیم مت مانو، یا پھر قدیم کی تعریف میں ترمیم کرو، وہ ترمیم یہ ہے کہ قدیم ہونے کے لئے موجود ہونا ضروری نہیں ہے، صرف ثبوت کافی ہے، اور معتزلہ کے نزدیک معدومات بھی حقائق ثابتہ کی حامل ہیں، پھر حال تو ان سے اوپر کی چیز ہے، ان کا ثبوت بدرجۂ اولیٰ ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ قدیم کا یہ معنی خلاف مشہور ہے۔

اب ذرا ان کے دلائل کا جائزہ بھی لے لو، جو وہ انکار صفات کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں، وہ تین دلائل ہیں:

(۱) تعدد قدماء کا قول کفر ہے، آخر نصاریٰ کا کفر یہی تو تھا کہ انھوں نے حق تعالیٰ کے لئے تین صفات کا اثبات کیا تھا، جنھیں وہ اقانیم ثلثہ کا نام دیتے ہیں، اقنوم وجود جسے وہ اب (باپ) کہتے ہیں، اقنوم علم جو ان کے خیال میں ابن اور کلمہ ہے، اور اقنوم حیوۃ جسے وہ روح القدس سے تعبیر کرتے ہیں، پھر ان لوگوں کی تکفیر کیوں نہ کی جائے جو حق تعالیٰ کے لئے سات یا آٹھ صفات ثابت کرتے ہیں۔

اس کا جواب صاحب مواقف نے یہ دیا ہے کہ نصاریٰ نے صفات قدیمہ نہیں ثابت کی ہیں، وہ ذوات قدیمہ کے قائل ہیں، جنھیں وہ اقانیم ثلثہ کہتے ہیں، وہ صفات نہیں ذوات ہیں، گو وہ ان پر ذات کا اطلاق کرنے سے احتراز کرتے ہیں، لیکن نام تبدیل کرنے سے حقیقت نہیں تبدیل ہوتی، لوازم ذات کو وہ اقانیم میں ثابت کرتے ہیں، چنانچہ وہ اقنوم علم کو **منتقل الی المسیح** مانتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ **مستقل بالانتقال** صفات نہیں ذات ہی ہوسکتی ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے بھی ان پر

تعدد صفات قدیمہ کا الزام عائد نہیں کیا ہے، بلکہ تعدد ذوات ہی کی بنا پر انھیں کافر قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ، پھر یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک خدا حقیقۃً تین ہے اور وہ تین حقیقۃً ایک ہیں، ظاہر ہے کہ حقیقۃً تین خدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ تین ذاتیں ہیں نہ کہ تین صفات! اب اگر کوئی ذات کو واحد مان کر اس کے لئے متعدد صفات کا اثبات کرے تو وہ کافر کیونکر ہوگا، نصاریٰ پر قیاس کرنا محض غلط ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ کے لئے عالمیت وقادریت واجبہ تسلیم کر لی جائیں تو کسی صفت کی جانب ان کے استناد کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اور حق تعالیٰ کا عالم وقادر وغیرہ ہونا بھی محفوظ رہے گا۔

اس کا جواب شارح مواقف یہ دیتے ہیں کہ عالمیت ہمارے نزدیک بجز اس کے اور کوئی چیز نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ علم قائم ہے، مطلب یہ ہے کہ صرف اوصاف ہی حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں، عالمیت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے کہ انھیں واجب کہا جائے، اور اگر بغرض محال عالمیت واجبہ کا ثبوت حق تعالیٰ کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوگا، اس عالمیت واجبہ کو صفت علم کی جانب مستند کرنا کیوں ممکن نہیں ہے، ظاہر ہے کہ عین ممکن ہے کہ اس کو صفت واجبہ علم کی جانب منسوب کر کے عالم مانیں، اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بذات خود واجب ہیں تو اس کا بطلان بالکل ظاہر ہے، کیونکہ صفات ہوں یا احوال ان کا موصوفات اور ذوی الاحوال کی جانب محتاج ہونا بدیہی ہے، انھیں وجوب ذاتی کے ساتھ متصف کرنا غیر ممکن ہے۔

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت، صفت کمال ہوگی، اگر ذات کے اوپر زائد ہو تو لازم آئے گا کہ حق تعالیٰ کی ذات ناقص ہو، اور غیر کے ذریعے اس کی

تکمیل ہو، اور یہ بالاتفاق باطل ہے (اسی وسوسہ کی بنیاد پر فلاسفہ صرف ذات کو مانتے ہیں، اور صفات کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ عین ذات ہیں)

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر استکمال بالغیر میں غیر سے مراد صفت کمالیہ زائدہ علی الذات لذاتہٖ ہو، تو ہمارے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ وہ صفت زائدہ خارج سے نہیں آئی ہے، بلکہ خود ذات کے تقاضے سے ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ جب کوئی ذات کامل ہوگی تو جامع الصفات ہوگی، اگر صفات سے خالی ہوتو وہ معدوم ہوگی، کمالِ ذات کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں صفات ہوں، تو درحقیقت صفات کی وجہ سے تکمیل ذات نہیں ہے، کمالِ ذات کی وجہ سے لزوم صفات ہے، اسی لئے علامہ ابن ہمام نے صفات کے لئے ''فروع ذات'' کی تعبیر اختیار کی ہے، جو بہت مناسب اور لطیف ہے، علامہ انور شاہ کشمیری نے اس کی بڑی تحسین کی ہے۔

اور اگر غیر سے مراد کوئی اور چیز ہے تو اولاً اسے واضح کرو، پھر اس پر خرابی کا لزوم ثابت کرو۔

یہ معتزلہ کے دلائل کا حاصل ہے، اور متکلمین کی طرف سے ان کے جوابات ہیں، پھر سوچو، کیا معتزلہ صفات کے معترف ہیں، جس چیز کے وہ معترف ہیں، وہ دوسری چیز ہے، ہاں اگر ہم بطور الزام کے...... یعنی جو کچھ ان کے دلائل سے لازم آتا ہے اُن سے...... انھیں صفات کا قائل کہہ دیں تو ممکن ہے، لیکن **هم للكفر أقرب منهم للايمان**، وہ مثبت صفات سے بعید اور منکر صفات یعنی فلاسفہ کے بہت قریب ہیں، وہ اپنی زبان سے خود کو معترف صفات کہنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہیں، اسی لئے وہ اہل حق کو طنزاً ''صفاتیہ'' کہتے ہیں، اور خود کو اہل التوحید کہتے ہیں۔

متکلمین جہاں تک فرقِ ضالہ کی تردید میں چلتے ہیں، وہاں تک خوب چلتے

ہیں، لیکن وہ جب خود مدعی کی پوزیشن میں آکر صفاتِ زائدہ کے اثبات کے لئے فلاسفہ ومعتزلہ کے رنگ میں دلائل پیش کرتے ہیں، تو کوئی دلیل اعتراض سے خالی نہیں ہوتی، چنانچہ شرح مواقف میں اس مدعا کے لئے اشاعرہ کی تین دلیلیں نقل کی گئی ہیں اور تینوں مخدوش ہیں، اسی لئے تشریح عقائد کے باب میں متکلمین کا طریقہ بہت نامکمل اور غیر تشفی بخش ہے، اسی سے متاثر ہوکر مولانا روم نے فرمایا تھا کہ ؎

گر زاستدلال کار دیں بدے　　فخر رازی راز دار دیں بدے
پائے استدلالیاں چوبیں　　پائے چوبیں سخت بےتمکیں بود

علم کلام سے صرف وہی کام لینا چاہئے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا، اثبات عقائد کی راہ میں فلاسفہ ومعتزلہ کی اصطلاحات سے دور ہی رہنا بہتر ہے، صرف قرآن وحدیث کے الفاظ اختیار کرنے چاہئیں، ضرورۃً ان کی اصطلاحیں لی جاسکتی ہیں۔

دیکھو! قرآن وحدیث میں لفظ قدیم، واجب الوجود، لاعرض، لاجوہر، لامحدود، لامعدود، لامتبعض، لایتجزیٰ، لامترکب، لایوصف بالماہیۃ **وغیر ذٰلک کثیر من الالفاظ**۔ یہ سب قرآن وحدیث میں کہاں ہیں؟ کہ ان کے اثبات یا نفی کے درپے ہوجائیں، حق تعالیٰ کی ذات ہو یا صفات، سب غیب ہیں، اور غیب تک رسائی اپنی عقل کے ذریعے یا کسی بھی انسانی عقل کے واسطے سے ممکن نہیں ہے، اس کا طریقہ صرف وحی الٰہی ہے، وحی کے ذریعے جو الفاظ ہمیں مل گئے صرف انھیں پر اکتفا کرنا ضروری ہے، ورنہ سوائے رجماً بالغیب کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن　　کہ جاہا سپر باید انداختن

یہ مذکورہ بالا تمام الفاظ اور ان جیسے دوسرے الفاظ جن کا پتہ قرآن وحدیث میں نہیں ہے، محض فلسفہ کی راہ سے آئے ہیں، اور متکلمین نے ان پر لمبی لمبی بحثیں کی

ہیں، حاصل بجز اشکالات قویہ اور شکوک عویصہ کے کچھ نہیں۔

بس بھائی! اتنا کچھ لکھنے کے بعد طبیعت اکتا گئی، اثبات صفات کی صحیح اور درست صورت کی جانب اجمالاً میں نے اشارہ کردیا ہے۔ تفصیل ایک مبسوط مقالہ چاہتی ہے، اس کے لئے مزید انتظار کرو۔ طبیعت حاضر ہوئی تو لکھ دوں گا، اتنا بھی اس لئے ہوگیا کہ امتحان ششماہی کی وجہ سے اسباق بند ہیں، اور اس میں بھی تین چار دن گھر پر گزر گئے، لیکن میں مسئلہ صفات میں اٹکا ہوا تھا۔ کل گھر سے واپس آیا، اور آج لکھنا شروع کیا، بعد نماز مغرب تمام کررہا ہوں۔

اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری وجہ سے ایک علم مدوّن ہوگیا، گوکہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ ایک ذہین عالم (۱) نے ہماری تمہاری مراسلت پڑھ کر کہا کہ اس سے دماغ مرعوب ومتاثر تو بہت ہوا، مگر قلب تاثر سے خالی رہا۔ اگر تفسیر وحدیث یا تصوف کے موضوع پر اتنی محنت کرتے تو دماغ کے ساتھ قلب بھی لطف اندوز اور محظوظ ہوتا، میرے خیال میں انھوں نے صحیح کہا، ایک بات اس سلسلے میں اور بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے، وہ یہ کہ انکارِ صفات کے نتائج بد کیا کیا پیدا ہوئے اور کیا کیا پیدا ہونے کا احتمال ہے، شاید اس پر بحث کی تکمیل ہوجائے، ورنہ یہ بحث تو ذوفنون ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

---

(۱) مخدوم زادہ مفتی محمد راشد بن حضرۃ الاستاذ مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ (اعجاز احمد اعظمی)

☆☆☆☆☆

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ الذی لہ الاسماء الحسنیٰ ولہ المثل الاعلیٰ، والصلوٰۃ

والسلام علیٰ من بعثه إلیٰ کافة الوریٰ بدین الحق والهدیٰ و علی الذین بلغوا باتباعه الدرجات العلیٰ، أمابعد!

آج جمعرات ہے، اس فکر میں ہوں کہ تم سے جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہو جائے، لیکن موضوع زیر بحث پر لکھتے ہوئے دل کانپتا اور قلم تھرتھراتا ہے، یہ ایک ایسا سمندر ہے، جس میں کودنے کے بعد کتنے لوگوں کا پتہ نہیں ملا، میری کیا حیثیت ہے؟ لیکن اتباع وحی وسنت ہی ایک ایسا سفینہ ہے جو اس بحر مواج کو بخیر وخوبی عبور کرا سکتا ہے، اللہ کا نام لے کر لکھتا ہوں، اور حق تعالیٰ کے حضور میں گریہ کناں ہوں کہ وہ ہفوات وزَلات سے حفاظت فرمائیں اور قدم وقلم کو جادۂ سنت سے منحرف ہونے سے بچائیں، **أللٰهم وفقنی لماتحب وترضیٰ من القول والفعل والعمل والنیة والهدی إنک علیٰ کل شئ قدیر۔**

چونکہ گفتگو علم کلام کی سطح پر چل رہی ہے، اور موضوع ''اثبات صفات باری تعالیٰ'' ہے، اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اولاً متکلمین کے طرز استدلال پر ایک نظر ڈال لی جائے، اور اس کے حسن وقبح کو پرکھ لیا جائے، تم نے شرح عقائد میں مسئلہ صفات پڑھ لیا ہوگا، اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، پھر صاحب شرح عقائد کا طرز بیان اور طریقۂ استدلال ذرا پیچیدہ اور الجھا الجھا سا ہوتا ہے، اس کی طرف متوجہ ہونا دردسر ہے، شرح مواقف کا انداز بیان واضح اور صاف ہے، اسی سے نقل کرتا ہوں۔

صاحب مواقف نے اثبات صفات کے لئے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک اجمالی، دوسرا تفصیلی۔ اجمالی کا حاصل یہ ہے کہ مجموعی طور پر تمام صفات کے ثبوت کے واسطے چند دلائل ذکر کئے ہیں، اور تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر صفت مثلاً قدرت، ارادہ علم وغیرہ کے مستقل مباحث قائم کر کے ان کے لئے جدا جدا دلائل تحریر

کئے ہیں، میں ان کا اجمالی بیان نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

''ذهبت الاشاعرة إلىٰ أن له صفات موجودة قديمة زائدة علىٰ ذاته فهو عالم بعلم قادر بقدرةٍ، مريد بارادة......احتج الاشاعرة علىٰ ماذهبوا إليه بوجوه ثلثة الاول اعتمد عليه القدماء من الاشاعرة وهو قياس الغائب على الشاهد فان العلة والحد والشرط لايختلف غائباً وشاهداً۔

اپنے مسلک کے حق میں اشاعرہ کی پہلی دلیل یہ ہے ۔۔۔۔ اور متقدمین اشاعرہ کی معتمد علیہ دلیل یہی ہے، کہ صفات کے مسئلے میں غائب یعنی حق تعالیٰ کو شاہد یعنی انسان پر قیاس کیا جائے، کیونکہ علت، حد اور شرط میں، غائب اور شاہد میں کوئی فرق نہیں ہے، دیکھو شاہد میں عالم ہونے کی علت علم ہے، اور عالم کی تعریف **ماقام به العلم** ہے، اور ثبوت مشتق کی شرط اس کے ماخذ اشتقاق کا ثبوت ہے، یہی چیزیں غائب میں بھی ہونی ضروری ہیں، لہٰذا جب شاہد کو عالم کہنے کے نتیجے میں اس کے اندر صفت علم کا وجود ضروری ہے، تو غائب کے حق میں بھی یہ بات واجب التسلیم ہوگی۔

اس دلیل کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دو چیزیں اگر ایک یا چند چیزوں میں شریک ہوں تو دونوں کا مساوی ہونا ضروری ہے، ظاہر ہے کہ یہ مفروضہ کتنا بودا اور بے جان ہے، دیکھو ایک جنس میں کتنے افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں کتنا فرق ہوتا ہے، پھر خود حضرات اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ واجب اور ممکن میں بون بعید ہے، پھر یہ قیاس کیونکر درست ہوسکتا ہے، اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ خود شاہد میں علم وقدرت کی صفت نہ ہو، بلکہ عالمیت، قادریت وغیرہ احوال ہوں۔

الوجه الثانی : لو کان مفهوم کونه عالماً قادراً حیاً نفس ذاته لم یفد

حملها علیٰ ذاته و كان قولنا لمثابة حمل الشئ علیٰ نفسه واللا زم باطل۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ کے عالم، قادر، حی ہونے کا مفہوم اس کی ذات ہی ہے، تو ذات باری تعالیٰ پر ان صفات کا حمل غیر مفید ہوگا، کیونکہ اس بنیاد پر تو اگر کسی نے کہا کہ ذات عالم ہے، تو درحقیقت اس نے کہا کہ ذات، ذات ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حمل مفید نہیں ہے، معلوم ہوا کہ صفات زائد از ذات ہیں۔

اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس سے فقط اتنا معلوم ہوا کہ صفات کا مفہوم، ذات کے مفہوم سے الگ اور زائد ہے، لیکن دونوں کے مصداق کے اتحاد میں اس سے کیا خلل پڑا، اور نزاع اتحاد مفہوم میں نہیں ہے، اتحاد مصداق میں ہے۔

الوجه الثالث : لو كان العلم نفس الذات والقدرة أيضاً نفس الذات لكان العلم نفس القدرة فكان المفهوم من القدرة والعلم أمراً واحداً، وانه ضروری البطلان۔

یہ دلیل بھی سابقہ دلیل ہی کی قبیل سے ہے، اس سے صرف اتنا ثابت ہوا کہ علم اور قدرت کے مفہوم میں تغایر ہے، لیکن مفہوم کا تغایر اور ہے اور مصداق وحقیقت کا تغایر امر دیگر! اس دلیل سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ علم اور قدرت اور ذات کی حقیقت اور مصداق الگ الگ ہے۔ تغایر کا انکار کون کرتا ہے؟ دراصل یہ دونوں دلیلیں حقیقت اور مفہوم کے درمیان امتیاز نہ کرنے کی بنیاد پر قائم ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد ہی غلط ہے، پس دونوں دلیلیں خود بخود منہدم ہوگئیں۔

شرح مواقف میں یہ تینوں دلیلیں اور ان پر اعتراضات مذکور ہیں، ان کا حال تم نے دیکھ لیا، ان کے علاوہ اس طرز کی جو دلیل بھی پیش کی جائے گی، عقل خوردہ بیں ضرور اس میں کوتاہی نکال دے گی، ان دلائل کی بنیادی خامی پر غور کرو۔

ذات وصفات کا تصور نیز طرز استدلال ہمارے متکلمین نے اہل معقول سے اخذ کیا ہے، یہی بنیادی کمزوری ہے، اس کو نہ قرآن وسنت سے کوئی مناسبت ہے اور نہ اہل زبان کے محاورات سے، یہ معقولین کی وضعی چیزیں ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شخص...... جس کو نوامیس فطرت سے ذرا بھی مناسبت ہوگی...... وہ بداہۃً یہ جانتا ہے کہ ذات وصفات کا تعلق ایسا نہیں ہے جیسا دو مستقل علیٰحدہ علیٰحدہ چیزوں میں ہوتا ہے، کہ ایک کے دوسرے سے ربط کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں، فلاں کے اوپر ایک زائد وجود رکھتی ہے، ذات وصفت کا تعلق ایسا ہرگز نہیں ہے، مانا کہ دونوں کا مفہوم بھی الگ ہے، اور دونوں کا مصداق بھی الگ ہے، مگر یہ صرف ذہنی اور عقلی لحاظ سے ہے، عقل اپنی قوت امتیاز سے ذات اور صفات دونوں کو جدا جدا شناخت کر لیتی ہے، لیکن یہ مفروضۂ ذہنی ہے، خارج سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، وجود خارجی کے لحاظ سے صفات کو زائد از ذات ماننا ممکن ہی نہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ذات کی حقیقت خارج میں الگ ہو اور صفات کا وجود علیحدہ ہو، پھر دونوں میں ارتباط ہوا ہو۔ وجود خارجی کے لحاظ سے اس کا تصور غیر ممکن اور ممتنع عقلی ہے، اہل معقول جو مرتبۂ ذات مجرد عن الصفات کہا کرتے ہیں، یا صوفیہ کے یہاں ذات بحت کی اصطلاح آتی ہے، یہ محض ذہنی ہے، حقیقت سے اس کو کچھ علاقہ نہیں، خارج میں جب بھی ذات ہوگی صفات کے ساتھ ہوگی، ذات بحت کا تصور خارج میں محال ہے، محض فرضی چیز ہے، اور گفتگو یہاں ذات وصفات کے وجود خارجی کی ہے، ذات کی شناخت اوصاف ہی سے ہوتی ہے، صفات دراصل لوازم ذات ہیں، یا انھیں علامہ ابن ہمام کی لطیف تعبیر میں فروع ذات کہہ لو، ذات جتنی کامل ہوگی اسی قدر وہ اوصاف کمال کے ساتھ متصف ہوگی۔ سوچو وہ ذات ہی کیا ہے جو صفت وجود تک

سے محروم ہو، اس کو ذات تو کوئی مسخرہ ہی کہہ سکتا ہے، اور ایسے مسخرے بہت ہوئے ہیں، اوصاف کے لئے زائد از ذات کا لفظ بھی پُر خطر ہے...... اور حق تعالیٰ کی جناب قدس میں ہر وہ لفظ خطرناک ہے، جس کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ہے...... اگر زائد سے مراد وجود خارجی کے لحاظ سے زائد ہے تو قطعاً باطل ہے، اور اگر لحاظ ذہنی کے اعتبار سے ہے تو درست، مگر یہاں لحاظِ ذہنی کا کیا کام؟ گفتگو تو وجود خارجی سے ہے، وجود خارجی کے کسی مرتبہ میں ذات اوصاف سے خالی نہیں ہوسکتی۔ دیکھو سورج کی ذات کے لئے روشنی لازم ہے، تصور کے لحاظ سے چاہے تم سورج اور روشنی کا الگ الگ لحاظ کرلو، مگر وجود خارجی میں دونوں علیٰحدہ ہرگز نہیں ہیں، وجود خارجی میں شمس کا مرتبۂ ذات روشنی سے جداگانہ ممتنع ہے، اہل معقول کو اس باب میں سخت مغالطہ ہوا ہے، خارج میں انھوں نے جزئیات وافراد موجود پائے، پھر یہ دیکھا کہ وہ افراد کچھ اوصاف متشابہہ کے حامل ہیں، مثلاً زید، عمرو، بکر، گائے، بکری وغیرہ کو دیکھا، پھر یہ دیکھا کہ ان سب میں حیوانیت، حساسیت، نامیت، حرکت بالارادہ وغیرہ اوصاف ہیں، یہ اوصاف لوازم ذی روح ہیں، انھوں نے ذہنی طور پر ان اوصاف کو موصوفات سے جدا لحاظ کر کے ایک وجود فرض کرلیا، اور ہر ایک کا نام کلی رکھ دیا، یہاں تک معاملہ درست رہا، آگے چل کر ان کی عقل نے ٹھوکر کھائی، جن چیزوں کو انھوں نے محض لحاظ ذہنی کے طور پر موجود علیحدہ ادراک کیا تھا، ان کو ایک مستقل حیثیت خارج میں بھی دے دی، اور ان میں سے بعض کو جنس اور بعض کو فصل مان کر حیوان موجود فی الخارج کو اسی مفروضۂ جنس وفصل سے مرکب مان لیا، حالانکہ یہ اوصاف تو ذات حیوان موجود کے توابع تھے، یہ مادہ ترکیب کیسے بن سکتے ہیں، اگر ترکیب ماننی ہی تھی تو ذہنی مفروضہ کے طور پر لحاظ کرلیتے، لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ خارج میں بھی انھیں اوصاف سے

مرکب مان لیا، سو چو کہ اوصاف تو ممکنات میں عرض ہوتے ہیں، اور اعراض کا مجموعہ عرض ہوگا نہ کہ جوہر! لحاظِ ذہنی اور حقیقت خارجیہ کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے اہل معقول نے ایسی ایسی بے عقلیاں کی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جوہر عقل سے نوازے بھی گئے تھے یا زبردستی معقولی بن گئے، صورت جسمیہ اور ہیولیٰ کے سلسلہ میں بھی اسی قسم کی نادانیاں سرزد ہوئی ہیں۔ **والقصة بطولها**

متکلمین چونکہ اہل معقول ہی کے تعاقب میں چلتے ہیں، اسلئے یہ بھی اسی وادی میں جا پھنسے، اور انھوں نے بھی اوصاف کو زائد علی الذات کہنا شروع کردیا اور انھیں مستقل حقائق تسلیم کرکے ذات وصفات کا جوڑ ملانے لگے، پھر کسی نے **لاعین، لا غیر** کہا، اور کسی نے محض غیر کہا، حالانکہ یہ سب کچھ بطور لحاظ ذہنی کے ہو تو ہو، وجود فی الخارج کے اعتبار سے حق تعالیٰ کی جناب قدس عین وغیر اور لاعین ولاغیر سب سے بالاتر ہے، انھیں مکملات ذات کہنا بھی غلط ہے، ان کا مستقل وجود علیٰحدہ ماننا بھی باطل ہے، اور ان کے لئے احوال کا لفظ تجویز کرنا بھی حماقت ہے۔ ؎

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

وہ کون سی ذات ہوگی جو اپنے مرتبہ وجود خارجی کے کسی بھی مرحلہ میں صفات سے عاری ہوگی، ان ذہنی تعینات کو موجودات خارجیہ سے بھڑا دینا سخت التباس واشتباہ کا سبب ہے۔

اب ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو، جو حق تعالیٰ کی ذات عالی صفات کو ایک مستقل حقیقت ہر قسم کے اوصاف حتیٰ کہ وجود سے بھی عاری ماننا چاہتے ہیں، اور اوصاف کو مستقل ایک حقیقت یقین کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ذات کے لئے اوصاف مانے جائیں تو ایک تو استکمال بالغیر لازم آئے گا، دوسرے تعدد وجباء

لازم آئے گا، تیسرے تعدد قدماء لازم آئے گا، اس لئے سرے سے اوصاف کا اتصال ذات سے ہونے ہی نہ دو، اور جس صفت کی ضرورت کہہ دو کہ وہ ذات ہی ہے صفت کے مصداق ومفہوم سے ذات خالی ہے، بھلا ان عقلمندوں سے پوچھو کہ ذات اوصاف سے خالی ہو کر کیا کہلائے گی، وہ تو معدوم محض ہے، محض ذہنی مفروضہ ہے، پھر جب وہ معدوم ہے تو اس میں اتنی طاقت کہاں کہ وہی علم بھی ہو، وہی قدرت بھی ہو، **نعوذ باللہ**۔ صفات مکملات ذات نہیں ہیں، لوازم ذات ہیں، مقتضیات ذات ہیں، ان کا مصداق ومفہوم سب کچھ ذات کے تابع ہے، اور ایسا تابع کہ اس پر زائد وغیرہ کا اطلاق ممتنع ہے، یہ احمقانہ نظریہ جس کے نتیجہ میں ذات پردۂ عدم میں چلی گئی، اسی بنیاد پر قائم ہوا کہ اوصاف کو ذات سے الگ ذہناً لحاظ کر کے پھر انھیں ہی مستقل وجود سمجھ لیا۔ ایک بیماری ہوتی ہے کابوس کی اس میں مریض احساسی اور ذہنی قوت ایک رخ میں مرکوز ہو کر بہت زیادہ قوت پیدا کر لیتی ہے، ایسا مریض ذہنی طور پر ایک خوفناک چیز فرض کر لیتا ہے، پھر اس کو اس کی قوت تصور مجسم صورت عطا کر دیتی ہے، اس کے بعد اسی سے ڈرتا گھبراتا اور بھاگتا ہے، اسی کی شاخ مالیخولیا بھی ہے، فلسفی وغیرہ کو یہ مرض عموماً لاحق ہو جاتا ہے، علی گڈھ یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر اسی ذہنی مرض میں مبتلا تھے، وہ شکار کے شوقین تھے، شکار سے واپس آکر بندوق کو بستر پر لٹا دیتے تھے، اور خود اس کونے میں جا کھڑے ہوتے تھے جہاں بندوق رکھا کرتے تھے۔

بہر حال فلاسفہ کا تو یہ حال ہوا، کچھ اور لوگ حماقت کے گھوڑے پر سوار آئے، انھوں نے صفات کو الگ کر کے احوال تسلیم کئے، جو نہ موجود نہ معدوم، **لاحول ولا قوۃ إلا باللہ**۔

حضرات متکلمین بھی انھیں کے پیچھے پڑ گئے اور اوصاف کو علیحدہ مان کر حق

تعالیٰ کو ان کے ساتھ متصف تو مان لیا، مگر جب تعدد قدماء کی خرابی ان کے سر پڑی تو کبھی کہتے ہیں کہ تعدد ذوات قدماء ممتنع ہے، تعدد اوصاف قدیمہ ممتنع نہیں، سوال یہ ہے کہ جب انھیں الگ تسلیم کر لیا گیا تو ذوات ہوں یا اوصاف، قدماء تو بہر حال قدماء ہیں، ان کا تعدد کیونکر ممکن ہوگا؟ اس پر کوئی دلیل نہیں پیش کی، کبھی کہتے ہیں کہ تعدد قدماء سے کیا خرابی لازم آئے گی، ہر قدیم کا الہ ہونا تو ضروری نہیں؟ اس پر سوال ہوگا کہ چند قدماء میں سے ایک کو الہ ماننا اور باقی کو نہ ماننا یہ ترجیح بلا مرجح ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ اوصاف ممکن بالذات اور قدیم بالغیر ہیں، لو صاحب ممکنات بھی ذات باری تعالیٰ تک راہ پا گئیں، اور راہ بھی کیسی؟ اف **نعوذ باللہ** ذات کی صفات بن کر! دیکھ لو یہ راہیں کتنی پُرخطر ہیں۔

اب سنو! بے خطر اور ہموار راستہ کیا ہے جس پر آنکھ بند کر کے چلا جا سکتا ہے، ہاں اس سے پہلے ذرا دیکھ لو ائمہ متکلمین اپنے چلے ہوئے راستہ کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں، صاحب فتح الباری، امام الحرمین کا قول نقل کرتے ہیں:

رکبت البحر الاعظم وغصت فی کل شئ نهی عنه اهل العلم فی طلب الحق فراراً من التقليد والآن فقد رجعت واعتقدت مذهب السلف، اور موت کے وقت فرمایا: **یا اصحابنا لاتشتغلوا بالکلام فلو عرفت أنه يبلغ بی مابلغت ماتشاغلت به** (فتح الباری ج:۱۳، ص:۳۵۰)

کوئی اور صاحب فرماتے ہیں:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها　　وسیرت طرفی بین تلک المعالم
فلم أر إلا واضعا کف حائر　　علی ذقن اوقارعا سن نادم

میری عمر کی قسم! میں تمام مکاتب فکر میں گیا، اور اپنی نگاہ ان تمام علوم وآثار پر دوڑائی،

میں نے سوائے اس کے کچھ نہیں پایا کہ حیران ہوکر ایک شخص ہاتھ ٹھڈی پر رکھے ہوئے ہے، یا ندامت سے اپنے دانت کرید رہا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

نهاية اقدام العقول عقال　　واكثر سعى العالمين ضلال
وارواحنا فى وحشة من جسومنا　　وحاصل دنيانا اذى ووبال
ولم نستفد بحثنا طول عمرنا　　سوى أن جمعنا فيه قيل وقال

اور فرماتے ہیں:

لقد تاملت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيتها تشفى عليلاً ولاتروى غليلاً ورأيت أقرب الطرق طريقة القرآن...... ومن جرب مثل تجربتى عرف مثل معرفتى، (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:٦، ص:١١/١٠)

اور سنو! حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمہ بھی اچھی بات لکھتے ہیں:

> ''دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ''ہم نے آدم کو سب نام سکھائے'' دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہونچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کی ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے، یہی ہماری حقیقت رسی ہے، اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے، لیکن ہزاروں صدیاں گذرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے رہے، جب مادیات کا یہ عالم ہے تو وراء والوراءہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی ہے، تجلی

گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔ (سیرۃ النبی، ج:۴، ص:۳۸۴)

سچ ہے اور بالکل سچی حقیقت ہے، ذات پاک تقدس وتعالیٰ غیب الغیب، وراء الوراء ہے، وہاں تک کسی انسان کی رسائی، یا ملک کی پہونچ ممکن ہی نہیں، وہ حد اِدراک وقیاس اور حیطۂ خیال ووہم سے بہت بالاتر ہے، اس کے عتبۂ عالی تک کسی کی رسائی ممکن نہیں، ایمان سب کا بالغیب ہے، ان فرشتوں کا بھی جو ہر وقت بارگاہِ قدس میں حاضر رہتے ہیں، صاحب مشکوٰۃ نے ابن حبان کے حوالے سے باب المساجد کی فصل ثانی کے اخیر میں ایک حدیث نقل کی ہے، اسے پڑھ لو، حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی پاک ﷺ سے عرض کرتے ہیں کہ **یا محمد إني دنوت من الله دنواً مادنوت قط، قال: وکیف ذاک یا جبرئیل؟ قال: کان بیني وبینه سبعون الف حجاب من نور۔**

بھلا بتاؤ جہاں ۷۰؍ ہزار پردے قرب کا اقرب ترین درجہ ہو، اس کے غیب ہونے میں کیا شبہ؟ وہاں تک کسی کی رسائی نہیں، پھر بے چاری عقل انسانی جو خود اپنی ذات وصفات کی تہوں میں نہیں جھانک پاتی، وہاں تک کیسے جاسکتی ہے، اقرب ترین اور اسلم ترین راہ یہ ہے کہ مغیبات میں محض خبر پر اعتماد کیا جائے، قرآن واحادیث جو اخبار صادقہ یقینیہ کا مجموعہ ہے، ان میں جو کچھ ترجمان الغیب ﷺ کے واسطے سے ہم کو ملا ہے، بس اس کو مرکز ایمان بنایا جائے، نہ ان کا تجزیہ کیا جائے اور نہ تحلیل کی جائے! یہ چیزیں محض توقیفی ہیں، عقل کے ناخنوں سے جب ان کو کریدا جائے گا، بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی، ایمان یہی ہے کہ جہاں تک لے جایا گیا، وہاں تک چلیں، اور جہاں ٹھہرا دیا گیا ٹھہر جائیں، مغیبات کا تفصیلی علم خدا کے حوالے! حق تعالیٰ نے اپنی معرفت اوصاف ہی کے ذریعے کرائی ہے، اس سے ہم فائدہ اٹھائیں، اور اپنا

ربط خدا سے صحیح کرلیں، صفات باری تعالیٰ کی تبیین کا فائدہ الفوز الکبیر میں دیکھو۔

جن صفات کا حق تعالیٰ نے اپنے لئے اثبات کیا ہے، بس انھیں کا اسناد واثبات کیا جائے، اور جن صفات کے بارے میں سکوت کیا ہے، ان کو نفیاً یا اثباتاً کسی طرح نہ چھیڑا جائے، ورنہ محض رجماً بالغیب ہوگا، ہاں اگر کوئی ہم پر ضد کرے گا تو ہم اس سے صفت غیر مذکورہ فی النصوص کی تشریح چاہیں گے، اگر اس کی تشریح کے لحاظ سے وہ کسی منصوص صفت کے مطابق ہوگی تو خیر ورنہ مردود! بس یہ خلاصہ ہے۔

مسئلہ صفات میں متاخرین نے تاویل کی راہ اختیار کی ہے، اور مصیبتوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ استواء، نزول محبت، غضب، رحمت وغیرہ کی تاویلات کی ہیں، لیکن سچ پوچھو تو تاویلات کے بعد ان حقائق والفاظ میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی، بعض اوقات یہ الفاظ بلا مصداق کے رہ جاتے ہیں، اور اگر تاویل کے راستے میں آدمی دور تک جائے تو انکار تک جا پہونچے گا۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

”ولیس أحد یتجاوز عن حد الاعتدال إلا یضطر إلی الاقتحام فی مثله فلیحترز عن الافراط والتفریط ولیحل حول حمی الحق فان النبی ﷺ قال: سَدِّدُوا وقاربوا، ألاتریٰ أن الاشعری لما بالغ فی التنزیه وشدد فیه لزمه نفی کثیر من الصفات التی أثبتها السمع حتیٰ قارن المعطلة، فلم یبق للاستواء المنصوص عنده مصداق وصار نحو ذلک کله من باب المجازات عنده۔ (فیض الباری،:۴، ص:۴۷۳)

صرف اتنا کافی ہے کہ یہ الفاظ اپنے اصل مفہوم میں ہیں، لیکن لیس کمثله شیٔ کے اصول پر ہم ان کی کیفیات پر آگاہ نہیں ہیں، کیونکہ ان کا تعلق ایسی ذات سے

ہے جو ہر قیاس وگمان سے بالاتر ہے، ائمہ کرام نے اس حقیقت کو خوب سمجھا تھا، امام مالک سے کسی نے سوال کیا کہ:

كيف استوى؟ فاطرق مالك راسه حتىٰ علاه الرحضاء ثم قال: الاستواء غير مجهول والكيف غير معقول والايمان به واجب والسوال عنه بدعة وما أراك إلا مبتدعاً، ثم أمر به أن يخرج ۔

دیکھتے ہو! أعلم أهل المدينة نے جو معاملہ اس شخص کے ساتھ کیا، وہی مناسب تھا، اور بعد والوں کے لئے بھی وہی مناسب تھا، اب سوچو جو حضرات استواء کے معنی استیلاء کے بتاتے ہیں، چند غرائب لغت کا سہارا لے کر! ان کے پاس اس معنی کے تیقن کی کیا دلیل ہے، اگر یہی معنی ہے تو سلف سے منقول کیوں نہیں ہے، لوگ کہتے ہیں کہ فلسفہ زدہ ذہنیت کی تسکین اسی طرح کی تاویلات میں تھی، یہ عذر بارد ہے، مان لیا کہ تھوڑی دیر کے لئے ایک فلسفہ زدہ کو تسکین ہوگئی، لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے دوسری نصوص میں جو شکوک وشبہات کا دروازہ کھل گیا، اس کے بند کرنے کا کیا سامان ہوگا، نہیں نہیں۔ مرض کا علاج دوا سے چاہئے، مرض سے نہیں، دوا یہ ہے کہ حد ادراک سے آگے بڑھنے سے انھیں روک دیا جاتا، آخر جناب نبی کریم ﷺ نے من خلق الله کے جواب میں صرف فلينته کیوں فرمایا؟ اس سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟ تاویل کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے، حالانکہ یہ یقینی امر ہے کہ نہیں جانتے، پھر کیا ضرورت ہے کہ ایسا دعویٰ کیا جائے جو پشت کا بار بن جائے، خدا ورسول نے جس کو مبہم چھوڑ دیا ہے اس کی تحقیق وکرید میں ہم کیوں پڑیں، اتباع متشابہات سے قرآن میں منع فرمایا گیا ہے، ابہام سے ہمارا کچھ نقصان نہیں فائدہ ہی فائدہ ہے، ہم کو اس سے فائدہ اٹھا کر راہ نجات ہموار کرنی چاہئے، ادھر ادھر

نہیں جانا چاہئے۔

بس بھائی! بات ابھی باقی ہے، مگر تھک بھی گیا ہوں اور وقت بھی ختم ہو گیا، اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، پھر اگر اللہ نے توفیق دی تو موضوع کے دوسرے جزء یعنی انکارِ صفات کی مضرتوں پر گفتگو ہوگی، گو کہ اس کا ایک حصہ اس مکتوب میں بھی آ گیا ہے۔

باقی یہاں سب خیریت ہے، آج کل میرے اوپر کتابوں کا انبار ہے، صحت وعافیت کی دعا کرو۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰٦ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسئلۂ صفات پر گفتگو آخری مرحلہ میں آ چکی ہے، کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ بقیہ بھی لکھ کر چھٹی کروں، مگر فرصت تحریر عنقا ہے، اور مسئلہ دقیق بھی ہے اور طویل بھی، متعدد مجالس میں لکھنے کی عادت نہیں اور طویل مجلس ملتی نہیں، اس لئے دیر ہوتی جا رہی ہے، آج بنام خدا قلم اٹھاتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ بخیر وخوبی پورا کرنے کی توفیق دیں۔

گفتگو اس پر کرنی ہے کہ انکار صفات اور اس کے متعلقات کی راہ سے کیا نقصانات اور خرابیاں پیدا ہوئیں، اور کیا احتمالات ہیں؟ اس مسئلہ میں گفتگو فلاسفہ سے شروع ہوگی اور معتزلہ تک پہونچے گی، کیونکہ انکار صفات کے مسئلہ میں پیش رو یہی فلاسفہ ہیں، معتزلہ بے چارے تو انھیں کے مقلد نادان اور طفیلیٔ دسترخوان ہیں، پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ انکار صفات پر کس لئے مجبور ہوئے، صفات کو تسلیم کرنے میں

انھیں کیا قباحت محسوس ہوئی۔

پورے فلسفہ پر غور کرنے سے اور خود ان کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گروہ حقیقت کی تلاش میں عقل کے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا ہے، عقل ہی کو یہ طائفہ معیارِ حق وصواب سمجھتا ہے، جو کچھ عقل انسانی تسلیم کرے وہ مسلّم، اور جسے رد کر دے یا اس کے دائرۂ فہم سے باہر ہو، وہ نا قابل تسلیم اور محال عقلی!

حسامی کا آخری سبق جو تم لوگوں نے پڑھا تھا، اس میں یہ عبارت ہے، **فقالت المعتزلة: العقل علة موجبة لمااستحسنه ، محرمة لما استقبحه على القطع والبتات فوق العلل الشرعية فلم يجوزوا أن يثبت بدليل الشرع مالايدركه العقل أو يقبحه** ، خط کشیدہ جملہ اصلاً معتزلہ کی آواز نہیں ہے، معتزلہ تو ناقل ہیں، یہ آواز درحقیقت فلاسفہ کی ہے، ہاں بعد والی عبارت معتزلہ نے بڑھائی ہے، فلاسفہ کو اس کو ضرورت نہ تھی، غرض اس گروہ کا سفر عقل کے سہارے ہوتا ہے، جہاں تک چل کر عقل تھک کر درماندہ ہو جاتی ہے، اس کے آگے داناؤں کا یہ گروہ راستہ ہونے ہی کا انکار کر دیتا ہے، ظاہر ہے کہ جب ان کے نزدیک اصل معیار عقل ہے، تو ان کے لئے ضروری ہوا کہ چند عقلی مفروضے گھڑیں، اور انھیں مفروضات عقلیہ پر پوری کائنات کی توجیہ کریں، فلسفہ کی کوئی کتاب ...... خواہ طبعیات کی ہو، خواہ الٰہیات کی ...... اٹھا لو، اور دیکھ لو کہ یہ ٹولہ عقلی تانے بانے تننے میں مشغول ہے، پھر خود ہی ایک ایک تار کو توڑتا ہے، ان لوگوں کا کوئی عقلی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر اسی گروہ کے دوسرے فرد نے اسی عقل کے تیشے سے حملہ نہ کیا ہو، اس گروہ کے حق میں حضرت حق جل مجدہٗ کا یہ ارشاد خوب صادق آتا ہے: **وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثاً۔**

لیکن بے شمار عقلی اختلافات کے باوجود، ان گنت واقعی تناقضات کے باوجود یہ گروہ اس بات پر متفق ہے کہ معیار حق وصواب عقل ہی ہے، اس بنیاد پر جو مفروضے انھوں نے وضع کئے ہیں، غور سے دیکھو گے تو اس گھروندے میں صفات کا مسئلہ تو خیر بعد کی چیز ہے، خود اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہی ضروری باقی نہیں رہتی، کیونکہ ان کے خیال میں ہیولیٰ اور صورت جسمیہ قدیم بالنوع ہیں، ظاہر ہے کہ پورے عالم کی ترکیب انھیں دونوں سے ہے، تو عالم قدیم ہوا، اور قدیم کسے کہتے ہیں؟ شئ لااوّل لہ۔ پھر بتاؤ اس جھنجھٹ کی کیا ضرورت کہ خدا کو بھی تسلیم کیا جائے، آخر جو چیز قدیم ہے وہ خود واجب الوجود ہے، اس کے لئے دوسرے واجب الوجود کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ فلاسفہ بھی ذات خداوندی کو تسلیم کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ قرون سابقہ میں انبیاء کا وجود مسلسل رہا ہے، ثم أرسلنا رسلنا تترا، اس پر گواہ ہے، اور ہر ایک نبی نے خدا کی حقانیت اور وحدانیت کا زور وشور سے اعلان کیا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات بطور علم ضروری کے پیوست ہے...... جس کو خارج کی کسی طاقت سے مٹایا نہیں جاسکتا...... کہ حق تعالیٰ کی ذات موجود اور واحد ہے، تو ایک طرف تو وہ اپنی فطری آواز سے مجبور، دوسری طرف انبیاء کی دعوت کا تسلسل وتواتر! انھوں نے مجبوراً ذات باری تعالیٰ کا اقرار کیا، لیکن بغور دیکھو کہ ان کی اقرار کردہ ذات کی حقیقت کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ ذات من حیث الذات ہے، اس میں کوئی صفت نہیں ہے، حتیٰ کہ وجود بھی ایک صفت ہے، اس کا انتساب بھی باری تعالیٰ کی جناب میں نہیں ہوسکتا۔

فلاسفہ کے نزدیک اشیاء کے تین درجے ہیں۔ ماہیت من حیث الماہیت، ماہیت من حیث الوجود الخارجی، ماہیت من حیث الوجود الذہنی، ان میں سے ہر ایک کو

یہ لوگ بالاستقلال ثابت مانتے ہیں، یعنی نفس ماہیت جو وجود خارجی کے انضمام سے خالی ہے، یہ ان کے خیال میں ایک حقیقت ثابتہ ہے، وہی ماہیت مطلقہ ان کے نزدیک واجب تعالیٰ کا مصداق ہے، اور ذات، ماہیت اور وجود یہ سب عین واحد ہیں باصطلاح فلاسفہ! پھر تم دیکھو کہ وہ ماہیت مطلقہ من جمیع الجہات واحد ہے، اس پر انھوں نے یہ مفروضہ وضع کیا کہ **الواحد لایصدر عنه إلا الواحد**، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس سے ایک ہی چیز صادر ہوئی ہے، اس کا نام انھوں نے اپنی عقل ناتمام سے عقل اول رکھا۔ اور پھر اس کے بعد عقول کا ایک سلسلہ شروع کرکے عقل عاشر پر دم لیا، اب یہ سارا عالم عقل عاشر کی کرشمہ سازی ہے، اور یہ سب قدیم ہیں، نیز ہر ایک کا صدور دوسرے سے ارادۂ واختیار کے ساتھ نہیں، بلکہ بطور اضطرار و وجوب کے ہوا ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ ان مجبور خداؤں کا کیا حاصل؟ ایسے ہی مضطر و بے بس خدا مانتے ہیں، تو سلسلہ اگر ہیولیٰ اور صورت جسمیہ پر تمام کردیا جائے، تو کیا حرج لازم آتا ہے، ان دونوں کی تو عالم کو ضرورت ہے، لہٰذا ان سے اوپر والے بے کار اور زائد ہی ہیں، سچ پوچھو تو بات یہی ہے کہ ہیولیٰ اور صورت جسمیہ کے علاوہ انھوں نے درحقیقت کسی اور وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے، مگر انبیاء کی دعوت کی اہمیت نے انھیں اس منافقت پر مجبور کیا، اور ان سے اس قسم کی فضول اور لایعنی باتیں صادر ہوئیں، یہ انبیاء کی ہیبت ہی کا اثر ہے کہ انھوں نے صرف خدا ہی کا وجود نہیں تسلیم کیا ہے، بلکہ دوسروں کو دکھانے کے لئے انبیاء کو بھی مان لیا ہے، اپنے لئے نہ سہی، عوام الناس ہی کے لئے سہی، لیکن یہ محض دکھاوا ہے، جب ان سے نبی کی تعریف اور نبوت کی حقیقت دریافت کی جاتی ہے تو بہکی بہکی باتیں شروع کردیتے ہیں، تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ورنہ بتاتا کہ نبوت کی حقیقت ان کی دانست میں کیا ہے، درحقیقت یہ خوف وہیبت کا اثر تھا، جس کے باعث

وہ ان غیبی حقائق کے اقرار پر مجبور ہوئے، مگر جب تشریحات پر آتے ہیں تو اصل حقیقت واضح ہوجاتی ہے: إِذَا جَاءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللهِ وَاللهُ يَعْلَمُ إِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔ خدا کو مانا، مگر کیا مانا؟ جبکہ ہر قسم کے اوصاف وکمال اور اختیار وقدرت سے خالی مانا۔ رسول کو مانا، لیکن کیا مانا؟ جبکہ وحی اور فرشتوں کو تسلیم نہیں کیا، بھلا یہ ماننا بھی کچھ ماننا ہے کہ من مانی تشریحات وضع کر کے اسی پر اصرار کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں یہی خیال جاگزیں ہے کہ عقل معیار کامل ہے، اور دوسری کوئی چیز معیار نہیں ہے، ارسطو اور افلاطون وغیرہ نے انبیاء سابقین کا تو اتباع کیا نہیں، اور نہ ان کی لائی ہوئی شریعت کا التزام کیا، اس لئے ان کو یہ مخمصہ پیش نہیں آیا کہ فلاں آیت دائرۂ عقل میں نہیں آتی، یا فلاں شرعی حکم خلاف عقل ہے، اس لئے انکار یا تاویل کی راہ اختیار کرو، وہ تو اپنے کو بے نیاز کہتے ہیں۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ نے مکتوبات شریف میں ایک جگہ افلاطون کا ایک قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ”دعوت نبوت حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام چوں بافلاطون ...... کہ کلاں تر ایں بے دولتاں بودہ ...... رسید، گفت کہ نحن مهتدون لاحاجة بنا إلىٰ من يهدينا ، زہے سفیہ! بایستے، شخصیکہ احیاء اموات می نماید ابراء اکمہ وابرص می کند خارج از طور حکمت ایشاں است، او را می دید وتفطن احوال می کرد، نادیدہ جواب دادن از کمال عناد وسفاہت است۔

؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

ترجمہ: حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت جب افلاطون کو پہونچی...... جوان بدنصیبوں کا سب سے بڑا سردار ہے...... تو اس نے کہا: ہم ہدایت یافتہ قوم ہیں اور ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو ہدایت دے۔ اس بے وقوف کو چاہئے تھا کہ ایسے شخص کو جو مُردوں کو زندہ کردیتا ہے، اور مادرزاد اندھے کو بینا، اور ابرص کو اچھا کردیتا ہے، جو (ان کی) حکمت سے قانون کے ناممکن ہے، پہلے ان کو دیکھتا اور ان کے حالات دریافت کرتا (پھر جواب دیتا) بغیر دیکھے جواب دینا کمال درجہ دشمنی اور کمینہ پن ہے۔ فلسفہ کا اکثر حماقت ہے تو اس کا کل بھی حماقت ہے، اس لئے کہ کل کا حکم اکثر کا حکم ہے۔

(مکتوب: ۲۶۶، دفتر اول، ص: ۴۶۹)

پس ان عقلمندوں نے تو شرائع کا مقابلہ شروع سے انکار کے ساتھ کیا، اس لئے اس ایک بات کے بعد شریعت کا کوئی اور مسئلہ ان کے لئے دردسر نہیں بنا، لیکن شریعت محمدیہ اور نبوت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ہیبت انبیاء سابقین سے بہت زیادہ ثابت ہوئی، کیونکہ وہ حضرات محدود زمانہ اور مخصوص اقوام کے لئے ہوتے تھے، اور یہ نبوت قیامت تک کے لئے اور تمام اقوام عالم کے لئے ہے، اس لئے اس کا مقابلہ انکار کے ساتھ آسان نہ تھا۔ یہ مسئلہ فلاسفہ کے تلامذہ کے لئے خاصا دشوار ہوگیا، لیکن ذہانتوں نے ہمت نہیں ہاری، جوڑ توڑ کا عمل جاری رہا، زیادہ تر تو ایسا ہوا کہ شریعت کے اصطلاحی الفاظ کو تسلیم کرتے رہے، لیکن ان کے معانی کو تاویل وتحریف کا نشانہ بنایا، تاکہ اصل الفاظ پر ایمان ان کے لئے وقایہ بنا رہے اور معانی کی تحریف سے فلسفیانہ مفروضے باقی اور سلامت رہیں، اور کمتر یہ بھی ہوا کہ اصطلاحات فلسفیہ میں توسیع اور گنجائش پیدا کی، تاکہ بعض قطعی شرعیات جن میں کسی طرح تاویل وتحریف ممکن نہ تھی،

ان کو جدید توسیعات کے دائرہ میں لایا جاسکے، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ امکان بالذات اور امتناع بالغیر کی اصطلاح بوعلی سینا کی اختراع ہے، متقدمین فلاسفہ اس اصطلاح سے آشنا نہ تھے، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> قلت : إن الامكان بالذات والاستحالة بالغير من مخترعات ابن سينا ، وكان الشئ عند قدماء هم إما واجباً أو ممكناً ، وكان الواجب عند هم مايكون ازلاً وابداً ، والممكن مايوجد مرة وينعدم اخرىٰ ومالا يوجد ازلاً وابداً فهو ممتنع عندهم هٰكذا صرح به ابن رشد، فلما جاء ابن سيناء ورأى أن بعض قواعدهم لايوافق الشرع أراد أن يتخذ بين ذٰلك سبيلا فاخترع الامكان بالذات والمستحيل بالغير ۔(فیض الباری، ج:۴،ص:۵۱۴)

تحریف وتاویل کا یہ عمل فلاسفۂ متاخرین اور معتزلہ دونوں کرتے رہے، یعنی ماجاء بہ الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی عقلی میزان پر تولتے رہے، دونوں میں فرق ہوتا ہے......اور ایسا بہت ہوتا......تو شرعیات میں ترمیم وتحریف بیشتر، اور فلسفیات میں کمتر کرتے رہے۔

صفات باری تعالیٰ کو بھی انھوں نے اسی میزان پر تولا، ظاہر ہے کہ جب ذات باری تعالیٰ جل مجدہٗ ہی عقلی ادراک سے ماوراء ہے، اور اسے انھوں نے مجبور قرار دے کر تسلیم کیا ہے، تو صفات کے سلسلے میں بجز انکار کے ان کے پاس اور چارۂ کار ہی کیا تھا، انھیں مانتے تو ان میں کتنی تاویل کرتے، صفات تو کثیر ہیں، پھر بیچاروں کی ذہانت کتنا ساتھ دیتی، ایک ہی بار کھٹ سے انکار کر دیا اور مخمصہ ختم ہو گیا، لیکن فلاسفہ کا یہ گروہ اس وقت سامنے آیا، جب صفات شہرہ بہت زیادہ ہو چکا تھا، اور علماء اہل سنت

کی کاوشیں اور قربانیاں اس مسئلہ کو بہت واضح کر چکی تھیں، ان کے لئے انکار صفات کا مسئلہ پھر دشوار ہو گیا، ان کی ذہانتوں نے ایک اور چال چلی، اور صفات کو عین ذات قرار دیدیا، کچھ معتزلہ نے یہ راہ اختیار کی، اور کچھ احوال کے راستے پر چل پڑے، یہ ساری سرگردانی کیوں پیش آئی؟ اس لئے کہ انھوں نے عقل انسانی کو حاکم مطلق قرار دیا اور پریشان ہوئے۔ کوئی مسئلہ آج تک بے چاروں کے نزدیک صحت قطعی کا درجہ نہ پا سکا، ایک عقل مفروضات کا کوئی گھروندا بناتی ہے، تو دوسرے کی عقل اسے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیتی ہے، حضرت سعدیؒ نے خوب فرمایا ہے۔ ؎

دگر مرکب عقل را پویہ نیست   عنانش بگیرد تحیر کہ ایست
دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت   گم آں شد کہ دنبال راعی نہ رفت
کسانے کہ زیں راہ برگشتہ اند   برفتند وبسیار سرگشتہ اند
خلاف پیمبرِ کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
مپندار سعدیؔ کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

اب تک کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ فلاسفہ ومعتزلہ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عقل انسانی کو حاکم مطلق قرار دیا ہے، لیکن وہ تمام عقلوں کو کسی ایک بات پر متفق نہ کر سکے، بات یہ ہے کہ جس طرح انسان کا وجود اور اس کی ذات محدود ومقید ہے، اسی طرح اس کی عقل بھی محدود ومقید ہے، انھوں نے اس عقل مقید کے ماسوا کسی اور چیز کو معیار ماننے سے انکار کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ بالکل خلاف عقل ہے، پھر یہ بھی سوال لاینحل ہے کہ بے شمار انسانوں کی بھیڑ میں کس انسان کی عقل کو معیار بنایا جائے، وہ کون سا عاقل ہے جس کی عقل سب پر حجت ہو، یعنی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کی عقل سے بڑھ کر کسی کی عقل نہیں ہو سکتی، انبیاء سے تو یہ دامن بچاتے ہیں، پھر جس نے کوئی

رائے پیش کی، انھیں کی برادری کے دوسرے فرد نے اس کو اسی عقل کی رو سے رد کر دیا، اسی روگ نے پورے فلسفہ کو شکوک و اوہام کا مجموعہ بنا دیا ہے، اکبر کا شعر تم نے برمحل نقل کیا ہے، مگر غلط نقل کیا ہے، صحیح اس طرح ہے۔ ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہ تو بنیادی بات تھی، ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی غلط ہے، تو دیوار کا کیا حشر ہوگا،

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

عقل کو حاکم مطلق بنانے کا نتیجہ تو تمہارے سامنے ہے، لیکن ذرا دقت نظر سے کام لو، تو صاف نظر آئے گا کہ ان کے اصول کے مطابق نعوذ باللہ حق تعالیٰ کا وجود کوئی واقعی چیز نہیں ہے، بلکہ ان کی عقلوں نے گڑھ گڑھا کر ایک چیز کا نام واجب الوجود رکھ دیا، یا اس کا کچھ منفی قسم کا تعارف کرا دیا، اور کہہ دیا کہ اسی کو خدا مان لو، پھر جب چاہتے ہیں اپنی عقل سے اس کے تعارف میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں، حاکم مطلق تو خدا کو ہونا چاہئے، لیکن انھوں نے حاکم مطلق اپنی عقلوں کو بنا لیا۔ خدارا بتاؤ کہ ان کے گھڑے ہوئے ذہنی اور عقلی خدا میں جو ہر قسم کی صفات سے خالی ہے اور بت پرستوں کی ہاتھ سے تراشی ہوئی مورتیوں میں کیا فرق ہے؟ بلکہ یہ گروہ بت پرستوں سے بدرجہا بدتر ہے، بت پرست تو خوبصورت مجسمے ڈھالتے ہیں، کچھ نہیں تو ان کے حسن و جمال کی طرف طبیعت انسانی کو کشش ہوتی ہے، اور ان عقلمندوں نے جس خدا کو تراشا ہے، وہ محض ذہنی مفروضہ اور ہر قسم کے حسن و جمال اور جلال و کمال سے قطعی خالی! بھلا ایسے خدا کی عبادت کون کرے، اور ایسے خدا کی کیا ضرورت ہے؟

اب آؤ یہ بھی دیکھ لیں کہ انکار صفات کے بعد معتزلہ کا حشر کیا ہوا؟ تم یہ دیکھ

چکے ہو کہ معتزلہ نے کوئی ایسا شرعی حکم یا ایسی شرعی خبر ماننے سے انکار کر دیا ہے، جو ان کے دائرۂ عقل سے خارج ہو، اسی بنیاد پر انھوں نے یہ خیال جمایا کہ صفات کے جو کچھ معانی ہم جانتے اور سمجھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے ماسوا اور کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا، اور انھیں معانی اور مفاہیم اور کیفیات وتفصیلات کے ساتھ اگر ان صفات کو حق تعالیٰ کے لئے ثابت کیا گیا، تو تشبیہ لازم آئے گی جو حق تعالیٰ کی جناب میں عیب ہے، اس لئے تفصیلاً انھوں نے ہر ایک صفت کی نفی کی، اور جس کی نفی صراحۃً نہیں کر سکتے تھے اس میں ایسی تحریف کی کہ اس میں اور نفی میں صرف لفظی فرق رہ گیا، جیسا کہ تم وجود، حیات، علم اور قدرت کے بارے میں ان کا نظریہ پڑھ چکے ہو۔ یہ بات جب ان کے نزدیک بطور اصول موضوعہ کے طے ہو چکی، تو اب انھوں نے قرآن وحدیث کا رُخ کیا، انھیں قدم قدم پر ایسا محسوس ہوا کہ قرآن وحدیث کی تصریحات، ان کے مفروضات کی شدت سے تردید کر رہی ہیں، اس صورت حال میں ان کے سامنے دو راہیں تھیں، یا تو اپنے عقلی مفروضات سے دستبردار ہو کر خلوص سے قرآن وسنت پر ایمان لاتے، یا پھر بالکل انکار کر کے کافر مجاہر ہوتے، یہ دونوں راہیں مشکل تھیں۔ پہلی صورت میں حاکمیت عقل کے ہاتھ سے نکلتی، جس کی اجازت ان کا کبر نفس نہیں دیتا۔ اور دوسری راہ اختیار کرتے تو اس وقت کا سب سے طاقتور معاشرہ ان کا دشمن ہو جاتا، مجبور ہو کر انھوں نے الٹی سیدھی بے تحاشا تاویلات وتوجیہات کا دروازہ کھول دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی گمراہ ٹولیاں وجود میں آگئیں، احادیث کے سلسلے میں تو انھیں قدرے آسانی تھی، جو حدیث ان کی سمجھ میں نہیں آئی، اس کے ذات نبوی کے ساتھ انتساب ہی کا انکار کر دیا، لیکن قرآن میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا، گو کہ ان کے دلوں میں اس قسم کی بات بھی آئی تھی، چنانچہ معتزلہ کے ایک پیشوا جہم بن صفوان کے بارے

میں صاحب فتح الباری نے ایک جگہ نقل کیا ہے کہ اسے تمنا تھی کہ کاش وہ **الرحمن علی العرش استویٰ**، کو قرآن سے نکال دینے پر قادر ہوتا، لیکن وہ لوگ جب ایسا نہ کر سکے تو اس میں تاویل وتحریف کا دروازہ کھولا، اور ایسے مطالب اختراع کئے کہ سطحی عقل اور سطحی علم والا تو انھیں قبول کر لے، مگر قرآن وسنت اور آثارِ سلف پر نظر رکھنے والا، اس کو محض تحریف سمجھے گا، یہ کتنا زبردست مفسدہ ہے کہ قرآن کے مدلولات کو توڑا جائے، ان کی بے جا تاویلات کی جائیں، اور ان لوگوں کی پیروی کی جائے جن کے بارے میں **یحرفون الکلم عن مواضعه** وارد ہے، پھر دوسری خرابی اس کے ذیل میں یہ بھی پیدا ہوئی کہ جو لوگ ان کی تردید انھیں کی زبان واصطلاح میں کرنے اٹھے، وہ بھی اکثر جگہوں میں انھیں جیسی مشکوک اور نامعتبر باتیں کرنے لگے، ہمارا علم کلام اس کی مثالوں سے لبریز ہے، لیکن یہ تاویلات اتنی پھیلیں کہ رفتہ رفتہ اذہان بالعموم ان سے متاثر ہو گئے، حتیٰ کہ جو لوگ فلسفۂ اعتزال کی تردید قرآن وسنت کی زبان میں کرتے ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر کہیں کہیں اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں، جیسی معتزلہ وغیرہ سے صادر ہوتی ہیں، یہ موضوع ذرا نازک ہے اور تفصیل طلب بھی اس لئے تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھتا، کبھی ملاقات ہوگی تو زبانی بتاؤں گا۔

معتزلہ کو مسئلہ صفات سے تو فراغت ہو گئی۔ اب آؤ حق تعالیٰ کے آمر وناہی ہونے کا مسئلہ بھی ان کے اصول کی روشنی میں سمجھ لیں، کیا بتاؤں عجب سفسطے ہیں، سوچنے سے بھی طبیعت اباء کرتی ہے، لکھنا تو بڑی بات ہے، لیکن نقل کفر ہے، مجبوراً لکھتا ہوں۔

معتزلہ نے جب عقل کو حاکم مان لیا، تو اس کی بنیاد پر حق تعالیٰ کے ذمے انھوں نے واجب قرار دیا کہ وہ افعال کے حسن وقبح کو ظاہر کر دیں، اسی اظہار حسن

وقبح کا نام امر ونہی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی فعل کے حسن یا قبح کا فیصلہ کرنے والی تو عقل ہے، لیکن صرف عقلی ادراک کی بنیاد پر اس کو فرض یا حرام نہیں کہا جا سکتا، جب شریعت اس کے حسن وقبح کا اعلان بصورت امر ونہی کردے گی، تب اس کو حرام یا فرض کہا جائے گا، گویا اصل تو عقلی فیصلہ ہے، شریعت محض اس کی منادی ہے، اچھا شریعت نے جب اس کو پکار دیا تو اب جو انسان اس فعل حسن یا قبیح کو وجود میں لاتا ہے، اس میں ان کے اصول کے لحاظ سے خدا کی قدرت کا دخل نہیں ہوتا، بندہ محض اپنی قدرت سے صادر کرتا ہے، بلکہ خلق کرتا ہے اور صادر کرتا ہے، لہٰذا ہر عمل کا نتیجہ اس کے ساتھ لازم ہوتا ہے، ایسا لازم کہ حق تعالیٰ اس کو اس سے جدا نہیں کرسکتے، کیونکہ جب صدور وخلق فعل میں قدرت الٰہیہ موثر نہیں ہے، تو نتیجۂ فعل میں کیوں موثر ہوگی، پس لازم ہوا کہ بندہ نے جو کچھ عمل کیا، اس کی سزا وجزاء بطور وجوب کے ہو، یعنی حق تعالیٰ کو اس کے خلاف پر قدرت نہ ہو، چنانچہ معتزلہ اسی کے قائل ہیں کہ تعذیب مجرم اور تنعیم مطیع حق تعالیٰ کے ذمہ لازم ہے، میرا خیال ہے کہ تعذیب وتنعیم کے عمل کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی زحمت ان لوگوں نے بلاضرورت کی ہے، ظاہر ہے کہ جب اعمال کا خلق وصدور دونوں بندے کے اختیار وقدرت سے ہوا، تو بدیہی امر ہے کہ اس کے لوازم ونتائج بھی بندے ہی کے خلق وکسب سے ہوں گے۔ حق تعالیٰ کی قدرت جب افعال ہی پر نہیں ہے، جو اصل ہیں تو ان کی فرع یعنی لوازم ونتائج پر بھی نہ ہوگی، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ فلاں فلاں امر خدا کے ذمے واجب ہیں، ہاں واجب کا اگر یہ مطلب ہو کہ خدا اس پورے منظر کا صرف ایک تماشائی ہے، اس کی قدرت کو اس کارخانہ میں کوئی دخل نہیں، تو درست ہوگا، اور شاید ان کی مراد یہی ہو۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی صاف ہوگیا کہ وعیدات عامہ میں خلف کی بحث انھیں

کے اصول کے مطابق آتی ہے، کیونکہ ہر عمل کا لازمی نتیجہ عذاب یا ثواب، جب قدرت الٰہیہ سے نعوذ باللہ خارج ہے، تو اگر اس کے خلاف نتیجہ کا ظہور ہو تو لازماً اسے خلف فی الوعید کہنا پڑے گا، اور چونکہ حق تعالیٰ کی قدرت ان پر واقع نہیں ہے، اس لئے خلف مذکور کو ممتنع بھی کہنا ضروری ہوگا۔ معلوم ہوا کہ وعیدات عامہ ہوں یا خاصہ، ان میں خلف کے امتناع و امکان کی بحث معتزلہ کے اصول پر آسکتی ہے، اہل سنت کے اصول کے مطابق خلف کی بحث آتی ہی نہیں، جیسا کہ سابق مکاتیب میں اس کو واضح کر چکا ہوں۔

پھر خلف فی الوعید کو ممکن مان لیا جائے تو ان کے لحاظ سے کذب بھی ضرور لازم آئے گا، کیونکہ اعمال کے نتائج ولوازم سے قدرت تو منتفی ہو چکی، اب خدا کے حصے میں کیا رہ گیا، محض نتیجۂ فعل کی خبر دینا، فرض کرو ایک عمل کے متعلق عذاب کے نتیجے کی خبر دے دی، بالفرض اگر اس کے خلاف کا ظہور ممکن ہو تو ضرور ہے کہ وہ خبر کاذب ہو جائے، یعنی جو نتیجہ واقعۃً تھا اس کی خبر نہ دی گئی، بلکہ اس کے خلاف کی خبر دی گئی، ظاہر ہے کہ یہ کذب ہوگا۔

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ جب انسانوں کے افعال اختیاریہ کا حسن وقبح عقلی ہے، اور ان کے خلق وصدور سے قدرت الٰہیہ علیحدہ ہے، اور اس لحاظ سے صدور وخلق میں تلازم ہے، تو یہ بھی ضروری ہے کہ کسی فعلِ قبیح کا خالق حق تعالیٰ کو نہ مانا جائے، نہ اس پر اس کی قدرت تسلیم کی جائے، کیونکہ جب خلق ہوگا تو صدور بھی ہوگا، کیونکہ دونوں میں باہم تلازم ہے، لامحالہ یہ تسلیم کرنے پڑے گا کہ حق تعالیٰ سے افعال قبیحہ صادر ہوتے ہیں، نعوذ باللہ۔ لہٰذا یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ قدرت علی القبائح حق تعالیٰ کو ہے ہی نہیں، اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قدرت علی المحاسن بھی نہیں ہے، بلکہ بطور وجوب کے حق تعالیٰ سے صادر ہوتے ہیں، دیکھو بات کہاں پہونچی، قدرت منتفی ہوئی

یا نہیں؟ پھر ان کے قادریت والے حال سے کیا حاصل؟ سوچو ایسا مجبور و بے بس خدا کس کام کا؟ اور ایسی بے بسی کے ساتھ عدل کا تصور کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔

اب ایک نہج سے اور غور کرو! کوئی بھی ذات **من حیث ھی ھی** قطع نظر صفات کے ...... جو کہ محض موجود ذہنی ہے ...... اس سے دنیا کی کسی چیز کو رابطہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ خارج کے اعتبار سے وہ معدوم محض ہے، اور معدوم محض سے کس کو دلچسپی ہوسکتی ہے، تعارف وشناخت، محبت وعظمت یا خوف وخشیت جو کچھ پیدا ہوتی ہے، اس کی بنیاد یہی صفات ہوتی ہیں، دیکھو! اللہ کے لئے اگر صفت ربوبیت اور خالقیت نہ ہوتی تو کسی شئ کا وجود کیونکر ہوتا، گویا مخلوق جو حق تعالیٰ کے ساتھ مربوط ہے، اس کی وجہ یہی صفت ربوبیت وخالقیت ہے، مخلوق جو حق تعالیٰ کی طاعت وعبادت کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے، وہ اس لئے کہ وہاں صفت الوہیت موجود ہے، اس سے جو خائف ولرزاں ہے، وہ اس لئے کہ اسی میں صمدیت، قہاریت اور قدرت مطلقہ کی صفات ہیں، مخلوق جو اس کی محبت بے حد وحساب رکھتی ہے تو اس لئے کہ اس میں جمال وکمال اور رحمت والطاف کی صفات عالیہ ہیں، غرضیکہ مخلوق جس جس راہ سے خالق تعالیٰ کے ساتھ مربوط ہے، وہ کوئی نہ کوئی وصف ہے، اور یہ بالکل بدیہی ہے جس کو ابتدائی عقل بھی بطور علم ضروری کے جانتی ہے کہ بغیر کسی وصف کمال کے کوئی شخص دوسرے سے مربوط ہو ہی نہیں سکتا، پھر سوچنے کی بات ہے کہ انکار صفات کے بعد حق تعالیٰ کی محبت، خوف، اس کی عبادت وطاعت، اس کی عظمت وتقدیس کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ پھر دیکھو کہ انسان کتنا بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس کو جتنی قوت حاصل ہے وہ تو معلوم ہے اور اس کے اوپر ان ظالموں نے کوئی ایسی طاقت چھوڑی ہی نہیں جو اس کا سہارا بن سکے، پھر اس غریب کا ٹھکانا کہاں؟ انھوں نے انکار

صفات کر کے خدا کو نعوذ باللہ مفلوج تو کیا ہی، خود کو بالکل نکما اور نا کارہ بنا کر چھوڑ دیا۔

أعاذنا اللہ من سوء الفہم والاعتقاد

اس جگہ جی چاہتا ہے کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی ایک عبارت نقل کروں، حضرت نے ان متفلسفین کو خوب سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ’’فلاسفۂ بے خرد، کمال در ایجاب دانستہ نفی اختیار از واجب تعالیٰ نمودہ، اثبات ایجاب نمودہ اند ایں بے خبراں واجب را تعالیٰ وتقدس معطل و بے کار داشتہ اند، وجز یک مصنوع کہ آں ہم بایجاب است از خالق سمٰوات وارض صادر ندانستہ، وجود حوادث را نسبت بعقل فعال دادہ کہ وجود آں جز در توہم ایشاں ثابت نشدہ است، بزعم فاسد ایشاں، ایشاں را بحق سبحانہ وتعالیٰ ہیچ کارے نیست ناچار باید کہ در وقت اضطراب واضطرار التجاء بعقل فعال آرند وبحضرت حق سبحانہ ہیچ رجوع نکنند کہ اورا در وجود حوادث مدخلے ندادہ اند، گویند کہ عقل فعال است کہ بایجاد حوادث تعلق دارد، بلکہ بعقل فعال ہم رجوع ندارند کہ اورا در دفع بلیاتِ ایشاں نیز اختیارے نیست، ایں بے دولتاں در حمق وبلاہت پیش قدم فرق ضلالت اند، کافراں التجاء بحضرت حق سبحانہ وتعالیٰ می آرند ودفع بلیہ از وتعالیٰ می طلبند بخلاف ایں سفیہاں۔ (مکتوب: ۲۶۶، دفتر اول، ص: ۴۶۸)

ترجمہ: بے عقل فلاسفہ نے کمال کو ایجاب میں جان کر واجب تعالیٰ سے نفی اختیار کر کے اس کے ایجاب کا اثبات کیا ہے اور ان بے عقلوں نے ذات واجب تعالیٰ وتقدس کو بے کار سمجھا ہے، اور سوائے ایک مصنوع کے کہ وہ بھی ایجاب سے ہے زمین و آسمان کے خالق سے صادر نہ جان کر حوادث کے وجود

> کوعقل فعال کے ساتھ نسبت دی ہے، جس کا وجود ان کے وہم کے علاوہ کہیں ثابت نہیں ہے، اور ان کے فاسد زعم میں حق سبحانہ وتعالیٰ سے ان کو کچھ کام نہیں ہے۔ لازمی طور پر چاہئے تھا کہ اضطراب واضطرار کے وقت عقل فعال کی طرف التجا کرتے، اور حضرت حق سبحانہ کی طرف رجوع نہ کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک حوادث کے وجود میں اس تعالیٰ کی کوئی مداخلت نہیں ہے، اور کہتے ہیں کہ عقل فعال ہی حوادث کی ایجاد سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ وہ تو عقل فعال سے بھی رجوع نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک بلیات کے دفع کرنے میں بھی اس کا اختیار نہیں ہے، یہ بدنصیب (فلاسفہ) اپنی بے وقوفی اور حماقت میں فرقۂ ضالہ سے بھی آگے بڑھ گئے، حالانکہ کافر بھی بخلاف ان بدبختوں کے حق سبحانہ وتعالیٰ سے التجا کرتے ہیں اور بلاؤں کے دفعیہ کو اسی تعالیٰ سے طلب کرتے ہیں۔

تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یہی حال معتزلہ اور تمام منکرین صفات کا ہے، چونکہ حق تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ بندوں کا خدا کے ساتھ تعلق دائم اور قوی رہے، اس لئے قرآن کریم میں جتنی کثرت سے صفات کا مضمون ہے اور کسی چیز کا نہیں، بیشتر آیات کا تکملہ تذکرہ صفات ہے، سمجھنے کی بات ہے کہ یہ مفصل اثبات کیوں ہے، اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جہاں نفی کا موقع آتا ہے وہاں غایت درجہ اختصار واجمال سے کام لیتے ہیں، **لیس کمثله شئ**، اور **ولم یکن له کفواً احد**، بس اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، آخر کچھ تو اس میں حکمت ہوگی، ہاں، انسان کو منفی سے کیا سروکار، اس کے لئے کشش اور تاثر کا سامان اگر کہیں ہے تو وہ محض اثبات میں ہے، حق تعالیٰ نے اثبات مفصل کیا ہے، البتہ گمراہی کا دروازہ بند کرنے کے لئے اجمالاً تشبیہ کی نفی کر دی ہے، اس کے برخلاف معتزلہ وفلاسفہ نفی مفصل کرتے ہیں، اور اثبات میں محض

تحیر کے شکار بن کر رہ جاتے ہیں، خدا تعالیٰ اپنی صفات کو مفصل بیان کر کے بندوں کو اپنی بارگاہ میں دعوت حاضری دیتے ہیں، اور فلاسفہ ومعتزلہ نفی مفصل کر کے بندوں کو خدا سے دور کرتے ہیں، یہ کتنا عظیم خسارہ ہے، اس پر خود کو عاقل کہتے ہیں۔ **ألا إنهم هم السفهاء ولكن لايعلمون۔**

حقیقت یہ ہے کہ انکار صفات کے بعد انسان نہ صرف خدا سے دور ہو جاتا ہے بلکہ خود کو خدا کے وجود سے محروم کر دیتا ہے، صفات نہ ہوں تو ذات کا وجود ذہنی تو ہو سکتا ہے، وجود خارجی نہیں۔

رہا مسئلہ خالقیت کا، یعنی ان کے اصولوں کے لحاظ سے بے شمار خالقین کا وجود ماننا پڑتا ہے، تو شاید خالقین کا تعدد، بالخصوص جبکہ وہ حادث ہوں، ان کے نزدیک قادح توحید نہ ہو، ان کے خیال میں قادح فی التوحید اگر کچھ ہے تو یہ کہ قدماء کا تعدد تسلیم کر لیا جائے، بس اس سے توحید میں خلل پڑتا ہے، لیکن انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ جب حق تعالیٰ سے صدور...... خواہ کسی چیز کا ہو...... بطور وجوب کے ہو، جیسے سورج سے روشنی علی سبیل الوجوب صادر ہوتی ہے، تو ہر وہ چیز جو حق تعالیٰ سے صادر ہوگی، وجوب کی وجہ سے قدیم ہوگی، جیسے فلسفیوں کے نزدیک عقول عشرہ قدیم ہیں، خواہ وہ یہ کہتے ہوں کہ حق تعالیٰ واجب بالذات ہیں، اور عقول واجب بالغیر، تاہم وہ حق تعالیٰ سے مسبوق بالزمان تو ہیں نہیں، ما بالذات کی اولیت محض ایک ذہنی اعتبار ہے، خارج میں سب کا وجود ایک ساتھ ہے، اور جب حق تعالیٰ کے لئے کوئی امر لازم اور واجب مانا جائے گا تو بلحاظ وجود خارجی کے دونوں یعنی لازم وملزوم متساوی القدم ہوں گے، تقدم وتاخر محض اعتباری ہوگا، پھر صفات کے ماننے میں تو تعدد قدماء سے ڈرتے تھے، صفات کے انکار کے بعد وہ وجوب کے قائل ہوئے، تو اس میں تمام

صادرات قدیم بن گئے۔ **فرمن المطر وقر تحت المیزاب، العیاذ باللہ ولاحول ولاقوۃ إلا باللہ العلی العظیم۔**

اتنا لکھنے کے بعد طبیعت بالکل منغص ومکدر ہوگئی۔ اب قلم رکھتا ہوں، اور یہ سلسلہ بند کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضی کے مطابق عقیدہ، علم اور عمل کی توفیق دے اور ٹھیک سنت نبوی (ﷺ) پر قائم رکھے۔ آمین

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا احمد سعید صاحب دربھنگوی

مدرسہ دینیہ شوکت منزل غازی پور کے قدیم طالبعلم اوراب مدرسہ اسلامیہ شکر پور، بھروارہ ضلع دربھنگہ کے معتبر استاذ ہیں۔ دورِ طالب علمی سے اب تک میرے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ بہت عرصہ سے رمضان المبارک میں دیوبند جانے والے طلبہ کی ایک جماعت میرے پاس رہ کر وہاں کے امتحانِ داخلہ کی تیاری کرتی ہے، اس کا آغاز کرنے والے دو طالب علم یہی مولوی احمد سعید اور مفتی انعام الحق سیتامڑھی تھے۔ یہ دونوں میرے گھر پر رہے، اور رمضان میں عدیم النظیر محنت کی۔ اس وقت سے اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ اس کا آغاز غالباً ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا۔

یہ خط تقدیر کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا۔

عزیزم مولوی احمد سعید سلّمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا خط ملے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا، اور جواب میں اب تک نہ لکھ سکا، مجھے خود تعجب ہے کہ اس قدر تاخیر کیوں ہوئی، جبکہ تمہارے اس خط میں ایک سوال بھی تھا، جس کے جواب کا تقاضا میرے دل میں بہت ہے، لیکن معاملہ وہی ہے جس کا تم نے سوال کیا ہے، یعنی تقدیر! آدمی اس کے سامنے بے بس ہے۔

(۱) عزیزِ من! تمہارا سوال جس مسئلہ کے متعلق ہے، اسکی حقیقت تک رسائی ہمارے اور تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اس پر ایمان لانا اور اس سے فائدہ اٹھانا مطلوب ہے، اس پر چون وچرا ممنوع ہے، اور سب کے لئے ممنوع ہے۔ طاعت وایمان کی برکت سے ممکن ہے کہ یہ مسئلہ منکشف ہوجائے، باقی یہ کہ پوری حقیقت معلوم ہوجائے، ناممکن ہے۔ ہاں ہمارے لئے اتنی بات معاند ومناظر کو ساکت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ مسئلہ خلاف عقل نہیں ہے، ہاں احاطۂ عقل سے خارج ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل ہونا مستلزمِ عیب ہے، اور ادراکِ عقل سے ماوراء ہونا اس کی عظمت وبلندی کی دلیل ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ خلافِ عقل کیوں نہیں ہے تو اس کی دلیلیں دو قسم کی ہیں، ایک مثبت، دوسری منفی۔ مثبت دلیل یہ ہے کہ تمام مذاہب اور تمام حکماء معتبرین کا اس پر اتفاق ہے کہ خدا تعالیٰ تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے، اور ظاہر ہے کہ صفاتِ کمال میں سے اکمل ترین صفت علم ہے، لامحالہ اس کا علم ازل وابد اور کلی وجزئی سب کو محیط ہوگا۔ پھر یقیناً مخلوقات کے تمام افعال واحوال اس کے علم تفصیلی کے اندر داخل ہوں گے، اسی علم کی تحریر کا نام ''تقدیر'' ہے۔

دوسرا مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے تھوڑا سا ہی سہی اختیار عنایت فرما رکھا ہے، جس کو ہر شخص بطور بداہت کے جانتا ہے، یہی اختیار سزا وجزا کی

بنیاد ہے، اور یہ بنیاد بالکل صحیح اور موافقِ عقل ہے۔

تیسرا مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ ظلم کہتے ہیں یا تو ملکیت غیر میں تصرف کرنے کو یا اپنی ملکیت میں نامناسب عمل کرنے کو، حق تعالیٰ کے لحاظ سے ملکیت غیر کا تو تصور ہی نہیں، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ نامناسب عمل صادر ہو، لیکن یہ دو وجہ سے منتفی ہے۔ **ایک تو اس وجہ** سے کہ افعال واعمال کے جو نتائج دنیا میں اپنے رسولوں کی زبان پر ظاہر فرمائے ہیں، وہ عین مطابق عقل اور برمحل ہیں، ظاہر ہے کہ آخرت میں انھیں نتائج کا ظہور ہوگا، اور یہ بداہۃً واضح ہے کہ علمی اور عقلی اعتبار سے جو قانون بالکل موافق عقل ہو، اگر اس کا عملی ظہور ہوجائے تو کون اسے خلافِ عقل اور نامناسب باور کرسکتا ہے، ظاہر ہے کہ وہی عین مناسب ہے اور اس کے خلاف نامناسب ہے، **دوسری وجہ** یہ ہے کہ مناسب اور نامناسب کے لئے معیار عقل انسانی تو ہو نہیں سکتی، کیونکہ اس میں بے حد وحساب تفاوت ہے، لامحالہ اس کا معیار حق تعالیٰ کا ارشاد وعمل ہے، تو وہی فعل خداوندی خوب وناخوب کا معیار ہے تو اسے کیونکر نامناسب کہا جاسکتا ہے، غرض دونوں معنی کے اعتبار سے ظلم حق تعالیٰ کی جناب سے منتفی ہے۔ خوب غور کرلو۔ یہ تینوں مسائل اپنے اپنے لحاظ سے خوب واضح اور مدلل ہیں، ان میں ذرا بھی شبہ نہیں اور بالکل بدیہی عقلی ہیں، لیکن ان تینوں کو جب ایک سلسلۂ بیان میں جوڑ دیا جاتا ہے، تو ایک حیرت سی ہوتی ہے، اور ایک نامعلوم الجھاؤ اس ترتیب میں پڑ جاتا ہے، بس یہ الجھاؤ نارسائی عقل اور ناتمامیٔ ادراک کا نتیجہ ہے، حدِ ادراک بس ان تینوں مسئلوں پر علیٰحدہ علیٰحدہ غور کرنا ہے، اس کے بعد عقل کی تُرکی تمام ہوجاتی ہے، اس لئے اسے تسلیم کرکے خاموش ہوجانا چاہئے اور الجھاؤ کے باوجود مسئلہ کے حق ہونے کا یقین رکھنا چاہئے۔ اور یہ بھی بتادوں کہ جب دلیل کے تمام مقدمات صحیح ہوں، ترتیب بھی

درست ہوتو نتیجہ لازماً صحیح نکلے گا، خواہ وہ سمجھ میں نہ آئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا تو کیا، انبیاء واولیاء کاملین تو سمجھے ہیں، ان کا سمجھنا ہمارے لئے کافی ہے۔

منفی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ اسی طور پر جیسے کہ اہل سنت ثابت کرتے ہیں، اگر نہ مانا جائے تو اسکے علاوہ جو بھی طریقہ، جو بھی اصول اور جو بھی نظریہ اختیار کیا جائے، وہ ایسے کھلے کھلے تضادات پر مشتمل ہوگا جن کو دور کرنا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی، بالکل خلافِ عقل چیزوں کو تسلیم کرنا پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل باتیں محال ہوتی ہیں، لہٰذا اس ایک عقیدہ ''عقیدۂ اہل سنت'' کے سوا سب باطل اور لغو ہیں اور وہی ایک ثابت وقائم ہے۔

ہاں ایک بات اور سمجھ لو کہ انسان کا اختیار محسوس ہے اور جبر نا معلوم اور غیر محسوس ہے۔ جبر کہتے ہیں سلب اختیار کو، اس کا اثبات ایک غلط مقدمہ پر مبنی ہے، جس کو تم نے ان الفاظ میں لکھا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی مقادیر پہلے متعین کر چکے ہیں اور ان کی مخلوق میں سے انسان بھی ہے، اس کی بھی تقدیر اللہ نے پہلے ہی متعین کر دی ہے، تو انسان مجبورِ محض باقی رہا'' سوال یہ ہے کہ تعیین تقدیر کی وجہ سے مجبورِ محض کیونکر ہو جائے گا؟ کیا تعیین تقدیر میں ''اعطاء اختیار'' داخل نہیں ہے، اور کیا یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اسی اختیار کی وجہ سے جو اسے دیا گیا ہے، افعال کا ارتکاب کرے گا، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بھی مقادیر کے ذیل میں آچکی ہیں، تو سلب اختیار کدھر سے آیا۔ اس سے تو واضح طور پر اختیار ہونا معلوم ہوتا ہے، ہاں اعطاء اختیار میں وہ مختار نہیں ہے، اسی لئے کہتا ہوں کہ اختیار معلوم ہے اور جبر نا معلوم۔ فرض کرو اگر تعیین تقدیر کے باعث جبر آتا تو بتاؤ کہ وہ مقادیر انسان کو معلوم ہیں، ہرگز نہیں پھر اس کے نتیجے میں جو جبر آئے گا وہ کیونکر معلوم ہو جائے گا۔ اگر تم یہ کہو کہ اجمالاً مقادیر کا وجود تو معلوم ہے،

لہٰذا جبر بھی معلوم ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ جبر بھی اجمالاً معلوم ہوگا۔ اتنا تو ہم بھی کہتے ہیں کہ، لیکن جبر جو اجمالاً ثابت ہوگا، اس سے کوئی محذور لازم نہ آئے گا، جبکہ اختیار تفصیلی معلوم ہے اور سزا وجزا محض اختیار ہی کے بقدر ہوگا، اس سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس لئے کوئی اشکال نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان مختار بھی ہے، مجبور بھی، مختار ہونا معلوم ومحسوس ہے اور مجبور ہونا نامعلوم ونامحسوس، اختیار کو ثابت کرنے کیلئے دلیل وبرہان کی حاجت نہیں، اور جبر کو ثابت کرنے کے لئے دلیل وبرہان کی ضرورت، اختیار بدیہی ہے، اور جبر نظری، نہ وہ مختارِ محض ہے اور نہ مجبورِ محض۔ اس سے زیادہ لکھنا دردِ سر ہے، میں نے بہت اجمال سے لکھا ہے، غور سے پڑھو اور بار بار پڑھو، انشاء اللہ سمجھ میں آجائے گا۔ اردو میں جبر زبردستی کے معنی میں آتا ہے میری تحریر میں وہ مراد نہیں ہے۔

یمحو اللہ مایشاء ویثبت (سورۂ رعد کا آخری رکوع، پارہ:۱۳) پر غور کرو، تقدیر مبرم ومعلق کا سراغ اس میں مل جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد حنفی تھے۔

باقی یہاں سب خیریت ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۹؍ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مفتی نسیم احمد صاحب علیہ الرحمہ

مدرسہ دینیہ شوکت منزل غازی پور کے ایک ذہین وفطین طالب علم تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور وہیں سے افتاء اور تدریب افتاء کی تکمیل کی۔ کچھ دنوں گجرات کے کسی مدرسہ میں معلّمی کی، پھر مولانا قاضی مجاہدالاسلامؒ کی خدمت میں دفتر امارت شرعیہ بہار میں آ گئے، اور قاضی صاحبؒ کی نگرانی میں امارت شرعیہ کے اہم علمی وانتظامی امور پر مامور رہے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ قدرت کی جانب سے عمر کم لے کر آئے تھے۔ ۳۰؍جنوری ۲۰۰۳ء میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کا تذکرہ میری کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔'' میں ہے۔

دیکھئے: ص: ۵۱۲تا۵۱۶)

عزیزم! رزقکم اللہ علماً نافعاً وعملاً متقبلاً

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہٗ

ابھی تمہارا خط ملا، انتظار تھا، پڑھ کر قلبی مسرت حاصل ہوئی۔ مجھے تم سے اسی تعلق وارتباط اور محبت وانس کی توقع تھی، بے حد خوشی ہوئی۔ ؎

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

میں ادھر تقریباً بیس بائیس روز سے گھر تھا، میری خالہ جان جو میری والدہ کے بعد میری ماں تھیں، بہت زیادہ علیل تھیں، طویل علالت کے بعد ۸؍ جمادی الاول کو انتقال کر گئیں۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون ، ابھی پرسوں مدرسہ پہونچا ہوں، حق تعالیٰ سے دعاء مغفرت کرو۔

تم نے جس احسان مندی کا ذکر کیا ہے، اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، بجز اس کے کہ یہ سعادت مندی ہے، بلاشبہ جو لوگ علم کی روشنی بخشتے ہیں، جن کے ہاتھ دل کی آنکھیں کھولتے ہیں، ان کے احسانات کو یاد رکھنا، ان کی قدردانی کرنا شرعی اور اخلاقی فریضہ ہے، اس قدردانی میں جتنی بلند حوصلگی ہوگی اسی کے بقدر انسان کے مراتب میں اضافہ ہوگا۔ میں تو پہلے بھی کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ اصل معطی اور واہب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں، ان کی بخشش وعطاء ہے، جتنا جس کو مناسب ہوتا ہے، عطا فرماتے ہیں، ہم لوگ کھیت میں پانی پہونچانے والی نالیوں کے مثل ہیں، تالاب یا کنویں سے پانی نکل کر آتا ہے اور کھیت میں جمع ہو کر سیراب کرتا ہے، نالیاں پہلے بھی خالی تھیں اور کھیت میں پانی پہونچ جانے کے بعد پھر خالی ہو جاتی ہیں، اپنی استعداد کے مطابق ہر شخص فیاضِ ازل سے فیضان حاصل کرتا ہے، تمہیں لوگوں کے نصیبے کا ہم لوگوں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، ہم کیا اپنا احسان سمجھیں، تمہیں لوگوں کا احسان ہے کہ

ہم کو واسطہ بنایا، ہاں واسطہ کی قدر ضروری ہے، دیکھو نالی میں اگر مٹی پاٹ دی جائے تو کھیت محروم ہو جائے گا، کھیت کو فائدہ اسی وقت تک پہونچے گا جب تک نالیوں کا سینہ کھلا ہوا اور صاف ہے، مزید تشریح کی ضرورت نہیں تم خود سمجھ سکتے ہو۔

اس سلسلے میں تم سے اگر کبھی کوئی قصور ہوا ہو جس پر تمہیں ندامت رہتی ہے تو میں نے دل سے معاف کر دیا ہے، میری جانب سے بالکل مطمئن رہو، تکدر کا شائبہ بھی نہیں ہے، دل سے تم لوگوں کا خیر خواہ ہوں اور دعا گو ہوں، تم لوگوں کی خوشی میری خوشی اور تم لوگوں کا رنج میری تکلیف۔ ہاں شریعت کی پابندی بیحد ضروری ہے، میرے تعلق کی رسّی یہی ہے، جب شریعت سے کوئی ہٹتا ہے اور اس پر مصر رہتا ہے تو میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔

نماز میں خشوع وخضوع اور دل کی یکسوئی کے متعلق تمہارے سوال سے بہت مسرت حاصل ہوئی، اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ وتقدس کی بارگاہِ عالی کے مناسب عبادت کا پیش کرنا ایسا امر عظیم ہے کہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے، محبوبانِ بارگاہ **علیہم الصلوات والتحیات** تک جب اس مسئلے میں عجز ودرماندگی کا اعتراف کرتے ہیں تو ماوشما کی کیا حقیقت ہے؟ تاہم **مالایدرک کلہٗ لایترک کلہٗ** کے پیش نظر ہر انسان پر کوشش فرض ہے کہ بقدر امکان بشری طاعات وعبادات کو سجا، سنوار کر پیش کرے۔ عبادت دراصل باطن اور قلب کا عجز ونیاز ہے، ظاہری اعضاء تو مظاہر ہیں یعنی عباداتِ قلبیہ کے ظہور ونمود کا تشکل ظاہری اعضاء پیش کرتے ہیں اس لئے اگر محض ظاہری تشکلات پر اکتفا کر لیا جائے تو حقیقت عبادت سے انسان دور جا پڑے گا، اعضاء ظاہری کا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکنا، اٹھنا، بیٹھنا تو فقہ کی کتابیں، استاذ کی تلقین سکھا دیتی ہے، لیکن قلب ہنوز غیر تربیت رہ جاتا ہے۔ اس

علم وتعلم کے بعد بلکہ اسی دوران ضروری ہے کہ آدمی اپنے قلب کو بھی ہاتھ لگا دے اور اس کی درستگی واصلاح کی تدبیریں شروع کردے، ورنہ اگر ایک حالت پر قلب پختہ ہوگیا تو اس کا دوسری جانب التفات بغایت دشوار ہو جائے گا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں اس جانب توجہ ہے ورنہ عموماً طلبہ کیا، علماء بھی اس سے غافل رہتے ہیں، اور اس کی وجہ سے زندگی بے کیف اور خشک گذرتی ہے، میں بے کیف اور خشک اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی ہر لذت اور خوشی فانی اور زائل ہے، کسی کی عمر دراز نہیں ہے، ابھی خوشی کی لذت ہے اور ابھی رنج کی بے لطفی ہے، ابھی راحت کی حلاوت ہے اور ابھی کلفت کی تلخی ہے، ایسی حلاوت جس کے پیچھے تلخی اور ایسی خوشی جس کے پیچھے رنج ہو کیا معنی رکھتی ہے؟ البتہ ایمان کی حلاوت، محبت الٰہی کی خنکی، ذوقِ عبودیت کی سرمستی اور اعتماد علی اللہ کی لذت ایسی چیزیں ہیں جنھیں کبھی زوال نہیں، ایک انسان انھیں حاصل کرلے پھر کیا رنج کیا راحت؟ کیا درد کیا درماں، کیا مرض اور کیا صحت، ہر حال میں انسان کے اندر وہ ایک لذتِ لازوال باقی اور دائم رہتی ہے، پھر تو جراحت میں بھی وہی لطف وحلاوت ہے، جو راحت میں، زندگی بھی ’’حیاتِ طیبہ‘‘ اور موت بھی ’’مماتِ سویہ‘‘۔ حدیث میں دعا وارد ہے: **أللٰھم إنی أسألک عیشة نقیة ومیتة سویة ومرداً غیر مخزی ولا فاضحٍ**، اگر قلب میں محبت الٰہی حاصل ہے تو زندگی وصول، ورنہ سب ضائع، اب دنیا کے احوال کچھ اس ڈھنگ سے چل رہے ہیں کہ انسان کی باطنی استعداد فاسد ہوتی چلی جارہی ہے، قلب کی درستگی کے لئے خاصی محنت درکار ہے جس کے لئے ابھی تمہیں فرصت نہیں، اس کم فرصتی میں چند باتوں کا التزام واہتمام کرلو تو بہت کچھ فلاح کی امید ہے۔

(۱) طلبہ کے ساتھ اختلاط کم ہو، اپنے کام سے کام رکھو، مجلس بازی، دوستی اور

زیادہ سیر وتفریح سے قطعاً اجتناب۔ اپنے ہم وطنوں سے جو تھوڑا بہت تعلق ہو اس سے معاملہ ہرگز آگے نہ بڑھے۔

(۲) نماز باجماعت کی پابندی اس درجہ میں کہ دنیا کے ہر کام سے ضروری یہی کام رہے، سفر وحضر، سونے جاگنے، کھانے پینے، بازار جانے کے تمام پروگراموں کا محور نماز باجماعت ہو، مطلب یہ ہے اور چیزوں کا پروگرام نماز جماعت کے وقت کا لحاظ کر کے بناؤ۔

(۳) تلاوت قرآن کم ازکم ایک پارہ روزانہ اس استحضار کے ساتھ کہ حق تعالیٰ کا کلام ہے، میں پڑھ رہا ہوں وہ سن رہے ہیں۔

(۴) صبح وشام کم ازکم سو سو بار **سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم** معنی کے استحضار کے ساتھ پڑھ لیا کرو۔

ان چار باتوں کو ہمیشہ کے لئے دستور العمل بنالو۔ فارغ ہونے کے بعد طلبہ کا لفظ ہٹا کر وہاں عوام الناس کا لفظ رکھ دو، باقی چیزیں زندگی بھر کے لئے ہیں، انشاء اللہ جو صفات مطلوب ہیں رفتہ رفتہ دل میں گھر کرتی چلی جائیں گی۔

میں صمیم قلب سے تمہارے لئے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۹؍ جمادی الاول ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ الکریم

عزیزم! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

تمہاری سلامتی فہم سے مسرت ہوئی، حق تعالیٰ علم صحیح عمل صالح اور فہم سلیم مزید ارزانی فرمائیں، تم لوگوں کی محبت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں، اور میری خواہش ہے کہ حق تعالیٰ نے ذہن ودماغ اور قلب ونظر کی جو صلاحیت بخشی ہے، اس کا مصرف صرف دین اور علم دین ہو، اسی سے میری طبیعت نہال ہوگی، دنیا کے خدام ان گنت ہیں، اور دین کے خدمت گزار گنتی کے بھی نہیں ہیں۔ مجھے اپنے لوگوں سے صرف خدمت دین ہی کی توقع ہے۔

دعاء والے مسئلے میں مجھے خود اضطراب تھا، یہ بالکل صحیح ہے کہ مروجہ طریقہ پر ہیئت اجتماعی کے ساتھ دعاء کا مانگنا روایات سے ثابت نہیں ہے، نہ اثبات، نہ صراحۃً نفی، ہاں اشارۃً نفی بھی شاید موجود ہو، اسی لئے صرف حافظ ابن تیمیہ ہی نہیں بعض اور اکابر بھی اس کو بدعت کہتے ہیں۔ مثلاً علامہ ابو اسحاق شاطبی صاحب الاعتصام نے بھی شدومد کے ساتھ اس کو رد کیا ہے، لیکن مجھ کو اس سلسلے میں جو خلجان تھا وہ یہ کہ یہ عمل زمانہ دراز سے متواتراً تمام دنیا کے مسلمانوں میں رائج ہے، اب اہل عرب نے اس کو ختم کر دیا ہے، ورنہ جب تک ترکوں کی حکومت تھی، اس وقت اس کا مکمل رواج تھا، اور اس کے ابتداء کی تاریخ معلوم نہیں۔ ہر زمانہ میں معدودے چند علماء جو اپنے انفراد وتفرد اور حدتِ مزاج کے اعتبار سے نمایاں رہے ہیں، ان کے علاوہ عموماً سب کے درمیان بلا نکیر جاری رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ حافظ ابن تیمیہ کے زمانہ میں بھی تھا اور ان سے پہلے بھی تھا، کب سے ہے معلوم نہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس طرح سے رواج نہ تھا لیکن یہ بھی نہ تھا کہ نمازوں کے بعد لوگ فوراً منتشر ہو جاتے ہوں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ فرض نمازوں کے بعد آپ خود بھی دعائیں پڑھتے تھے، اور صحابہ کو بھی فرض کے بعد دعاء کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ قبولیت دعاء کے

مواقع میں سے سب سے عامۃ الورود موقع یہی دبر الصلوات المکتوبۃ ہی بتایا گیا ہے، اس سے اتنی بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد فوراً جگہ چھوڑ دینا اور منتشر ہونا مطلوب نہیں ہے، بلکہ استحباباً یہ مطلوب ہے کہ آدمی اپنی جگہ بیٹھا رہے، اور اَذکار واَدعیہ میں مصروف رہے۔ اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی ایک عبارت دیکھو، حجة الله البالغة جلد: ۲، صفحہ: ۱۲ پر فرض نمازوں کے بعد چند اذکار مسنونہ تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

والاولیٰ أن یاتی بهٰذه الاذکار قبل الرواتب فإنه قد جاء فی بعض الاذکار مایدل علیٰ ذٰلک نصاً کقوله : من قال قبل أن ینصرف أو یثنی رجلیه من صلاة المغرب والصبح .... وکقول الراوی کان إذا سلم من صلاته یقول بصوته الاعلیٰ .... وفی بعضها مایدل ظاهراً کقوله دبر کل صلاةٍ وأما قول عائشة ” کان إذا سلم لم یقعدإلا مقدار مایقول أللٰهم أنت السلام .... “ فیحتمل وجوهاً. منها أنه کان لایقعد بهیئة الصلوٰة إلا هٰذاالقدر ولکنه کان یتیامن أو یتیاسر أو یقبل علی القوم بوجهه فیاتی بالاذکار لئلا یظن الظان أن الاذکار من الصلوٰة ، منها أنه کان حیناً بعد حینٍ یترک الاذکار غیر هٰذه الکلمات یعلمهم أنها لیست فریضة، وإنما مقتضی کان وجود الفعل کثیراً لا مرةً ولا مرتین ولا المواظبة ۔

اس تحریر کے نقل سے میرا مدعا یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد فوراً منتشر ہوجانا نہ صرف یہ کہ مطلوب نہیں ہے بلکہ خلافِ اولیٰ ہے۔ ہیئت اجتماعی کے ساتھ دعاء کرنے کا بیشک ثبوت نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرض نمازوں کے

بعد دعاء کی ترغیب دی ہے، اس لئے اگر اس وقت دعاء بالکل نہ کی گئی ہو تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ترغیب کا حاصل کیا ہوا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ نمازیوں نے اپنے اپنے طور پر دعاء کی ہوگی، نہ ہیئت اجتماعی کے ساتھ، تو یہ بلاشبہ صحیح ہے، لیکن سوچو کہ ہیئت اجتماعی بنتی کیسے ہے؟ اسی طرح تو چند افراد اکٹھا ایک ہی کام میں مشغول ہوں، یہاں یہ صورت ہے، فرض کرو امام نے بھی دعاء شروع کی اور کچھ مقتدیوں نے بھی تو ہیئت اجتماعی بن گئی، گو کہ اس میں اتباعِ امام کی نیت نہ ہو، خیال ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دورِ مسعود میں ایسی صورت ضرور احیاناً ہوتی رہی ہوگی، احادیث کے اقتضاء سے یہ بات بعید نہیں ہے، آپ کے بعد اس نے ایک عام رواج کی شکل اختیار کرلی ہو۔ بہر کیف اس کی بنیاد کا دورِ رسالت ہی میں پڑنا بظنِ غالب ثابت ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کا رواج بڑھتا چلا گیا، اگر یہ چیز وہاں سے چلی نہ ہوتی تو سارے عالم کے مسلمانوں میں نہ پھیلتی، اس خیال کی بنیاد پر اس کو بدعت کہنے سے طبیعت میں رکاوٹ ہوتی ہے، امت میں معدودے چند علماء کے علاوہ کسی نے اس کو بدعت نہیں کہا ہے، جبکہ اس پر اتنا طویل عرصہ گذر گیا ہے کہ اس کا زمانۂ آغاز متعین طور پر بتانا مشکل ہے، اس لئے بھائی بدعت کہنے سے طبیعت کو رکاوٹ ہوتی ہے، اور اسے ترک کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، ہاں یہ ہے کہ یہ بات خوب واضح کردی جائے کہ دعاء نماز کا جزو نہیں ہے، اور میرا خیال ہے کہ اتنا تو ہر مسلمان جانتا ہے۔

آج اس مسئلہ پر میں غور کررہا تھا کہ اچانک ایک بات ذہن میں آئی، جو سابقہ باتوں ہی کی بنیاد پر متفرع ہے، اس کی تفصیل سنو! آج کل میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے، دوسرے کاموں کا حرج کر کے لکھ رہا ہوں، لیکن تمہاری طلب کیسے ٹال دوں، بغور سنو! ممکن ہے صرف ذہنی خیال ہو، لیکن ایک عمل جو بنیادی طور پر نہ صرف یہ

کہ مطلوب و مستحب ہے، بلکہ قرناً قرن سے معمول بہ ہے، اس کو اگر کسی مختلف فیہ عارض کی وجہ سے بدعت قرار دیا جائے تو اس کی سند کے لئے یہ ذہنی خیال بھی کچھ نہ کچھ تو معاون بن ہی جائے گا۔

بات یہ ہے کہ بعض امور جو فی الاصل اس لائق تھے کہ ان کی فرضیت نازل ہوتی، لیکن اس سے امت مشقت میں پڑ جاتی، رسول اللہ ﷺ نے ان کی ترغیب تو دیدی مگر عام طور سے اس کا اہتمام والتزام نہیں فرمایا۔ آپ کے اوپر تمام اعمال کی خاصیات وخصوصیات اوران کی خیرات وبرکات واضح تھیں، آپ مشاہدہ فرمالیتے تھے کہ محبوبیت ومقبولیت کے لحاظ سے فلاں عمل اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ امت پر فرض ہوجائے، لیکن باوجود رغبت وشوق کے محض اس بنا پر اس عمل کو ترک فرمادیتے تھے کہ آئندہ امت مشقت میں نہ پڑ جائے ۔ دیکھو تراویح کے ساتھ یہی قصہ ہوا، حالانکہ اس کو آپ نے روزہ کے مساوی ثواب کے اعتبار سے قرار دیا ہے۔ چنانچہ **من صام رمضان ایماناً واحتساباً الخ** کے ساتھ **من قام** بھی فرمایا ہے۔ یہی حال مسواک کے متعلق بھی منقول ہے، تلاش سے اور چیزیں بھی مل جائیں گی۔ کیا عجب کہ فرض نمازوں کے بعد دعاء کا بھی یہی مقام ہو، حدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل فرائض کی ادائیگی ہے، اور فرائض میں سب سے بلند رُتبہ نماز کا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بندہ کس قدر محبوب ومقبول بن جاتا ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فرض کی مشروعیت اصالۃً جماعت کے ساتھ ہوئی ہے اور جماعت کا ثواب پچیس یا ستائیس گنا زیادہ ہے۔ پھر خیال کرو کہ محبوبیت کس درجہ ترقی کرجاتی ہے۔ اس صورت میں اگر فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنی فرض ہوجاتی تو عین مناسب تھا، مگر آپ کی شفقت نے گوارا نہ فرمایا کہ ایک

اور چیز مزید فرض ہو کر امت کی ذمہ داری بڑھ جائے، اس لئے اجتماعی طور پر آپ نے اس کا اہتمام نہ فرمایا ہو، اور آپ کے بعد جب یہ احتمال ختم ہو گیا، تو خود بخود اس کا دستور بن گیا۔ اور الگ سے دستور بنانے کا اہتمام نہیں کرنا پڑا، کیونکہ یہ روز پانچوں وقت عمل میں آنے والی چیز تھی، اس کے برخلاف تراویح کا اہتمام کرنا پڑا اور شاید اسی وجہ سے کہ اس کا وقوع سال میں ایک ہی مرتبہ ہوگا، صرف قولی ترغیب پر آپ نے اکتفاء نہ فرمایا بلکہ عملاً تین روز جماعت کے ساتھ ادا کر کے دکھا دیا اور دعاء میں اس کی ضرورت نہ تھی، اس لئے صرف قولی ترغیبات پر اکتفاء کیا۔ **واللہ أعلم بحقیقة الحال**

مجھے اس پر اصرار نہیں ہے، لیکن تمام ترغیبات سے صرف نظر کر کے محض اہتمام والتزام کے شبہ سے اس عمل کو چھوڑنا گوارا نہیں ہوتا۔ اہتمام والتزام سے بدعت ہونا مختلف فیہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ بعض چیزیں دیکھتا ہوں کہ امام شافعیؒ کے یہاں غیر معمولی اہتمام والتزام کے ساتھ جاری ہیں، مثلاً جمعہ کے روز فجر میں **الم سجدہ** اور **سورۂ دھر** کی تلاوت، حالانکہ التزاماً آپ سے اس کا ثبوت نہیں ہے، مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ التزامِ مالا یلزم احناف کے نزدیک تو مکروہ ہے، مگر شوافع کے نزدیک مکروہ نہیں، تم تحقیق کرلو۔ اگر ایسا ہو تو کیا مضائقہ ہے کہ اس عمل کو ان کے اصول پر درست مان لیا جائے۔ دعاء کے مسئلے میں اتنی بات اجمالاً لکھ دی، تفصیل لکھوں تو دفتر تیار ہو جائے، لیکن کچھ تو میرے پاس وقت کی کمی، اور کچھ یہ خیال کہ میری حیثیت ہی کیا ہے، کہیں کوئی اور شخص دیکھ کر ہذیان نہ سمجھنے لگے، اس لئے قلم کو روکتا ہوں، زبانی گفتگو میں تفصیل سے عرض کروں گا، اس میں بہت سے اصول ہوں گے۔ اگر میری یہ تحریر تمہارے دل کو لگتی ہو تو خیر، ورنہ اس کو میرے پاس لوٹا دو۔ میں ابھی اور غور کر رہا ہوں، لیکن اس کا بدعت ہونا طبیعت کو قبول نہیں ہوتا۔ بصورتِ ترک

ان تمام ترغیبات سے محرومی لازم آئے گی، جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اہل عرب اور غیر مقلدین نے دین کو بہت کچھ حذف و ترمیم کا نشانہ بنایا ہے۔ لہٰذا ان کی وجہ سے یہ عمل چھوڑا نہیں جا سکتا۔ رہے حافظ ابن تیمیہ تو وہ بایں جلالت قدر بہت کچھ حدید المزاج اور تفرد پسند بھی ہیں، اس لئے ان کے اقوال کو اختیار کرتے ہوئے طبیعت ہچکچاتی ہے، بالخصوص سنت و بدعت کے بارے میں۔

آگے دوسرے امور سے متعلق سنو!

حضرت حاجی صاحب کے جس مکتوب کا ذکر تم نے کیا ہے، وہ میرے خیال میں وضعی ہے۔ مکاتیب رشیدیہ میں حضرت حاجی صاحب کا ایک مکتوب موجود ہے، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ اس مکتوب کے خلاف اگر کوئی بات کہیں سے معلوم ہو تو اس کو فقیر کی جانب منسوب نہ کریں۔ حضرت گنگوہیؒ کے بعض معاندین حضرت حاجی صاحب کے پاس رہتے تھے، اور مکہ معظّمہ سے واپس آ کر جھوٹی سچی خبریں اور تحریریں مشتہر کیا کرتے تھے۔ حضرت گنگوہی کو بعض اوقات بڑی ایذائیں ان لوگوں نے پہونچائی ہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس سلسلے میں تسلی فرمائی ہے، خود حضرت گنگوہیؒ کے جو مکاتیب مختلف لوگوں کے نام ہیں، ان میں اس قسم کے اشارات ہیں۔ تم مکاتیب رشیدیہ پڑھ لو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، ورنہ اس مکتوب کی نشاندہی کر دیتا۔

وسیلہ متعارف کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، قرآن میں جو وسیلہ ہے، وہ بمعنی قربت و طاعت ہے، اس لئے اس سے کوئی بھی استدلال بے محل ہے، نہ وہاں نفی ہے اور نہ اثبات، حافظ ابن تیمیہ وسیلہ کے مسئلہ میں ہمارے مسلک سے الگ نہیں ہیں، وسیلہ کی بعض صورتیں جو اہل بدعت میں رائج ہیں، وہ بلا شبہ بدعت بلکہ شرک ہیں،

وسیلہ بالاعمال سب کے نزدیک جائز اور مستحب ہے۔ حدیث میں غار والے تین آدمیوں کا قصہ مذکور ہے، اس کے علاوہ مسنون دعاؤں میں کتنی دعائیں ایسی ہیں جن میں توسل کا ثبوت ملتا ہے، حاصل اس توسل کا یہ ہے کہ یا اللہ فلاں بزرگ میرے ظن میں آپ کے محبوب ہیں مجھے ان سے محبت ہے، اس محبت کے طفیل میں آپ سے یہ درخواست ہے، یہ جو بطفیل فلاں آتا ہے اس کا مفہوم یہی ہے، فلاں کے صدقے میں، فلاں کی برکت سے، یہ سب الفاظ یہی معنی رکھتے ہیں۔ اس توسل کو حافظ ابن تیمیہ بھی جائز بلکہ اعظم قربات کہتے ہیں۔ یہ توسل بالمحبۃ ہے، ہمارے نزدیک یہی توسل جائز ہے۔ آج کل عربوں نے فتاویٰ ابن تیمیہ جو شائع کیا ہے، اسکی پہلی جلد صفحہ ۲۲۰ پر دیکھو، توسل بالمحبۃ پر کلام بہت اچھا کیا ہے، اور اعظم الوسائل بتایا ہے۔

لا تشدوا الرحال إلا إلیٰ ثلٰثة مساجد میں مجھے تعجب ہے کہ مستثنیٰ منہ **الیٰ شیٔ** کیونکر ہو جائے گا، یہ استثناء ظاہر ہے کہ متصل ہے، اور استثناء متصل کا قاعدہ ہے کہ مستثنیٰ منہ مستثنیٰ کی جنس سے ہوگا۔ لہٰذا بات صاف ہے کہ **لا تشدوا الرحال الیٰ مسجد من المساجد إلا إلیٰ ثلٰثة مساجد**، اس میں قبور کا ذکر کدھر سے آیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ استثناء مفرغ میں اگر ایسا ہی عام مستثنیٰ منہ مراد ہوگا تو کلام سخریہ بن کر رہ جائے گا۔ تم کہو **ما جاء نی إلا زیدٌ** تو کیا اس سے دنیا کی ہر چیز کی نفی مقصود ہے، کلا وحاشا۔ محض یہ ارشاد ہے کہ عبادت کے اہتمام کے لئے اگر تین مسجدوں کی جانب سفر ہو تو ٹھیک ہے، ان کے علاوہ کسی مسجد کو کسی مسجد پر فوقیت حاصل نہیں، فقط۔

زیارتِ قبور کو اس حدیث کے ذیل میں لانا خوش فہمی ہے، یا اجتہاد کا طغیان ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کا یہ نظریہ قطعاً بے دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک خط بھیج چکا ہوں، ملا ہوگا۔ اس میں، میں نے وعدہ کیا تھا کہ دو باتوں کی کسی قدر تفصیل کروں گا، ایک تو یہ کہ مختلف بدعات میں باہم تفاوت ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ طبیعتوں کے فاسد الاستعداد ہونے کی بنا پر بعض مسائل کے اعلان واشتہار سے اجتناب ہی مناسب ہے، اور یہ دونوں باتیں اس لئے لکھنے کی ضرورت پیش آئی کہ تم **دعاء بعد الصلوات** کے التزام کے سلسلے میں کچھ لکھے جانے کے خواہش مند ہو۔

بخاری شریف میں تم نے **کفر دون کفر** اور **ظلم دون ظلم** کے عنوانات پڑھے ہوں گے، ان ابواب وعناوین کا مدعا یہ ہے کہ جس طرح اعمالِ صالحہ کے درجات باہم متفاوت ہوتے ہیں، اسی طرح معاصی ومظالم بھی آپس میں رتبوں کا فرق رکھتے ہیں، سب گناہوں کو ایک درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اسی فرق مراتب کو ظاہر کرنے کے لئے کفر وفسق اور حرام ومکروہ وغیرہ اصطلاحیں وجود میں آئی ہیں، ٹھیک یہی حال بدعت کا بھی سمجھو، ان میں بھی باہم فرقِ مراتب ہوتا ہے، اطلاق کے لحاظ سے تمام بدعتوں پر یہ اصطلاح بول دی جاتی ہیں، مگر تفصیل میں باہم امتیاز کرنا، ناگزیر ہے۔

بدعت کے سلسلے میں جناب نبی کریم ﷺ نے **من أحدث فی أمرنا ھٰذا مالیس منہ** فرمایا ہے، أمرنا سے مراد ظاہر ہے کہ مجموعۂ دین ہے، اس میں ہر محدث امر بدعت ہے، اب غور کرنا چاہئے کہ محدثات کی کتنی صورتیں ہوسکتی ہیں اور ان کے احکام کیا ہوں گے، صاحب فتح الباری لکھتے ہیں:

قال ابن عبد السلام فی اواخر " القواعد " البدعة خمسة أقسام فالواجبة كالاشتغال بالنحو الذی يفهم به كلام الله ورسوله لان حفظ الشريعة واجب ولايتاتى إلا بذالک فيكون من مقدمة الواجب .... "والمحرمة" ما رتبه من خالف السنة من القدرية والمرجئة والمشبهة " والمندوبة " كل احسان لم يعهد عينه فی العهد النبوی كاجتماع عن التراويح وبناء المدارس والربط والكلام فی التصوف المحمود وعقد مجالس المناظرة ان أريد بذالک وجه الله والمباحة كالمصافحة عقب صلوٰة الصبح والعصر والتوسع فی المستلذات من أكل شرب وملبس ومسكن وقد يكون بعض ذالک مكروهاً أو خلاف الاولیٰ ،والله أعلم (كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ)

اس عبارت میں بدعت کے پانچ رتبے جو بیان ہوئے ، ان میں پہلا اور تیسرا تو من أحدث فی أمرنا کے تحت آتا ہی نہیں، کیونکہ فی أمرنا کا مطلب تو یہ ہے کہ دین کے مجموعہ میں وہ دینی حیثیت براہ راست پیدا کرلے، اور یہ امور وسائل وذرائع بن آئے ہیں، وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے، اور وسائل بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا ان پر بدعت کا اطلاق تجوزاً ہے، ہاں دوسری اور چوتھی اور پانچویں چیز قابل غور ہے، دوسری اور پانچویں تو یقیناً من أحدث فی أمرنا هٰذا مالیس منه میں داخل ہے، چوتھی کو اگر اس میں داخل کیا جائے تو یقیناً رد ہونی چاہئے ، پھر اسے مباح نہیں کہنا چاہئے ، اور اگر وہ داخل نہیں ہے تو مباح ہونے میں شبہ نہیں۔

بندہ نے جہاں تک غور کیا ہے اور قرآن وحدیث اور تعامل سلف سے جو کچھ

سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس بدعت کو رسول اللہ ﷺ نے رد فرمایا ہے............ درحقیقت بدعت وہی ہے بھی .... ابتداءً اس کی دو قسمیں ہیں، بدعت اعتقادی اور بدعت عملی، پھر بدعت عملی کی بھی دو صورتیں ہیں، بعض وہ ہیں جو کسی اعتقادی بدعت کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن کے نتیجہ میں بدعت اعتقادی پیدا ہوتی ہے، پھر اس دوسری قسم کی دو نوعیں ہیں۔ ایک تو وہ جن کے مقتضیات خیر القرون میں تھے، اس کے باوجود ان کو عمل میں نہیں لایا گیا، دوسرے وہ جن کے مقتضیات خیر القرون میں نہ تھے۔ خلاصہ یہ کہ بدعت کی چار اقسام ہیں۔

بدعت اعتقادی، بدعت عملی، جو نتیجہ ہے بدعت اعتقادی کا۔ بدعت عملی جس کے نتیجہ مین بدعت اعتقادی وجود میں آتی ہے، اور اس کے مقتضیات خیر القرون میں نہ تھے، بدعت عملی جس کے مقتضیات خیر القرون میں تھے۔ بدعت اعتقادی کی مثال خلق قرآن، انکارِ صفات وغیرہ۔ دوسری کی مثال شیعوں کے عقیدۂ امامت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے شمار خرافات۔ تیسری کی مثال جیسے گیارہویں شریف، کونڈا، صحنک وغیرہ، تفصیل اس کی یہ ہے کہ گیارہویں کا تعلق حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ کی غالباً ولادت سے ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مقتضیٰ خیر القرون میں نہ تھا، لیکن اس عمل کے نتیجے میں اس دن کے متبرک ہونے کا اعتقاد پیدا ہوگیا ہے، آخری کی مثال جیسے مجلس میلاد اور عید میلاد النبی وغیرہ۔ عید میلاد النبی کی رسم غیر مسلموں سے مسلمانوں میں داخل ہوئی اور عبادت بن گئی، اس کا مقتضیٰ تو خیر القرون میں موجود تھا لیکن نہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے اس کا اہتمام کیا، اور نہ صحابہ کو اس کا حکم دیا، اس کے نتیجہ میں ۱۲؍ ربیع الاول کے متبرک ہونے کا عقیدہ جما۔ حالانکہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس تاریخ کو رسول اللہ ﷺ کی ولادت شریف ہوئی ہے، وہ یقیناً عالم انسانیت بلکہ

سارے عالم کے لئے رحمت و برکت کا عنوان تھی، خدا کی خاص رحمت کا نزول ہوا تھا، لیکن کیا وہ تاریخ پھر کبھی لوٹ کر آئی ہے، ظاہر کہ وہ دن گیا، وہ تاریخ گئی، اس کی برکت ورحمت اسی کے ساتھ جا کر خزانۂ بقا میں جمع ہوگئی۔ اب سال بھر کے بعد اسی نام کی تاریخ پھر آئی، تو صرف اسم لوٹا ہے، مسمیٰ نہیں لوٹا ہے، وہ تو جا چکا ہے، ہم کسی دلیل سے یہ تسلیم کرلیں کہ صرف اسم کے اشتراک کی وجہ سے اس حصۂ زمان میں بھی وہی خیر و برکت سرایت کرگئی، ۱۵؍ شعبان، عشرہ ذی الحجہ، رمضان شریف وغیرہ کے لئے تو قرآن وحدیث سے دلائل موجود ہیں کہ یہ ایام جب آتے ہیں تو حق تعالیٰ کی رحمت برس جاتی ہے، لیکن ۱۲؍ ربیع الاول ہو یا کوئی اور تاریخ ولادت کسی نبی کی ہو، اسی نام کی تاریخ جب کبھی آئے گی تو وہی خیر و برکت عود کرے گی، اس کیلئے کیا دلیل ہے؟

بدعت عملی کی قسم ثانی وثالث کے ذیل میں تقیید مطلق کی بدعت بھی آجاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ شریعت نے کسی کام کا حکم دیا، مگر اس کی کوئی مخصوص شکل نہیں متعین کی بلکہ اصولی طور پر جائز وناجائز کی کچھ حدیں متعین کرکے، کرنیوالے کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً تعلیم وتبلیغ وغیرہ، یہ امور مامور بہا ہیں، لیکن شارع نے ان کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں مقرر کی ہے، ان میں سے کسی امر کی کوئی مخصوص ہیئت متعین کرکے اس پر اصرار کرنا، جس کے نتیجے میں وہی ہیئت مقصودیت کا رتبہ حاصل کرلے، یہ بھی بدعت کا احداث ہے، کیونکہ اس میں ایک نئے عمل کا ایجاد اور پھر اس کا اہتمام والتزام وجود میں آتا ہے، اور بلاشبہ **من أحدث فی أمرنا هٰذا** میں یہ بھی داخل ہے۔ بدعت کی چاروں قسموں میں پہلی دو قسمیں بہت شدید ہیں، کیونکہ ان کے نتیجے میں نصوص کا انکار اور بے جا تاویلات کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، اور نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

بدعت کی آخری دو قسمیں ان کے مقابلے میں نسبتاً اخف ہیں، لیکن ان کا ارتکاب بھی ضلالت ہی ہے۔ ان سے اجتناب ضروری ہے، اور دین کو آلائشوں سے پاک کرنا بے حد ضروری ہے۔

اب دو صورتیں اور رہ گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی نیا عمل ایجاد کیا جائے اور اس کا اہتمام والتزام بھی کیا جائے، مگر اس کو دین کا درجہ نہ دیا جائے، یعنی اس میں ثواب کا اور اس کے ترک میں گناہ کا تصور نہ ہو، بعض اکابر نے اسے بھی بدعت شمار کیا ہے، لیکن بنظر غائر دیکھو تو فی أمرنا کے ذیل میں اس قسم کا عمل نہیں آتا، اس طرح کے اعمال کو ''رسم ورواج'' کہنا چاہیئے، یہ بھی حرام وناجائز ہیں، کیونکہ دینی اعمال کی طرح ان میں بھی مقصودیت کی شان پیدا ہوجاتی ہے، شادی بیاہ کی رسمیں، عید بقرعید کی سوئیاں اسی میں داخل ہیں، ہمارے فقہاء کے نزدیک عصر وفجر اور عیدین کے بعد مصافحے اسی قسم میں داخل ہیں۔ ان پر بھی بدعت کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن حقیقت واضح ہوچکی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی عمل اپنی ہیئت وصورت کے ساتھ قرون مشہود لہا بالخیر میں رہا ہو، اور مقصود رہا ہو، عملاً اور قولاً اس کی ترغیب بھی ہو، مگر اس کا اہتمام والتزام نہ رہا ہو، بغیر التزام کے اس پر عمل ہوتا رہا ہو، پھر بعد میں اس کے اندر التزام واہتمام پیدا ہوگیا ہو، اس کی مثال جیسے ایصالِ ثواب، ظاہر ہے کہ ایصال ثواب کا وجود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا، مگر اس کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا، بس چند لوگوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے، لیکن بعد میں اس کا جیسا لزوم ہوا وہ ظاہر ہے، یہ التزام بھی دو طرح کا ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ لزوم کا اعتقاد کرلیا جائے۔ دوسرے یہ کہ لزوم کا اعتقاد تو نہ ہو، لیکن عملاً اس کا التزام ہو، جس سے لزوم کا ایہام ہو، اس میں لزوم اعتقادی کا درجہ

سخت ہے، اور دوسرا درجہ اہون ہے، اسے فقہاء التزام مالا یلزم سے تعبیر کرتے ہیں، اوراس کے حکم کیلئے فقہ میں مکروہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس پر بدعت کا اطلاق نہیں ہوتا **إلا تجوزاً**۔

اب تم **دعاء بعد الصلوات** کو دیکھو کہ یہ آخری قسم کی چیز ہے، کیونکہ نمازوں کے بعد دعاء کی ترغیب ثابت ہے، دعاء کا وجود یقینی ہے، اب عرصۂ دراز سے اس کا پانچوں وقت التزام ہے، اور یہ التزام بھی اعتقادی نہیں ہے، عملی ہے، کسی بھی مسلمان سے دریافت کر کے دیکھو، کوئی بھی انشاء اللہ اس کو ضروری بمعنی فرض وواجب نہ کہے گا، ہاں اس کا ایہام ضرور ہے، اور یہ بھی ہے کہ اس کے تارک کو ملامت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن شاید اس کی وجہ یہ نہ ہو کہ یہ دعا فرض سمجھ لی گئی ہے، بلکہ عامة المسلمین سے عدم موافقت اور انفرادیت خود ایک قابل انکار چیز بن گئی ہے، دیکھو نعلین سمیت اگر کوئی نماز پڑھنا چاہے تو شرعاً بالکل مباح ہے، جوتا اتار کر نماز پڑھنا فرض نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو اس کا حشر کیا ہوگا، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرزِ عمل میں کوئی قباحت نہیں ہے، نہیں، ہے اور ضرور ہے، لیکن میرا مقصد یہ ہے کہ جس درجہ کی جو برائی ہو، اسی درجہ کی اس پر نکیر بھی ہو۔ اس کا حال تم دیکھ چکے، اس کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ کبھی کبھار اس کو ترک کر دیا جائے، اور بس۔ محنت اور کوشش کرنے کے لئے اور دوسری بڑی بڑی بدعات موجود ہیں، ان کے خلاف جہاد کرنا چاہئے۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔

اب دوسری بات سنو! آج کل مسلمانوں میں جہالت، نفسانیت اور غلو کا ایسا مرض ہے کہ کوئی بات کہتے ہوئے سخت اندیشہ ہوتا ہے، اگر کوئی امر متفق علیہ ہے، تو خیر، ورنہ جہاں کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہوا، فوراً ٹولیاں بننے لگتی ہیں، خواہ مسئلہ کسی نوعیت کا ہو۔

غلواور تشدد وتعمق کا ایسا غلبہ ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو، دیکھو رفع یدین اور ترک رفع یدین، قرأۃ خلف الامام وترک قرأۃ، آمین بالجہر وآمین بالسر وغیرہ مسائل قرون اولیٰ سے مختلف فیہ چلے آرہے ہیں، لیکن ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے کہ کچھ لوگوں نے ان مسائل کو مستقل موضوع بنالیا، اور نتیجۃً بات غیر مقلدیت تک جاپہونچی، کچھ لوگوں نے امکانِ نظیر وامکانِ کذب جیسے دقیق علمی مسائل پر قلم اٹھایا، اور بالآخران کی کوکھ سے بریلویت نے جنم پایا، کچھ لوگوں نے حکومت واقتدار کو اپنا نشانہ بنایا اور جماعت اسلامی بن کر علیحدہ ہوگئے۔ اور بھی بعض بعض افراد کچھ معمولی مسائل کو مستقل اپنا مشغلہ بنا کر اپنی انفرادیت قائم کرنا چاہتے ہیں اور امت کی ایک ایک ٹولی لے کر الگ ہونا چاہتے ہیں۔ **والقصة بطولها ، حديث الحزن يا سعدیٰ طويل**

میرے دل میں کچھ ایسی بات آتی ہے کہ **دعاء بعد الصلوٰۃ** کو اگر مستقل موضوع بنا کر عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے تو عوام میں انتشار تو الگ رہا، خود علماء میں کچھ قبول کریں گے، اور کچھ رد وانکار سے پیش آئیں گے، پھر اگر سلسلہ بڑھا تو شدت بھی پیدا ہوگی اور بالآخر یہ مسئلہ ایک کشمکش بن کر رہ جائے گا، حالانکہ اس کی حیثیت دیکھ چکے ہو۔

جناب نبی کریم ﷺ نے بناءِ کعبہ کے مسئلے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: **یا عائشة! لولا قومک حديث عهدهم ...... قال ابن زبير : بكفر ...... لنقضت الكعبة فجعلت لها بابين ، باب يدخل الناس وباب يخرجون** ۔ اس حدث کے فوائد میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ: **ومنه ترک انکار المنكر خشية الوقوع فی انكر منه** (فتح الباری، **كتاب العلم ، باب من ترک بعض الاختيار الخ**)

دیکھتے ہو! اگر کسی بڑے منکر میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو چھوٹے منکر کو گوارا کیا جاسکتا ہے، اس زمانہ میں شقاق ونزاع سے بڑھ کر کیا منکر ہوگا؟ مجھے اندیشہ ہے بلکہ یقین ہے اور مسلمانوں کے مزاج کا تجربہ کرنے کے بعد عین الیقین ہے کہ اگر اس عمل کو بدعت اور منکر بنا کر پیش کیا گیا تو نزاع کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی، ہاں اگر بدعت اس قسم کی ہے، جس کا اوپر تذکرہ ہوا وہ یقیناً خلاف وشقاق سے بہت زیادہ اشد ہے، کیونکہ ان اقسام میں مغیبات کے سلسلے میں ایسا اعتقاد پایا جاتا ہے، جس کا ثبوت دلائل شرعیہ سے نہیں ہے، اس لئے حتی الامکان دل آزاری اور نفسانیت سے بچتے ہوئے اور دائرۂ اعتدال میں رہ کر ان کا ردوانکار ضروری ہے، یہ دوسری وجہ ہے۔

تیسری وجہ کا بھی استطراداً تذکرہ کردوں، وہ یہ کہ میری حیثیت کیا ہے، جو اس قسم کے مسائل پر زبان کھولوں، یا قلم کو کام میں لاؤں، تم لوگ مجھے جو چاہو سمجھو، مگر دنیا مجھے کیا حیثیت دے گی، خوب معلوم ہے، اس لئے کف لسان ہی مناسب ہے ہر مردے وہر کارے، ایاز قدرِ خویش بشناس۔

سوچا تھا کہ کچھ اور لکھوں گا، مگر فرصت نہیں ہے، اس لئے بعد میں لکھوں گا۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۷ر جمادی الاخریٰ ۱۴۰٦ھ

☆☆☆☆☆

عزیزم! زادکم اللہ علماً نافعاً ورزقکم فہماً سلیماً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل رات میں تمہارا خط ملا، بہت خوشی ہوئی۔ تین اشکالات رفع ہوگئے، اس

سے بہت مسرت ہوئی، دعاوالا مضمون اشکال رفع کرنے کی غرض سے لکھا ہی نہ گیا تھا، بلکہ غور وفکر کا ایک دروازہ کھولا گیا تھا، اب اگر تمہارا اشکال رفع نہ ہوا تو اس میں کچھ تمہارے قصورِ فہم کو دخل نہیں ہے، دعاء بعد الصلوات کا التزامی پہلو ہے ہی کچھ ٹیڑھا سا، اس التزام واہتمام کے باعث اس کو اگر کوئی بدعت کہے تو کچھ بے جا نہیں ہے، لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ علماء کا سوادِ اعظم ہمیشہ اس پر عامل رہا ہے اور مانعین شاذ ہوئے ہیں تو بدعت کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، اسی جانب میرے خط میں اشارہ ہے، اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم دونوں نے ایسی باتیں اپنے مسلمہ تشدد، حدت مزاجی اور مخصوص ادعائی ذہن کی بناء پر کہہ ڈالی ہیں، جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں، مثلاً **دبر صلوٰة** کو انھوں نے جزوِ صلوٰۃ کہا ہے، یہی بات حافظ ابن قیم نے لکھی ہے، لیکن جس کی نظر محض بخاری شریف پر ہوگی وہ اسے رد کردے گا۔ حافظ ابن قیم کی عبارت صاحب فتح الباری نے نقل کی ہے، ذرا ان کا ادعائی تیور ملاحظہ کرو، جب شاگرد کا یہ حال ہے جو نسبتاً معتدل مزاج ہیں، تو استاذ کا انداز کیا ہوگا۔ **الهدی** النبوی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

> واما الدعاء بعد السلام من الصلوٰة مستقبل القبلة سواء الامام والمنفرد والماموم فلم یکن من هدی النبی ﷺ اصلاً ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن وخص بعضهم ذالک بصلاتی الفجر والعصر ولم یفعله النبی ﷺ ولا الخلفاء بعده ولا ارشد الیه امته وانما هو استحسان رآه من راه عوضاً من السنة بعدهما. قال: وعامة الادعیة المتعلقة بالصلوٰة انما فعلها فیها وامر بها فیها، قال: وهذه اللائق بحال المصلی فانه مقبل علی ربه مناجیه، فاذا اسلم منها انقطعت المناجاة وانتهی موقفه وقربه فکیف یترک سواله فی حال مناجاته والقرب منه وهو مقبل علیه، ثم یسأل اذا انصرف عنه، ثم قال: لکن الاذکار الواردة بعدالمکتوبة یستحب لمن اتی بها ان یصلی علی النبی ﷺ بعد ان یفرغ

> بها ويدعو بما شاء، ويكون دعاء ه عقب هذه العبادة الثانية لا لكونه دبر المكتوبة۔ (فتح الباری کتاب الدعوات ج ١١ ص ١٦٠)
>
> حاصل اس عبارت کا یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رو بیٹھے بیٹھے دعا کرنا خواہ امام ہو، منفرد ہو یا مقتدی ہو، یہ سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں ہے، اور نہ آپ سے کسی صحیح، یا حسن سند کے ساتھ مروی ہے، بعض لوگوں نے اس دعا کو نماز فجر اور نماز عصر کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں کیا ہے، نہ آپ کے بعد خلفاء راشدین نے کیا ہے اور نہ ہی آپ نے اپنی امت کو اس کی ہدایت فرمائی ہے، یہ بعض حضرات کا استحسان ہے انہوں نے اسے سنتوں کے عوض میں تجویز کیا ہے، یعنی عصر اور فجر کے بعد چونکہ کوئی سنت نماز نہیں ہے، اس لئے اس کے عوض میں لوگوں نے دعا کو تجویز کر دیا۔
>
> فرماتے ہیں کہ نماز سے متعلق جتنی دعائیں منقول ہیں انہیں آپ نے نماز کے اندر کیا ہے اور اسی میں ان کا حکم دیا ہے، علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ یہی بات نمازی کے حق میں مناسب بھی ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی طرف بالکلیہ متوجہ ہے، اس سے مناجات کر رہا ہے، پھر جب سلام پھیرتا ہے تو اس کی مناجات منقطع ہو جاتی ہے، اور قرب کا وہ مقام جو نماز کے اندر اسے حاصل تھا، ختم ہو جاتا ہے، تو کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ جب وہ قرب و مناجات کے حال میں تھا، اور بالکلیہ رب تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا تب تو سوال و دعا نہ کرے اور جب اس سے فارغ ہو گیا، تب دعا کرنا شروع کرے۔
>
> البتہ خاص خاص اذکار جو فرض نماز کے بعد وارد ہیں، انہیں جو پڑھنا چاہے اس کے لئے مستحب ہے کہ ان اذکار سے فارغ ہونے کے بعد نبی ﷺ پر درود بھیجے اور جو چاہے دعا کرے۔ اس کی یہ دعا اس دوسری عبادت یعنی اذکار مسنونہ کے ورد کے بعد ہو گی، فرض نماز کے بعد ہونے کی وجہ سے نہیں۔

دیکھو اس میں علامہ ابن قیم نے مطلقاً نماز کے بعد دعاء کی نفی کر دی ہے، خواہ امام ہو، خواہ مقتدی، خواہ منفرد، فرض ہو یا نفل، پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ سرے سے تھا ہی نہیں، اس کے لئے نہ صحیح، نہ حسن، نہ فعلی نہ قولی کوئی روایت ثابت ہی نہیں، نہ

خلفاء نے یہ عمل کیا، نہ کسی نے امت کی اس کی جانب رہنمائی کی، اللہ اکبر کتنا بڑا دعویٰ ہے، اب سنو صاحب فتح الباری کا اس پر انتقاد:

> قلت: وما ادعاه من النفی مطلقاً، مردود، فقد ثبت عن معاذ بن جبل ان النبی ﷺ قال له: یا معاذ انی واللہ احبک فلا تدع دبر کل صلوٰۃ ان تقول: اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ، اخرجه ابو داؤد والنسائی وصححه ابن حبان والحاکم وحدیث أبی بکرۃ فی قول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ، کان النبی ﷺ یدعو بهن دبر کل صلوٰۃ اخرجه احمد والترمذی والنسائی وصححه الحاکم وحدیث سعد الآتی فی باب التعوذ من البخل قریباً فان فی بعض طرقه المطلوب وحدیث زید بن ارقم: سمعت رسول اللہ ﷺ یدعو فی دبر کل صلوٰۃ: اللهم ربنا ورب کل شئی الحدیث اخرجه ابو داؤد والنسائی وحدیث صهیب رفعه کان یقول اذا انصرف من الصلوٰۃ: اللهم اصلح لی دینی الحدیث اخرجه النسائی وصححه ابن حبان وغیره
>
> فان قیل: دبر کل صلوٰۃ قرب اخرها وهو التشهد: قلنا قد وردالامر بالذکر دبر کل صلوٰۃ والمراد به بعدالسلام اجماعاً فکذا هذا حتی یثبت ما یخالفه.

فرماتے ہیں کہ حافظ ابن قیم نے نمازوں کے بعد دعا کرنے کی جو مطلقاً نفی فرمادی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

(١) کیونکہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے معاذ! واللہ مجھے تم سے محبت ہے پس کسی نماز کے بعد یہ دعا کرنا نہ چھوڑنا: اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ، یہ روایت ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہے، اور اسے ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

(٢) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ یہ روایت

> امام احمد، امام ترمذی، امام نسائی نے نقل کی ہے اور امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔
>
> (۳) حضرت سعد ؓ سے بھی اس سلسلے میں ایک روایت منقول ہے، جو قریب ہی **باب التعوذ من البخل** میں آ رہی ہے، اس کے بعض طرق میں مطلوب موجود ہے۔
>
> (۴) حضرت زید بن ارقم ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے سنا: **اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْئٍ** اسے امام ابوداؤد اور امام نسائی نے نقل کیا ہے۔
>
> (۵) حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے تو یہ دعا کرتے: **اللهم اصلح لي ديني الخ** اسے امام نسائی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے اور ابن حبان وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔
>
> اور اگر کوئی کہے کہ حدیث میں آئے ہوئے لفظ **دبر** کے معنی نماز کے اخیر کے قریب والا جز ہے، یعنی تشہد کے بعد کا حصہ، مطلب یہ ہے کہ یہ دعائیں نماز کے آخری جز میں پڑھی جائیں گی، نہ کہ نماز کے بعد۔
>
> تو ہم کہیں گے کہ احادیث میں بعض اذکار کے متعلق حکم ہوا ہے کہ انہیں **دبر کل صلوٰۃ** پڑھا جائے، اور وہاں بالاجماع نماز کے بعد مراد ہے، اسی طرح ان دعاؤں کے بارے میں بھی یہی کیا جائے گا کہ نماز کے بعد کی جائیں گی، جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔

دیکھتے ہو، حافظ ابن قیم کا دعویٰ کیا تھا، اور ان حدیثوں سے ان کا دعویٰ کس طرح رَد ہو رہا ہے، **دبر** کو خوامخواہ **دبر** حیوان سے مشتق ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ احادیث میں صرف **دبر** ہی کا لفظ تو نہیں آیا ہے۔ بخاری شریف میں **باب الذکر بعد الصلوٰۃ** میں **خلف کل صلوٰۃ** کا لفظ آیا ہے، صاحب فتح الباری نے بخاری ہی کی ایک روایت کے سلسلے میں **اثر کل صلوٰۃ** کا لفظ نقل کیا ہے، بتاؤ کہ **دبر کل صلوٰۃ سبحان اللہ الحمد للہ اللہ اکبر** جو پڑھنے کا حکم ہے وہ نماز کے اندر ہے یا باہر؟ صاحب فتح الباری تو اس پر اجماع قرار دیتے ہیں کہ اس کا تعلق نماز کے بعد سے ہے، فتح الباری کی ایک عبارت دیکھو:

وادعیٰ ابوعمرو الزاهد انه لایقال (الدبر) بالضم إلا للجارحة ورد بمثل قولهم أعتق غلامه عن دبر (فتح الباری، ج:۲،ص:۳۲۸)

دبر سے حیوان کا پچھلا حصہ ہی مرادلینا اوراس کے ماسوا کی نفی کرنا زیادتی کی بات ہے، آخر **أعتق غلامه عن دبر** کا کیا مطلب ہے؟

ان حضرات کے دعووں سے مرعوب نہ ہو، ایسی نہ جانے کتنی روایتیں ہیں جو صراحۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ فرض نمازوں کے بعد آنحضرت ﷺ نے دعائیں کی ہیں، اورکرنے کی ترغیب دی ہے، اس لئے اگر یہ منقول نہیں ہے کہ اجتماعاً لوگوں نے دعاء کی ہے تو کچھ حرج نہیں ہے، صراحۃً اور عبارۃً گومنقول نہیں ہے، لیکن دلالۃً اور التزاماً منقول ہے، اور جانتے ہو کہ دلالۃ النص کی بھی حیثیت ہوتی ہے۔

اب دوسری بات علامہ انورشاہ کشمیری کی سنو! فرماتے ہیں:

”لا ریب ان الادعية دبر الصلوٰة قدتواترت تواتراً لا ینکرا ما رفع الایدی فثبت بعد النافلة مرة او مرتین فالحق بها الفقهاء بعد المکتوبة ایضاً وذهب ابن تیمیة وابن قیم الی کونه بدعة بقی ان المواظبة علی امر لم یثبت عن النبی ﷺ إلامرة او مرتین کیف هی؟ فتلک هی الشاکلة فی جمیع المستحبات فانها تثبت طوراً فطوراً ثم الامة تواظب علیها .“

حاصل یہ ہے کہ نمازوں کے بعد دعا کرنا ایسے تواتر سے ثابت ہے، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، باقی ہاتھوں کا دعا میں اٹھانا تو نفل کے بعد ایک یا دومرتبہ ثابت ہے، فقہانے اسی قیاس پر فرض نمازوں کے بعد بھی ہاتھ اٹھانے کو ملحق کیا ہے، اور علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ایک یا دوبار ثابت ہے اس پر دوام کرنا کیسا ہے؟ تو معلوم ہونا چاہئے کہ تمام مستحبات کے اثبات کا یہی طریقہ ہے کہ ان کا ثبوت حضور اکرم

ﷺ سے کبھی کبھی ہوتا ہے، پھر امت اس پر مواظبت کرتی ہے"۔ (فیض الباری ج ۴ ص ۴۱۷)

اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کے بعد دعاء کا ثبوت ہے، اور تواتر کے ساتھ ہے، لیکن ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا ایک یا دوبار ثابت ہے، اور مستحبات میں ایک بار یا دو بار ثبوت ہو جائے تو اس پر دوام اور مواظبت کی جا سکتی ہے، ہاں اتنا نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا تارک ملامت کا مستحق ہو جائے، بس یہ ہے فیصلہ کی بات! اب اگر کسی کے خیال میں بات دوام اور مواظبت سے آگے بڑھ چکی ہے تو اسے کبھی کبھی یہ عمل ترک کر دینا چاہئے، اور بلا شبہ **دعاء بعد الصلوات** کے سلسلے میں اسی قسم کا رجحان بنا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

(۲) اکل شجرہ کے سلسلے میں حضرت آدم علیہ السلام سے دو مرتبہ سوال ہوا ہے۔ ایک بار حق تعالیٰ نے سوال کیا تو اس کے جواب میں عرض کیا **ربنا ظلمنا أنفسنا الخ**، اور ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا تو جواب وہ دیا جو تم نے نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے پاس دوسرا جواب نہیں چل سکتا۔ جوابات کے اس فرق میں ایک بڑا نازک اور لطیف راز ہے، جس کے تحریر کی اس وقت فرصت نہیں ہے، کبھی فرصت ملی تو انشاء اللہ لکھ دوں گا۔ ابھی تو اپنے سوال کا جواب سنو!

یہاں تقدیر کی تحریر کی بنیاد پر کوئی سوال ہرگز نہیں پیدا ہوتا، کہ جب آپ نے میرا کفر لکھ دیا تھا تو مجھے عذاب کیوں دیا جا رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جیسے کفر لکھ دیا تھا اور اسی لکھنے کی وجہ سے تم نے کفر کیا تو ہم نے عذاب بھی تو لکھا تھا، اسی لکھنے کی وجہ سے جہنم میں جاؤ، ہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایسا لکھا ہی کیوں؟ کیوں نہیں سب کو جنتی لکھ دیا؟ تو یہ سوال درحقیقت خدا کی خدائی پر اعتراض ہے، جس کی مجال کسی بندے کو نہیں؟ اس کا حاصل تو یہ ہے کہ آپ خدا کیوں ہوئے؟ اور آپ نے مخلوق میں

ہرطرح کا تصرف کیوں جاری کیا ہے؟ تصرف کا ایک ہی رخ کیوں نہیں رکھا؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال بیجا ہے، جن کو ایمان حق تعالیٰ کی مہربانی سے نصیب ہوگیا ہے، وہ خیر منائیں، اللہ کا شکر ادا کریں، سوالات کی راہ چھوڑ دیں، بہت خطرہ ہے، خدا کی بے نیازی کا ہاتھ کہیں بھی پہونچا سکتا ہے۔ خدا، خدا ہے، اگر وہ ہرطرح کا تصرف اپنی مخلوق میں نہ کرے تو یہ اس کے نقص کی دلیل ہے، اس لئے جو کچھ کرتے ہیں کرنے دو، اپنی فکر میں رہو، وہی کافی ہے۔

(۳) حضرت مجدد صاحب کے واقعہ کا تعلق کشف سے ہے، اس شخص کا ابتدائی حال ان پر منکشف ہوا تھا جس کا اظہار انھوں نے کیا، ابھی ان پر یہ منکشف نہں ہوا تھا کہ انھیں کی دعاء سے اسے دوبارہ ایمان نصیب ہوگا، یہ تبدیلی بھی تقدیر کی تحریر میں موجود تھی، مجدد صاحب پر مکشوف نہ تھی۔ آج ایک شخص کو تم فاسق وفاجر دیکھتے ہو، کل وہ ولی کامل ہوجاتا ہے تو کیا اس کی تقدیر بدل گئی، تقدیر نہیں بدلی، یہ سب احوال تقدیر میں مرقوم تھے۔ اپنے اپنے وقت پر ان کا ظہور ہوا، اسی طرح سمجھ لو کہ وہ شخص مومن تھا لیکن اس کے اندر استعداد کفر کی موجود تھی، وہی استعداد ”کافر“ کی تحریر کی شکل میں مکشوف ہوئی، پھر یہ بھی تحریر تھا کہ اس کی یہ استعداد حضرت مجدد صاحب ہی کی دعاء سے مٹ جائے گی اور اس کے لئے ان کے فرزندوں کا اصرار باعث ہوگا۔ یہ ساری باتیں منکشف نہ تھیں، پس جب یہ افعال ظہور میں آگئے تو اس کی یہ استعداد مٹادی گئی، اور پھر اس کا انکشاف ہوگیا، اور یہ سب حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر مبنی ہے، اس کا موقع تحریر نہیں ہے، اس کے لئے صحبت شرط ہے، عجیب وغریب رموز واسرار ہیں، اگر اطمینان کی ملاقات ہوتی تو کچھ بتاتا، انھیں حقائق کے تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے، فہم سے بالاتر ہیں، لیکن جب ان میں سے کسی حصہ کا نزول فہم میں ہوتا ہے تو علم ومعرفت

کی ایک دنیا روشن ہو جاتی ہے، بہت اہتمام سے ”ایمان“ کو بچائے رکھو، اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ التجاء وزاری قائم رکھو کہ اللہ ایمان کو قائم ودائم رکھیں۔

(۴) فطرت سے مراد ”استعداد“ ہے، جس میں ایمان کی صلاحیت ہوتی ہے، بعضوں کی استعداد میں رجحان کفر کی جانب ہوتا ہے اور بعضوں کی فطرت میں رجحان ایمان کی جانب ہوتا ہے، اس صلاحیت کو فعلیت میں لانے والی چیز ماحول اور معاشرہ ہوتا ہے، مسلمان ہو کر پیدا ہونے کا مطلب یہی ہے کہ ان میں استعداد اسلام کی غالب ہوتی ہے۔ کافر ہو کر پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں استعداد کفر کی غالب ہوتی ہے۔ ایک مطلب اور ذہن میں آرہا ہے لیکن حدیث کے الفاظ سامنے ہوں تو اسے لکھوں، تم دوسرے خط میں الفاظ نقل کر کے بھیج دو۔

آخری حدیث کا مطلب دوسری صحبت کے لئے اٹھا رکھو، اس پر موقع ملا تو مفصل کلام کروں گا کہ میرا اصل موضوع وہی ہے، ویسے اس کا خیال رکھو کہ ایک خط میں ایک ہی سوال لکھا کرو! تا کہ تفصیل سے اس کا جواب قلمبند ہو سکے، میں لکھتے لکھتے اکتا جاتا ہوں۔ ایک ہوگا تو سیر حاصل بحث ہو سکے گی، تمہارا ہر سوال مستقل ایک مقالہ چاہتا ہے اور جی بھی یہی چاہتا ہے، اس طرح ایک علم مدون ہو جائے گا، لیکن کئی سوال ہونے کی وجہ سے سب کو سمیٹنا پڑا۔ اب اگلے خط میں ایک ہی بات لکھو، انشاء اللہ اس کا مفصل جواب تحریر کروں گا۔

احمد سعید کو ایک خط میں نے تقدیر کے مسئلے پر لکھا تھا، اسے دیکھو اور سمجھ لو۔

تمہارے خط میں ایک جملہ یہ ہے کہ ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو مجرم قرار دینے کی کوشش کی“ یہ تعبیر سخت ناگوار ہے، اس قسم کی تعبیر اکابر کے سلسلے میں لکھنے سے احتراز کرو، اس کو تم یوں لکھ سکتے تھے کہ ”حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

حضرت آدم علیہ السلام سے اکل شجرہ کی بابت سوال کیا'' اتنے سے حدیث کا جاننے والا مفہوم کو پالیتا۔

فقط والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

عزیزی و محبی! **زادکم اللہ علماً وفہماً**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل تمہارا خط ملا۔ تمہاری محبت اور حسن عقیدت کا دل پر خاص اثر ہے، خدا تمہیں خوش رکھے۔ ؎ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

فطرۃ کی شرح میں، جو کچھ میں نے لکھا تھا، وہ میری رائے نہیں ہے، یہی تشریح شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ، مشہور محدث علامہ طاہر پٹنی صاحب مجمع بحار الانوار، علامہ قرطبی اور امام المتاخرین علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی ہے، سب حضرات کی عبارتیں نقل کرنا طولِ عمل ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ جن حضرات نے فطرۃ کی شرح ''اسلام'' سے کی ہے، ان کا بھی مقصود وہی ہے جس کو علماء مذکورین نے تحریر فرمایا ہے، اختلاف صرف لفظ کا ہے، مطلب ایک ہے۔

اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ''حدیث فطرۃ'' کے پورے الفاظ سامنے ہوں، اور فطرۃ کی شرح جن لوگوں نے اسلام سے کی ہے، اور جن شارحین کو اس پر اصرار ہے کہ اس سے مراد ''استعداد اسلام'' نہیں، خود اسلام ہے، ان کے دلائل بھی پیش نظر ہوں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن أبی هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مامن مولودٍ إلا

يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أوينصرانه أويمجسانه كما تنتج البهيمة بهيمة جمعاء هل تحسون فيها من جدعاء ثم يقول: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (متفق عليه)

صاحب فتح الباری نے لکھا ہے کہ أجمع أهل العلم بالتاويل على أن المراد بقوله تعالىٰ (فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا)’’ الاسلام ‘‘ ج: ۳، ص: ۲۴۸۔ پوری آیت یوں ہے: فَأَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰکِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ۔

اب سنو! حدیث میں جو الفطرۃ کا لفظ آیا ہے، وہ یہی ہے، جس کو آیت قرآنی میں فطرۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اسی کے سلسلے میں حافظ الدنیا ابن حجر نے اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے، کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ اس کی دلیل میں چند باتیں کہی گئی ہیں۔

(۱) آیت کریمہ میں فطرۃ کی اضافت اللہ کی جانب کی گئی ہے، اس میں اشارہ اس کے مدح وکمال کی جانب ہے، ظاہر ہے کہ اس مدح کا مستحق اسلام ہی ہوسکتا ہے، محض استعداد کی مدح کیا معنی رکھتی ہے؟

(۲) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس کے التزام اور اہتمام کا حکم دیا ہے، چنانچہ فطرۃ اللہ جو منصوب ہے، اس کا عامل ألزم مقدر ہے، اور اس پر لفظ أقم دلالت کرتا ہے، اور ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جس کے التزام کا مکلّف بنایا گیا ہے، وہ اسلام ہی ہے۔

(۳) اسی آیت میں اس کو دین قیم فرمایا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس سے مراد اسلام ہے۔

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ: **إنی خلقت عبادی حنفاء کلھم فاجتالتھم الشیاطین عن دینھم** اور روایتوں میں حنفاء کے بعد مسلمین کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہ حدیث صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ حدیث سابق میں **الفطرۃ** سے مراد اسلام ہی ہے۔

(۵) حدیث فطرۃ میں الفطرۃ کے بعد یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کا تقابلاً ذکر آیا ہے اور یہ تینوں فرقے مذاہب ہیں، اس لئے صحت تقابل کے واسطے ضروری ہے کہ الفطرۃ سے دین اسلام مراد لیا جائے۔

یہ خلاصہ ہے، ان حضرات کے دلائل کا، جو فطرت سے عین اسلام مراد لیتے ہیں، ان دلائل کی حقیقت تو بعد میں واضح ہوگی، پہلے اشکال سنو!

(۱) اگر یہ صحیح ہے کہ ہر بچہ خلقۃً مسلمان ہوتا ہے، تو سمجھ آنے کے وقت اس کو مسلمان قرار دینا چاہئے، فرض کرو کوئی اسلامی حکومت ہو تو اس کی غیر مسلم رعایا کے بچوں کو مسلمان مان کر مسائل کو اسی بنیاد پر متفرع کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر یہ بچہ ناسمجھی کے زمانہ میں مرجائے تو اس کا ترکہ اس کے والدین کو، یا اس کے برعکس صورت میں والدین کا ترکہ اس کو نہیں ملنا چاہئے، کیونکہ اختلافِ دین کی صورت میں توارث جاری کرنا ممکن نہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بعض علماء نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس حدیث کا تعلق حکم دنیوی سے نہیں ہے، حکم اُخروی سے ہے، لیکن اس تخصیص کی دلیل کیا ہے؟

(۲) اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس کا تعلق محض حکم آخرت سے ہے، تو بالفرض اگر کافر کا بچہ مرجائے تو اسے قطعیت کے ساتھ جنتی کہنا چاہئے، حالانکہ حدیث میں ہے: **سئل رسول الله ﷺ عن أولاد المشرکین فقال : الله إذ خلقھم أعلم بما کانوا عاملین** (بخاری) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قطعیت کے ساتھ ان

کے جنتی ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) حدیث خضر میں بچہ کا کافر مطبوع ہونا مصرح ہے۔

(۴) حق تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں فرمایا ہے کہ لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللهِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حالت پر خدا نے پیدا کر دیا ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، حالانکہ حدیث میں صراحۃً تبدیلی کا ذکر موجود ہے، اور مشاہد بھی یہی ہے، ہاں اگر اس کو نہی قرار دیا جائے تو معنی درست ہوسکتا ہے، لیکن یہ تکلف ہے۔

(۵) اگر اسلام پیدائشی اور جبلی امر ہے، تو ظاہر ہے کہ بندے کے اختیار سے نہیں ہے۔ اس کے ارادہ و اختیار کے بغیر اسلام اس کی سرشت میں داخل کر دیا گیا ہے، اور یہ بدیہی ہے کہ سزا و جزا کا مدار اختیار پر ہے، پھر چاہئے کہ اسلام پر اس کو کوئی اجر وثواب نہ ہو۔

یہ اشکالات ہیں، جن کی بنا پر فطرۃ سے عین دین اسلام مراد لینا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے فیض الباری میں اس موضوع پر نفیس بحث کی ہے، فرماتے ہیں کہ: **فالصواب عندی أن الفطرة من مقدمات الاسلام لاعینه فهی جبلة متهیئة لقبول الاسلام، وبعبارة أخریٰ هی استعداد فی الولد، له بعد من الکفر وقرب من الایمان، وبعباره أخریٰ هی عبارة عن خلوبنتیه عما یحثه علی الکفر ولولا القوادح والموانع لبقی أقرب إلی الایمان الخ ج: ۲، ص: ۴۸۵.**

حاصل یہ ہے کہ فطرۃ عین اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام کی وہ استعداد ہے، جو ابتداء آفرینش ہی سے انسان کی نہاد میں رکھ دی گئی ہے، اگر خارجی اسباب وعوامل نہ ہوں، اور انسان اپنی خلقی حالت پر قائم رہ جائے تو اپنے اختیار سے وہ اسلام ہی کو پسند

کرے گا، گویا یوں سمجھو کہ انسان اپنی پیدائشی حالت میں ایسی کیفیت لے کر آیا ہے کہ اس میں کفر و شرک کی آلودگی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اور انسان کی اصلی حالت یہی ہے، پھر اس کے گھر والے اور اس کا ماحول اس کی اصلی حالت زائل کر کے غیر فطری حالات اس پر مسلط کر دیتے ہیں، یہ استعداد مدارِ تکلیف نہیں ہے، اور اس استعداد کا شمار احکامِ شرعیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تکوینی محسوس حالت ہے، چنانچہ اس کو سمجھانے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جو مثال بیان فرمائی ہے، اس پر غور کرو۔ فرماتے ہیں کہ جانور کا بچہ دیکھو کہ کیسا صحیح وسالم، عیوب سے پاک پیدا ہوتا ہے، کیا کبھی کسی بچہ کو پیدائشی طور پر کان کٹا ہوا دیکھتے ہو؟ بعد میں لوگ کان کاٹ دیتے ہیں، گویا اسلام اس کی اصل اور اندرونی استعداد ہے، اور کفر وشرک بیرونی موثرات ومحرکات کا نتیجہ؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ فطرة وہ استعداد ہے، جس میں قبول اسلام کی صلاحیت اصلی اور بغیر کسی خارجی وعامل ومؤثر کے ہے، اور قبول کفر کی صلاحیت عارضی اور خاجی عوامل واسباب کے زیر اثر ہے۔

مسلم شریف میں ایک روایت نقل کی گئی کہ آنحضور ﷺ نے ایک شخص کی آواز سنی، جو اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ **علی الفطرة**، پھر اس نے کہا **أشهد أن لا إله إلا الله** تو آپ نے فرمایا کہ **خرجت من النار**، بعد میں لوگوں نے دیکھا تو وہ ایک چرواہا تھا، دیکھو رسول اللہ ﷺ نے محض اللہ اکبر کی صدا سن کر اس کے فطرة پر ہونے کی گواہی دی، لیکن نجات کی بشارت اس وقت دی جب اس سے کلمۂ توحید سن لیا، اس سے معلوم ہوا کہ فطرت اور اسلام میں فرق ہے، مدارِ نجات فطرت نہیں اسلام ہے۔

اب غور کرو کہ آیت کریمہ میں فطرة کی اضافت جو حق تعالیٰ نے اپنی جانب

کی ہے، اس سے یہ کچھ ضروری نہیں کہ لازماً اسے اسلام ہی مانا جائے، ظاہر ہے کہ جو چیز قبول اسلام کی بنیاد اور اس کا مقدمہ ہوگی، وہ بھی کچھ کم قابل مدح وستائش نہ ہوگی، اور یہ جو کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کے التزام کا حکم ہوا، اس لئے وہ اسلام ہی ہو سکتا ہے، اس پر عرض ہے کہ اس التزام کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد کو خارجی مضر اثرات سے بچایا جائے، اور کیا حرج ہے کہ **الدین القیم** سے اشارہ **فأقم وجهک للدین حنیفاً** میں مذکور الدین ہو، اور مانا کہ **الدین القیم** کا مصداق فطرۃ اللہ ہی ہے، جب بھی اس سے مراد دین اسلام ہونا متعین نہیں ہے، دیکھو حق تعالیٰ فرمایا ہے کہ: **إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْراً فِيْ كِتَابِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِکَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ**، ظاہر ہے کہ سال کا بارہ مہینوں پر مشتمل ہونا از قبیل تکوینیات ہے، احکام شرع میں اس کا شمار نہیں ہے، لیکن اسے بھی حق تعالیٰ نے دین قیم فرمایا ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ کسی امر کو محض دین قیم کہہ دینے سے لازم نہیں آتا کہ وہ بس دین اسلام متعین ہے، دین قیم کا اطلاق تکوینی امور پر بھی ہوتا ہے۔ فطرۃ اور استعداد تکوینی امور میں سے ہے، اس پر دین قیم کا اطلاق اسی لحاظ سے ہے، حدیث میں حنفاء مسلمین جو فرمایا گیا ہے اس سے صلاحیت کا اظہار مقصود ہے، اس میں بھی اشارہ یہی ہے کہ انسان اپنی اصل سرشت کے لحاظ سے کفر وشرک کے عیب سے بری ہوتا ہے، پھر شیاطین گھیر گھار کر اپنی طرف لے جاتے ہیں، حدیث فطرت میں الفطرۃ کا تقابل یہودیت وغیرہ سے نہیں ہے، ورنہ ہر کافر پر ارتداد کا حکم لگتا، بلکہ خارجی موثرات وعوامل کے عمل کا اظہار ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک اور آیت پر غور کرو، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: **إِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا**

وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً ۔

اس آیت میں امانت سے مراد کیا ہے؟ کیا اسلام ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، ورنہ **لیعذب اللہ المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات** والی بات بے ربط ہوکر رہ ہوجائے گی، کیونکہ اس امانت کو تو تمام انسانوں نے قبول کیا ہے، ہر انسان اس امانت کو لے کر پیدا ہوتا ہے، اور محض بے اختیاری امر ہے، تکویناً اس کا بار اٹھالینے کے بعد کوئی اس کو خود سے پھینکنا چاہے، تو ممکن نہیں ہے۔ ناچار یہی کہنا پڑے گا کہ اس سے وہی استعداد مراد ہے، جس کی تعبیر دوسری آیت میں **فطرة اللہ** سے کی گئی ہے، غرض اس آیت میں امانت اور سابق آیت میں فطرۃ، دونوں کا مصداق واحد ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ فطرۃ ایک امر تکوینی ہے، جس کے سلسلے میں انسان صاحب اختیار نہیں ہے، لہٰذا اس پر کسی حکم شرعی کا مدار نہیں ہے، اور نہ اس خلق میں کسی تبدیلی کا امکان ہے، جو لوگ کفر میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی استعداد بھی فنا نہیں ہوتی، حدیث میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ بعض مومن پیدا ہوتے ہیں اور بعض کافر، اس کے متعلق پہلے مکتوب میں کچھ لکھ چکا ہوں۔

اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس کا تعلق فطرۃ اور استعداد سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق تقدیر سے ہے، یعنی انسان کے تقدیری اطوار کا اس میں ذکر ہے کہ بعض لوگوں کی تقدیر میں ابتدا سے انتہا تک اسلام ہی اسلام ہے اور بعض لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ پیدائش سے پہلے ہر انسان کے متعلق فرشتہ حق تعالیٰ سے دریافت کر کے شقی یا سعید لکھ دیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ مقدر کی تحریر ہے، فطرۃ سے اس کا کوئی تصادم نہیں ہے۔ فطرت اب بھی وہی ہے، خارجی عوامل نے اِدھر اُدھر ڈال دیا ہے۔ ہاں اگر فطرت سے مراد اسلام ہو تو ضرور دشواری

ہوگی۔ یہی بات قصہ خضر میں بھی ہے کہ بچہ جو کافر مطبوع تھا، اس کا تعلق تقدیر سے ہے، فطرۃ اس کی وہی تھی، جس میں قبول اسلام کی صلاحیت تھی۔

پہلے لکھ چکا ہوں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ارشاد ہے کہ جن اکابر نے فطرۃ کی شرح اسلام سے کی ہے، ان کا مقصود بھی یہی صلاحیت واستعداد ہے، سبب پر مسبب کا اطلاق ظاہر ہے کہ رائج ہے، لہٰذا اگر اسلام کہہ کر صلاحیت اسلام مراد ہوتو کچھ بعید نہیں، اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو سارا اختلاف ختم، اور بات یہی جی کولگتی بھی ہے، ورنہ وہ تفسیر اشکال سے خالی نہیں۔ واللہ أعلم

(۲) ام الزوجہ اور بنت الزوجہ کی حرمت حرمت مصاہرت کے ذیل میں آتی ہے، حرمت مصاہرت میں دو حکمتیں...... والعلم عنداللہ...... محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جس کو تم اصول فقہ اور فقہ میں پڑھ چکے ہو کہ ولد کے واسطے سے مرد وعورت ایک دوسرے کے جز ہوجاتے ہیں، اور پھر یہ جزئیت متعدی ہوکر دونوں کے اصول وفروع کو بھی اپنے دائرہ میں سمیٹ لیتی ہے، اور اپنے اجزاء سے نکاح ظاہر ہے کہ ناجائز ہے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر یہ حرمت ثابت نہ ہوتو معاشرہ تباہ ہوکر رہ جائے گا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ نکاح کے بعد ظاہر ہے کہ دو خاندانوں میں نہایت قریبی تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں، قرابت داری کی وجہ سے آپس کا اختلاط ناگزیر ہے، ایسی صورت میں اگر ام الزوجہ وبنتہا کے سامنے حرمت کی دیوار کھڑی نہ کردی جائے تو شوہر کو بیوی کی ماں یا اس کی بیٹی کی طرف بھی رغبت ہوسکتی ہے، اور اس رغبت کے نتیجے میں نیا تعلق قائم کرنے کے لئے پرانے تعلق کو توڑنے اور ختم کرنے کی کوشش ہوگی، اور یہ بات خوب معلوم ہے کہ جنسی بنیادوں پر جو محبت قائم ہوتی ہے وہ ہر ناکردنی کو کردنی بنادیتی ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماں بیٹی کے درمیان سخت عداوت اور کشمکش پیدا ہوتی،

اور قتل وخون کی نوبت پہونچ جاتی، اور قطع رحمی کا بازار گرم ہوجاتا، جس کو مٹانے کے لئے شریعت کا نزول ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومنها المصاهرة فإنه لو جرت السنة بين الناس أن يكون للأم رغبة فى زوج بنتها وللرجال فى حلائل الابناء وبنات نسائهم لأفضىٰ إلى السعى فى فك ذٰلك الربط أوقتل من يشح به، وان أنت تسمعت إلىٰ قصص قدماء الفارسين واستقرأت حال أهل زمانك من الذين لم يقيدوا بهٰذه السنة الراشدة وجدت اموراً عظاماً ومهالك ومظالم لاتحصىٰ. (حجۃ اللہ البالغۃ ج:۲،ص:۱۳۲)

عبارت کا حاصل وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا، مجوسیوں اور اہل جاہلیت میں یہ قید حرمت نہ تھی، تو کتنے فساد اور کتنی خونریزیاں اسی بنیاد پر ہوئیں؟ حرمت کی دیوار قائم کردینے کے بعد ان رشتوں کی جانب کوئی حرص وہوس کی نگاہ کرتا ہی نہیں، بلکہ ایک ایسا احترام اور تقدس طبائع میں جاگزیں ہوگیا کہ رشتۂ زوجیت کے تصور سے بھی طبع سلیم اباء کرتی ہے۔

اب مزید غور کرو! پہلی حکمت یعنی انشاء جزئیت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں رشتے محض عقد نکاح کی بنیاد پر حرام نہ ہوں کیونکہ جزئیت کا ثبوت ولد پر موقوف ہے، اور ولد کا قریبی سبب وطی ہے، نہ کہ عقد نکاح! اس لئے چاہئے کہ جب دخول ہو تب حرمت ثابت ہو، لیکن دوسری حرمت کا اقتضاء یہ ہے کہ محض عقد نکاح سے حرمت قائم ہوجانی چاہئے، کیونکہ قرابت تو محض عقد نکاح سے ثابت ہوگئی۔ اب وہ تمام امور حرام ہونے چاہئیں جن سے قطع رحمی لازم آئے۔

پھر غور کرو! اصل وجہِ حرمت تو جزئیت کا ثبوت ہے، اور دوسری وجہ تو قطع رحمی

سے بچانے کی غرض سے ہے، اس لئے اس کو فرع اور تابع کہو تو بجا ہے، اب پہلی وجہ کا تقاضا یہ ہے کہ حرمت مصاہرت کے لئے بہر صورت وجودِ وطی کو بنیاد قرار دیا جائے، لیکن دوسری حکمت کی رعایت بھی ضروری ہے، اس لئے اب تقسیم کار یوں مناسب ہے کہ جہاں قطع رحمی اور تحاسد کا احتمال شدید ہو، وہاں حرمت کے ثبوت کے لئے وجودِ وطی کا انتظار نہ کیا جائے، بلکہ محض عقد نکاح کی بنیاد پر جلد تر بندش قائم کردی جائے، اور جہاں قطع رحمی کے احتمال میں اس درجہ شدت نہ ہو، وہاں وجود وطی کے بعد حرمت مانی جائے، اور جہاں اس قطع رحمی کے احتمال میں مزید کمی ہو، وہاں معاملہ کچھ اور سہل کردیا جائے۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد ایک بار پھر تامل کرو کہ بیوی کے ہوتے ہوئے اگر اس کی ماں کی جانب رغبت کی گنجائش ہو تو بیوی اس کو کسی طور پر گوارا نہیں کرے گی، عام عادت یہی ہے کہ اس باب میں بیٹی کو سخت غیرت آئے گی، اور شر و فساد اور قطع رحمی اپنے آخری نقطہ پر پہونچ کر رہے گی، اس کے برخلاف اگر بیوی کی بیٹی کی طرف رغبت ہو تو عام طبیعت یہی ہے کہ ماں اپنی اولاد کے لئے بہت امکان ہے کہ بخوشی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ وہ یہ خیال کرسکتی ہے کہ اولاد کی زندگی بن جائے، میرا کیا ہے، اب کتنے دنوں جینا ہے۔ چنانچہ ماؤں کا اپنی اولاد کے لئے ہر قسم کی قربانی دینا ایک عام مشاہدہ ہے۔ پہلی صورت میں قطع رحمی شدید ہے۔ اس لئے جزئیت کے سبب قریب یعنی وطی پر حرمت کو موقوف نہ رکھا گیا، بلکہ سبب بعید یعنی عقد نکاح کو حرمت کے لئے کافی سمجھا گیا، اور دوسری صورت میں یہ احتمال ہے کہ قطع رحمی کا وجود ہی نہ ہو، بلکہ برضاء و رغبت اپنی بیٹی کے لئے یہ قربانی دے ڈالے، اس لئے اس کی حرمت اس وقت تک موقوف رکھی گئی جب تک جزئیت کا سبب قریب یعنی وطی نہ

پائی جائے۔ **والعلم عند اللہ**

یہ وجہ میں نے خود سے اختراع نہیں کی ہے، صاحب بدائع الصنائع نے لکھی ہے۔ بدائع کی عبارت بھی دیکھ لو، جلد: ۲، ص: ۲۵۸۔

اور جہاں قطع رحمی کا احتمال اس سے بھی کم ہے، وہاں صرف **جمع بین المرأتین** کو حرام کیا گیا ہے، علیحدہ علیحدہ ہر ایک سے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے، مثلاً دو بہنوں کا مسئلہ۔ امید کہ اتنی تفصیل کافی ہوگی۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۴؍ رجب ۱۴۰۶ھ

☆☆☆☆☆

بنام مفتی عبدالرحمٰن صاحب غازی پوری
ومولانا غلام رسول صاحب

مفتی عبد الرحمن صاحب: جامعہ مخزن العلوم دلدارنگر غازی پور کے تعلیم یافتہ! جامعہ مظاہر علوم سہارن پور سے فراغت حاصل کی اور وہیں سے افتاء کی بھی تکمیل کی۔ ایک باصلاحیت عالم دین، ایک خوش اخلاق انسان، چھوٹے بڑے کے یکساں خدمت گزار! عرصہ تک متعدد مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی اور اب ”جدہ“ سعودیہ عربیہ میں مقیم ہیں، اور وہاں بھی تعلیم وتدریس ہی کا شغل ہے۔ ایام حج میں حجاج کی بے نظیر خدمت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم اور اس کی خصوصی رحمت کے مورد ہیں۔

☆☆☆☆☆

مولانا غلام رسول صاحب: یہ بھی جامعہ مخزن العلوم دلدارنگر کے ذی استعداد اور باصلاحیت تعلیم یافتہ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، اور اپنے مادر علمی مخزن العلوم دلدارنگر میں عرصہ تک تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اور اب مغل سرائے میں ایک دینی درسگاہ کے ذمہ دار ہیں۔۔

عزیزان گرامی قدر! زادکم اللّٰہ حرصاً علی الدین

السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم لوگ بخیر وعافیت مدرسہ پہونچ گئے ہوگئے۔ میں شام کو خیرآباد آ گیا تھا، معلوم ہوا کہ کچھ چندہ ہوگیا تھا، مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کتنا ہوا۔ دوسرے روز صبح ساڑھے دس بجے میں مدرسہ پہونچا اور پھر اسی روز تمہارا خط ملا، ابھی ملاقات کی حلاوت وتازگی قلب میں باقی تھی کہ خط نے مزید لطف پیدا کردیا، یہ واقعہ ہے، اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کی محبت، اخلاص اور تعلق خاطر میرے لئے باعث سعادت ونجات اور وجہ مسرت وانبساط ہے، لیکن اس کے ساتھ میں یہ سوچ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے کس قدر کرم فرمایا ہے، کیسی پردہ پوشی فرمائی ہے، کتنی ان کی عنایت ہے، کس درجہ ان کی رحمت ہے، اللہ اکبر! ایک گند در گند شخص جو سرے سے پاؤں تک گناہوں میں شرابور ہے، جو علم وعمل سے تہی دامن ہے، جس میں کوئی ہنر نہیں، کوئی کمال نہیں، کوئی حسن نہیں، کوئی جمال نہیں، وہ جب اپنی پچھلی اور موجودہ زندگی کو دیکھتا ہے تو شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہے، اور جب مستقبل کو دیکھتا ہے تو بجز ایک رحمت الٰہی کے روشنی کی اور کوئی کرن نہیں دیکھتا، حیرت ہوتی ہے کہ صالحین اس سے کس قدر محبت فرماتے ہیں، یقین ہے کہ صالحین کی محبت ہی اس کا بیڑا پار لگا سکتی ہے، ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اپنے گناہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے وجود کے بعض تجربات کی بنا پر خود کو ایسا شخص تصور کرتا ہوں، جس سے خیر وبرکت کی کوئی توقع نہیں۔ البتہ شامت ونحوست جس قدر نہ پھوٹ پڑے، اور اسی کے باعث کہیں آنے جانے سے بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں بنی بنائی برکت میری وجہ سے بکھر نہ جائے، یہ سب لکھنے میں بھی خطرہ خودستائی کا ہے، لیکن تم لوگوں پر اعتماد ہے، تم لوگ

مخلص ومحبّ ہو اور محبوب بھی ہو، اور مجھے تم لوگوں سے قلبی لگاؤ ہے، اس لئے اس وقت جو کچھ ذہن میں آتا جارہا ہے یا جو خیالات وحالات ہر وقت میرے قلب ودماغ پر مسلط رہتے ہیں انھیں بے تکلف سپردِ قلم کرتا چلا جارہا ہوں، نہ ترتیب کا اہتمام ہے نہ غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد میں حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے، مجلس خاموش تھی، ایک صاحب نے کہا کہ کچھ کہئے۔ میں نے کہا کہ کچھ آتا ہی نہیں کیا کہوں۔ اب سے کچھ مدت پہلے میں سمجھتا تھا کہ چند حروف پڑھ لینے کے نتیجے میں کچھ معلومات ہوگئی ہیں، اور انھیں کو دہراتا رہتا تھا، مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ محو ہوگیا ہے، کبھی کبھی مجلس کی خاموشی یا حاضرین کی لغوگوئی سے اکتا کر سوچتا ہوں کہ کچھ کہنا شروع کروں تا کہ کچھ کام کی بات ہو، مگر ذہن کا دروازہ کھولتا ہوں تو گھر خالی پڑا نظر آتا ہے، پھر شرمندہ ہوکر ارادہ بدل دیتا ہوں، ایسا بارہا ہوتا ہے، خیال آتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ علم میں ترقی ہونی چاہئے، مگر یہاں اس کے برعکس قصہ ہے، سخت پریشان اور پشیمان ہوتا ہوں۔ پھر یہ سوچ کر قلب کو ٹھنڈا کر لیتا ہوں کہ جب منظورِ حق یہی ہے کہ تم جہالت میں ترقی کرو تو **اترک ما ارید لما یرید**، یہ تو علمی مفلسی کا عالم ہے، اب شامت اعمال کی سنو!

گذشتہ جمعہ کو ایک جگہ سے واپسی میں کھیتا سرائے اتر گیا تھا۔ ساتھ میں قاری شمیم صاحب بھی تھے، وہاں دوستوں میں ایک صاحب کی لوہے پٹیا کی دکان ہے، ان کے یہاں گئے۔ وہ عرصہ سے اپنی دکان میں بلا رہے تھے اور میں معذرت کر دیتا تھا، حالانکہ تعلقات بہت گہرے ہیں، لیکن میں نے دکان دیکھی تک نہ تھی، قاری صاحب نے ان سے فرمایا کہ لو بھائی، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، مولانا خود آگئے ہیں، ان سے دعا کرالو، میں نے اپنے احوال سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا

کہ مجھ سے دعا کے لئے نہ کہئے، پہلے ایک قصہ سنئے! ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا کرتا تھا، ایک دن اس نے باصرار کہا کہ میرے لئے دعا کر دیجئے، انھوں نے فرمایا کہ آج کل ہماری دعا الٹا اثر کرتی ہے، کیونکہ دن اچھے نہیں ہیں، اور پھر یہ نقل بیان فرمائی کہ ایک مجذوب دلی میں رہا کرتے تھے، اتفاقاً امساکِ باراں ہوا، اور خلق خدا مجتمع ہوکر زار و نالاں قاضی صاحب کے پاس آئی، قاضی ان کو ہمراہ لے کر بادشاہ سلامت کے پاس آیا کہ نمازِ استسقاء پڑھنی چاہئے، بادشاہ نے کہا بہت اچھا، چنانچہ تین دن نماز پڑھی گئی، کچھ موثر نہ ہوئی، بادشاہ نے کہا کسی فقیر کو میرے پاس لاؤ۔ لوگوں نے اسی مجذوب کو پیش کیا، بادشاہ نے ان سے دعا کی التجا کی، مجذوب نے لنگوٹ کھول کے دیا کہ یہ دھولاؤ اور سوکھنے کو ڈال دو، تھوڑی دیر کے بعد بڑے زور وشور سے بارش ہونے لگی، بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے، مجذوب نے کہا آج کل اللہ میاں سے ہمارا بگاڑ ہو رہا ہے، ہم جو بات چاہتے ہیں وہ اس کے خلاف کرتے ہیں، اب ہمارا لنگوٹ سوکھنے نہیں دیں گے، جب خوب مینہ برس لیا تو لوگوں نے لنگوٹ کو آگ پر سکھا دیا، مینہ تھم گیا، بس میاں! ان دنوں ایسا ہی معاملہ ہو رہا ہے، ہماری دعا کا اثر خلاف ہوتا ہے، اس نے کہا حضرت الٹا اثر ہو یا سیدھا، آپ دعا کیجئے، انھوں نے فرمایا اچھا، آج دعا کریں گے، ہنوز جلسہ برخاست نہیں ہوا تھا کہ ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور خبر لایا کہ تمہاری بیوی کنویں میں گر پڑی، حضرت نے فرمایا کہ لو ابھی ہم نے دعا بھی نہیں مانگی وعدہ ہی کیا ہے، وہ یہ سنتے ہی دوڑا، اتنے میں تھانے دار آپہونچا، اس کی بیوی کو کنویں سے نکلوایا اور پوچھا تجھ کو کس نے گرایا تھا اس نے شوہر کا نام لیا، اب وہ ناکردہ گناہ کرنال کی عدالت میں حاضر کیا گیا، لیکن ان بزرگ نے چلتے وقت یہ فرما دیا تھا کہ مقدمہ کی پیشی کے وقت ہمارا تصور کرنا، جب مقدمہ پیش ہوا، انگریز نے عورت سے

بیان لیا، اس نے تین چار دفعہ یہی کہا کہ میرے شوہر نے گرایا، اس وقت اس شخص کو حضرت کا ارشاد یاد آیا، تصور کرنا شروع کیا، عورت خود بخود کہنے لگی کی صاحب ایک اور بڑا ظلم مجھ پر کر رکھا ہے، انگریز نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ میرے سر پر تین ریچھ بٹھا رکھے ہیں، انگریز نے دریافت کیا کہ کہاں ہیں؟ کہا یہ دیکھو میرے بالوں میں پھرتے ہیں، اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ صاحب یہ تو پاگل ہے، غرض اس طرح اس غریب کو رہائی نصیب ہوئی، بیوی کچھ دیر کے بعد ہوش میں آئی تو شوہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ارے کم بخت مجھ کو کچہری میں کیوں لایا ہے، اس نے کہا ظالم تو لائی ہے یا میں؟ پھر وہ وہاں سے ان بزرگ کی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا کہو میاں! ہم تمہارے لئے دعا کریں، کہا کہ حضرت بس میں اپنی دعا سے باز آیا، مجھے بغیر دعا ہی کے یہاں رہنے دیجئے۔

یہ واقعہ سنا کر میں نے عرض کیا کہ وہ تو خیر بزرگ تھے، اور میں کچھ نہیں، تاہم نتیجہ کے لحاظ سے دونوں مشترک ہیں، ایک کے مقامِ ناز وادلال میں ہونے کی وجہ سے، اور دوسرے کے مقامِ عصیان واذلال میں ہونے کی وجہ سے، تاہم نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے، پھر بھی صاحب دکان اصرار کرتے رہے، مگر میں چپکے سے چلا آیا، یہ جمعہ کی بات ہے، دوشنبہ کے دن میں مغرب کے بعد ذکر میں مشغول تھا، وہی صاحب آئے اور ایک طرف بیٹھ گئے، جب میں فارغ ہوا تو انھوں نے سلام ومصافحہ کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ کا خدا کے ساتھ جو معاملہ ہو! مگر میں بہت کمزور ہوں میرے ساتھ وہ معاملہ نہ کیجئے، اس دن سے آج تک کوئی گاہک دکان پر نہیں چڑھا، اور جو آیا الٹے پاؤں لوٹ گیا، میں تو دھک سے رہ گیا۔ میں نے کہا اچھا میں مقبولین سے دعا کے لئے کہوں گا، دوسرے دن قاری شمیم صاحب اور بعض طالب علموں سے کہا، ان لوگوں نے دعائیں کیں اور بحمد اللہ دکان کا بند دروازہ کھل گیا۔ فالحمد للہ

تو صاحب! میرا حالِ زار یہ ہے، معلوم نہیں میری یہ تحریر حق تعالیٰ کو پسند آئے گی یا نہیں؟ بہت ڈرتا ہوں کہ ایک تو نالائق اور پھر نالائقی کا اشتہار! یہ کب زیبا ہے، لیکن جو، کچھ نہ ہو وہ کیا کہے، اور نہ کہے تو کیا کرے۔ تم لوگ میرے محبّ بھی ہو اور محبوب بھی ہو، اور میرے اعتقاد اور حسن ظن میں خدا کے مقبول بھی ہو، کیا عجب تم لوگوں کی محبت میرے کام آجائے، اس لئے میں نے اپنا حالِ تباہ من وعن ظاہر کردیا، شاید تم لوگوں کی دعا ہو، اور پروردگار کو رحم آجائے، اپنی کاہلی، سستی اور آرام پسندی کو دیکھتا ہوں تو بالکل مایوسی کا عالم طاری ہوجاتا ہے، لیکن مایوسی کا انتہا کو پہونچ جانا کفر ہے، رحمت الٰہی دستگیری کرتی ہے اور بہت کچھ امید دلا جاتی ہے، دلاسا دے جاتی ہے، پھر تم لوگوں کی محبت، تم لوگوں کے کلماتِ خیر یاد آجاتے ہین، وہ بھی کسی قدر غلط فہمی پیدا کرکے اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔

بھائی! میں اپنے نفس سے بہت عاجز ہوں، ایسا عاجز کہ کچھ علاج نہیں بن پڑتا، تم لوگوں کے جذبۂ محبت کی بڑی قدر ہے، تم لوگوں کے احوال ماشاء اللہ اچھے ہیں، اب طبیعت میں تقاضا ہے کہ تم لوگوں کی خدمت میں حاضری دینی چاہئے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور علم نافع، عمل صالح، قلب سلیم اور عقل فہیم عنایت فرمائے، اس خط میں اگر کوئی بات نامناسب محسوس ہو تو میری طبیعت کی پراگندگی پر محمول کرکے لائق درگزر سمجھو، مراسلت کا سلسلہ قائم رکھو، مجھے نفع ہوگا۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۷/ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

یہ خط مولانا غلام رسول صاحب اور مفتی عبدالرحمٰن صاحب کو مذکورہ خط کے جواب ملنے کے بعد لکھا گیا۔

محبی ومحبوبی! عافاکم اللہ وإیای محبته ومحبة رسوله

بہت عرصہ کے بعد میرے خط کا جواب ملا، مجھے انتظار تھا، اور اب یہ انتظار یاس میں تبدیل ہو چکا تھا کہ ناگاہ کل مکتوبِ دلنواز باصرہ نواز ہوا، اللہ کا شکر ادا کیا، قلم میں حرکت آئی گونگے کی زبان کھلی تو! ماشاءاللہ خوب لکھا، اچھے انداز سے لکھا، طبیعت خوش ہوگئی۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

میرے خط کے جس حصے پر تمہیں اشکال ہوا ہے وہ میرے حق میں محل اشکال ہرگز نہ تھا۔ مولانا گنگوہیؒ کے حق میں اشکال ہو تو ہو، حالانکہ مجھے تو وہاں بھی اشکال نہیں ہے۔ حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نے مخاطب کی رعایت سے وہ جواب دیا ہے جو تم نے نقل کیا ہے، ورنہ حقیقۃً نہ کوئی اشکال ہے نہ جواب کی ضرورت! اس کی تائید میں حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ سنو! جو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت حکیم الامت سے کسی نے سوال کیا کہ بوستاں میں حضرت ذوالنون مصری کا ایک واقعہ شیخ سعدیؒ نے تحریر کیا ہے کہ ایک بار امساکِ باراں کے موقع پر بہت سے لوگ جمع ہوکر حضرت ذوالنون مصری کی خدمت میں پہونچے اور دعاء کی درخواست کی، حضرت ذوالنون نے جواب دیا کہ بارش کا نزول رحمت ہے اور رحمت کا نزول معاصی کی وجہ سے رکتا ہے، اور یہاں مجھ سے زیادہ کوئی گنہ گار نہیں ہے یہ کہہ کر وہ اس جگہ سے فوراً چلے گئے، ان کا جانا تھا کہ بارش موسلا دھار شروع ہوگئی، اس پر سوال کیا گیا کہ یہ بات کیا واقعہ ہے کہ ان سے بڑا کوئی گنہ گار نہ تھا، اگر نہ تھا تو ان کے جانے سے بارش کیونکر کوئی؟ تو کیا ذوالنون مصری جو اکابر اولیاء میں سے ہیں وہ اتنے بڑے معصیت کار تھے؟ اس پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا کیا عجب! ممکن ہے

ایسا ہی ہو، بس اس پر پوچھنے والا خاموش ہوگیا، نہ حضرت نے اس کی کوئی وضاحت فرمائی اور نہ کسی نے دریافت کیا، اوراس سے زیادہ حیرت انگیز وہ قصہ ہے کہ چندلوگ کشتی سے سمندر پار کررہے تھے کہ اچانک دریا میں طغیانی آگئی اور لگی کشتی ہچکولے کھانے ، لوگوں نے کہا اس میں کوئی خطا کار عبد آبق (بھگوڑا غلام) ہے، اسی کی نحوست کی وجہ سے کشتی کا یہ حال ہورہا ہے۔ اس میں ایک بزرگ بھی بیٹھے تھے، انھوں نے کہا کہ وہ خطا کار میں ہی ہوں، مجھے سپرد دریا کردو، ان کی بزرگانہ صورت دیکھ کر کسی کو یقین نہ آرہا تھا، قرعہ اندازی پر فیصلہ ٹھہرا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جب قرعہ ڈالا گیا تو انھیں بزرگ کے نام پر پڑا، بالآخر انہی کو غرق دریا کرنے کا فیصلہ کردیا گیا، ادھر وہ دریا میں کودے اور ادھر اس کا جوش وخروش تھما، اور ایک بڑی مچھلی انھیں نگل کر قعر دریا میں بیٹھ گئی، بھلا بتاؤ! یہاں کیا کہو گے۔

اب مجھ دیوانے کی سنو! کہ وہ بات محل اشکال کیوں نہیں ہے۔ اس کی ایک تقریر مصطلحانہ ہے جسے چاہو تو عالمانہ کہہ لو، اور دوسری تقریر متصوفانہ ہے جسے چاہو تو عارفانہ کہہ سکتے ہو، لیکن میری سمجھ ہی کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو، اگر ایسا ہو تو امیدوار ہوں کہ اصلاح کردو گے۔ بات یہ ہے کہ حسن ظن ہو یا اعتقاد، محبت ہو یا عداوت، یقین ہو یا شک، یہ قلبی جذبات ہیں لیکن ان جذبات کے ظہور کا سب سے آسان اور سہل ذریعہ الفاظ ہیں، جن الفاظ وکلمات سے ان جذبات کا اظہار ہوتا ہے وہ صورۃً گو خبر ہوتے ہیں مگر حقیقۃً انشا ہوتے ہیں۔ دیکھو افعال تعجب درحقیقت افعالِ تحسین ہیں، صورۃً خبر ہیں مگر فی الحقیقت انشا ہیں، ایسے الفاظ وکلمات میں واقعہ کچھ نہیں ہوتا، یہ خود واقعہ ہوتے ہیں، اس لئے تصدیق وتکذیب سے برکنار ہوتے ہیں، تصدیق وتکذیب کا مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی واقعہ کی حکایت ہو، اور

یہاں جذبات واعتقادات ہیں جن کی ترجمانی ان الفاظ سے ہوتی ہے جیسے امر و نہی ہیں کہ اول ان کا انبعاث قلب میں ہوتا ہے، پھر اسی انبعاث کو **إفعل** یا **لاتفعل** کے پیکر میں ادا کیا جاتا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا اپنے بارے میں میرا یہی یقین کامل ہے، اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا، اپنا ایک اعتقاد ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر اتر آیا۔ اس پر یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ یہ واقعہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ دوسرے اعتبارات سے اسے غلط تو کہہ سکتے ہو مگر خلافِ واقعہ نہیں کہہ سکتے اور کسی کو جو کسی کے متعلق اعتقاد و خلوص ہے تو یہ بھی اس کے دل کا ایک جذبہ ہے جو کسی لحاظ سے غلط ہو تو ہو مگر صدق و کذب سے اس کا تعلق نہیں۔ دیکھو ایک ہی عورت ہے اسے مجنوں نے دیکھا تو سارے جہاں سے خوبصورت اور سراپا حسن و جمال گردانا، دوسروں نے دیکھا تو مثل لیل سمجھا، اب اس میں کس کو جھوٹا اور کس کو سچا سمجھو گے، اور دیکھو حضور سرور کائنات ﷺ کے بارے میں ساری امت کا اعتقاد ہے کہ وہ قطعاً معصوم ہیں، صغائر سے بھی کبائر سے بھی، اور دیکھو خود کیا فرماتے ہیں: ’’**أنا المذنب الذليل البائس الفقير**‘‘ مناجات مقبول اٹھا کر دیکھو اور اس سے بڑھ کر دیکھو، بڑے میاں بھی فرماتے ہیں: **ليغفر الله لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر**، انھوں نے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے گناہوں کی معافی کا اعلان کیا، پھر بھی امت یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ آپ سے گناہوں کا صدور ہوا ہی نہیں، اس کی تاویل جو چاہو کر لو، مگر کون سی کتنی جی لگتی ہے، اسے تم سمجھ سکتے ہو۔ اصل میں دل کے جذبات حکایت و واقعہ سے بے نیاز ہیں، یہ کچھ اور ہی چیزیں ہیں، سچ پوچھو تو یہ خبر و حکایت کے سانچے میں ڈھلتے ہی نہیں، اب میں کس طرح عرض کروں کہ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ روزِ روشن کی طرح مجھ پر عیاں ہے، جس کا علم ضروری مجھے حاصل ہے، اور رہا کمالاتِ

متوقعہ کے لحاظ سے کمالاتِ موجودہ کی نفی، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، کمالات متوقعہ وہاں ہوتے ہیں جہاں استعداد و صلاحیت ہو، اور جہاں ماضی و مستقبل دونوں جانب اندھیرا ہو، کمالات موجودہ ہی کے لالے پڑے ہوں، صلاحیت و استعداد ہی کا فقدان ہو وہاں کمالاتِ متوقعہ کا کیا سراغ۔ حضرت گنگوہیؒ کے بارے میں یہ بات جتنی بھی درست ہو، میرے باب میں تو بالکل نادرست ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ جو کچھ تم لوگوں کا اعتقاد ہے، یہ تمہارا ایک جذبۂ دل ہے جسے میں غلط نہیں کہہ سکتا اور نہ صحیح قرار دے سکتا۔ ہاں تم لوگوں کی ذرہ نوازی، وسعت ظرف، حسن اعتقاد، مہربانی اور عنایت کہہ سکتا ہوں، اور اس کے لئے کسی واقعہ کی ضرورت نہیں، ایک دن کے بچے میں کون سا کمال ہے لیکن ایک شخص اسے دیکھتا ہے اور محبت و الفت سے اس کا قلب لبریز ہو جاتا ہے، دوسرا دیکھتا ہے تو نفرت سے مونھہ پھیر لیتا ہے، یہی حال نفس کا ہے، میں دیکھتا ہوں تو گھن آنے لگتی ہے، تم دیکھتے ہو تو پیار آ جاتا ہے، خدا معلوم اپنے دل کی بات سمجھا پا رہا ہوں یا نہیں، کئی اشکالات مجھے ہو رہے ہیں اور ان کے جوابات کا جلوہ بھی دیکھ رہا ہوں، مگر تحریر طویل ہوتی جا رہی ہے، اور بال کی کھال نکلتی چلی آئے گی، اس لئے گھبرا رہا ہوں۔ اجمال ہی اس باب میں مناسب ہے۔

جس تقریر کو میں عارفانہ کہہ چکا ہوں، اسے لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی کیونکہ وہ نہ میرے منہ پر پھبتی اور نہ قلم پر کھلتی، کیونکہ وہ حال میرا ہے نہیں، پھر لکھوں تو غلط فہمی کا اندیشہ ہے، وہ صرف میرا مطالعہ ہے اور بس۔ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا ہوں اسے ذکر کر کے، اور اور ایسا بہت ہوتا ہے، از راہِ کم اندیشی ایک بات زبان یا قلم پر آتی ہے اور جب اس کے پس و پیش پر نگاہ پڑتی ہے تو حیرانی ہوتی ہے کہ کہوں تو کیونکر کہوں اور نہ کہوں تو کیونکر ٹالوں، لیکن تم لوگ محبّ ہو، محبوب ہو، کوئی بات تم لوگوں سے اٹھا رکھنی

آدابِ محبت کے خلاف ہے، اس لئے لکھتا ہوں، تاثر و اعتقاد کا تمھیں اختیار ہے جو چاہو قائم کرو۔

بات یہ ہے کہ ساری کائنات بشمولیت انسان کے مکمل عدم اور نابود ہے، کائنات کی اصل حقیقت عدم اور نیستی ہے، وجود تو صرف خدا کا ہے، انھیں اعدام پر اپنے وجود کا پرتو ڈال دیا ہے تو کائنات جاگ اٹھی، ورنہ کون یہاں اپنا ذاتی وجود رکھتا ہے، یہ تمام موجودات نشو ونما پا رہے ہیں حق تعالیٰ کے وجودِ مطلق کے سائے میں! زمین و آسمان اور ساری کائنات کا وجود ہی کیا ہے یہ تو بالکل بدیہی بات ہے، اب ایک بات اور سنو! دنیا میں جتنا خیر و کمال ہے سب وجود کا مرہون منت ہے، اگر وجود ہی نہ ہو تو کیسا خیر اور کیسا کمال، جس کا وجود جتنا قوی ہوتا ہے اسی کے بقدر اس میں کمالات پیدا ہوتے ہیں، سورج کا وجود دیکھو اور چراغ کا وجود دیکھو، اور جانتے ہو کہ وجود ایک کلی مشکک ہے، وجود کے قوت و ضعف کے اعتبار سے اس کے آثار کے ظہور میں تفاوت ہوتا ہے، یہ مقدمہ بھی بدیہی ہے، پھر خیال کرو کہ وجود تو حقیقۃً صرف خدا کا ہے اور اشیاء جو موجود ہیں یہ اپنی اصل کے لحاظ سے عدم محض ہیں، اسی عدم کی سیاہی پر وجودِ الٰہی کی روشنی پڑی تو یہ جگمگا اٹھیں۔ اب سنو! کہ منجملہ موجودات کے ہماری اور تمہاری ذات بھی ہے، اور یہ بھی عدم محض ہیں، وجود خدا کا عطیہ ہے جو انھیں کی جانب راجع ہے، اور کمالات جتنے ہیں وہ سب اسی وجود سے ناشی ہیں، لہٰذا تمام کمالات بھی انھیں کی جناب میں حاضر ہیں اب اپنے پاس بچا کیا؟ عدم محض، اور اس کے آثار و علامات یعنی شرور و نقائص، عامۃ الناس تو اس عدم اور وجود کے درمیان امتیاز نہیں کر پاتے گو کہ امتیاز کی نشانیاں ہمہ وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں تاہم انسان وجود کی لذت و سرمستی میں ایسا کھویا رہتا ہے کہ اسے عدم کا پہلو نظر ہی نہیں آتا لیکن جن لوگوں کو اپنی

اور ربِّ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے ان کے سامنے یہ امتیاز ہمہ وقت رہتا ہے، ان کی نگاہ اس عدم اور وجود کے خطِ فاصل کو ہمہ وقت دیکھتی رہتی ہے، اس بناء پر اپنی ذات سے جس قدر خیر وکمال کا ظہور انھیں محسوس ہوتا ہے، وہ بداہۃً اسے حق تعالیٰ کی جناب سے دیکھتے ہیں، اور جس قدر شرور وفتن نظر آتا ہے، اس کا منبع خود ان کی ذات ہوتی ہے، اس لحاظ سے وہ ہمہ وقت خجل اور عرق آلود رہتے ہیں، انھیں کسی خیر وکمال کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، چہ جائیکہ اس کو اپنی جانب منسوب کریں، کمالات کو کسی بھی درجہ میں وہ اپنی ذات کے ساتھ وابستہ دیکھنے کی تاب نہیں لاتے، ایسا کرنا ان کے نزدیک شرک کے درجے کا گناہ ہے، وہ بداہۃً محسوس کرتے ہیں اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں کوئی خیر، کوئی کمال اور کوئی صلاحیت نہیں دیکھتے جس کو دوسرے لوگ کمالات سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ جمالِ خداوندی اور کمالِ الٰہی کا پرتو ہے اور ہونا یہی چاہئے۔ آخر ساری کائنات جب عبد ٹھیری جو سراپا عجز و نیاز کا نام ہے تو اس میں بجز عاجزی اور ضعف واضمحلال بلکہ عدم اور فنا کے کیا نظر آئے، وجود تو صرف ایک ذاتِ بے بہا کا ہے، باقی سب ہیچ در ہیچ ہے۔ اس نکتہ کو پالینے کے بعد حضرت ذوالنون کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کا عقدہ بھی حل ہوجاتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ بارش جو ہوئی وہ اس لئے نہیں کہ خدانخواستہ حضرت ذوالنون تمام لوگوں سے بڑھ کر گنہگار تھے۔ یا دریا کا طوفان جو تھا تو خدانخواستہ حضرت یونس علیہ السلام گنہگار تھے، نہیں ! ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان حضرات کو اپنے اپنے رتبے اور استعداد کے لحاظ سے معرفت کا آخری درجہ حاصل تھا، اور معرفت الٰہی ہی مقصود تخلیق ہے، چنانچہ **وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون** میں **ليعبدون** کی تفسیر ترجمان القرآن

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے **لیعرفون** منقول ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عبادت کے تمام درجات معرفت ہی پر موقوف ہیں، معرفت جتنی اعلیٰ ہوگی عبادت بھی اتنی ہی پُر مغز ہوگی، اور جس قدر معرفت میں نقص ہوگا عبادت بھی ناقص ہوگی، تو چونکہ ان حضرات کو معرفت نفس اور معرفت ربّ بدرجۂ کمال حاصل تھی اور اس کا ظہور ان دونوں خاص واقعات میں علی وجہ الاتم ہو رہا ہے، پس اس مظہر معرفت پر رحمت ربّ کو پیار آ گیا، ان دونوں حضرات کے درجات بڑھے، مزید راہیں کھلیں اور دوسرے لوگ ظاہری فیضانِ رحمت سے فیضیاب ہوئے، خدانخواستہ یہ بات نہ تھی کہ یہ بہت گنہگار تھے، معرفت الٰہی کے وفور نے ان پر یہ حال طاری کر رکھا تھا، جو عبدیت کا اعلیٰ مظہر ہے، اور خدا جو ہر بالا سے بالاتر ہے اس کو وہ شخص بہت پسند ہے جو پستی کی انتہا کو پہونچا ہوا ہو، **أنا عند المنكسرة قلوبهم** میں اس کا راز دیکھو، اور غالباً یہی وہ حقیقت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے **أنا المذنب الذليل** کہلوا رہی ہے، اور **ليغفر لك الله** میں بھی اسی سے درگذر کا اعلان ہے، پس اب یہ حقیقت خوب واضح ہوگئی کہ حضرت گنگوہیؒ نے جو نہایت شد و مد کے ساتھ اپنے کمالات کی نفی فرمائی وہ بلحاظ اپنی ذات اور حقیقت کے ہے اور بالکل حق ہے، اور ہم جو اعتقاد رکھتے ہیں تو وہ بلحاظ اس کے ہے کہ حق تعالیٰ کی موہبت اور بخشش کا ظہور اسی عدم محض کے آئینہ میں ہو رہا ہے، آخر اس ظہور کو ہم کس کی جانب منسوب کریں، ان کے سامنے حق تعالیٰ جل شانہٗ کی عظمت، ان کا جلال اور ان کی کبریائی ہے، انھیں حیا آتی ہے کہ ادھر کے عطیے کو اپنی ذات کے ساتھ منسوب کریں اور ہم چونکہ ان عطیوں کو اسی دائرۂ ذات میں دیکھ رہے ہیں اس لئے ہم اور کہاں لے جائیں، اب دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ لیکن یہ بات چونکہ عام عقول واذہان کے بس کی نہیں ہے، اس لئے برملا اس کا اظہار

مناسب نہیں ہے، میں بھی یہ بات ہرگز نہ کہتا لیکن تم نے ایک بات چھیڑ دی اور ماشاء اللہ صاحب فہم ہو، تم لوگوں سے کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے لکھ دیا۔ خدا کرے یہ بات صحیح ہو اور میں اس کے بیان پر قادر بھی ہو سکا ہوں۔ اگر سمجھ میں آ جائے اور تم دونوں تصدیق کردو تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی، اور اگر غلطی محسوس ہو تو اس کی نشاندہی کر کے واپس کردو، میری عقل ہی کیا اور میری سمجھ ہی کس درجہ کی ہے، غلطی ہو تو عین میری فطرت، درستگی ہو تو بس پروردگار کا عطیہ!

میں اپنے ناقص خیال میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوسری تقریر زیادہ صاف ہے، پہلی تقریر کج مج ہے، اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے، بالخصوص خط کشیدہ عبارت قابل تشریح ہے، کبھی طبیعت حاضر ہوئی تو اسے پھر لکھوں گا، اور اس کی مزید وضاحت کروں گا، ان شاء اللہ

یہ خط تم دونوں دوستوں کے لئے ہے، چند جملے لکھ کر بھیج دیتے تو مجھے تسکین ہو جاتی۔ بقیہ سب خیریت ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

بنام مولانا گلاب حسین صاحبؒ

ایک بہت ذی استعداد اور شریف النفس عالم جو صحت کی خرابی کی وجہ سے ادھیڑ ہونے سے پہلے ہی بوڑھے ہوگئے تھے۔ میرے محترم دوست قاری شمیم احمد صاحب کے واسطہ سے تعارف ہوا، اور غالباً ۱۹۹۱/۹۲ء میں ضلع بستی کے اس مدرسہ میں میری حاضری ہوئی تھی جس میں یہ مدرس تھے، تو باوجودیکہ میرے ہم عمر تھے انتہائی بوڑھے آدمی محسوس ہوئے اور شاید دو تین سال کے بعد انتقال ہوگیا۔

مکرم ومحترم جناب مولانا گلاب حسین صاحب!

السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته

مزاجِ گرامی!

آپ نے جس مسئلے کا تذکرہ وہاں کیا تھا، وہ میرے ذہن میں چکر لگاتا رہا۔ یہاں آ کر میں نے شرح وقایہ دیکھی، مسئلہ کی جو صورت آپ بتا رہے تھے وہ تو نہیں، ایک دوسری صورت اس میں ملی اور اس میں اقل مدتِ حمل کو مدارِ مسئلہ قرار دیا ہے، میرے خیال میں مسئلہ یہی ہے جو بیان کرنے والے کے قصورِ فہم کی وجہ سے دوسری صورت اختیار کر گیا۔ یہ مسئلہ باب النسب والحضانت کا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مطلقۂ مراہقہ خواہ بائنہ ہو یا رجعیہ اگر طلاق کے نو ماہ سے قبل بچہ جنتی ہے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مولود ثابت النسب ہوگا، کیونکہ تین ماہ عدت کے ہیں اور اقل مدت حمل چھ ماہ ہے، تو اگر عدت پوری ہونے کے بعد علوق تسلیم کیا جائے تو چھ ماہ سے قبل کا تولد لازم آئے گا، اس لئے ضروری ہے کہ علوق یا تو حالت نکاح کا مانا جائے یا دورانِ عدت کا، اور علوق ان ہر دو صورتوں میں مثبت نسب ہوتا ہے، مطلقہ رجعیہ میں نکاح کی وجہ سے اور مطلقہ بائنہ میں وطی بالشبہہ کی وجہ سے، اور اگر نو ماہ کے بعد بچہ ہو تو طرفین کے نزدیک بچہ ثابت النسب نہ ہوگا، کیونکہ تین ماہ نابالغہ کی عدت کے لئے شرعاً متعین ہے، اور نابالغہ ہونے کی وجہ سے علوق کا احتمال نہ تھا، انقضاء عدت کے چھ ماہ پر بچہ پیدا ہو رہا ہے، اس لئے یہی احتمال متعین ہے کہ علوق تین ماہ کے بعد ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہی صورت اگر بالغہ میں پیش آئے تو فقہاء نے اکثر مدت حمل کا اعتبار کیا ہے، یعنی دو سال تک میں بچہ پیدا ہوا تو ثابت النسب ہوگا، اور یہاں اقل مدتِ حمل کا اعتبار کیا ہے، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ شبۂ وطی سے نسب ثابت ہوتا ہے، شبہۃ الشبہۃ کا شریعت نے اعتبار نہیں کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ

ہے کہ بالغہ سے اگر زمانۂ نکاح یا زمانۂ عدت میں وطی حقیقۃً ثابت ہوتو بلا شبہ نسب ثابت ہوگا۔ موجودہ صورت میں جبکہ بالغہ طلاق کے بعد دوسال کے اندر بچہ جنتی ہے اور شوہر کی جانب سے اس کا اثبات نہیں ہے بلکہ شبہ وطی کی بنیاد پر ہے، اس کے برخلاف نابالغۂ مراہقہ میں حقیقت وطی ہی مثبت نسب نہیں ہے، کیونکہ نابالغی متیقن ہے اور بلوغ محتمل، پھر اس احتمال کی بنیاد پر نسب کا جو اثبات ہوگا وہ ظاہر ہے کہ شبہ کی بنا پر ہی ہوسکتا ہے، اندریں صورت جبکہ مدت کے انقطاع کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوگا، تو حالت عدت میں نابالغی متیقن ہے، اب حمل کو اقرب اوقات کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ ایک امر حادث ہے، اب اگر نسب کا اعتبار کیا جائے تو شبہۃ الشبہۃ کا اعتبار لازم آئے گا۔ عبارت یہ ہے:

يثبت نسب ولد مطلقة مراهقة أتت بولد لأقل من تسعة أشهر من وقت الطلاق . وإنما أعتبر تسعة أشهر لأن ثلٰثة أشهر مدة عدتها وستة أشهر أقل مدة الحمل . واكثر مدة الحمل فى البالغة لأن النسب يثبت بالشبهة ففى البالغه شبهة الوطى زمان النكاح أس العدة ثابتة وحقيقة الوطى فى أحد هٰذين الزمانين توجب ثبوت النسب فكذا شبهته وأما فى المراهقة فشبهة الوطى فى النكاح أو العدة وهى ثلٰثة أشهر ثابتة ثم حقيقة الوطى فى أحد هٰذين الزمانين لايوجب ثبوت النسب لعدم تحقق البلوغ فالبلوغ وهو أمر حادث يضاف إلىٰ أقرب الاوقات وهو ستة أشهر إلىٰ وقت الولادة۔ (شرح وقایہ ج:۲/ باب النسب والحضانۃ)

یہ تو مسئلہ کی گفتگو ہوئی۔ اتنی مخاطبت کے بعد طبیعت میں کچھ بے تکلفی کا احساس ہونے لگا ہے، اس لئے اور چند باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کا تذکرہ اکثر قاری شمیم صاحب کرتے رہتے ہیں، آپ کی ذہانت، آپ کی لیاقت وسنجیدگی کے وہ بہت

معترف ہیں، اور قاری صاحب جس کسی کی توصیف کرتے ہیں میرے دل میں خود بخود اس کی محبت وعظمت پیدا ہو جاتی ہے، آپ سے ملاقات کے بعد بحمد اللہ اس محبت وعظمت میں اضافہ ہوا، جی میں یہ بات آتی ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کو متعدد صلاحیتوں سے نوازا ہے تو ان صلاحیتوں کا بروز وظہور بھی ہونا چاہئے۔ یہی درحقیقت نعمت کا شکریہ ہے، اور ظاہر ہے کہ مخفی صلاحیتوں کے استعمال کے مواقع جب تک میسر نہیں آتے ان کا ظہور نہیں ہوتا، اور جب عرصۂ دراز تک یہ صلاحیتیں ظہور نہیں کرتیں تو ان پر مردنی چھا جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جہاں آپ ہیں وہاں یہ استعدادیں لاریب کہ سوئی رہیں گی، کیونکہ مواقع استعمال میسر نہیں۔ ہاں اگر آپ یہ عزم کریں اور اس کے اسباب مہیا کرنے کی پوری سعی فرمائیں کہ مدرسہ کو آگے ترقی دینا ہے، اس کے لئے جدوجہد کریں تو امکان ہے، ورنہ مناسب تو یہ تھا کہ خود کو کسی ایسی جگہ مامور کرتے جہاں اس کے مواقع پہلے سے مہیا ہوں۔ قاری صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نہ جانے کیا سوچتے ہیں، اگر آپ کا یہ طبعی انکسار ہے تو بہت محمود ہے، تاہم اس کے استعمال کا یہ انداز کہ استعدادیں مخفی رہ جائیں، یہ مناسب نہیں ہے، اس وقت دین اور علم دین اور روحِ دین کی خدمت کی جس پیمانے پر حاجت ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے، ہر اس شخص پر جو کسی بھی درجہ میں دین کی خدمت کرسکتا ہے اس دور میں ضروری ہے کہ اپنی تمام توانائیاں اس راہ میں صرف کردے۔ آپ سے تعلق چونکہ ملاقات سے پہلے سے ہے اور ملاقات کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوا۔ اس لئے یہ چند باتیں معرضِ تحریر میں آگئیں، امید ہے کہ ناگوارِ خاطر نہ ہوں گی۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

◉◉◉◉◉

بنام عبدالخالق صاحب مبارک پور

مبارک پور کا بدنام منکر حدیث، کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شائق وحریص مگر اس سے نفع حاصل کرنے کے بجائے نقصان اٹھانے والا، ذہانت کا پُتلا مگر ایسی ذہانت جو غلط راہوں پر بھٹک گئی۔ انھوں نے اپنا حاصل مطالعہ ابتداءً ’’ردایصال ثواب‘‘ کے نام سے تحریر کیا تھا، جس میں اہل سنت کی تمام جماعتوں اور ان کے علماء کے خلاف بغاوت کا ہلّہ بول دیا۔ خاکسار نے اس کا جواب لکھا، (یہ رسالہ ’’مسئلہ ایصال ثواب اور ایک ذہنی طغیان کا احتساب‘‘ کے نام سے شائع ہوا) پھر دوسری کتاب انھوں نے ’’رد ایصال ثواب اور قرآن‘‘ کے نام سے لکھی، اسی سلسلہ کے یہ خطوط ہیں۔

عبدالخالق صاحب! السلام علیکم

میں ۱۴/ ذی الحجہ کو مبارکپور گیا تھا۔ دو کام کی غرض سے، ایک تو بعض اعزہ سے ملاقات مقصود تھی، اور دوسرے آپ کی تازہ تالیف حاصل کرنی تھی اور اس کے اثرات قصبہ میں معلوم کرنے تھے۔ پہلی غرض سے آپ کا تعلق کچھ نہیں، ہاں دوسری غرض کے متعلق کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

چند ہفتے پہلے آپ کا ایک خط مجھے ملا تھا، اس کی رسید آپ کو مل چکی ہوگی، اس میں آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ قلم میں روشنائی بھر لو، تا کہ تالیف جدید کے آتے ہی اس کا احتساب شروع ہو جائے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کتاب میں آپ نے کون سے

تیر مارے ہیں، اور یہ کہ مبارکپور میں آپ کے اور اس کتاب کے اثرات کیا ہیں؟ چنانچہ میں نے مبارکپور پہونچ کر آپ کے اثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس سے پہلے آپ مبارکپور میں خواہ کتنے ہی وقیع اور مؤثر رہے ہوں، مگر اس وقت کوئی آپ کا نام لینا اور سننا پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے قلوب کو جس انداز میں آپ نے مجروح کیا ہے، اس کی پاداش میں آپ کا دامن عزت پارہ پارہ ہو چکا ہے، لوگ اہل حق کے بھی مخالف ہوتے ہیں، لیکن ان کی عظمت و وقعت قلوب سے زائل نہیں ہوتی، اہل حق کی سچائی، دیانت اور خلوص کا اعتراف کبھی ڈھکے چھپے، اور کبھی علانیہ مخالفین کی زبان و دل سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ سنت نبوی ہے، کفارِ مکہ آپ کے مخالف تھے، مگر آپ کی عظمتوں کا اعتراف کرتے تھے، آج بھی کفار و مشرکین کا یہی حال ہے کہ گو آپ کے مخالف ہیں لیکن قلم اور زبان دونوں سے آپ کی اخلاقی اور علمی برتری کے معترف و مداح ہیں، اہل حق کی اس ریت کے خلاف، آپ کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی حالت کی کوئی اہمیت وعظمت قلوب میں، میں نے نہیں پائی، بلکہ شدید قسم کے انکار واستکراہ اور تحقیر وتنفر کی کیفیت سے آپ دوچار ہیں، اور صرف آپ ہی نہیں، آپ کے حواریین بھی، کسی ایک فرد نے بھی گواہی نہیں دی کہ آپ یا آپ کے جرگہ کے لوگ دینی وانسانی قدروں کی بنیاد پر کسی بھی درجہ میں عظمت واہمیت کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق میں ایک عظمت وجلال اور وقعت وکمال کی کیفیت کا پایا جانا ضروری ہے، اس ضرورت پر عقل ونقل اور تاریخ ومشاہدہ سب شاہد ہیں، مگر آپ کے یہاں نہ اس ہیبت وجلال کا کچھ پتہ ہے، اور وقعت وکمال کا کچھ سراغ!

قرآن کا مطالعہ بھی آپ کو بتائے گا کہ اہل حق کے مخالف گو ابتداء میں بہت ہوئے ہیں، مگر اس مخالفت کے باوجود انھیں کی زبانیں ان کے امانت ودیانت اور

صداقت وصلاحیت کے ساتھ متصف ہونے کا اقرار بھی کرتی ہیں، لیکن آپ کا حال تو یہ ہے کہ کئی لوگوں سے کہا کہ آپ کی کتاب لاکر مجھے دیں تو محض اتنی بات پر مجھے بھی ان کی ملامتوں کا نشانہ بننا پڑا، کسی سے کہا کہ آپ کے گھر کا راستہ بتادو تو اس کے لئے بھی محض دور کے اشارہ پر اکتفا کیا گیا۔

میں سمجھ گیا کہ آپ کی گستاخیوں اور بدزبانیوں کی وجہ سے حق تعالیٰ نے آپ کی وقعت قلوب سے نکال دی ہے، ورنہ حق پرست مخالفت کی فضا میں بھی ذلیل نہیں ہوا کرتا۔ آپ یاد رکھئے کہ آپ جسے حق کہہ رہے ہیں محض اسے نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ اس شخص کو بھی دیکھا جائے گا جس نے وہ حق پیش کیا ہے، ورنہ صورت کے لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا اور ساحروں کے جادو میں کوئی فرق نہ تھا، لیکن فرق دونوں طرف کی شخصیتوں اور ان سے صادر ہونے والے افعال میں تھا، موسیٰ کے معجزہ پر حق کا جلال نمایاں تھا، اور ساحروں کے سحر پر باطل کی ذلت عیاں!

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نہایت بلند بانگ دعووں کے ساتھ حق کی نمائندگی کا دعویٰ کررہے ہیں اور حالت یہ ہے کہ آپ مع اپنے جرگہ کے سخت ترین ذلیل حرکات میں مبتلا ہیں، جھوٹ، فریب، بدزبانی، بداخلاقی، ایذارسانی، سب وشتم، غرض ڈھیر کے ڈھیر اخلاقی جرائم میں مبتلا ہیں، اور اس کی شہادت آپ کے قصبہ والوں نے دی، ظاہر ہے کہ جس حق کو آپ پیش کررہے ہیں اگر اس کے اثرات ونتائج یہی ہیں، جن کا ظہور ہورہا ہے تو ہم سمجھ گئے کہ یہ حق نہیں باطل ہے، درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، آپ کے شجرۂ حق میں کیسے پھل آرہے ہیں، کبھی اس پر غور کیا۔ تلخ وبدمزہ، بس تو درخت کا بھی حال یہی ہے، اگر آپ کو لوگوں کی شہادت کا اعتبار نہیں تو خود اپنے اور اپنے جرگہ کے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے، کیا آپ کا وِجدان شہادت دے گا کہ

آپ اور آپ کی ٹولی والے حق و دیانت کے ساتھ متصف ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ کا وِجدان اسی حالت میں آپ کو اور آپ کے حواریین کو مقرب بارگاہِ خداوندی محسوس کر رہا ہے، تو قرآن کے مسلمات کو توڑنا پڑے گا، کیونکہ آپ لوگوں کے درمیان سے فرائض غائب، اور منہیاتِ قرآنیہ کھلم کھلا موجود ہیں۔ اگر اس کے باوجود آپ اعلیٰ درجہ کے دیندار اور متبع قرآن ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ فسّاق و فجار کا وجود کہاں ہے؟ آپ تو کہہ دیں گے کہ ''ایصالِ ثوابی'' پاپی ہیں۔ لیکن کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے۔

بہر کیف اگر آپ کا مطالعۂ حق اور نمائندگیٔ صداقت، آپ لوگوں کی دینی و اخلاقی حالت سدھار نہیں سکتی تو وہ حق و صداقت آپ ہی کو مبارک ہو، حق تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کے سایہ سے بچائے۔

اور سنیے! آپ ہمیں کچھ نہ کہئے گا، کیونکہ ہم تو ہزار سال سے زیادہ سے گمراہی اور بدعقیدگی میں مبتلا ہیں۔ ہم سے آپ کا یہ مطالبہ بے جا ہوگا کہ تم بھی اپنے اخلاق و دیانت کا ثبوت پیش کرو، آپ چونکہ مدعیٔ حق ہیں اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں اور اگلے پچھلے سب کو غلط کار اور بدفہم قرار دے رہے ہیں، اس لئے ہم آپ کی ہر حالت کو پرکھیں گے، آخر عقیدۂ و عمل کی جو ڈگر ایک ہزار سال سے متعین ہے، اس کو آپ کے ارشادات کی وجہ سے ہم یکلخت تو چھوڑ نہیں دیں گے، پہلے آپ کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھیں گے، بازار میں آدمی ایک روپیہ کی ہانڈی خریدتا ہے تو خوب ٹھونکتا ہے کہ اس کا عیب و ہنر کھل جائے، پھر یہاں تو عقیدہ جیسی قیمتی چیز ہے، ایک ہزار سال سے زیادہ پرانا عقیدہ محض اس لئے کیونکر ترک کر دیں کہ عبدالخالق صاحب نے اسے غلط کہہ دیا ہے، ہم آپ کا علم دیکھیں گے، آپ کا عمل دیکھیں گے، آپ کی

دیانت دیکھیں گے، آپ کا مزاج دیکھیں گے، آپ کی زبان دیکھیں گے، آپ کا رہن سہن دیکھیں گے، آپ کا طور طریقہ دیکھیں گے، آپ کے معاملات دیکھیں گے، آپ کے پڑوسیوں سے آپ کا مزاج دریافت کریں گے، آپ کی معاشرت کا پتہ لگائیں گے، آپ کے اہل مجلس کو دیکھیں گے، پرکھیں گے، پرکھائیں گے، جب اعتماد پیدا ہوگا کہ آپ کے اندر واقعی اصلاح کا جذبہ ہے، دین کا درد ہے، ہدایت کا شوق ہے، رضاءِ الٰہی کے حصول کا ولولہ ہے، اور اسی رنگ میں آپ کے اہل مجلس بھی رنگے ہوئے ہیں، ہر ایک فرد دینداری و پاکبازی کا اپنی اپنی استعداد کے بقدر نمونہ ہے، معصوم ہونے کی بات نہیں کرتا، زندگی کے مسائل و معاملات میں دیانت داری و پاکبازی، صداقت و امانت کے غلبہ کی بات کر رہا ہوں، جب یہ چیزیں دیکھ لیں گے جب کہیں جا کر اپنے قدیم عقیدے سے دستبردار ہو کر آپ کے ساتھ ہوں گے۔

آپ ایک نہیں قرآن کی ہزار آیت کا ترجمہ کہیں سے نقل کر دیجئے، اس سے کیا ہوتا ہے، ہم تو یہ دیکھیں گے کہ آپ نے کچھ سمجھا بھی ہے یا یونہی جھک مار رہے ہیں، ان سب معیاروں پر آپ کا پورا اترنا تو درکنار ان کے کسی درجہ تک آپ کی رسائی نہیں، علم کی حالت تو یہ ہے کہ قرآن کی زبان ہی سے آپ ناواقف! بھلا جو قانون کی زبان تک نہ جانتا ہو، اس کی علمی حالت پر کون اعتماد کر سکتا ہے، عمل کی اور باقی چیزوں کی جو کیفیت ہے، وہ سب اہل مبارکپور جانتے ہیں۔ اس لئے ہم ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ قرآنی آیات کے اَن گنت ترجمے درج کر کے ان سے جو نتائج آپ نے نکالے ہیں، وہ من وعن صحیح ہیں، آپ ان کا مفہوم غلط سمجھے، پھر خواہ مخواہ دعوت دے رہے ہیں کہ میرے غلط معنی و مطلب کو کلامِ الٰہی سمجھ کر اس پر ایمان لاؤ، آپ کی غلطیاں میں اپنی کتاب میں واضح کر چکا ہوں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آپ کے اَثرات سے مبارک پور ...... آپ کی بہت معمولی ٹولی کو چھوڑ کر ...... بالکل پاک ہے، اور آپ کی موجودہ کتاب بالکل غیر مؤثر ہے، اس لئے مجھے قلم میں روشنائی بھرنے اور اس کا احتساب کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اگر اس کے اثرات ہوتے، تو اس کے ازالہ کی تدبیر کرتا، پہلی کتاب سے ہلچل مچی تھی، دلوں میں شکوک وشبہات ابھرے تھے، مگر بحمد اللہ ان کا قلع قمع بالکل ہو گیا، اور آپ کی موجودہ کتاب میں انکارِ حدیث کی صراحت کے سوا کوئی بات زیادہ نہیں ہے، ہاں لفاظی اور یاوہ گوئی میں اضافہ ہوا ہے، اس لئے کیا ضرورت ہے کہ اس کے احتساب میں وقت ضائع کیا جائے۔

تاہم آپ خیال کریں گے کہ میری یہ کتاب لاجواب ہے، اس لئے آپ کے علم میں لانے کے لئے چند باتوں کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ کی علمی لیاقت کا سراغ آپ کو خود مل جائے۔

(۱) آپ تو حدیثوں کو وضعی کہتے ہیں، پھر پھر جگہ جگہ حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں، آخر آپ کے پاس اس کا کیا معیار ہے کہ فلاں حدیث صحیح اور قابل استدلال ہے، اور فلاں نہیں۔ محدثین کے اصول وقواعد تو آپ کے نزدیک معتبر نہیں ہیں، کم از کم جس چیز کا آپ انکار کر چکے ہیں، اس سے استدلال تو نہ کریں۔

(۲) آپ کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ امام ابوحنیفہؒ نے کوئی کتاب نہیں لکھی، امام شافعیؒ نے بھی ''متعدد کتابیں'' نہیں لکھیں۔ امام احمد نے بھی ''مسند'' مرتب نہیں کی ہے، راویوں اور مصنفوں کا حوالہ معتبر نہیں، کیونکہ جو علماء ومحدثین حدیثیں گھڑ کر حضور کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کی جانب غلط انتساب کر سکتے ہیں اگر انھیں میں سے کوئی کہے کہ امام ابوحنیفہ نے، امام شافعی نے

اور امام احمد نے کوئی کتاب نہیں لکھی، تو اس کا اعتبار ہم کس بنیاد پر کریں گے۔ جھوٹا تو جھوٹا ہے، اس کی بات کا اعتبار کیا، یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ جس کو چاہیں غلط کہہ دیں اور جسے چاہیں صحیح مان لیں، اگر یہ علماء ومحدثین جھوٹے ہیں تو آپ کو، یا آپ کے حاصل مطالعہ کو ہم کس بنیاد پر سچا مان لیں، وضاحت فرمادیں تو ممنون ہوں گا۔

(۳) آپ کہتے ہیں کہ کتابوں میں بے شمار الحاقات ہوئے ہیں، اور الحاق کرنے والے کوئی اور نہیں یہی علماء ومحدثین ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جن روایتوں اور کتابوں سے آپ استدلال کررہے ہیں آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ وہ الحاق سے پاک ہے؟ اگر ہو تو پیش کریں۔

(۴) آپ وہ روایات جنھیں محدثین اور علماء خود موضوع قرار دے چکے ہیں، انھیں سے علماء پر الزام قائم کررہے ہیں، گویا آپ کے گمان میں علماء انھیں معتبر اور مستند تسلیم کررہے ہیں، حیاء کا خون ہوگیا، میں پوچھتا ہوں کہ کون سا عالم موضوعات کو معتبر مانتا ہے کہ انھیں لیکر آپ محدثین پر الزام لگارہے ہیں، اور کیا آپ کوئی ثبوت اس کا پیش کرسکتے ہیں کہ حدیثیں جن لوگوں نے وضع کی ہیں وہ یہی رُواۃ ومحدثین ہیں جن کی روایات وکتب پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ علماء نے تو تمام واضعین حدیث کو نام بنام محدثین ومعتبرین کے زُمرہ سے ممتاز کردیا ہے، آپ انھیں کیوں اُٹھا اُٹھا کر ہمارے سامنے پیش کررہے ہیں کہ یہ ہیں تمہارے محدثین جنھوں نے حدیثیں وضع کی ہیں، اور اگر آپ صحیح احادیث کو بھی موضوعات کی فہرست میں داخل کرتے ہیں تو ہم ان کے موضوع ہونے کی قطعی اور یقینی دلیل طلب کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں گے یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے، لیکن آپ کا فیصلہ ہمارے لئے قطعاً قابل اعتناء نہیں ہے، کیونکہ علوم میں نارسائی اور عقل وفہم کی خامی کا آپ کے اندر خوب تجربہ ہوچکا ہے، اور

اگر آپ کو اپنے فیصلہ کی صحت پر اصرار ہے تو بسم اللہ کوئی ایسی دلیل پیش کریں جسے اہل دانش بے تکلف تسلیم کرلیں۔

(۵) آپ کہہ رہے ہیں کہ ”پہلی افواہ یہ اڑائی گئی کہ عورتیں ناقص العقل ہیں“ میں پوچھتا ہوں کہ اس روایت کے ”پہلی افواہ“ ہونے کی دلیل آپ کے پاس کیا ہے؟ نیز یہ بھی سوال ہے کہ کیا یہ بات غلط ہے؟ اگر غلط ہے تو دلیل ارشاد فرمائیے! اچھا یہ بتائیے سورۂ بقرہ کی آیت مداینت میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے مساوی کیوں قرار دیا گیا ہے۔ آپ کے عالی دماغ میں اس کی کیا توجیہ ہے؟

(۶) آپ کہتے ہیں کہ ”پھر یہ حدیث سنائی گئی کہ ”نماز کو عورت، گدھا اور کتا توڑ دیتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ایسی توہین آمیز روایت کو سنا تو تلملا گئیں اور اس کی تردید فرمائی، میں پوچھتا ہوں:

(الف) حضرت عائشہؓ کا قول بھی روایت سے ہم تک آیا ہے، اور سابقہ حدیث بھی راویوں ہی کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قول تو آپ کے نزدیک صحیح ہے اور حدیث غلط، اس کے غلط اور اس کے صحیح ہونے کی بنیاد معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(ب) پھر آپ کے اس دعویٰ سے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ آپ کے خیال میں حضراتِ صحابہ بھی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، کیونکہ جس روایت کی تردید حضرت عائشہؓ سے منقول ہے اور اسے آپ وضعی قرار دے رہے ہیں، اس کو بیان کرنے والے صحابی ہی ہیں، ورتردید کے وقت وہ زندہ بھی تھے، یہی حال رویتِ باری اور سماعِ موتیٰ کی موافق ومخالف روایات کا بھی ہے کہ ایک صحابی اگر رویت وسماع کے قائل ہیں تو دوسرے نہیں، ایک روایت کو آپ کو وضعی قرار دے رہے ہیں اس کا صاف مطلب یہ

ہے کہ صحابیٔ رسول نے حدیث وضع کی ہے، اگر آپ کہیں کہ صحابی نے یہ حدیثیں نہیں وضع کی ہیں بلکہ کسی جھوٹے نے ان کی طرف منسوب کر کے یہ غلط روایت بیان کی ہے ، تو ارشاد ہو کہ ان صحابی نے اس کی وضاحت کیوں نہیں کی، اور اعلان کیوں نہیں فرمایا کہ ہم نے یہ روایت ہرگز نہیں بیان کی ہے، جس نے بھی کہا غلط کہا، اس سے کیا معلوم ہوا یہی نا کہ غلطی کسی راوی و ناقل کی نہیں ہے، بلکہ خود صحابی رسول نے حدیث گھڑ کر بیان کردی ہے، نعوذ باللہ سوچئے تو سہی علماء و محدثین کے منہ لگتے لگتے آپ کا ہاتھ کن مقدس دامنوں تک جا پہونچا، آپ صحابہ کو جھوٹا اور وضاع قرار دیں تو آپ میں اور ایک رافضی میں کیا فرق رہ گیا، آخر رافضی بھی تو یہی کہتا ہے کہ صحابۂ کرام نعوذ باللہ جھوٹے اور منافق تھے، قرآن میں حذف و اضافہ کیا ہے، اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ صحابہ کرام حدیثیں گھڑتے تھے، میں پوچھتا ہوں کہ کوئی رافضی آپ سے کہے کہ آپ بھی صحابہ کرام کے سلسلے میں وضع حدیث کی حد تک قائل ہو گئے ہیں، آیئے ایک قدم اور بڑھایئے کہ صحابہ نے آیاتِ قرآنی میں بھی الحاق و ترمیم سے کام لیا ہے۔ بتایئے اس اقدام سے پ کس بنیاد پر انکار کریں گے۔

(۷) آپ کا ارشاد ہے کہ اگر ایک طرف ہزاروں راوی حدیثیں گھڑنے میں مصروف تھے تو دوسری جانب محدثین قطار باندھے ہر حدیث کو باوضو لکھنے میں مصروف تھے، اس طرح نو لاکھ نوے ہزار روایتوں کا بے پایاں ذخیرہ کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔

آپ نے دس ہزار پر کیوں کرم فرمایا۔ پورے دس لاکھ کو موضوع اور گھڑی ہوئی قرار دینے میں کیا تکلف ہے، آخر ان دس ہزار کی صحت پر آپ نزدیک تو کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۸) پھر آپ لکھتے ہیں کہ ”دین میں نئے نئے طریقے وضع کرنے میں لچوں،

لفنگوں، بدمعاشوں، جاہلوں کا ہاتھ کبھی نہیں رہا۔ ان میں تو تمام کے تمام مجددوں، محدثوں، اماموں، مفتیوں، صوفیوں اور ولیوں کے ہاتھ کام کر رہے ہیں"

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ دین اسلام سے زیادہ ناکام دین اور نبوتِ محمدی سے زیادہ کمزور اور ناکارہ نبوت آپ کے زعم کے مطابق کوئی اور بھی پائی جاتی ہے؟ دین اتنا ناکام کہ ادھر پیغمبر کی آنکھ بند ہوئی، ادھر تمام مجدد، محدث، امام، مفتی، صوفی اور ولی ٹوٹ پڑے کہ زیادہ سے زیادہ اس میں نئے نئے طریقے داخل کر کے اس کی صورت مسخ کر دیں، اور نبوت اس درجہ کمزور کہ خاص صحابہ بغیر کسی جھجھک اور بغیر کسی تکلف کے حضور انور ﷺ پر افترا پردازی میں مصروف ومنہمک! مسلمان بیچارے خوامخواہ اپنی چہاردہ سو سالہ تاریخ کی تابنا کی پر ناز کر رہے ہیں، اور اغیار بھی بلاوجہ دھوکہ میں پڑ کر مرعوب ومتاثر ہیں کہ اہل اسلام نے اپنے پیغمبر کے ایک ایک قول وعمل کی حفاظت اس طرح کی کہ ساری انسانی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی، آپ نے تو ایسا آئینہ پیش کر دیا ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ سے زیادہ بدنما اور بھونڈی کوئی تاریخ نظر نہیں آتی، بشارت ہو اغیار کو، آئیں اور عبدالخالق صاحب سے اسلامی تاریخ کے سلسلے میں معلومات حاصل کر کے چشم دل کو روشن کریں، اور اپنے لکھے ہوئے تمام اعترافات کو نذر آتش کر دیں، کیا کارنامہ انجام دیا ہے، مبارکپور کے اس شیر نے، شاباش!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

سبحان اللہ! ابتداءِ اسلام سے اب تک تمام مجددوں، تمام محدثوں، تمام اماموں، تمام مفتیوں، تمام صوفیوں، اور تمام ولیوں نے صرف ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے اور دین میں نئے نئے طریقے شامل کرنے کا۔ اس وقت سے اب تک ....جس وقت تک کہ آپ کے اندر مطالعہ کی استعداد اور

حاصل مطالعہ پیش کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ....کوئی ایسا مجدد نہیں پیدا ہوا جو ان وضعی حدیثوں اور نئے نئے طریقوں کے خلاف جہاد کرتا، ہاں آپ کے تیور سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ آنجناب کے نزدیک اس قسم کا جہاد لچے لفنگے، بدمعاش اور جاہل کرتے رہے، اس لئے کہ آپ کے بقول نئے نئے طریقے وضع کرنے میں لچوں لفنگوں کا ہاتھ تو کبھی رہا نہیں، یہ کام تو امام اور مجدد حضرات کرتے رہے۔ اس سے بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے اور آپ کی استدلالی منطق تو بانگ دہل یہی ثابت کرتی ہے کہ دین کی حمایت ودفاع کا فریضہ لچے لفنگوں سے انجام پایا ہے۔ معلوم نہیں آپ کا شمار کس گروہ میں ہے، عالموں، مجددوں، محدثوں کے گروہ میں تو یقیناً نہیں ہے، کیونکہ آپ تو انھیں کے خلاف نعرہ زن ہیں، پھر آپ خود کو کہاں پاتے ہیں، آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کہیں گے تو برا مان جائیں گے۔

عبد الخالق صاحب! اس جگ ہنسائی سے کیا فائدہ؟ آپ کی تو بیان کردہ تاریخ اسلام بڑی شرمناک ہے، اس تاریخ نے تو اہل اسلام کو کہیں کا نہ چھوڑا، حال تو جو ہے وہ ہے ہی کہ آپ جیسے حضرات خم ٹھونک کر میدان میں آ رہے ہیں، ماضی روشن تھا، آپ نے اس کی یہ گت بنائی۔ حق تعالیٰ ہر انسان کو ذہنی ہذیان سے محفوظ رکھے، میں نے آپ کی خرافیات کو پہلے طغیان کہا تھا، لیکن درحقیقت یہ طغیان نہیں ہے، طغیان میں تیزیٔ ذہن کا سراغ لگتا ہے، آپ کی تحریریں ہذیان ہیں، جس میں آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔

(۹) آپ کہتے ہیں کہ ’’بزرگوں کی ایجاد کے خلاف آپ قرآن کی آیتیں پیش کیجئے، حضور کی سنت سامنے رکھئے، صحابۂ کرام کی پوری زندگی آئینہ کی طرح دکھائیے۔ تابعین وتبع تابعین کا واسطہ دیجئے، نئی نئی باتوں کے خلاف حضور فخر عالم ﷺ کے فرامین

کو سنایئے، مگر کانوں پر جوں رینگنے والی نہیں‘‘

میں پوچھتا ہوں کہ قرآن، اور اس کا فرمان کس کے واسطے سے آپ تک پہونچا، حضور کی سنت کی راہ کس نے دکھائی، صحابۂ کرام کی پوری زندگی آپ کس کے واسطے سے آئینہ کی طرح دکھائیں گے، تابعین و تبع تابعین کا واسطہ آپ کیونکر لائیں گے، حضور فخر عالم کے فرامین آپ کہاں سے حاصل کریں گے، تمام محدثین وعلماء تو غیر معتبر، واضع حدیث قرار پاکے ردی کی ٹوکری میں جا چکے، ان کے ذریعے سے پہونچے ہوئے ذخیرے کا آپ کے نزدیک اعتبار کیا، آخر قرآن وحدیث کا تمامتر خزانہ انھیں حضرات سے آپ تک منتقل ہوا، لچوں لفنگوں کے ذریعے سے تو آپ تک آیا نہیں، بتایئے ان محدثین وعلماء کے واسطے سے پہونچا ہوا علم آپ کے نزدیک کیونکر قابل اعتماد ٹھہرے گا۔ اس کی کیا بنیاد ہوگی، ہمیں اس بنیاد کے معلوم کرنے کا غایت درجہ اشتیاق ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ آپ سے زیادہ عقلمند اس دنیا میں شاید کوئی نہ پیدا ہوا ہو، ایک افسانہ سنا تھا کہ چند لوگوں کو سب سے بڑے احمق کی تلاش تھی، انھیں ایک شخص ملا جو اسی شاخ پر کلہاڑا چلا رہا تھا جس پر اطمینان سے بیٹھا تھا، لوگوں نے کہا کہ ہمارا مطلوب یہی شخص ہے، یہ افسانہ تھا، مگر مبارکپور میں واقعہ بن گیا۔ ایک دعویٰ یہ کہ سنت رسول پیش کیجئے، حضور فخر عالم کے فرامین سنایئے وغیرہ وغیرہ، اور دوسری طرف اس سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ یہ نعرہ کہ سب محدث، سب مجدد، سب مفتی، سب صوفی، سب ولی حدیثوں پر حدیثیں گھڑ گھڑ کر انھیں باوضو لکھ لکھ کر دین میں نئی نئی باتوں کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں، سچ کہئے گا وہی بات ہے یا نہیں۔

(۱۰) آپ لکھتے ہیں کہ ’’میں یہ عرض کروں کہ میری یہ ناچیز کوشش کسی دنیوی

منفعت یا نام ونمود کے لئے نہیں ہے، یہ میرے دل کے ولولوں اور دینی تقاضوں کا بے ساختہ اظہار ہے، اور یہ بھی عرض کروں کہ اگر میرے اپنے کرم فرماؤں نے میرے ساتھ سخت نامناسب سلوک نہ کیا ہوتا تو میں اپنے حاصل مطالعہ کو قرطاس پر لاکر پہلے ''ردِ ایصالِ ثواب'' اور پھر قرآن اور ایصال ثواب'' کی صورت میں آپ کے سامنے پیش نہ کرتا، جس طرح میرے مطالعہ کا بیشتر حصہ میرے ساتھ قبر میں چلا جائے گا، اسی طرح یہ حصہ بھی قبر میں چلا جاتا، اگر میرے اپنوں کا یہی رویہ رہا تو ممکن ہے کہ میں اپنے مطالعہ کا کوئی اور حصہ آپ کے سامنے پیش کروں''

ایک سانس میں دو بالکل متضاد بات آپ نے ارشاد فرمائی، اور ایک سفید جھوٹ آپ سے سرزد ہوا۔

متضاد بات سنئے! آپ کہتے ہیں کہ یہ کوشش آپ کے دل کے ولولوں اور دینی تقاضوں کا بے ساختہ اظہار ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش کو پیش کرنے میں آپ مخلص ہیں، محض دین کی حفاظت، رضاء الٰہی کے حصول اور حق وصداقت کے اظہار کے پیش نظر آپ نے اتنی کاوش کی اس کے علاوہ کوئی اور دنیاوی غرض اس سے مقصود نہیں ہے۔

پھر معاً یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ میرے اپنے کرم فرماؤں نے میرے ساتھ سخت نامناسب سلوک نہ کیا ہوتا تو میرا یہ حاصل مطالعہ اسی طرح قبر میں چلا جاتا، اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہی نا کہ اس کتاب کے لکھنے میں کسی دینی تقاضے کی کارفرمائی نہیں ہے، کچھ لوگوں نے آپ کو تنگ کیا، آپ کی شان میں گستاخی کی، آپ کے ساتھ بد سلوکی کی، آپ کو غصہ آیا، طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا، دل بے قابو ہوگیا، آپ ابل پڑے اور اس سرے سے اس سرے تک پوری امت کو بکھان ڈالا ورنہ اگر ایسا نہ ہوا

ہوتا تو اپنے افکار وخیالات اور حاصل مطالعہ کو لے کر آپ قبر میں چلے جاتے ، چاہے مخلوق خدا گمراہی میں بھٹکتی پھرتی ، خالق عالم جب پوچھتا کہ اے عبدالخالق ! میری مخلوق ایصال ثواب کی گمراہی اور دیگر بہت سی گمراہیوں میں مبتلا تھی ، اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدت اس گمراہی پر گذر چکی تھی ، تم نے ان کی ہدایت کا سامان کیوں نہیں کیا ۔ جتنی تمہاری طاقت تھی اس قدر تو تم کئے ہوتے ، تو آپ جواب دیتے کہ بارِ الٰہا ! آپ کی مخلوق میں سے کسی نے میرے ساتھ ”سخت نامناسب سلوک“ کیا ہی نہیں ، ورنہ میں ضرور کتابِ ہدایت لکھ آتا ، کتنا شاندار ہے یہ جواب !

سچ کہیئے گا ، بات کی پچ چھوڑیئے ، کہاں دینی تقاضوں کا اظہار اور کہاں کرم فرماؤں کے سخت نامناسب سلوک پر یہ چیخ وپکار ، اور پھر ابھی سے یہ اعلان وتکرار کہ آئندہ جو کچھ بھی حاصل مطالعہ پیش کیا جائے گا اس کے پیچھے بھی یہی جذبۂ بے قرار ہوگا ۔ ماشاءاللہ

اور جھوٹ کی سنئے ! آپ نے دعویٰ کیا کہ میرے اپنے کرم فرماؤں نے میرے ساتھ سخت نامناسب سلوک کیا ، میں عرض کرتا ہوں کہ یہ سفید جھوٹ ہے ، آپ کوئی ثبوت پیش کیجئے کہ کس نے نامناسب سلوک کی ابتداء کی ہے ۔ بات تحریری ہونی چاہئے ، مبارکپور میں آپ کے موافقین ومخالفین میں کیا گفتگو ہوتی تھی ہم دور والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ۔ آپ یہ بتلایئے کہ منظر عام پر کتاب شائع کر کے پہل کس نے کی ، کسی نے قلمی فتویٰ دیا ۔ آپ نے جواب لکھ کر شائع کر دیا ، اور جواب بھی کیسا بدزبانی اور یاوہ گوئی سے لبریز ! اور دشنام صرف ایک مفتی کو نہیں پورے زُمرۂ علماء وحلقۂ محدثین کو ، بلکہ ان سے بڑھ کر اجلۂ ائمہ اور صحابۂ کرام کو ۔ سخت جارحانہ سلوک آپ نے کیا ، بالفرض اگر آپ کی شان میں کسی نے گستاخی کی بھی ہو...... جسے آپ

ثابت نہیں کر سکتے ......تو محض زبانی اور فقط آپ کی شان میں ، اور آپ کی دست درازیوں نے تو پوری امت اور پورے طبقۂ علماء وفقہاء اور محدثین کے دامن چاک کرڈالے۔ اسی کا نام ہے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

میں صرف اس نامناسب سلوک کی تحریری شہادت جو منظر عام پر شائع ہوئی ہو، آپ سے طلب کرتا ہوں، جس کی اشاعت ''ردِ ایصالِ ثواب'' سے پہلے ہوئی ہو، اگر آپ اپنے دعویٰ میں سچے ہوں تو پیش کریں۔ منظر عام پر پہلی بدگوئی آپ نے کی ہے، تف ہے اس عقل ودانش پر! اسی کے بل بوتے پر اپنی اقتداء کی دعوت دے رہے ہیں؟

بس اب طبیعت منقبض ہوگئی ، یہ معروضات صرف ''کلماتِ مصنف'' کے سلسلے میں ہیں، سنجیدہ اور معقول جواب دے سکتے ہوں تو شوق سے مطالعہ کروں گا ، اور اگر ایسا ہی لکھنا ہے جیسا ''کلماتِ مصنف'' تو اسے اپنی قبر میں ساتھ ہی لیجائیے ، میرے پاس نہ بھیجئے گا، اور نہ اس کا جواب لکھ کر میری تحریر غائب کرکے شائع کرنے کا حوصلہ کیجئے گا۔ مولوی جمیل احمد کے ساتھ جو نازیبا سلوک آپ نے کیا ہے، وہ قصہ یہاں نہ دہرائیے گا۔

اعجاز احمد اعظمی
۲۰/ذوالحجہ ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆

(دوسری مجلس)

جی چاہتا ہے کہ آپ کی کتاب سے بھی عقلمندی کا ایک نمونہ پیش کردوں تاکہ اس کے بارے میں بھی خوش فہمی نہ رہ جائے۔

آپ لکھتے ہیں کہ:

’’کتاب اللہ میں صراحۃً نہ سہی کم از کم اشارۃً ہی ایصال ثواب کا ذکر ہونا لازمی وضروری ہے، کیونکہ یہی وہ واحد کتاب علم ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس میں حیاتِ آخرت کی فلاح کے متعلق ہر چھوٹی و بڑی چیز تفصیل سے بتادی گئی ہے؟

آپ چاہتے ہیں کہ قرآن میں ایصال ثواب کا ذکر ضرور ہونا چاہئے، اور اگر نہیں ہے تو ایصال ثواب ہی باطل ہے۔ آپ نے اپنے وضع کردہ اس اصول پر قائم رہ کر چند سوالوں کے جواب عنایت فرمایئے۔

(۱) نماز کے پانچ اوقات تحدید وتعیین کے ساتھ قرآن میں صراحۃً نہ سہی کم از کم اشارۃً ہی دکھلا دیجئے، اور اگر نہ دکھا سکیں تو اپنے اصول کے مطابق غلط ہونے کا فتویٰ صادر کیجئے۔

(۲) نماز کی رکعتوں کا قرآن میں صراحۃً نہ سہی اشارۃً ہی ذکر بتلا دیجئے کہ کہاں ہے۔

(۳) نماز کی مجموعی ہیئت، تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، قعدہ وغیرہ ان سب کی مجموعی شکل ہمیں قرآن میں صراحۃً نہ سہی اشارۃً ہی دکھلا دیجئے۔

(۴) زکوٰۃ کا مصداق، اس کی مقدار، نصاب، حولانِ حول اور دوسری تفصیلات کا ذکر قرآن میں کہاں ہے؟ صراحۃً نہ سہی اشارۃً ہی قرآن میں دکھلا دیجئے۔

(۵) روزہ کے احکام ومسائل، قضا وکفارہ کی تفصیلات قرآن میں بتایئے کہ کس جگہ ہے؟

(۶) حج کی تفصیلات کا سراغ قرآن کریم میں دکھایئے۔

(۷) یہ تو بنیادی عبادات کی بنیادی چیزیں ہیں، جن کا براہ راست تعلق حیاتِ آخرت کی فلاح سے ہے۔ کتاب اللہ میں صراحۃً نہ سہی اشارۃً ہی ان کا ذکر ہونا لازمی

وضروری ہے، کیونکہ یہی وہ واحد کتاب علم ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ اس میں حیات آخرت کی فلاح کے متعلق ہر چھوٹی بڑی چیز کی تفصیل بتا دی گئی ہے۔

(۷) آپ بتایئے کہ پوتی، نواسی، بھتیجے کی بیٹی، بھانجے کی بیٹی، رضاعی بیٹی، رضاعی بھتیجی، رضاعی بھانجی وغیرہ کے نکاح کی حرمت کا ذکر قرآن کی کس سورہ اور کس رکوع میں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا ان سے نکاح کی حلت کا فتویٰ آپ دیتے ہیں؟

(۸) کتا، بلی، شیر ریچھ، بندر، ہاتھی کے گوشت کی حرمت کا ذکر صراحۃً یا اشارۃً قرآن میں کہاں ہے؟

(۹) ہرن، نیل گائے، خرگوش، بھینس حلال ہے، قرآن سے ثبوت چاہئے۔

ان چیزوں کا تعلق حلت وحرمت سے ہے، جن کا براہ راست اثر حیاتِ آخرت پر پڑتا ہے، کتاب اللہ میں صراحۃً نہ سہی اشارۃً ہی ان کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ آپ احادیث کا سہارا نہیں لے سکتے، کیونکہ وہ ایسے لوگوں نے آپ تک پہونچائی ہیں، جن کی زندگی کا مشن ہی آپ نے وضع حدیث قرار دیا ہے، ان کا کیا اعتبار کہ کیا گھڑ کر پیش کر دیا ہو۔

آپ نے کہیں کہیں صحابہ کے اجماعی عمل کو مستند قرار دیا ہے، لیکن مذکورہ بالا تمام امور میں اس سے بھی استناد مشکل ہے، نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ صحابہ کے اجماعی عمل کے ناقل وراوی کون ہیں؟ لچے لفنگے تو ہیں نہیں یہی محدثین ورُواۃ ہیں جنھیں آپ صلواتیں سنا چکے ہیں۔ ان کا کیا اعتبار!

اور اگر آپ کچھ روایتوں پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں، تو وجہ اعتبار بتایئے تاکہ ہم بھی اسے پرکھ لیں، اور اگر ان میں سے کوئی بات نہ ہو تو ان کے خلاف بھی فتویٰ صادر کیجئے کہ یہ بھی علماء کی تراشیدہ ہیں۔ قرآن میں ان کا کہیں پتہ نہیں، اور ان بنیادی

چیزوں کا قرآن میں ہونا ضروری ہے، اور جب قرآن میں نہیں تو غلط۔

صحیح وغلط کا اصول بتائے بغیر صحت وغلطی کا فیصلہ کرتے چلے جانا حماقت کا شاہکار ہے۔ ہاں ایک اصول آپ نے ضرور بتایا ہے کہ روایت کتاب اللہ کے خلاف نہ ہو۔

محترم! یہ اصول تو بنیادی اور مسلمہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کے خلاف ہونے کا معیار کیا ہے؟ فہم اور فہم میں بہت تفاوت ہے۔ ایک ہم لوگ ہیں، جنھوں نے برسہابرس اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے اور ہمارا سلسلۂ تعلیم بغیر کسی انقطاع کے اساتذہ دراساتذہ ہوتا ہوا جناب نبی کریم ﷺ تک منتہی ہوتا ہے۔ کڑی سے کڑی مربوط ہے، ہم نے صرف الفاظ ہی نہیں پڑھے ہیں، معانی کا ادراک بھی سیکھا۔ الفاظ ومعانی دونوں سلسلے آنحضرت ﷺ تک سند متصل کے ساتھ پہونچتے ہیں۔ ہمیں تو آیاتِ قرآنی اور احادیث صحیحہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نظر نہیں آتا، اور جہاں کہیں بظاہر تعارض نظر آتا ہے وہ محض ظاہری اعتبار سے، امعانِ نظر اور دقت فکر کے بعد سرے سے اختلاف وتعارض نہیں معلوم ہوتا۔

اور ایک آپ ہیں کہ نہ الفاظ ہی کی تعلیم میں اور نہ معانی کی تعلیم آپ کے اوپر تک سلسلہ چڑھتا۔ محض خودرَو پیداوار ہیں۔ آپ کو آیات کے خلاف بے شمار احادیث نظر آتی ہیں، اور اپنی ہی عقل کے بل بوتے پر فیصلہ کئے چلے جارہے ہیں، اس کا مطلب کیا ہوا؟ یہی نا کہ اس اصول کو استعمال کرنے کا معیار آپ کی عقل ہے، یعنی جس حدیث کو آپ کی عقل کتاب اللہ کے خلاف ٹھہرادے، امت کے ذمہ ضروری ہے کہ اسے بے چون وچرا تسلیم کرلے، اسے ہذیان کے علاوہ اور کیا کہا جائے۔

عبدالخالق صاحب! ایسا اصول ارشاد فرمایئے، جس کو آپ کے مرنے کے بعد بھی ستعمال کیا جاسکے، کل کو آپ مرجائیں تو حدیثیں ہم کس کسوٹی پر لے کر جائیں

گے۔ لاحول ولا قوۃ إلا باللّٰہ

اعجاز احمد اعظمی
۲۱/ ذوالحجہ ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆

تیسری مجلس (بشکل مضمون)

جو لوگ انکارِ حدیث کے علمبردار ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ حدیثیں بعد کے علماء کی تراشیدہ ہیں اور ان کا کوئی اعتبار نہیں، یہ لوگ ایک طرف تو تاریخ اسلام کے روشن صفحات پر سیاہی لیپ کر تمام دنیا کی نگاہوں میں اسلام اور اہل اسلام کو ذلیل و رُسوا کرنا چاہتے ہیں، اور دوسرے طرف خود بھی اہل دانش کی نگاہ میں مضحکہ بن رہے ہیں، لیکن شعور سے خالی ہیں۔ یہ لوگ اپنی اس حرکت سے اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ انھیں قوانین فطرت اور دستورِ الٰہی سے یکسر ناواقفیت ہے، انھیں ان بنیادی باتوں کی بھی خبر نہیں، جن پر نظامِ وجود گردش کر رہا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَداً رَّابِیاً وَّمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِیْ النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْیَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً وَّأَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۔

خلاصہ اس آیت کریمہ کا سنئے!

مشاہدہ ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ بارش کے بعد جب پانی کی رَو چلتی ہے، اور دریا پھیلنا شروع ہوتا ہے تو صرف پانی ہی نہیں بڑھتا، بلکہ اس کے ساتھ بے شمار

خس وکاشاک اور کوڑا کرکٹ بھی سطحِ آب پر تیرتے نظر آتے ہیں۔ ہر طرف پانی کے اوپر جھاگ اُٹھ آتی ہے، پانی بالکل گدلا ہو جاتا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دریا کے اوپر حکمرانی انھیں خس وخاشاک اور کوڑا کرکٹ کی رہے گی، اور اب پانی کبھی قابل استعمال نہیں ہو سکے گا، لیکن جونہی سیلابی دور ختم ہوتا ہے، اور اس کا جوش وخروش مدھم پڑتا ہے، جھاگ اُڑ جاتی ہے، گدلا پن تہ میں بیٹھ جاتا ہے، کوڑا کرکٹ ایک طرف ہو کر ختم ہو جاتا ہے، اور صاف ستھرا پانی نکھر کر باقی رہ جاتا ہے۔

دوسری مثال لو، دھاتوں کو پگھلا کر زیور، برتن اور دوسری چیزیں بنائی جاتی ہین۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب دھات تپائی اور گلائی جاتی ہے تو اس کی میل کچیل بھی حرارت پا کر بصورت جھاگ ابھر آتی ہے، مگر آناً فاناً فنا بھی ہو جاتی ہے، اور صاف ستھری قابل صنعت دھات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم یہ مثال حق اور باطل کو واضح کرنے کے لئے بیان کر رہے ہیں۔

یعنی باطل اپنی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی وقیع اور موثر معلوم ہو، آخر اس کا زور ٹوٹ کر رہتا ہے۔ اہل عقل اسے رد کر دیتے ہیں اور حق کا ظہور ہو کر رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی جھوٹ بہت دنوں تک نہیں چل پاتا۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے خواہ کتنے ہی طمطراق سے اس کا اعلان کیا جائے، اور خواہ اس کی ظاہری رونق سے کتنی ہی نگاہیں خیرہ ہو جائیں، لیکن بہت دن نہیں گذرتے کہ اس کی قلعی کھل جاتی ہے، کتنے مدعیانِ الوہیت ونبوت دنیا میں آئے، دنیا ان سے کس درجہ متاثر ہوئی، لیکن عرصہ نہیں گزرا کہ ان کے کذب وفریب کا بھانڈا پھوٹ گیا، اور ذلت ورُسوائی کا طوق ان کے گلے لگا۔ دنیا کی تاریخ اس کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ فرعون کا جاہ وجلال دیکھو، کہ أنا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ بلند کرتا تھا مگر مٹ گیا اور ایسا مٹا کہ بجز نفرت

وحقارت اسے کوئی سوغات نہیں ملتی، قارون کو اپنی دولتِ فراواں پر کتنا غرور تھا، مگر کہاں گیا؟ مسیلمۂ کذاب اور مسیلمۂ پنجاب کتنی قوت وشوکت سے اٹھے تھے، مگر دنیا نے کیسا روندا دنیا میں کب کوئی جھوٹ بولا گیا اور اس کا بھانڈا نہیں پھوٹا؟ جھوٹ ایک جھاگ ہے، جس میں ٹھہرنے اور باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے، روزانہ کتنے غلط اور بے بنیاد افکار ونظریات مختلف دماغوں سے دھوئیں کی طرح اٹھتے رہتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے فضا تیرۂ وتاریک ہوجاتی ہے، مگر جن آنکھوں نے انھیں اٹھتے دیکھا تھا، وہی آنکھیں پھر دیکھتی ہیں کہ دھوئیں کے مرغولے فنا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ بقاء اگر ہے تو حق وصداقت کو۔ دیکھو ابتداء میں انبیاء پر ان کی قوم کے لوگ اس طرح ٹوٹے جیسے نبوت کو پاش پاش کرہی دیں گے، مگر زیادہ مدت نہیں گذری کی حق کی آہنی دیوار سے ٹکرا کر باطل کا بھیجا نکل گیا، اور حق کا اُجالا اپنے جاہ وجلال کے ساتھ پھیل گیا۔

نرا کذب اور جھوٹ کبھی باقی نہیں رہ سکتا، ہاں اگر اس میں کسی قدر سچ اور راستی کی شمولیت ہوجائے تو اس کے بقدر اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی عمر کچھ بڑھا لیتا ہے، پھر بھی یہ نہیں ہوسکتا کہ صحیح طبائع اسے قبول کرلیں، جس طرح ایک تندرست آدمی کھانے کے لقمے کے ساتھ مکھی نہیں نگل سکتا ٹھیک اسی طرح جو طبیعتیں باطنی سقم سے خالی ہیں، ان کے سامنے سچ کے ساتھ اگر جھوٹ کو ملا کر پیش کیا جائے تو ہرگز اسے قبول نہ کریں گی، یہ بات اس درجہ بدیہی اور فطری ہے کہ ہر شخص اس کے اعتراف واقرار پر مجبور ہے۔

اس کسوٹی پر فن حدیث وروایت کو پرکھو، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اور آپ کے بعد بھی حدیثوں کی روایت کا سلسلہ چلتا رہا، آپ کی حیات اقدس میں آپ کے عشق ومحبت کے متوالے اور آپ کے شیدائی براہ راست آپ کی خدمت میں

حاضر ہوکر آپ کے جمالِ جہاں آراء سے اپنے قلب ونظر میں روشنی حاصل کرتے ، اورآپ کے ارشادات وفرمودات سن کر ہدایت ورہنمائی سے فیضیاب ہوتے ، لیکن جب آپ نے اس دنیا سے روپوشی اختیار کی ، تو آپ کے وہ شیدائی جنھیں آپ کے زیارتِ جمال سے محرومی رہی ، وہ کیا کرتے ؟ آپ کے ارشادات وفرمودات ہی سننے اور یاد کرنے میں لگ گئے ۔ جس کے بارے میں معلوم ہوجاتا کہ اس کے پاس آپ کا کوئی ارشاد ہے تو سفر کرکے دور دراز سے اس کی خدمت میں پہونچ جاتے ۔ عشق ومحبت کا تقاضا یہی ہے، جولوگ اس ذوق سے نا آشنا ہیں انھیں کون سمجھا سکتا ہے، اس طرح آپ کی احادیث گھر گھر اور بچہ بچہ کی زبان پر پھیل گئیں ۔ اس وقت بجز قرآن وحدیث کے اور کوئی علمی مشغلہ بھی نہ تھا، سب اسی پر لگے رہے، پھر روایت حدیث کا سیلاب چلا تو بہت سے ناخدا ترس اور مسخرے افراد نے جب دیکھا کہ اہل ایمان حدیث نبوت کے کیسے شیدائی ہیں تو انھوں نے اس جذبۂ عشق ومحبت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی باتوں کو نبی ﷺ کی جانب منسوب کرکے بیان کرنا شروع کردیا، اس طرح صحیح احادیث پر موضوع اور غلط باتوں کی جھاگ چڑھتی چلی گئی لیکن جیسا کہ قانونِ قدرت ہے کہ اس جھاگ کو باقی نہیں رہنا تھا، اللہ تعالیٰ نے ایسے زبردست ہاتھ پیدا کردئے جنھوں نے پوری قوت سے اس جھاگ کو فنا کردیا، چاند پر جو بدلیاں چھائی تھیں چھٹ گئیں ، جتنی غلط اور موضوع حدیثیں دین کے دشمنوں نے وضع کی تھیں، ایک ایک پر انگلی رکھ کر بتادیا کہ یہ سب غلط ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کے سچے ارشادات کو دنیا کے سامنے واضح کردیا، چنانچہ جب تک سیلابی دور تھا، خس وخاشاک اٹھتے رہے اور اب جبکہ تمام حدیثوں کی حیثیت متعین ہوچکی ہے، وضع وایجاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے، چنانچہ عرصہ دراز سے کسی بطال کو ہمت نہیں ہوئی کہ حدیث وضع کرے،

کیونکہ اب تو وہی حدیث معتبر ہے، جسے معتبر بتلایا جا چکا ہے، ان کے علاوہ سب غیر معتبر۔

علماء اسلام کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان اور رفیع القدر ہے کہ صرف اپنوں نے نہیں، غیروں نے بھی اس کارنامہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، حدیثِ رسول کے لئے پانچ لاکھ افراد کی سوانح حیات مرتب کی گئی، کیوں؟ تا کہ آپ کے ارشادات کے ساتھ دوسروں کے اقوال مخلوط نہ ہونے پائیں، افسوس دوسرے دشمنانِ دین تو اپنے کو اعتراف عظمت پر مجبور پائیں لیکن اپنوں میں ایسے ناخلف افراد اٹھتے ہیں جنھیں شاید بستر پر سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے اور کلی کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی، وہ اپنے اسی گندہ ذہن اور گندہ دہن کے ساتھ اس عظیم القدر کارنامہ کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

بہر کیف! اگر تمام حدیثیں غیر معتبر اور وضعی ہوتیں تو یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے کہ وہ چودہ سو سال تک قائم و دائم رہتیں، اور لوگ انھیں حق وصداقت باور کئے رہتے۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ تمام حدیثیں غلط اور وضعی ہیں، اور اب تک انھوں نے اپنے کو حق وصداقت باور کرائے رکھا۔ تو واللہ دنیا میں اس سے بڑا معجزہ ظاہر نہیں ہوا۔

جو حدیثیں وضعی تھیں وہ ضرور کتابوں میں محفوظ ہیں، لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ غلط اور کذب ہیں، وہ خود اپنے بطلان کی شہادت ہیں۔ ان کی حیثیت ختم ہو چکی ہے، وہ اپنا اعتبار کھو چکی ہیں اور جن کو علماء ومحدثین صحیح قرار دے چکے ہین، ان کی صداقت پر دنیا کی دنیا ایمان رکھتی ہے۔ وہ زندگی کے معاملات ومسائل میں آج بھی رہنما ہیں۔

میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو تمام حدیثوں کو موضوع اور جعلی قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، اور صرف اس بنا پر تلے ہوئے ہیں کہ ان کی بیمار ذہنیت انھیں قبول نہیں کرتی، کہ فطرت کے مطالبہ کو کب تک ٹھکراتے رہو گے۔ فطرت کا مطالبہ ہے کہ

جھوٹ فنا ہوا اور سچ کو بقا رہے۔ صحیح حدیثیں باقی ہیں، لہٰذا انھیں کذب اور جعل قرار دینا بدترین جھوٹ ہے، اور یہ جھوٹ ختم ہو جائے گا۔ آج تم پہلے منکر حدیث نہیں ہو، تم سے پہلے بھی کتنے باطل فرقے اٹھے، اور قرآن ہاتھ میں لے لے کر صحیح احادیث کی تکذیب کرتے رہے، لیکن وہ فرقے فنا ہو گئے اور حدیثیں باقی ہیں۔ لوگوں نے حلق کی مکھی کی طرح اُبکائی لے کر انھیں قے کر دیا۔ معتزلہ بھی یہی کرتے رہے، خوارج بھی اسی راہ پر چلے، قدریہ بھی یہی ہانک لگاتے رہے، پھر اب سے پہلے کچھ اہل قرآن، کچھ حق گو، کچھ رافضی، کچھ ناصبی، کچھ نیاز، کچھ جوش، کچھ یگانہ، کچھ پرویز، کچھ برق، کچھ اسلم، کچھ فضل الرحمٰن پیدا ہوتے رہے، ہوا میں تلوار گھماتے رہے، چاند پر تھوکنے کی کوشش کرتے رہے، آسمان پر بندوق داغتے رہے، بہت کچھ دھنا دھن اور زنا زن رہی، مگر کیا ہوا، خود ہلاک ہو گئے۔ دنیا نے رد کر دیا۔ بلبلے بیٹھ گئے، جھاگ اُڑ گئی۔ پچھلوں کو اگلوں سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ اے کاش ایسا ہوتا۔

اسی اصول پر مسئلہ ایصال ثواب کو پرکھ لو۔ یہ مسئلہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، آج جو غلغلہ اٹھایا جا رہا ہے کہ عقیدۂ ایصال ثواب باطل ہے، اور اس کے خلاف بغیر سوچے سمجھے آیاتِ قرآنی کے ترجمے اٹھا اٹھا کر پیش کئے جا رہے ہیں، یہ آج کا کوئی نیا فتنہ نہیں ہے، اب سے بہت پہلے فرقۂ معتزلہ نے بھی انھیں آیات کا سہارا لے کر ایصال ثواب کو باطل قرار دینے کی سعی نامراد کی تھی۔ اور ایک ایصال ثواب ہی کیا، کتنے مسائل میں انھوں نے اپنی سطحی عقل اور نارسا ذہن کی ترنگ میں آ کر جمہورِ امت سے الگ راہ اختیار کی مگر جھوٹ کی جھاگ فنا ہونی تھی، فنا ہو گئی۔ یہ فرقہ بھی مٹ گیا، اور اس کے نظریات بھی اڑ گئے، اور جمہور امت کے عقائد آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ باقی ہیں۔ ہر زمانے میں جھوٹے اور فریبی لوگوں نے مختلف جہتوں سے دین

میں غلط نظریات وافکار داخل کرنے کی گستاخی کی ہے، لیکن سب کی قلعی کھلتی رہی، اگر کچھ مسخروں نے سرے سے ایصال ثواب کا انکار کیا تو کچھ خوش فہموں نے ایصال ثواب کے سیدھے سادے شرعی طریقہ میں بہت کچھ اعمال ومعمولات داخل کئے، لیکن علماء حق نے جہاں ان کی تفریط کو دور کیا وہیں دوسروں کے اِفراط پر بھی قدغن لگائی، اور جتنا کچھ احادیث سے ثابت ہے اس کو واضح کر دیا۔

رہا یہ کہ اس کے ابطال میں آیات قرآنی پیش کی جارہی ہیں تو یہ محض سمجھ کا قصور ہے، یا دیدۂ ودانستہ بد دیانتی ہے، یہ شور وغوغا بھی عارضی اور چند روزہ ہے، سیلاب کی جھاگ ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد یہ جھاگ اڑ جائے گی، اور حق کا آبِ زلال باقی رہے گا۔

اعجاز احمد اعظمی

۲۶؍زوالحجہ ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆

(چوتھی مجلس)

عبدالخالق صاحب! آپ نے احادیث کا انکار کر کے قرآن فہمی کا کوئی اصول تو متعین کیا نہیں، جو کچھ آپ کی ناقص فہم میں آتا گیا، قلم کا گھوڑا دوڑاتے گئے۔ آپ کی پوری کتاب دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے قرآن کے ترجموں کا مطالعہ صرف اس واسطے کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی سے کون کون سی حدیثیں متصادم ہیں۔ خواہ ان کا مطلب ومفہوم کچھ ہو آپ نے تعارض وتخالف ثابت کر دیا۔ میں تو قلم روک چکا تھا، لیکن جی چاہا کہ ایک آئینہ اور آپ کے سامنے رکھ دوں، اگر آنکھوں میں کچھ بھی بینائی ہوگی تو چہرہ کا داغ نظر آجائے گا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: أفلا يتدبرون

القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه إختلافاً كثيراً ، کیا قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر غیر اللہ کی جانب سے یہ کلام ہوتا تو اس میں بہت کچھ تضاد یہ لوگ پاتے۔

ذرا غور سے دیکھئے! حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں حق و باطل کو پرکھنے کا ایک معیار ارشاد فرمایا ہے۔ باطل کی شناخت یہ ہے کہ اس میں آپس میں تعارض اور تضاد بہت ہوگا۔ ابھی ایک بات کہی گئی، ابھی دوسری بات اس کے برعکس کہہ دی گئی۔ یہ تعارض ایسا ہوتا ہے کہ کسی طرح دفع نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک بات کو صحیح اور ایک کو غلط نہ کہہ دیا جائے۔ داعیِ حق کے عقائد و نظریات میں کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا اور اہل باطل اس ٹکراؤ سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے، تمام مذاہب باطلہ اور فرقِ ضالہ کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کی تعلیمات میں اس درجہ سنگین تضادات ہوتے ہیں کہ کوئی ذہین سے ذہین اور عاقل سے عاقل شخص ان کی تسلی بخش توجیہ و تاویل نہیں کرسکتا۔

اس اصول کی بنیاد پر آپ کے پیش کردہ حق و راستی کو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا حاصل مطالعہ جو آپ کے نزدیک حق کی نمائندگی کرتا ہے، دو رسالوں ''رد ایصال ثواب'' اور ''قرآن اور رد ایصال ثواب'' کی صورت میں آچکا ہے، پہلی کتاب میں جس قدر حماقتیں آپ سے سرزد ہوئی ہیں آپ کی حق پرستی اور حق کوشی کی قلعی تو انھیں سے کھل گئی ہے، تاہم یہ دوسری بھی کچھ کم نہیں، مجھے چونکہ مکمل تبصرہ نہیں کرنا ہے، اس لئے فقط چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔

آپ کی کتاب کی تضاد بیانی کی کچھ مثالیں تو سابقہ سطور میں گذر چکی ہیں، یہاں ایک اور زاویہ نظر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، اسے سنئے!

حدیثوں کو تو جانے دیجئے، ان کی تو آپ گردن ہی مار چکے، ہاں قرآن پر آپ کا ایمان ہے، اور اس پر بھی آپ نے کا ایمان ہے کہ اس میں کہیں اختلاف

وتعارض نہیں ہے، لیکن جس سرسری انداز پر آپ نے قرآن کے مطالب اخذ کئے ہیں، اس کے لحاظ سے ہم بعض آیات، قرآنی کا مطلب آپ سے دریافت کرتے ہیں، تاویل وتوجیہ اور آنا کانی سے کام نہ لیجئے گا۔ جس لب ولہجہ کو آپ نے دونوں کتابوں میں استعمال کیا ہے، ٹھیک اسی لب ولہجہ میں جواب مطلوب ہے۔

(۱) آپ نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ دعویٰ کیا ہے، اور ثبوت میں بہت سی آیات کے ترجمے پیش کئے ہیں کہ جس نے بھلا یا برا جو عمل کیا ہوگا، قیامت کے روز فقط اسی کو دیکھے گا، محض اسی کی جزا پائے گا۔ ایک شخص دوسرے کا بوجھ قطعاً نہ اٹھائے گا، اس مضمون کی آیات پیش کرکے آپ نے ایصال ثواب کو درست ماننے والوں پر نہایت بے دردی کے ساتھ فقرے کسے ہیں۔ خود ایصال ثواب پر اس درجہ مسخرہ پن کیا ہے کہ شوخی بھی شرما جائے۔ ان آیات کو ٹھیک اسی طرح رہنے دیجئے، اس میں سے کچھ استثنا نہ کیجئے اور بتایئے کہ اگر یہی بات ہے کہ کسی کو اپنے عمل کے علاوہ دوسرے کے عمل سے فائدہ نہ گا، تو اگر کوئی شخص دوسرے کے حق میں دعاء مغفرت کرتا ہے تو اس کا نفع دوسرے کو کیونکر پہونچ سکتا ہے۔ قرآن میں وہ بھی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا اور یہ بھی ہے کہ دعاء مغفرت سے نفع ہوتا ہے۔ یہ صریح تعارض ہے یا نہیں؟ ایک جگہ آپ کے گمان کے مطابق قرآن عام اعلان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کے کسی عمل سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ دوسروں کی دعاء مغفرت مفید ہوگی۔ یہ تضاد آپ کے بیان کے مطابق قرآن میں موجود ہے۔ اب ایسا جواب دیجئے کہ تضاد بھی رفع ہوجائے اور آپ کے بتائے ہوئے مطلب پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔

(۲) قرآن ایک جگہ فرماتا ہے کہ: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرىٰ ، دوسری جگہ کہا گیا کہ: لِيَحْمِلُوْا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ

بِغَيْرِ عِلْمٍ ، اور ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالاً مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ، پہلی آیت اور ان دونوں آیتوں کے درمیان آپ کے بیان کردہ مطلب کے لحاظ سے کھلا ہوا تضاد ہے، اپنے مطلب پر قائم رہئے اور تضاد ختم کیجئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: وأن ليس للانسان إلا ماسعىٰ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَابِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَئٍ ، اور ایک جگہ فرمایا گیا: وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ وَكَانَ أَبُوْهُمَا صَالِحاً فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَّبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ، پہلی آیت اور بعد والی دونوں آیتوں میں آپ کے فہم کے لحاظ سے واضح تعارض موجود ہے، ایک طرف تو یہ کہ اپنے عمل کے علاوہ انسان کو کچھ مل ہی نہیں سکتا۔ اور دوسری طرف یہ کہ باپ کے عمل صالح کی وجہ سے اولاد کے درجات بلند ہو رہے ہیں۔ اور باپ کے صالح ہونے کی بنیاد پر خزانہ کی حفاظت ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی اپنے مطلب پر قائم رہتے ہوئے اس تعارض کو دور فرما دیجئے۔

(۴) آپ کے نزدیک وأن ليس للانسان إلا ماسعىٰ جب ہر قسم کی سعی کو بالکل عام ہے تو اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں ہے، بس انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے محنت و کوشش کی ہے تو براہ کرم ایک سوال حل کر دیجئے کہ اس عام سعی کو آپ نے آخرت کے ساتھ کیوں خاص کر دیا۔ یعنی آپ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا کہ آخرت میں اپنی سعی کا بدلہ پانے کا مستحق ہوگا۔ آخر آیت میں آخرت کا کوئی اشارہ تو موجود نہیں ہے، لہٰذا یہ کہئے کہ یہ آیت دنیا و آخرت ہر جگہ کے لئے عام ہے، دنیا میں بھی آدمی اسی کا مستحق ہوگا جو اس نے کمایا، اور آخرت میں بھی وہی پائے گا جو اس نے محنت کی۔ پھر اس کی بنیاد پر دنیا میں جو ایک شخص کی کمائی سے دوسرا فائدہ اٹھا رہا ہے یا تو سب کو

ناجائز ٹھہرایئے، یا قرآن کی ان آیات کے معارض مانئے، جن میں اپنی کمائی دوسروں کو دینے کا حکم دیا گیا ہے، اور پھر اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے جواب عنایت فرمایئے، اور یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ عام مخصوص منہ البعض کے تو قائل نہیں ہیں اس لئے اس آیت میں کسی طرح کی تخصیص جائز نہ ہوگی۔

آپ سے گزارش ہے کہ جس عموم کو دلیل بنا کر آپ نے آیاتِ قرآنی کو ایصال ثواب کے خلاف پیش کیا ہے، اس عموم کو قائم رکھتے ہوئے ان اختلافات اور تضادات کو حل کیجئے، کوئی تاویل و تخصیص نہ کیجئے گا، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہزار کوشش کے باوجود آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ پھر دو صورتیں ہیں، یا تو قرآن میں تعارض و تضاد مان کر ایمان سے ہاتھ دھوئیں، یا جن اصولوں پر علماء قرآن سمجھتے ہیں، انھیں پر آپ بھی آیئے، لیکن یہ آپ کی توہین ہے، اس لئے تیسرا راستہ نکالئے۔

آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ قرآن میں ایسے تعارضات نہیں ہیں۔ آپ کی قرآن فہمی کی بنیاد پر ایسے تضادات پیدا ہو رہے ہیں، ورنہ ہمارے علم میں قرآن کریم اور احادیث صحیحہ............ جنھیں محدثین کے اصول پر صحیح قرار دیا جا سکے............ کے درمیان کہیں تعارض نہیں ہے، اگر ہے تو صرف ظاہری طور پر۔ ہم اللہ کے فضل سے بہت سہولت کے ساتھ ظاہری تعارض حل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ شیوہ بہت ہی لغو ہے کہ جہاں آپ کی عقل نے ٹھوکر کھائی، جھٹ حدیث صحیح کا انکار کر دیا اور پوری ملت پر پانی پھیر دیا۔

اعجاز احمد اعظمی
یکم محرم ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بابِ پنجم

متفرقات

ایک صاحب علم نے دریافت کیا تھا کہ میت کو جب دفن کیا جاتا ہے تو تین مٹھی مٹی لوگ ڈالتے ہیں، اور پہلی مٹھی پر **منھا خلقنکم** اور دوسری پر **وفیھا نعیدکم** اور تیسری پر **ومنھا نخرجکم تارۃً اخریٰ** پڑھتے ہیں۔ اس کی سند کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہ خط لکھا گیا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

محترمی! **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ**

آپ کا خط عرصہ ہوا ملا تھا۔ میں نے یہ حدیث کنز العمال میں بہت دنوں پہلے دیکھی تھی، اس وقت میرے پاس کنز العمال نہیں ہے۔ جہانا گنج میں ہے، سوچا تھا کہ وہاں جاؤں گا تو تلاش کرکے بھیج دوں گا۔ مگر وہاں بھی نہ جاسکا، اور جواب میں تاخیر ہوتی چلی گئی، پھر ایک موقع پر مفتی محمد امین صاحب مبارکپوری سے اس حدیث کا حوالہ دریافت کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ’’نواب صدیق حسن خاں بھوپالیؒ نے اپنی تفسیر ’’فتح البیان‘‘ ص:۷۰،۷۱ پر یہ حدیث نقل کی ہے، نیز تفسیر ابن کثیر میں اسی آیت کے تحت رسول ﷺ کا عمل بعینہٖ اسی طریقے سے جو ہمارے یہاں معمول بہٖ ہے، سنن کے حوالے سے نقل کیا ہے، اسے صابونی صاحب نے اپنی مختصر ابن کثیر میں بھی باقی رکھا ہے، اس کے علاوہ امام نوویؒ نے اپنی مشہور کتاب ’’المجموع شرح المھذب‘‘ میں امام احمد بن حنبلؒ کی مسند کے حوالے سے اسی مضمون کی حدیث ذکر کی ہے اور اس کے استحباب پر استدلال کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے: **وفی الحدیث الذی فی السنن أن رسول ﷺ حضر جنازۃً فلما دفن المیت أخذ قبضۃً من التراب فألقاھا فی القبر وقال منھا خلقنکم ثم أخذ أخریٰ وقال وفیھا نعیدکم ثم أخریٰ وقال ومنھا نخرجکم تارۃً أخریٰ** (ج:۳ص:۲۵۰) اور ’’**المجموع شرح المھذب**‘‘ میں ہے: **وقد یستدل لہٗ بحدیث أبی أمامۃؓ قال لما وضعت أم کلثوم بنت رسول اللہ ﷺ قال رسول**

ﷺ **منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارةً أخرىٰ (رواه الامام احمد من رواية عبيد الله زخر بن على بن زيد بن جدعان عن القاسم وثلٰثة منهم ضعفاء و لكن يستانس بأحاديث الفضائل وإن كانت ضعيفةالاسناد ويعمل بها فى الترغيب واترهيب وهٰذا منها والله أعلم** ۔ص:٢٩٤ج:٥) یہ عمل تو مسلمانوں میں توارثاً معمول بہ ہے، ایسے متوارث عمل کے بارے میں تشکیک مناسب نہیں ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

٩/ جمادی الاولیٰ ١٤١٣ھ

☆☆☆☆☆

ایک عالم نے ''تصور شیخ'' کا مسئلہ پوچھا تھا، ''تصور شیخ'' حضراتِ صوفیہ کے یہاں ایک اصطلاح ہے، اسے ''شغلِ برزخ'' اور ''شغلِ رابطہ'' بھی کہتے ہیں۔ سالک اپنے دل کو ہر تصور سے خالی کر کے اپنے شیخ کی صورت کا تصور کرتا ہے، اور یہ کہ خدا کا فیض عرش الٰہی سے اترتا ہے، شیخ کے قلب سے گزر کر اس تک پہونچتا ہے، یہ تصور فی نفسہٖ مباح اور مفید ہے، مگر اس میں جب غلو ہوتا ہے، تو فاسد عقیدہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ یہ تصور جب دل میں راسخ ہوتا ہے، تو شیخ کی صورت ہر وقت جلوہ گر رہتی ہے، اور بعض اوقات سالک کو دھوکہ ہوتا ہے کہ شیخ ہر وقت میرے ساتھ ہیں، اور میری ہر حرکت وسکون کو دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ شیخ کو اس کی خبر بھی نہیں، یہ تو سالک کے تصور کی قوت اپنا کرشمہ دکھا رہی ہے، اسی لئے ہمارے علماء دیوبند نے اس شغل کو موقوف کر دیا ہے، زیر نظر مکتوب میں اسی مسئلے کی اجمالاً وضاحت ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

عزیزم! **السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاته**

تمہارا خط ایسے وقت ملا تھا کہ میں بہت مشغول تھا، اس سے دم لینے کا موقع ملا تو ایک غیر متوقع سفر سر پر سوار ہوا، اور میں کل دو ہفتہ کے طویل سفر کے بعد واپس لوٹا۔

”تصور شیخ“ کے متعلق تم نے سوال کیا ہے، ”تصور شیخ“ کی حقیقت اور مقصد کیا ہے؟ پہلے یہ سنو! کہ ”تصور شیخ“ جو ہمارے مشائخ کے درمیان کبھی رائج تھا اسے اصطلاح میں شغل برزخ اور رابطہ بھی کہتے ہیں، اس کی حقیقت بس اس قدر ہے کہ مرید خود کو اپنے شیخ کے سامنے تصور کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ فیضانِ الٰہی کی لہریں شیخ کے قلب سے ہو کر اس کے قلب میں آرہی ہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ فیضانِ الٰہی کے نزول کا واسطہ اس کے حق میں اس کا شیخ ہی ہے، **لاالٰہ الااللہ** کے بعد **محمد رسول اللہ** کے تعلق پر غور کرو گے تو اس کی تہ میں اس رابطہ کی حکمت کارفرما نظر آئے گی۔ بھلا بتاؤ اس تصور میں کیا مضائقہ ہے؟ مرید نہ تو اپنے شیخ کو خدا سمجھتا، نہ خدا کی طرح قابل تعظیم سمجھتا، نہ اس کے سامنے جھکتا، نہ اس کی عبادت کرتا، اگر اس کو کچھ سمجھتا ہے تو بس اپنے اور خدا کے درمیان ایک رابطہ تصور کرتا ہے، اس میں کیا بات خلافِ شرع ہے اگر یہ تصور خلافِ شرع ہے تب تو کسی کا تصور بطور تعظیم قابلِ مواخذہ ہوگا خواہ نبی کا ہو یا ولی کا۔

ہاں اگر ”تصور شیخ“ بطور رابطہ کے نہ ہو بلکہ بالاستقلال یہ عمل کیا جائے، اور شیخ ہی کو مقصود و مراد سمجھ لیا جائے، اور یہ اعتقاد کیا جائے کہ وہ حاضر و ناظر ہے یا میرے حال سے واقف ہے، تب یہ ضرور قبیح ہے اور مفضی الی الشرک ہے، اور جن بزرگوں نے اس سے منع کیا ہے ان کے سامنے ”تصور شیخ“ کی یہی تصویر رہی ہے یا اس کا اندیشہ رہا ہے، اور جہلاء کے غلو نے بات اس درجہ تک پہونچا رکھی تھی، اس لئے سدِ باب کیلئے مطلقاً منع کر دیا، ورنہ اپنی حد پر رہے تو نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بیحد مثمرِ برکات وفوائد ہے، لیکن جہلا جس چیز کو ہاتھ میں لیتے ہیں، اسے تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں، اس لئے ہمارے بزرگوں نے اسے قریب قریب ترک کر دیا ہے اب تو کسی کو

غلبۂ محبت میں یہ مراقبہ حاصل ہوجائے تو ہوجائے، ورنہ بالقصد تعلیم نہیں دی جاتی، تاہم ہر وہ شخص جو درجۂ کمال تک پہونچا، سلوک کے کسی نہ کسی مرحلہ میں اس کو اس حال سے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن وہ غیر اختیاری طور پر ہوا ہے۔

امید ہے اس مختصر وضاحت سے اطمینان ہوجائے گا، اگر کوئی خدشہ باقی ہو تو پھر لکھو، سلوک کے اثبات کیلئے **واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون**، اور **أن تعبد اللہ کأنک تراہ** اور **انما الاعمال بالنیات الخ** بہت کافی ہیں۔ تفصیل درکار تو ہو پھر آئندہ۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

☆☆☆☆☆

نوٹ: مذکورہ مکتوب کے کافی عرصہ بعد ایک دوسرے عالم کا سوال اسی موضوع (تصور شیخ) سے متعلق آیا، اور اس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک قول کا حوالہ دیا گیا، جس میں انھوں نے ''تصور شیخ'' کو شرک قرار دیا ہے۔ اس پر یہ تحریر لکھی گئی۔

''حضرت سید احمد شہیدؒ نے اسے جو شرک سے تعبیر کیا ہے، اس میں ایک وجہ تو وہی قباحت مذکورہ بالا ہے، دوسرے یہ بھی ہے کہ ان کی استعداد نہایت عالی تھی، وہ شیخ کی تعلیم کی مدد سے براہ راست خدا تعالیٰ کا استحضار کر سکتے تھے، ''تصور شیخ'' کی مشق زیادہ تر کمزور استعداد والوں کیلئے ہوتی ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی استعداد بغایت بلند تھی۔ اور یہ استعداد کمالاتِ نبوت سے مناسبت رکھتی تھی، اس لئے ان کے حق میں ''تصور شیخ'' کا شغل نہ صرف یہ کہ کارِ عبث تھا۔ بلکہ ان خرابیوں کی وجہ سے جو اس زمانہ کے جاہل متصوفین میں رائج ہوچکی تھیں بحکم شرک تھا، ورنہ یہ صریح شرک نہیں ہے، ہاں جہالت نے ایک درجہ کی مشابہت شرک کے ساتھ پیدا کردی تھی۔

چنانچہ حضرت سید احمد شہیدؒ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ''تصور شیخ'' کا شغل بتایا، تو انھوں نے عرض کیا کہ یہ تو شرک ہے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

تو حضرت سید احمد شہید نے عرض کیا کہ اس مصرع میں شراب کے اندر سجادہ کو غوطہ دینا ظاہراً گناہ سے کنایہ ہے، اگر آپ اس کا حکم دیں تو کسی تاویل سے میں اسے کرلوں گا، مگر ''تصور شیخ'' تو شرک ہے، اس کی اس مصرع میں تعلیم نہیں ہے، اس بات سے حضرت شاہ صاحب بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ تم کو کمالاتِ نبوت سے مناسبت ہے، تمہارا سلوک دوسرے طریق سے طے ہوگا۔

اس سارے واقعہ میں غور کرو کہ سید صاحب حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کو شرک فرما رہے ہیں، لیکن شاہ صاحب کو نہ مشرک قرار دیتے ہیں نہ کافر، بلکہ اسی اعتقاد پر جمے ہوئے ہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے شیخ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ عمل وہ شرک نہیں ہے، جس کو شریعت کی نگاہ میں نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے، ورنہ کوئی معنی نہیں کہ سید صاحب اس کے بعد بھی ان سے لگے اور چپکے رہتے، اور یہ بھی نہیں ہے کہ شاہ صاحب نے اپنا خیال ترک فرمادیا، ہاں البتہ یہ فرمادیا کہ تمہارا سلوک دوسرے طریقہ سے طے ہوگا۔ یہاں ایک بات اور بتادوں کہ حضراتِ صوفیہ شریعت کی بعض اصطلاحات کو ان کے اپنے اصلی معانی سے ملتے جلتے صورۃً دوسرے مشابہ معانی میں استعمال کردیتے ہیں، یہ منقول اصطلاحی کے قبیل سے ہوتا ہے، اس بنیاد پر کہہ سکتے ہو کہ یہ ''شرک شریعت'' نہیں ہے، بلکہ ''شرک طریقت'' ہے۔۔۔ دوسرا نکتہ اس واقعہ میں یہ دیکھو کہ حضرت سید صاحب نے جب اس عمل کو شرک قرار دیا تو شاہ صاحب ناراض نہیں ہوئے، اور یہ نہیں فرمایا کہ تم اپنے شیخ کو مبتلائے شرک۔۔۔ بلکہ معلم شرک

۔۔۔ سمجھتے ہو، لہٰذا تم کو مجھ سے فیض حاصل نہ ہوگا، بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ تم کو کمالات نبوت سے مناسبت ہے، اس لئے تم کو شغل برزخ کی ضرورت نہیں ہے، یہ دونوں حضرات محقق تھے، اس لئے نہ کوئی کسی سے بدگمان ہوا، اور نہ ناراض ہوا۔ اب اگر کوئی شخص بے سوچے سمجھے حضرت سید صاحب کے ارشاد کو خالص شرک پر محمول کرلے تو ضرور ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے بدگمان ہوجائے اور اگر شاہ صاحب سے حسن ظن ہے تو لازم ہے کہ حضرت سید صاحب کو گستاخ قرار دے، جبکہ یہ دونوں حضرات باہم ایک دوسرے کے معتقد و مداح ہیں۔ پس یہ دونوں خیالات غلط ہوں گے۔

اس مضمون سے تمہارے اس اشکال کا خاتمہ ہوجاتا ہے کہ وساوس کو ختم کرنے کیلئے یہی ایک مشرکانہ فعل تو نہیں ہے۔ واضح ہو چکا کہ یہ عمل مشرکانہ نہیں ہے۔

اور یہ تم نے عجیب بات لکھی ہے کہ تصور کرنا ہی ہے تو خداوند قدوس کا تصور کرنا چاہئے، میرے عزیز! ذرا ایسا کرکے تو دیکھو، آخر خدا کا تصور کیسے کروگے؟ انسان تو صورت کا خوگر ہے، اسی کا تصور کرتا ہے، لیکن خدا کی صورت کہاں سے لائے، اگر کسی صورت کو ذہن میں لاکر اسے خدا کا تصور کرے گا تو یہ البتہ صریح شرک ہوگا۔ کیونکہ اس نے غیر خدا کو خدا سمجھ لیا۔ اور اگر مجرد تصور کرنا چاہے تو بتاؤ ایک مبتدی مجرد تصور کیونکر کرے گا۔ ذرا کرکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ خدا کا تصور تو نہیں ہوا صرف وسوسے اور خیالات رہ گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان صورت کا عادی ہوتا ہے، اور جس سے آدمی کو محبت ہوتی ہے، اس کا تصور خوب جمتا ہے۔ مرید کو اپنے شیخ سے والہانہ محبت ہوتی ہے، اس لئے اس کا تصور متخیلہ پر خوب نقش ہوتا ہے، اور یہ تصور باقی وساوس کی جڑ کاٹ دیتا ہے، پھر جب انسان کے دل سے وساوس کا خاتمہ ہوجاتا ہے تو شیخ کی رُوحانیت اسے خدا کے حضور میں کھڑا کردیتی ہے، خوب سمجھ لو۔

مشائخ اور بزرگوں کی باتوں پر اشکال بھی ہو تو اس کے اظہار میں ادب کا پیرایہ باقی رہنا چاہئے۔ ہم لوگوں کی عقل اور علم بہت ناتمام ہے، اس کے بھروسے پر دیدہ دلیری سنگین غلطی ہے، تمہارے مکتوب میں قلت ادب کا اثر ہے اس سے احتراز کرو۔ محققین کی باتوں کی تقلید ہی سلامتی کا راستہ ہے۔ امید ہے کہ اس تحریر سے اشکال دفع ہو جائے گا۔ اب بھی اگر کوئی شبہ باقی رہ گیا ہو، تو لکھو غور کروں گا۔

(**نوٹ**) شیخ کی صورت اور اس کی روحانیت کی معرفت یہ خود ایک مستقل علم ہے جس کے بعد معرفت الٰہی کا بہت بڑا دروازہ کھلتا ہے۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی

۲۶/رجب ۱۴۱۲ھ

☆☆☆☆☆

یہ خط ایک عالم کے نام لکھا گیا ہے، جو کبھی میرے رفیق درس تھے، بعد میں انھوں نے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ میرے سر پر انھوں نے سیاہ عمامہ دیکھا تو بہت خفا ہوئے، اور مجمع عام میں خفگی کا اتنا شدید اظہار کیا کہ الامان والحفیظ، اس وقت میں نے خاموشی اختیار کی، بعد میں یہ خط ان کے نام ارسال کیا جس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ (اعجاز احمد اعظمی)

برادر مکرم فاضل جلیل!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ میں بعافیت تمام جہانا گنج سے غازی پور پہونچ آیا، جہانا گنج میں تو اتنی مصروفیت رہی کہ آپ کی مختصر ملاقات کی یاد تازہ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ غازیپور میں اطمینان حاصل ہوا تو آپ کی یاد حافظہ کے پردے پر ابھری، میں سوچنے لگا کہ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی اور اتنی ناخوشگوار! مجھے بہت شرمندگی ہے کہ جو مسئلہ

زیر بحث آیا تھا، وہ میرے عمل سے قطع نظر اور میری اگلی پچھلی عادات سے الگ ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ عمامہ باندھنا شروع کرنے سے پہلے میں نے اس مسئلہ کے اطراف وجوانب کی اپنی بساط بھر تحقیق کر لی تھی، اس پر آپ خفا ہونے لگے اور کچھ ایسی باتیں آپ سے صادر ہونے لگیں جن کی مجھے توقع نہیں تھی، اس سلسلے میں مزید اتنی گزارش اور سن لیجئے!

کوئی خاص رنگ کسی قوم کا شعار بن چکا ہو، تو کیا محض اس بنا پر اس رنگ کا ہر لباس ترک کر دیا جائے گا خواہ وہ رنگ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو؟ اور خواہ رنگ کے علاوہ اس کی تمام اوضاع میں تبدیلی پیدا کر لی گئی ہو؟ اس سلسلے میں کوئی صراحت آپ کے پیش نظر ہو تو اپنی معلومات میں اضافہ چاہتا ہوں۔

خاص طور سے عمامہ کے سلسلے میں، میں نے اسی وقت مدرسہ میں آ کر شمائل ترمذی میں ''عمامۂ نبوی'' کو تلاش کیا، اس میں بجز سیاہ رنگ کے اور کسی رنگ کا ذکر ہی نہیں، اس وقت میرے پیش نظر شمائل نہیں ہے، ورنہ دو چار احادیث ہدیۂ خدمت کرتا، سفر میں آپ نے سفید عمامہ کا استعمال فرمایا ہے، اس کا ذکر علامہ زرقانی نے مواہب لدنیہ کی شرح میں فرمایا ہے، اس میں ملاحظہ فرمالیں۔

''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب'' حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے، اس میں مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کا ایک رسالہ بتمامہا منقول ہے، رسالہ کا عنوان ''شیم الحبیب'' ہے، اس میں صحیح روایات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے شمائل وخصائل کو مختصراً جمع فرمایا ہے، عمامہ کے سلسلے میں اس کی تھوڑی سی عبارت ملاحظہ فرمائیے!

وروی عن ابن عباس أنه (ﷺ) کان یلبس القلانس تحت

العمامة ویلبس العمامة بغیر القلانس و کان له عمامة سوداء۔ (حضرت ابن عباس ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمامہ کے نیچے ٹوپی پہنا کرتے تھے، اور بغیر ٹوپی کے بھی عمامہ باندھتے تھے، اور آپ کے پاس سیاہ عمامہ تھا) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ’’چونکہ ایک روایت میں اس کی (یعنی بغیر ٹوپی کے عمامہ باندھنے کی) ممانعت آئی ہے اس لئے اس کو کسی خاص حالت عذر وغیرہ پر محمول کیا جائے گا۔

معلوم نہیں فقہاء احناف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تاہم ہمارے لئے ان کی تصریحات بشرطیکہ کسی نص صریح کے معارض نہ ہوں...... ایسا تعارض جس کی تطبیق نہ ہو سکے...... پسند ہیں۔ علامہ شامی **کتاب الحظر والاباحة فصل فی اللبس** میں لکھتے ہیں کہ **ویستحب الابیض وکذا الاسود لانه شعار بنی العباس ودخل علیه الصلوٰة والسلام مکة وعلیٰ راسه عمامة سوداء۔** صاحب تنویر الابصار لکھتے ہیں کہ **وکره لبس المعصفر والمزعفر الاحمر والاصفر للرجال ولاباس بسائر الالوان۔**

اب آپ بتائیے ان علماء وفقہاء کو شیعوں کے شعار کی خبر نہ تھی؟ یا جو انھوں نے لکھا غلط لکھا، میرے خیال میں آپ اس کی ہمت نہ کریں گے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق اگر آپ کے پاس ہو تو منتظر ہوں، اپنے اکابر میں حضرت گنگوہیؒ جو غایت درجہ متبع سنت بزرگ تھے کتابوں میں تصریح دیکھی کہ ان کا عمامہ سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ مفتی صاحب مبارکپوری (حضرت مفتی محمد یٰسین صاحبؒ) کا عمامہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں، اب ایک اور گزارش بطور نصح نصیح کے یہ بھی گوش گزار کر لیجئے کہ خلق وخالق دونوں کے یہاں مرتبہ ومقام آدمی کے اخلاق عالیہ سے حاصل ہوتا ہے، آپ جیسے حضرات سے جس اخلاق کی توقع آدمی کو رہتی ہے اس کو نہ پا کر آدمی خوامخواہ بدگمان ہوتا ہے، میں تو

پہلے ہی برا تھا اور اب اس سے کہیں زیادہ برا ہوں، لیکن کاش آپ نے کسی بھلائی کا ثبوت دیا ہوتا، آپ کی تیز تیز باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ پہلے سے بھرے بیٹھے تھے، آپ خود سوچئے! یہ طرز کلام مناسب تھا، آپ پھر ناراض ہو جائیں گے، لیکن کیا کروں، کبھی آپ یہ سوچتے کہ ؎

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

میری تو آپ جتنی زیادہ برائی کریں گے اس سے زیادہ کا مجھے پہلے ہی سے اعتراف ہے، دور کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہوں۔ دو چار متعین طور پر اور بتا دیں گے تو انھیں بھی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ **وأسال الله التوفيق والهداية**

تشبہ کے سلسلے میں اتنی بات اور عرض کردوں کہ وضع کی تبدیلی سے بھی تشبہ ختم ہو جاتا ہے، عمامہ مشرکین بھی باندھتے تھے، اہل کتاب بھی۔ مسلمانوں کو جب عمامہ باندھنے کا حکم ہوا تو تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لی گئی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: **فرق مابيننا وبين المشركين العمائم على القلانس**، اگر صرف ٹوپی کے رکھنے سے وضع کی تبدیلی ثابت ہو سکتی ہے اور تشبہ ختم ہو سکتا ہے تو ہمارے تعمیم اور روافض کے تعمیم میں تو کھلا ہوا فرق ہے، روافض شملہ نہیں لٹکاتے اور ہم شملہ لٹکاتے ہیں، ٹوپی کا رکھنا تو ایک پوشیدہ امر ہے اور شملہ تو بالکل کھلی چیز ہے۔ مولانا یہ ضد نہیں تحقیق ہے، اس کے خلاف کوئی تحقیق آئے گی بشرطیکہ وہ صحیح ہو تو مجھ سے زیادہ تسلیم کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

میرے خط سے ناگواری تو ضرور ہوگی، مگر معاف کر دینے میں کیا مضائقہ ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی / ۲۹؍صفر ۱۴۰۳ھ

مدرسہ دینیہ شوکت منزل، غازی پور

یہ ایک مکتوب ایک مدرسہ کے حضرات اساتذہ کرام کے نام لکھا گیا۔

حضرات احبابِ کرام واساتذۂ مدرسہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

آپ حضرات سے بہت عرصہ ہوا کہ ملاقات نہیں ہوئی، اور اِدھر مستقبل قریب میں بھی ملاقات کے آثار نہیں محسوس ہوتے، حضرت اقدس ناظم صاحب مدظلہٗ نے مدرسہ کی بابت چند کلمات تحریر فرمائے تھے، اس سے تأثر ہوا، تو بے اختیار جی چاہا کہ حضرت کی خدمت میں جو لکھنا ہے وہ تو خیر ہے ہی، آپ حضرات سے بھی چند باتیں عرض کردوں، گوکہ میری ایسی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ آپ حضرات کو براہ راست مخاطب کرسکوں، میں بھی ایک مدرسہ کا مدرس ہوں، آپ حضرات بھی میری طرح مدرسہ اور علم دین کی خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں، جو باتیں میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، ان کا میں اس سے زیادہ محتاج ہوں، جتنے آپ حضرات محتاج ہیں، ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپ حضرات کو مجھ سے محبت ہے، اور خصوصی محبت ہے، اور میں بھی دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں، بس یہی چیز ہے جس نے براہ راست تخاطب پر آمادہ کیا ہے، مجھے امید ہے کہ میری کسی بات سے آپ کو ناگواری نہیں ہوگی، کیونکہ محبت تلخیوں کو بھی گوارا بلکہ خوشگوار بنادیتی ہے۔

سب سے پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ آپ حضرات معلم ومربی ہیں، جن لوگوں سے متعلق تعلیم وتربیت کا کام ہو، انھیں دوسروں کی تربیت سے پہلے خود اپنی تعلیم وتربیت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے، آپ کسی وقت یہ تصور دل میں نہ لائیں کہ آپ کی تعلیم وتربیت ہوچکی، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں، علم میں اضافہ کی کوشش

کرتے رہنا چاہئے ، اور اخلاق تو ایسی چیز ہے کہ زندگی بھر اس میں کوئی نہ کوئی عیب دکھائی دیتا رہے گا، پوری توجہ کے ساتھ اپنے علم واخلاق کو بڑھانے اور سدھارنے کی محنت میں لگے رہئے۔ علماء واساتذہ کیلئے اخلاق کی بنیاد دو چیزیں ہیں ، تواضع اور ترکِ حسد۔ یہ بنیاد اوروں کیلئے بھی ہے، مگر طلبہ واساتذہ کیلئے اس کی حیثیت خصوصی بنیاد کی ہے، تواضع کا مطلب یہ کہ آدمی اپنی کوئی فضیلت دوسروں پر نہ سمجھے، اور اس کی اصل یہ ہے کہ آدمی غلام اور بندہ ہے، غلاموں کی نگاہ ہمیشہ اپنے مالک پر ہوتی ہے، مالک کے سامنے ہوتے ہوئے، کوئی غلام، اپنے جیسے غلام پر فوقیت جتلانے کی جرأت نہیں کرتا، اور یہ تو آپ اپنے شاگردوں میں بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے سامنے کسی طالب علم کو جرأت نہیں ہوتی کہ دوسرے طالب علم پر برتری ظاہر کرے، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو آپ کے غصہ کی حد نہیں رہتی ، بس یہی حال ہمارا اللہ کے سامنے ہونا چاہئے ، اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور ہم غلام ہیں، اور ہمہ وقت اللہ کی نگاہ میں ہیں ، ایسی حالت میں یہ بات بہت نازیبا ہے کہ ہم کسی پر بڑائی ظاہر کریں، اس ضابطہ میں وہ بھی شامل ہیں، جو ہم سے عمر، علم اور مرتبے میں بڑے ہیں، اور وہ بھی داخل ہیں، جن کو عرفاً ہمارے برابر سمجھا جاتا ہے، اور وہ بھی شامل ہیں جو ہم سے چھوٹے ہیں ، یعنی طلبہ واولاد وغیرہ۔ البتہ یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا رنگ جدا جدا ہوگا۔ لیکن بہر حال اپنے کو جھکا کر رکھنا ہی عبدیت ہے، آدمی کو جب یہ تصور قائم ہو جاتا ہے کہ سب سے چھوٹا میں ہی ہوں، تو بہت سے رذائل خود بخود دفع ہو جاتے ہیں، تواضع کی ضد کبر ہے ، کبر سے غصہ، غیض وغضب ، جوش انتقام ، ظلم وغیرہ پیدا ہوتے ہیں ، تواضع آجائے تو یہ دشمنانِ دین واخلاق اپنے آپ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، تواضع ہر حسن خلق کی بنیاد ہے، اور حسن خلق پر اللہ کی رحمت برستی ہے، اور بدخلق سے اللہ کی رحمت

دور ہوجاتی ہے، اور ہم کو مدرسہ میں رہ کر اللہ کی رحمت کی کس قدر ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے، یہاں پر ہماری کوئی آمدنی تو ہے نہیں، سوائے اس کے کہ لوگوں کے ذریعے ہماری روزی مہیا کرائیں، اور ہمارے کام کے لئے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالیں کہ وہ اپنے بچوں کو ہمارے سپرد کرجایا کریں۔ پس جو کچھ ہم کو مل رہا ہے۔ خواہ وہ ہماری معاش ہو، یا ہمارے طلبہ ہوں، یہ سب براہ راست اللہ کی رحمت کا کرشمہ ہے، اس میں ہماری قوت بازو کا کوئی دخل نہیں ہے، جب یہ ہے تو ہم پر قطعی لازم ہے کہ صرف وہی کام کریں، جس سے اللہ کی رحمت برسا کرے، اور ہر اس کام سے دور رہیں، جس سے نزول رحمت میں رکاوٹ ہوتی ہو۔

اور حسد کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کا زوال چاہے، یہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا ہے، خواہ دل سے خواہ زبان سے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو فلاں نعمت سے کیوں نوازا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کس قدر مہلک ہے، کوئی مسلمان اس سے ناواقف نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ مرض علماء واساتذہ میں بڑا طاقتور ہوتا ہے، اگر ان دونوں دشمنوں سے نجات مل جائے تو مدرسہ کی فضا جنت بن جائے۔

(۲) تعلیم وتدریس ایک ایسا منصب ہے، جو خدا کی طرف سے سونپا جاتا ہے، اس کا عوض اور معاوضہ اللہ کے ذمے ہے، اسی لئے بعض ائمہ کے نزدیک تعلیم پر اجرت لینا سرے سے جائز نہیں ہے، لیکن انسانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے، ایک دنیاوی معاوضہ بھی طے کردیا جاتا ہے، تعلیم کسب معاش ہرگز نہیں ہے، اسی لئے تعلیم وتدریس کا مدار اس ضرورت پر کبھی نہیں رکھنا چاہئے، یہ اہل انتظام کی ذمہ داری ہے کہ بقدر وسعت اس کی تکثیر کا اہتمام کریں، لیکن اساتذہ کو تعلیم تو خالصاً لوجہ اللہ دینی چاہئے، اور اس کے بعد جو کچھ بقدر قُوتِ لَایَمُوت مل جائے، اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر گزار ہونا

چاہیے، اللہ تعالیٰ اپنے خادموں کو کبھی رسوا نہیں کریں گے، مال کی بہتات تو نہیں ہوگی، لیکن واقعی ضروریات بھی کبھی بند نہیں ہوں گی۔ حرص وطمع سے الگ ہوکر بے نیازی کے ساتھ دین کی خدمت کیجئے، زیادہ دن نہیں گزرے گا کہ دنیا قدموں پر نثار ہونے لگے گی۔ مجھے اس کا خوب تجربہ ہے، مال کی حرص نے علماء کے وقار کو پامال کررکھا ہے، عوام میں ان کا پانی اتر گیا ہے، اگر یہ مستغنی ہوتے، اپنے فقر وفاقہ پر صبر ورضا کے ساتھ دین کی خدمت کرتے ہوتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں توہین وذلت کی نگاہ سے دیکھتا۔

(۳) اساتذہ نائب رسول ہیں، اور طلبہ مہمان رسول ہیں، اب یہ سوچئے کہ اگر یہ طالب علم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بلکہ انھیں الگ کرکے خود اپنے بارے میں سوچئے کہ ہم اگر طالب علم بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم آپ کی طرف سے کیا سلوک پاتے۔ یا ہم آپ سے کیا سلوک چاہتے، رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ تو اپنے شاگردوں اور صحابۂ کرام کے ساتھ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نے ہمیشہ اپنے لوگوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا ہے، حضرت انسؓ جنھوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت دس سال کی عمر سے کی ہے، نہ جانے کتنا کتنا کام بگڑتا رہا ہوگا، مگر فرماتے ہیں کہ مارنا تو درکنار حضور اکرم ﷺ نے کبھی مجھے ڈانٹا اور گھڑکا تک نہیں، اگر کوئی ڈانٹتا تو اسے منع کردیتے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے پاس دور دراز سے آدمی علم حاصل کرنے آئیں گے، ان کے سلسلے میں خیر اور بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، اس کو تم قبول کرو، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، جب اپنے مہمان کا اکرام کرنا ایمان کا تقاضا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کا کس قدر ضروری ہوگا، ان کو ایذا ہوگی، تو رسول اللہ

ﷺ کو ایذا ہوگی، اوران کوراحت ملے گی تو رسول اللہ ﷺ خوش ہوں گے، اس سلسلے میں اساتذہ سے بہت کوتاہیاں ہوتی ہیں، اول تو طلبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ بدترین جرم ہے، یہ گو بچے ہیں، نادان ہیں، ناواقف ہیں، لیکن دل میں ان کی تحقیر ہرگز نہیں ہونی چاہئے، یہ جس کام کیلئے آئے ہیں، اس نے ان کا مرتبہ بڑھا دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے ساتھ جو شفقت کی ہے، ہم جو طلبہ کے ساتھ برتاؤ کریں تو وہی شفقت اس میں جھلکنی چاہئے، ورنہ نیابت چھن جائے گی، نائب رسول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کام کیا جائے جو اصل اور منیب کے منشاء کے مطابق ہو، ہمارے بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ واقعات تو بے شمار ہیں لیکن میں صرف ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے اکابر طلبہ کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

دیوان عبدالرشید جونپوری قدس سرۂ سلسلۂ قلندریہ کے بہت بڑے شیخ ہیں اور بہت بڑے عالم بھی، انھوں نے زندگی بھر خانقاہ کے ساتھ مدرسہ کا بھی سلسلہ بھی جاری رکھا، انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کی قبر میں وہ پتھر رکھ دیا جائے جس پر طلبہ اپنے جوتے اتارا کرتے تھے، مجھے اس کی برکت سے نجات کی امید ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، خیال فرمایئے ان کے دل میں طالب علم کی کیا وقعت تھی؟ ایک واقعہ اور سن لیجئے! حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہٗ طلبہ کو پڑھا رہے تھے، صحن مسجد میں سبق ہو رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی، سب طلبہ کتابیں لے کر اندر بھاگے، اندر پہونچ کر تپائیاں درست کر کے دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا، وقت کا یہ محدث اعظم، استاذ العلماء، مرجع الخلائق، شیخ طریقت، ولی کامل اپنے طالب علموں کے جوتے اٹھا اٹھا کر سائے میں رکھ رہا ہے کہ وہ بھیگنے نہ پائیں، اللہ اکبر کس قدر تواضع تھی، اور دل میں کیسی طلبہ کی عظمت تھی، یہ نمونے اگر عام ہو جائیں تو ہماری کتنی خرابیاں دور ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ طلبہ سے ان کے تحمل سے زیادہ کام نہ لیا جائے، نہ علم کے سلسلے میں اور نہ خدمت کے سلسلے میں، ان سے کوئی ایسی فرمائش نہ کی جائے جس کو وہ نہ سمجھ سکیں، یا سمجھ لیں تو کرنے میں انھیں دشواری ہو۔ وہ ہمارے غلام نہیں ہیں، عموماً حضرات اساتذہ کو اس کا اہتمام نہیں ہوتا، کبھی طلبہ سے ناصاف گفتگو میں کوئی فرمائش کر دیتے ہیں، وہ اسے سمجھ نہیں پاتے، اور مارے ڈر کے پوچھ نہیں پاتے، اور بعد میں انھیں زجر وتوبیخ اور بعض اوقات ضرب وتنبیہ کا نشانہ بننا پڑتا ہے، یاد رکھئے کہ طلبہ کی غلطیوں کو آپ معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی غلطیوں کو معاف کریں گے، اور اگر آپ ان کی ہر غلطی پر گرفت کریں گے اور سزا دیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ایسا ہی کریں گے، طلبہ کی تعلیم میں بے حد تحمل ہونا چاہئے، مارنا بالخصوص نابالغ بچوں کو بہت ناپسندیدہ امر ہے، بچوں کو زدوکوب سے نہیں پیار ومحبت سے پڑھانا چاہئے، زدوکوب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا دل تعلیم سے اچاٹ ہو جاتا ہے، نہ جانے کتنے لوگ اپنے اساتذہ کی مار پیٹ کی وجہ تعلیم سے بھاگ نکلے، اس کا حساب کون دے گا، میں مطلقاً مارنے کا انکار نہیں کرتا، لیکن بقدر ضرورت ہو اور بے تحاشا مارنے کی ضرورت میں تسلیم نہیں کرتا، اور میں کیا، اللہ اور رسول تسلیم نہیں کرتے، ہم انھیں تعلیم دیتے ہیں، اور ثواب کی امید رکھتے ہیں، ہم انھیں مارتے ہیں اور بے تحاشا مارتے ہیں، اور تمام ثواب کو آگ لگا دیتے ہیں، اوپر سے ظلم کا گناہ لاد لیتے ہیں، ان بچوں کی طرف سے کوئی ہم سے سوال کرنے والا نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ ان کا وکیل اللہ ہے، اللہ کا رسول ہے، اللہ کے دربار میں اگر رسول نے دعویٰ دائر کر دیا تو بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، اگر ہم کو یہ خیال ہو کہ یہ بچے رسول اللہ ﷺ کے مہمان عزیز ہیں تو ہمیں ہرگز جرأت نہ ہوگی کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں، اگر کوئی طالب علم ہماری شفقت کے باوجود نہیں پڑھ سکا تو

انشاءاللہ ہم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر ہماری سختی اور مار پیٹ کی وجہ سے تعلیم سے ہٹ گیا تو دوہرا مواخذہ ہوگا، ایک بے جا سختی کا، دوسرے اس کی تعلیم کے خراب ہونے کا، اور اساتذہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ان کا بے تحاشا پیٹنا کسی ہمدردی کی وجہ سے ہوتا ہے، عموماً ایسا شفائے غیظ کیلئے ہوتا ہے، اس چیز سے میں بہت خطرہ محسوس کرتا ہوں۔

مشہور شاعر علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا، یہ گدائے مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا، دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، اس کے بار بار چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آ کر اسے مارا، اور اس مار پیٹ میں فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا، زمین پر گر گیا، علامہ کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے، اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیر الرسل ﷺ کی امت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدائے دردمند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف حضور رسالت مآب ﷺ سے فریاد کرے گا، اس وقت

اے صراطت مشکل از بے مرکبی   من چہ گویم چوں مرا پُرسد نبی
حق جوانے مسلمے باتو سپرد   کو نصیبے از دبستانم نبرد
درملامت نرم گفتار آں کریم   من رہین خجلت وامید وبیم
باز این ریش سفیدِ من نگر   لرزہ ٔ امید وبیمِ من نگر
از تو ایں کارِ آساں ہم نشد   یعنی آں انبارِ گل آدم نشد
اندکے اندیش ویاد آر اے پسر   اجتماع امت خیر البشر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن   پیش مولٰی بندہ را رسوا مکن

یعنی اے اقبال! بغیر سواری کے راستہ قطع کرنا مشکل ہے۔ مجھ سے نبی ﷺ پوچھیں گے، تو میں کیا کہوں گا، وہ پوچھیں گے کہ حق تعالیٰ نے تم کو ایک جوان مسلمان بیٹا سپرد کیا تھا، لیکن اسے میرے دبستان سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ (تم سے اتنا آسان کام بھی نہ ہوسکا کہ، یعنی مٹی کا ڈھیر تمہاری تربیت میں رہ کر آدمی نہ بن سکا) نبی کریم ﷺ تو نرم گفتاری سے مجھے ملامت کریں گے، لیکن میں شرمندگی اور امید و بیم میں غرق ہوں گا، میرے بیٹے! ذرا اس وقت کو سوچو تو سہی، جب خیر البشر ﷺ کی امت اکٹھا ہوگی، پھر میری سفید داڑھی کو دیکھو اور امید و بیم کے درمیان میرے لرزنے کو دیکھو، باپ کے اوپر یہ نازیبا ظلم مت کرو، مولیٰ کے سامنے اس بندہ کو رسوا مت کرو۔

واقعی معاملہ سخت ہے، یہ بچے اگر کل قیامت کے دن دامن گیر ہوں گے تو جان مشکل میں پڑ جائے گی، ان کے ساتھ طاقت کا استعمال کم سے کم کرنا چاہئے، ہاں! روحانی طاقت، یعنی اخلاق وانسانیت سے زیادہ کام لینا چاہئے، اس سلسلے میں حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہ مولانا فضل حق، ہدیہ سعیدیہ کے مصنف، زبردست عالم ہیں، منطق وفلسفہ اور ادب کے امام ہیں، ان کے والد گرامی مولانا فضل امام صاحب بھی بڑے عالم تھے۔ منطق کی مشہور کتاب ''مرقات'' انھیں کی تصنیف ہے، طلبہ پر بے حد شفقت فرماتے تھے، ان کے ایک شاگرد مولانا غوث علی شاہ تھے، بڑے آزاد مزاج اور دنیا جہاں کے سیاح! وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم رامپور گئے تو مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آ گیا، اپنے والد بزرگوار (مولانا فضل امام صاحب) کو یاد کرکے روتے رہے، ہم نے کہا، مولوی صاحب، آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جا گری تھی، ہنسنے لگے اور فرمایا کہ

خوب یاد ہے، وہ عجیب زمانہ تھا، اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولانا فضل امام صاحب نے ایک طالب علم سے فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو، وہ تھا غریب آدمی، بد صورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند، یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت ومعنیٰ سے آراستہ، چودہ برس کا سن وسال، نئی فضیلت، ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے ملے، اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے، تھوڑا سبق پڑھا تھا کہ بگڑ گئے، جھٹ اس کی کتاب پھینک دی، اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا، وہ روتا ہوا مولانا فضل امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سارا حال بیان فرمایا، فرمایا: بلاؤ اس خبیث کو، مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہوگئے، مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے، تو ظالم عمر بھر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز ونعمت میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا، طالب علموں کی قدر ومنزلت تو کیا جانے، اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ارے طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھو، خیر بھلا جانو گے، اگر ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا، یہ چپ کھڑے روتے رہے، کچھ دم نہیں مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا، لیکن پھر کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا برتاؤ کیا جائے، انھیں خوفزدہ نہ کیا جائے، نہ جانے ان میں کل کون کیا ہونے والا ہے، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے ایک استاذ نے طالب علمی کے زمانہ میں انھیں تھپڑ رسید کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے دیکھا کہ ان کا وہ ہاتھ سوکھا ہوا ہے، دریافت کرنے پر انھوں نے بتلایا کہ عبد القادر کو اس ہاتھ سے تھپڑ مارا تھا، اس کی یہ سزا ملی ہے۔ اس نے شیخ سے جا کر عرض کیا، شیخ ان کی قبر پر تشریف لے گئے، اور بارگاہ الٰہی میں بہت کچھ مناجات کی، جب

ان پر سے یہ سزا ہٹی، بچپن میں بسا اوقات اندازہ نہیں ہوتا کہ کل اس طالب علم کا کیا رتبہ ہوگا، یہاں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے، بات ذرا لمبی ہوگئی، لیکن دیکھتا ہوں کہ حضرات اساتذہ اس باب میں بے اعتدالی کا شکار ہوجاتے ہیں، اسی لئے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کردیا اور بعض لوگ تعلیم وتربیت کے حق میں دوسری کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ کہ طلبہ سبق یاد کریں یا نہ کریں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، اخلاق خواہ ان کے کیسے ہی ہوں، وہ سرے سے روک ٹوک کرتے ہی نہیں، یہ بھی غلط ہے، انھیں اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا چاہئے، ان سے غلطی ہورہی ہوتو روکنا چاہئے اور بار بار چاہئے، یہ نہیں کہ ایک دومرتبہ روکا پھر اکتا گئے نہیں بلکہ جتنی باران سے غلطی ہو اتنی بار ٹوکئے، مگر نرمی سے اور ایسا بھی نہ ہو کہ بالکل پیچھے پڑ جانا محسوس ہو۔ تربیت کا مسئلہ ذرا نازک ہے، تاہم روک ٹوک کرتے رہنا چاہئے، اس سے برائی سمٹتی ہے، اور اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو برائی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا، کچھ اور لکھنا چاہتا تھا، مگر یہاں آکر طبیعت بند ہوگئی، قلم رک گیا، بہت سوچا کہ اور کیا لکھنا چاہئے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب تک بے تکلف لکھا تھا، اب تکلف ہوتا، اس لئے اس تحریر کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی شان میں کوئی نازیبا بات میرے قلم سے نکل گئی ہوتو اسے معاف کریں گے، آپ حضرات کے لئے دعا گو ہوں اور دعاؤں کا ملتجی ہوں۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۳/ذوقعدہ ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆

یہ خط ایک عالم دین کے نام لکھا گیا، جو ایک مدرسہ کے ذمہ دار تھے۔

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد

برادر محترم ومکرم ! **زید مجدکم**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

فون اور موبائل کی بَلا نے خطوط نویسی کی سعادت کو غارت کردیا ہے۔ بہت عرصہ ہوا کوئی خط نہیں لکھ سکا ہوں، نہ مختصر نہ مفصل! آپ کے خط نے طبیعت کو گرمایا، جی میں آیا کہ فوراً قرطاس وقلم بہم کروں، اور جس طرح آپ نے دردِ دل کی داستان سنائی ہے، میں بھی اس کا دوسرا باب رقم کردوں، مگر اس وقت جلالین شریف کی شرح کی دھن لگی ہوئی ہے، اس کی مشغولیت اور بعض خصوصی مہمانوں کی آمدورفت نے اس کی مہلت نہیں دی، آج جمعرات ہے، تقاضائے قلب ہوا کہ آج اس قرض کی ادائیگی کردوں، کچھ خیالات ہیں، جو آپ کی داستان پُرملال پڑھنے کے بعد دل ودماغ میں گردش کررہے ہیں، انھیں سینۂ قرطاس پر ثبت کرنا چاہتا ہوں، ترتیب کی ذمہ داری نہیں لیتا، اور اس کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ معلوم نہیں آپ کے مزاج اور آپ کی طبیعت کے موافق یہ تحریر ہوگی یا نہیں! اگر ہوتو سبحان اللہ، ماشاء اللہ! اور اگر نہ ہو اور میرا قلم کہیں آپ کے لئے باعث تکلیف ہوجائے تو پیشگی معذرت!

بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو دیکھا ہے، آپ سے ملا ہوں، آپ کا مہمان رہا ہوں، لیکن دوستوں اور عزیزوں کیلئے میری آنکھ میں حسن ہی حسن ہے، مجھے ان کی کوئی کمی اور خامی نظر نہیں آتی، تو اس صورت حال میں، آپ کو کیا نصیحت یا فہمائش

کروں، لیکن جو حالات وواقعات آپ نے لکھے ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے، جس سے آپ کو تسلی بھی ہو، کام کا راستہ بھی کھلے، پس میں کچھ عمومی باتیں لکھوں گا، ان سے آپ اپنا مطلب اخذ کرلیں، خدا کرے آپ کے مطلب کی کوئی بات ان خیالات میں آجائے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑے باپ کی جانشینی بخشی ہے، اس جانشینی میں مدرسہ بھی ہے، عقیدہ بھی ہے، تربیت بھی ہے، لوگوں کی محبت وعقیدت بھی ہے، بہتوں کی عداوت بھی ہے، اس جانشینی میں علم وفضل کے ساتھ ساتھ، ایک ماحول بھی ملا ہے، جو عجیب جہل وبدعت اور رفض کی وحشت کا مجموعہ ہے، اس ماحول میں دین خالص کا کام کرنا، اور اپنے دامن کو آلودگیوں سے بچائے رکھنا، ایک کام ہے جان جوکھم کا! پھر آپ کی ایک طبعی خوبی یا کمزوری یعنی سفر کرنے سے گریز پائی؛ اس نے اقامت وطن کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کردیا ہے، اس صورت حال میں آدمی کیا کرے؟ اسی کو سامنے رکھا، اور خیالات ذھن میں امنڈنے لگے انھیں بے ترتیب سہی لکھے دیتا ہوں۔

میں جب آپ کا خط پڑھ رہا تھا، تو میرے ذہن میں ایک آیت مسلسل جگمگا رہی تھی۔ آپ وہ آیت سنئے! تفسیر وتشریح کی حاجت نہیں، مگر اس کے تعلق سے کچھ کہوں گا۔ آیت شریفہ یہ ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ج فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي
الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ O

اگرچہ آپ کو ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے، مگر چاہتا ہوں کہ ترجمہ بھی لکھتا چلوں، بات سے بات پیدا ہوتی ہے، شاید ترجمہ سے آیت شریفہ کے نکتوں کی طرف تجدید نگاہ ہو، فرماتے ہیں:

> (اے پیغمبر) یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کیلئے اس قدر نرم مزج واقع ہوئے، اگر تم سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے، تو لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے (ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھنچتے، جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں) پس ان سے درگزر کرو، اوران کیلئے (اللہ سے) بخشش بھی طلب کرواور معاملات میں ان سے مشورہ بھی کیا کرو، پھر جب تم نے کوئی عزم کرلیا، تو اللہ پر بھروسا کرو، یقیناً اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، جواس پر بھروسہ رکھنے والے ہیں۔

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ مزاج کی نرمی اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے، جس قدر مزاج میں نرمی ہوگی لوگوں کی طبیعتیں اس کی طرف کشش محسوس کریں گی، اور والہانہ محبت کا انداز اس کا ہالہ بنے گا۔ مزاج کی نرمی کا پہلا اثر کلام کی نرمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، ملنے جلنے والے، پاس میں رہنے والے، دور سے آنے والے، معاملہ کرنے والے، گھر والے، باہر والے سب کا سابقہ جس چیز سے سب سے زیادہ پڑتا ہے، وہ کلام ہی ہے، تو مزاج کی نرمی جب کلام میں گھلتی ہے، تو آدمی پیکر جمال بن جاتا ہے اور لوگ پروانہ وار اس پر نچھاور ہوتے ہیں۔ یہ وصف کمال، بدرجۂ اتم، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا، اب جس کو ان سے جتنا قرب ہوگا، اتنا ہی وہ نرم مزاج اور شیریں کلام ہوگا۔ اس صفت کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے، کیسا ہی غصہ اور طیش کا موقع ہو؛ نہ دل کی نرمی میں کوئی فرق آئے، نہ کلام کی شیرینی میں کوئی تلخی شامل ہو،

یہاں مجھے ایک مشہور حدیث یاد آرہی ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے، امام ترمذیؒ نے سورہ ص کی تفسیر میں اسے نقل کیا ہے، حدیث طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز کے لئے قدرے تاخیر سے تشریف

لائے، نماز کے بعد آپ نے سب کو روکا اور فرمایا کہ میں سویرے اٹھ کر نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے ہلکی سی اونگھ آ گئی، میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھا، حق تعالیٰ نے پوچھا کہ ملاء اعلیٰ کے لوگ کس مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا، حق تعالیٰ نے اپنا دست مبارک میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھا اور مجھ پر دنیا کی چیزیں روشن ہو گئیں، پھر مجھ سے فرمایا اب بتاؤ، گفتگو کفارات اور درجات کے بارے میں ہو رہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ سنا تھا، بتایا، تو درجات بلند کرنے والی چیزیں جو فرشتوں کی اس محفل میں مذکور ہوئیں وہ تین باتیں تھیں: **إطعام الطعام، لین الکلام، والصلوٰۃ باللیل والناس نیام** ۔ کھانا کھلانا، نرمیٔ کلام۔ اور جب لوگ سو رہے ہوں تو رات کے اوقات میں نماز۔

فرائض کے بعد یہ ایک مختصر سا نسخہ ہے، جس سے درجات بلند ہوتے ہیں، اور مقبولیت ومحبوبیت من عند اللہ نازل ہوتی ہے، اتنا لکھ چکا تھا کہ ایک آیت اور ذہن کے افق پر چمکی، سورۂ احزاب کی آیت ہے:

يَـاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْ ا اتَّقُوْاللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْداً يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُم وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً۔

اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور بات درست بولو، (اس کے نتیجہ میں) اللہ تمہارے کاموں کو سنوار دیں گے، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے، اور جو کوئی اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے یقیناً اسے بڑی کامیابی مل گئی۔

تقویٰ کا محل قلب ہے، اور درست باتوں کا محل زبان ہے، انسان کے جسم میں وہ بنیادی چیز جس سے انسان انسان بنتا ہے یہی دونوں چیزیں ہیں، ان دونوں

کے درست ہونے کے بعد اس قادر مطلق پروردگار کا وعدہ ہے کہ باقی تمہارے کاموں اور درستگی کا ذمہ ہمارا ہے۔

دل کی زمین نرم ہوتی ہے، تو اس میں محبت کا بیج خوب جمتا ہے، پھر وہ سایہ دار درخت بن کر دائرہ بڑھاتا رہتا ہے، دنیا میں یہی ایک چیز ایسی ہے جس کا بازار ہمہ دم گرم رہتا ہے، آدمی محبت کرتا ہو، تو اس کا سایہ ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اور اس کی حلاوت سب کو بھلی معلوم ہوتی ہے، محبت کا خاصہ ہے کہ اس سے خالق بھی راضی ہے اور مخلوق بھی خوش ہے، قلب شاید بنا ہی اس لئے ہے کہ آدمی اپنے خالق و مالک سے محبت کرے، اور پھر اس کے واسطے سے اللہ کی مخلوق سے بھی محبت کرے، خالق سے محبت ہوئی، تو ان کی خوشنودی حاصل ہوئی، مخلوق پر محبت کی پھوار پڑی تو وہ نہال ہوئی۔

قلب کی نرمی اسے زرخیز بناتی ہے، پھر اللہ کا حکم آتا ہے **فاعف عنهم**، مخلوق سے خطا ہوتی ہے، اس خطا کی وجہ سے تکلیف بھی پہونچ جاتی ہے، مگر دل کا حوصلہ بلند ہونا چاہئے، دل تنگ نہ ہو، تکلیف اور غصہ دل میں جمنے نہ پائے، معاف کردو، درگزر کردو، دل صاف ہوجائے گا۔ معاف کرنا، بڑا حوصلہ چاہتا ہے، خردہ گیری، ہر بات پر گرفت، گرفت پر ٹھہراؤ، معاف کرنے سے پہلوتہی، یہ وہ باتیں ہیں، جن سے حوصلہ کی پستی ٹپکتی ہے اور ساتھ والوں کا دل ٹوٹ جاتا ہے، حوصلہ بلند ہوتا ہے، تو مخلوق کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہوا آدمی سیدھا خدا تعالیٰ کے حضور پہونچتا ہے، تکلیف و آرام سب انھیں کی طرف سے پاتا ہے، مخلوق کی غلطیوں میں بھی وہ مشیت کی کارفرمائی دیکھتا ہے، پھر وہ سب سے اپنی نگاہ ہٹا کر اسی دربار میں نگاہ جما دیتا ہے، پھر نفع ہے، تو ان کی نگاہ کرم ہے، ضرر ہے، تو ان کی مشیت ہے، اور بندہ کو آقا کی مشیت پر راضی ہی رہنا ہے، ہر حال میں نگاہ وہیں جمائے رہنا اور نفع وضرر کو انھیں کے

حوالے کرنا توکل ہے، توکل سے بھی آدمی کے حوصلے کو بلندی ملتی ہے، حوصلہ بلند ہوتا ہے، تو آدمی خودرائی نہیں کرتا، اعجاب رائے میں مبتلا نہیں ہوتا، اپنے لوگوں سے مشورہ لیتا ہے، ان کی رائے معلوم کرتا ہے، اور سب کو ساتھ لے کر باہمی رضامندی سے کوئی فیصلہ کرتا ہے، اور جب کسی بات کا فیصلہ ہوگیا، تو اس پر پختگی سے جمتا ہے، معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہے، انھیں پر اعتماد کرتا ہے۔

دنیا میں کام بالخصوص اجتماعی کام اسی طور ہوتا ہے، مرحوم اقبالؔ نے اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

آیت کریمہ کے متعلق جو کچھ سوچا تھا وہ لکھ چکا، باتیں تو ابھی اور ہیں، تلاش کیجیے گا، تو اسی تحریر کی تہوں میں وہ بھی مل جائیں گی، آیت کریمہ کے جلو میں ایک حدیث بھی حافظہ کے پردہ پر روشن ہوئی، وہ بھی ملاحظہ فرمالیں:

حضرت سہل بن سعد ؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اکرم ﷺ کے پاس حاضر خدمت ہوا، اس نے دریافت کیا کہ حضرت! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے کہ اس کے کرنے سے، اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت فرمائیں اور لوگ بھی محبت کریں، آپ نے اس پر دو باتیں ارشاد فرمائیں:

(۱) **إزهد في الدنيا يحبک الله** ۔ دنیا میں زہد یعنی بے رغبتی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔

(۲) **وازهد فيما عند الناس يحبک الناس** ۔ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اس سے بے رغبت ہوجاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے۔ (رواہ ابن ماجہ)

یہ تحصیل محبت کا نسخۂ کیمیا ہے، جو زبان نبوت سے صادر ہوا ہے، اس کے

برحق ہونے اور کامیاب ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، واقعی دنیا قابل اعتنا چیز نہیں ہے، اس کے ساتھ اعتناء صرف اس حیثیت سے اور اس درجے میں ہونا چاہئے کہ آخرت کا سامان تیار کر سکے، خود یہ نہ مقصود ہے نہ مرغوب! مرغوب ومقصود تو آخرت ہے، خوشنودیٔ الٰہی ہے۔

اسی طرح جو چیز ہماری جیسی مخلوق کے نصیب میں ہے، ہم اس پر حرص وطمع کی نگاہ کیوں ڈالیں، جہاں سے وہ چیز انھیں ملی ہے، ہمیں بھی وہیں سے مل جائے گی، اور اگر ہمیں نہیں ملتی تو بھی ہم کو مخلوق سے دل سے چھیننے کا کیا حق ہے؟

اللہ کی شان یہ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے ان سے مانگئے، تو وہ خوش ہوتے ہیں، دینا نہ دینا ہماری مصلحت پر مبنی ہوتا ہے، لیکن ان کو خوشی تو ہو ہی جاتی ہے۔

اور مخلوق کا حال یہ کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اس کو مانگئے تو اسے گرانی ہوتی ہے، اور اگر مخلوق کو اطمینان ہو جائے کہ یہ شخص ہم سے کچھ نہیں مانگتا، اور نہ مانگے گا، تو یہ بات اس کی خوشی اور محبت کا باعث ہوگی۔

آپ کے سامنے میں نے پورا وعظ کہہ ڈالا، معلوم نہیں میں نے مناسب کام کیا یا نامناسب؟ مگر دل میں ایک بے چینی تھی میں نے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے پیشگی معذرت کر چکا ہوں، پھر معذرت خواہ ہوں۔

اس عام بات کے بعد کچھ باتیں خط کے مندرجات کے متعلق عرض کردوں۔

مدرسہ کے لئے سرکاری امداد کے سلسلے میں آپ کا جو خیال اور نظریہ ہے، اس پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ اس میں ذرا بھی مداہنت نہ کریں، مدرسہ بند کرنا منظور، مگر حکومت کا نجس پیسہ لینا گوارا نہیں، یہ نرسری والا مشورہ بھی غلط ہے۔

آپ نے جو طریقہ بلکہ جو مسلک بصیرت کے ساتھ اختیار کیا ہے، اس پر قائم رہئے۔ اللہ کی رضا مطلوب ہے، کسی کی خوشامد نہیں۔

روزانہ صلوٰۃ التوبہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، کبھی جب گناہ ہو جائے، اور متیقن طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے اس وقت نماز پڑھ کر خواہ وہ فرض ہو، سنت ہو، یا نفل ہو، پڑھ کر صدق دل سے توبہ کر لی اور بس، نیز جب کوئی گناہ یاد آئے، یا احساس ہو تو حضور قلب سے چند بار استغفار کر لیں، کافی ہے، البتہ اس کی کوشش کریں کہ اخیر شب کا تھوڑا سا سہی حصہ نصیب ہو جائے، دو ہی رکعت سہی، بلکہ حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ کے بقول ایک ہی رکعت سہی! رات کو سویرے سونے کی کوشش کریں، عشاء کے بعد عمومی گفتگو اور ملاقات معمولات کے خانے سے حذف کر دیں، استثنائی صورتیں علیٰحدہ ہیں۔

دعاؤں کا البتہ خصوصی اہتمام کریں، اپنی عبدیت، بے چارگی، ناکارگی اور بے بسی کا احساس تو رہتا ہی ہے، اس احساس کو خدا کے حضور پیش کر کے اس جناب سے مدد مانگئے، اپنے لئے، مدرسہ کے لئے، اساتذۂ مدرسہ کے لئے، طلبۂ مدرسہ کے لئے، البتہ اس کا معمول بنائیے کہ کبھی کبھی اجتماعاً بھی دعا کا اہتمام ہو، بالخصوص اس وقت جب مدرسہ میں کوئی مشکل صورت حال ہو۔ مومن کا یہ سب سے بڑا ہتھیار ہے، کہاں تک لکھوں، زبانی گفتگو کا موقع ہوتا، تو دعا کے عجیب عجیب محیر العقول تجربے آپ کو سناتا، آپ اس سے قطع نظر کر لیجئے کہ حالات ناموافق ہیں، بہت سے لوگ آمادۂ عداوت ہیں، ستانے کے درپے ہیں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا جب تک مشیت الٰہی نہ ہو، ان تفکرات سے دل و دماغ کو اور ان کے تذکرے سے زبان کو اور مجلس کو آلودہ مت کیجئے، جو کچھ ہو رہا ہے اسے مشیت خداوندی پر محوّل کر کے خود کو متوجہ بجناب الٰہی

رکھئے، اور انھیں سے التجا کیجئے، اور انھیں اپنا وکیل بنائیے، اور **أفوض أمری إلی اللہ ، إن اللہ بصیر بالعباد** کا مراقبہ کیجئے۔

مدرسہ کے ماحول کو محبت اور ہمدردی کی خوشبو اور سایہ سے پُرکشش اور آرام دہ بنائیے، اس کے لئے پہلے آپ کو محنت کرنی ہوگی، پہلے کیا؟ اول وآخر سب! پھر جو لوگ ساتھ دیں ان کی قدر کریں، اور جو لوگ ساتھ نہ دیں ان سے صرف نظر کریں، اور اپنی محبت ان سے بھی برقرار رکھیں، صرف ساتھ نہ دینے سے صرف نظر کریں، کیونکہ استعدادیں منجانب اللہ ہی مختلف ہوتی ہیں۔

اس کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ جو لوگ آپ کے گرد کام کرتے ہیں، ان کے حق میں کبھی حرف شکایت زبان سے نہ نکالیں، ان کے کانوں میں کبھی آپ کی طرف سے کوئی کلمۂ شکایت نہ پہونچے، ان کی کوئی بات ناگوار ہو، تو تنہائی میں بغیر کسی غیظ وغضب کے نرم لہجہ میں فہمائش کردیں، یہ کام کئی بار بھی کرنا پڑے تو بھی لہجہ کی نرمی اور گھلاوٹ میں فرق نہ آئے، اپنے لوگوں کے دل جیت لینا، کام کے آگے بڑھنے کی بنیاد ہے، طلبہ بھی اور اساتذہ بھی محبت کی خوشبو پائیں گے، تو پھر ملنے کو سوچیں گے بھی نہیں۔ ہاں کچھ ایسی طبیعتیں جن میں شر کا مادہ غالب ہوتا ہے، وہ مستثنیٰ ہیں۔

انتظام وتدریس کے ساتھ کچھ تصوف وسلوک کا معمول ضروری ہے، اس سلسلے میں مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے کیا معمولات ہیں، بہرحال ہونا چاہئے، میرے خیال میں عمر کا کارواں نصف صدی پار کرچکا ہوگا، اب آخرت کا غلبہ ہونا چاہئے۔

مدرسے کے سلسلے میں اتنی اور عرض ہے، کہ طلبہ کے طعام اور مدرسین وملازمین کی تنخواہ کے باب میں قلت وسائل اور تنگی مال کا لحاظ نہ کریں، معقول تنخواہ مقرر کریں، طلبہ کے لئے امکان بھر کھانے کا اچھا نظم کریں۔ دلوں کی خوشی کا، تحصیل

مال میں بہت دخل ہوتا ہے، جو تنخواہ آپ مقرر کریں گے، وہ ان کے رزق کا ایک جزو ہی ہوگی، اللہ کو روزی دینی ہے، ایک جزو جو آپ مقرر کریں گے، اسے اللہ تعالیٰ آپ کی طرف منتقل کردیں گے، وہ ان تک آپ کے ذریعے پہونچائیں گے۔ مجھے خوب تجربہ ہے کہ جب مدرسہ میں اساتذہ وملازمین کی تنخواہ بڑھتی ہے، آمدنی میں خود بخود اضافہ ہوجاتا ہے، دل میں قطعاً تنگی کا احساس نہ لائیں، بڑھائیں، پھر دعا بھی بڑھائیں، اس جناب میں کوئی کمی نہیں۔ فرمان نبوی ہے: **أنفق یا بلال و لا تخش من ذی العرش اقلالاً۔**

حضرت بلال ؓ، رسول اللہ ﷺ کے حضور میں ناظم مالیات تھے، اب وہ نہیں رہے، مگر رسول کا دین تو موجود ہے، اس کے بلال، یہی لوگ ہیں، جو دین کے لئے، علم دین کے لئے ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے ہیں، انھیں وہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے جو زبان حق ترجمان حضرت رسالت مآب ﷺ سے صادر ہوئی تھیں:

أنفق یا بلال و لا تخش من ذی العرش اقلالاً۔

بلال خرچ کرو، اور عرش والے سے کسی کمی کا اندیشہ نہ کرو۔

باتیں میں بہت لکھ گیا، خدا کرے آپ کو ناگوارِ خاطر نہ ہو، اور محبت میں ناگواریوں کا کہاں گزر؟ بہت مدت کے بعد اتنا مفصل خط، دل کھول کر اور رہوارِ قلم کی باگ ڈھیلی کرکے، جو کچھ دل میں جمع ہوگیا تھا، لکھا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

اعجاز احمد اعظمی
۲۵؍محرم ۱۴۳۰ھ

* * * * *

گزشتہ دنوں استاذی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب مدظلہٗ کے نام دہلی سے ایک خط آیا، لکھنے والے صاحب کوئی راشد شاز ہیں، ان سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے، ان کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان پر قیادت وسیادت کا بھوت سوار ہے، اس لئے ’’تنصیب امامت‘‘ اور ’’امت کی قیادت‘‘ وغیرہ سے کم کی بات نہیں کرتے، چند روز پہلے ایک دوست نے ان کی ایک کتاب ’’ادراک زوال امت‘‘ مطالعہ کے لئے دی تو اس کے چند ہی ابواب پڑھ کر اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص طبقۂ منکرین حدیث کی صف اول کا آدمی ہے، اور اس نے انکارِ حدیث کے سلسلہ میں اپنے تمام پیش رؤں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، کتاب کو پڑھ کر طبیعت بہت مکدر ہوئی، اس خط کا جواب حضرت مولانا مدظلہٗ نے نہایت تفصیل سے دیا، جو پیش خدمت ہے، راشد شاز کا خط پہلے ملاحظہ ہو، اس سے ان کے افکار ونظریات اور ذہنی کجروی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

گرامی قدر جناب مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذشتہ ایک سال کے دوران مجلّہ ’’فیوچر اسلام‘‘ نے عالمی سطح پر اپنی شناخت ایک ایسے رسالہ کی حیثیت سے مستحکم کرلی ہے جہاں مشرق ومغرب کے اہل فکر مستقبل کے ایجنڈے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کررہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس سلسلۂ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم نے امت مسلمہ کے مستقبل کے سلسلے میں ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا جس میں مختلف حلقۂ فکر کے اصحاب علم ودانش نے اس بارے میں اپنی تجاویز پیش کیں کہ امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کے لئے کیا کچھ کیا جانا چاہئے۔ آنے والے دنوں میں ہم مذاکرہ کی یہ مجلس دنیا کے مختلف دارالحکومتوں میں منعقد کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں، تاکہ اس ظلمت شب سے جہاں اہل زمین فی زمانہ جینے پر مجبور ہیں، ایک نئی صبح کے طلوع کی راہ ہموار ہوسکے۔

مجلّہ ’’فیوچر اسلام‘‘ چونکہ بیک وقت اردو، عربی، اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے جسے دنیا کے مختلف حصوں میں انٹرنیٹ پر لاکھوں قارئین پڑھتے ہیں، اور جسے ہم آنے والے دنوں میں ترکی، بنگالی اور دوسری بڑی زبانوں میں بھی شروع کرنا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ اس بین الاقوامی مباحثے میں آپ کی ضرور شرکت ہو۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ اس سے پہلے بھی ہم نے مجلّہ ’’فیوچر اسلام‘‘ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

’’ہمارے زوال کی تلافی صرف اندرونی مسئلہ نہیں۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت

سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے، اس لئے امت مسلمہ کے موجودہ انتشار اوراس کے فکری زوال کونظر انداز کردینا دنیائے انسانیت کیلئے خطرناک مضمرات کا حامل ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے زوال پر بحث ومباحثہ کا حوصلہ پیدا کریں۔ اپنی طویل تہذیبی تاریخ اور فکری انحرافات کا وحی کی روشنی میں سخت محاسبہ کریں، جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے اور جس کے دل ودماغ کو علمائے متقدمین کی شخصیت نے مبہوت کررکھا ہے، اس کے لئے یقیناً یہ آسان نہیں کہ وہ صدیوں پر مشتمل اپنے تہذیبی اور علمی سرمائے پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ جہاں **قال فلان** اور **روى فلان** پر معاملات فیصل کرنے کا رواج ہو، وہاں ہر مسئلہ پر وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت خواہ کتنی معقول ہو، اجنبی ضرور لگے گی۔ ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو اس پر تجدد پسندی کا گمان ہو، لیکن جو لوگ قرآن مجید میں رسول اللہ (ﷺ) کے مقصد بعثت سے متعلق ارشاد سے واقف ہیں (**ويضع عنهم إصرهم والاغلال التى كانت عليهم**) (اعراف: ۱۵۷) ان کے لئے اس نکتے کا ادراک مشکل نہیں کہ جس طرح قرآن مجید خدا اور بندے کے مابین کسی ربائیت یا پاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح وہ مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے، نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی اجارہ داری ہے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کرے۔ اہل ایمان کو تو چھوڑیئے، اللہ تعالیٰ نے تو حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے۔ **إن الله يفصل بينهم يوم القيامة**

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، دائرۂ وحی سے ہمارے باہر آجانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہوگئے، بلکہ پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی، سخت بحران سے دوچار ہوگئی۔ تاریخ کے اس سب سے بڑے انحراف سے درستگی کے لئے لازم ہے کہ ہم ان اسباب پر ایماندارانہ غور کریں، جس نے ہمیں انسانیت کی قیادت سے ہٹا کر تاریخ کے dustbin میں ڈال دیا ہے۔ تاریخ کے اس بحران عظیم کی درستگی کے لئے اب کیا کیا جائے؟ اور اس کا آغاز کہاں سے ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینے کے لئے ہم نے طے کیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر امت کے علماء ودانشوروں کا ایک مستقل فورم قائم کیا جائے، جہاں ایک نئی ابتداء کے لئے سنجیدہ غور وفکر کی طرح ڈالی جاسکے''۔

اس سلسلے میں مزید تفصیلات انگریزی، عربی اور اردو زبانوں میں ہماری ویب سائٹ www.futureislam.com پر موجود ہے، جسے آپ راست انٹرنیٹ پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ انٹر نیٹ پر آپ کے مضامین کی اشاعت مذکورہ بحث کو آگے بڑھانے کے علاوہ آپ کی بیش قیمت تحریروں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسے قارئین فراہم کرے گی جن تک یقیناً آپ کی تحریر پہونچنے کی مستحق ہے، توقع ہے کہ آپ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہوئے اس بنیادی مسئلہ پر اپنی تحریریں روانہ کریں گے کہ دنیا کی موجودہ بے سمتی کا ازالہ کیسے ہوسکتا ہے، امت مسلمہ کے موجودہ زوال کو کیسے روکا جاسکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کیسے ہوسکتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ آپ ہمارے تجزیے سے اتفاق رکھتے ہوں، اور نہ ہی ہم اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ اس سوال کے مختلف جوابات میں یکسانیت ہوگی، البتہ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے ہر ممکنہ جواب کو سنجیدہ غور وفکر کا مستحق سمجھا جائے۔ آپ کے فی الفور جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

راشد شاز، مدیر فیوچر اسلام ڈاٹ کام

☆☆☆☆☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلوٰة والسلام علیٰ خاتم النبيين و آله واصحابه اجمعين ، امابعد !

گرامی قدر جناب راشد شاز صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

آپ کا مطبوعہ مکتوب ملا۔ اسے پڑھ کر میں نے سمجھنے کی کوشش کی، مگر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ آپ کی دعوت کا کیا مقصد ہے؟ اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اس کے لئے آپ نے کیا طریقۂ کار اختیار کیا ہے؟ آپ شاید تعجب کریں کہ اتنی بلید اور موٹی سمجھ والے کو آپ نے کیوں مخاطب کیا؟ تو آپ کا تعجب حق بجانب ہے، میں بھی حیرت میں ہوں کہ میرے پاس یہ چیستاں اور معمہ کیوں بھیجا گیا؟

آپ کے مکتوب کا اجمالی جواب تو میں نے لکھ دیا، لیکن تھوڑی سی اپنی ناسمجھی کی تشریح بھی پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں، تاکہ میرا ناقابل التفات ہونا پختہ ہو جائے۔

آپ نے جس زبان میں خط لکھا ہے، اس سے مجھے مناسبت نہیں، میں نے ابتداءِ عمر سے قرآن وحدیث کی زبان پڑھی ہے، اور وہی زبان سمجھتا ہوں، آپ کے خط کے وہ الفاظ وکلمات جو مجھے بنیادی اور مرکزی معلوم ہوئے، انھیں میں نے قرآن وحدیث کے الفاظ ومفاہیم کی روشنی میں دیکھنا چاہا، تو وہ مجھے نہیں ملے، حالانکہ آپ نے خط میں قرآن کے ایک دو جملوں کا حوالہ بھی دیا ہے، مگر ان کی روشنی میں بھی آپ کے مدعا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

یہاں میں ان بنیادی الفاظ کو نوٹ کئے دیتا ہوں۔ (۱) مستقبل کا ایجنڈا، (۲) امت مسلمہ کا مستقبل، (۳) تنصیب امامت، (۴) بین الاقوامی مباحثہ، (۵) آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے، (۶) جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے، (۷) کسی ربّائیت وپاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے، (۸) نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے، (۹) اہل ایمان کو تو چھوڑیئے اللہ تعالیٰ نے حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے، (۱۰) ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہو گئے، (۱۱) پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی، (۱۲) دوبارہ تنصیب امامت وغیرہ۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان الفاظ سے آپ نے کیا سمجھانا چاہا ہے، مستقبل کیا چیز ہے؟ ہمارے زمانے کے بعد سے قیامت آنے تک کے زمانے کو آپ نے مستقبل قرار دیا ہے یا دنیا کے بعد والی زندگی کو مستقبل کہا ہے؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا

ہے کہ آپ نے موجودہ زمانے کے بعد سے قیامت آنے تک کے زمانے کو مستقبل کہا ہے، تو اس کا ایجنڈا کیا ہے؟ ساری دنیا پر امت مسلمہ کا سیاسی غلبہ؟ اقتصادی غلبہ؟ یا علمی غلبہ؟ فکری اور تہذیبی وغیرہ صرف خوش نما الفاظ ہیں، جن کا کوئی مفہوم شاید اب تک متعین نہیں ہوسکا، یا اس سے مراد تدین وتقویٰ، صداقت وامانت اور اخلاق حمیدہ میں امامت ہے۔

پوری دنیا پر سیاسی غلبہ اور اس اعتبار سے امت کی امامت کے وعدے سے قرآن وحدیث کے صفحات خاموش ہیں، اور ایسا کبھی تاریخ میں بھی نہیں ہوا۔ اس لئے پوری دنیا پر سیاسی امامت وغلبہ کا خواب دیکھنا، یا اس میں سر کھپانا ایک فضول کام ہے، ہاں جہاں جہاں مسلمانوں کی حکمرانی ہے، انھیں خالص مسلمان بننے، اسلامی قانون کو نافذ کرنے اور یہود ونصاریٰ کی تقلید، ان کے رعب وتسلط اور ان کے خوف ودہشت سے آزاد ہونے کی دعوت دی جانی چاہئے، لیکن آپ نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

اور اگر امامت سے مراد اقتصادی غلبہ ہے، تو یہ چیز مطلوب کیا ہوتی؟ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مطابق تو حرص مال سخت خطرناک ہے، اور فی زمانہ اقتصادی غلبہ مال کی بے تحاشا حرص وہوس کے بغیر ممکن نہیں، انفرادی سطح پر یا اجتماعی سطح پر اصحابِ ثروت کون ہیں؟ یہود ونصاریٰ، اور ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں قومیں مال وجاہ کی جوع البقر میں مبتلا ہیں، اس لئے ہر ناکردنی ان کے یہاں رَوا ہے، تو کیا آپ اسی راہ پر امت کو ڈالنا چاہتے ہیں؟

اور اگر امامت سے مراد علمی امامت ہے، تو آج کل جسے علم کہا جاتا ہے، وہ دنیاوی علوم وفنون ہیں، مثلاً سائنس اور اس کی مختلف شاخیں، ڈاکٹری وغیرہ، ان علوم کا

تعلق صرف دنیا کی زندگی تک ہے، موت کے بعد یہ سب علوم جہالت کے خانے میں چلے جاتے ہیں ان میں امامت مفید تو ہے، مگر امت اسلامیہ کے مقاصد میں نہیں ہے۔

اور دوسری چیز جو حقیقۃً علم ہے، مگر آج کی خدا فراموش اور آخرت سے غافل دنیا اسے علم ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ علم آخرت ہے، اس میں بحمد اللہ آج بھی امامت امت مسلمہ ہی کو حاصل ہے، کوئی اقتداء کرے یا نہ کرے۔

تدین وتقویٰ، صداقت وامانت اور اخلاق حمیدہ میں امامت البتہ مطلوب ہے، مگر وہ نہ عالمی مجلس مذاکرہ سے حاصل ہوگی، نہ بین الاقوامی مباحثہ سے، لیکن آپ کے یہاں اس کا اشارہ بھی نہیں۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، فکری، تہذیبی وغیرہ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں، بے معنی الفاظ! اس لئے وہ درخورِ اعتناء نہیں۔ ’’بین الاقوامی مباحثہ‘‘ میں کیا دنیا کی ہر قوم شریک ہوگی، اگر ایسا ہے، تو اس کا امت مسلمہ سے کیا تعلق؟ وہ تو کفر وشرک کا مجموعی سنڈاس بن کر رہ جائے گا۔

’’پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے‘‘ الفاظ تو بہت خوشنما ہیں، مگر آپ ہی بتائیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کس اعتبار سے مستقبل وابستہ ہے؟ اور کون سا مستقبل؟ اس وابستگی کی خبر کس نے دی، اللہ نے، رسول نے یا آپ نے؟

’’جو امت صدیوں سے فقہی طریقۂ فکر کی عادی ہے‘‘ کیوں صاحب فقہی طریقۂ فکر کا عادی ہونا کوئی جرم ہے، آخر علم فقہ قرآن وحدیث اور سنت نبوی ہی کی صراحتوں، اشاروں سے ماخوذ ومستنبط ہے، فقہی طریق فکر ترجمان ہے، قرآن وسنت کا۔ کیا آپ فقہی طریقۂ فکر سے بغاوت کی دعوت دے کر امت کو قرآن وسنت سے بغاوت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں؟ اگر آپ کہیں کہ

’’ہم وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت‘‘ دے رہے ہیں، تو معاف کیجئے گا یہ امت کو فریب دینا ہے، آپ درحقیقت یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ وحی ربّانی کی روشنی میں علماء اسلاف نے جو طریقۂ فکر متعین کیا ہے، اس سے بغاوت کر کے اس طریقۂ فکر پر آجاؤ، جو ہمارے دل ودماغ کی پیداوار ہے، جس کو اسلاف کے طریقۂ فکر سے بچایا گیا ہے۔ یہ دعوت وحی ربّانی کی طرف نہیں ہے، اس انسانی فکر وفہم کی طرف ہے، جو مغربیت کی چکا چوند اور دنیا پرستی کے شور وغوغا سے مرعوب ہو کر قرآنی تعلیمات اور اسلامی احکام کو بوجھ محسوس کر رہی ہے، اور اسے کسی بہانے سے اتار پھینکنا چاہتی ہے۔

یاد رکھئے اسلاف کے فقہی طریقۂ فکر سے آزاد ہو کر اپنے دل ودماغ کو متحرک کیجئے گا، تو وہ کچھ اور ہی مذہب ہوگا، اسلام نہ ہوگا۔ اور اس مذہب کی امامت سے، جو اسلام نہ ہو، ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

’’جس طرح قرآن مجید خدا اور بندے کے درمیان کسی ربّائیت و پاپائیت کو قابل استرداد سمجھتا ہے، اسی طرح مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے‘‘

بے شک قرآن کریم نے یہودیوں کی احبار پرستی اور عیسائیوں کی رہبان پرستی کا انکار کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: إتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله۔ انھوں نے اللہ کے مدمقابل اپنے علماء اور اپنے درویشوں کو رب بنالیا تھا۔ اس میں مــــــن دون الله کا لفظ بہت اہم ہے، جب کسی بندے کے لئے خدائی اختیارات مان لئے جائیں، تو یہ کفر وشرک ہے، لیکن اگر علماء نے اللہ کے بندے بن کر، اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہوئے، اللہ کے کلام کو سمجھنے کی پوری کوشش کی اور اسی میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کیں، اپنی عمر اسی میں کھپائی، پھر پیروی کرنے بھی والوں

نے انھیں خدا نہیں قرار دیا، بندہ ہی مانا، البتہ اپنے سے زیادہ واقف کار سمجھ کر ان کے علم وفہم پر اعتماد کیا اور ان کی پیروی کی تو قرآن اس کا انکاری کب ہے، وہ تو کہتا ہے: **فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون** ، علم والوں سے پوچھو، اگر تمہیں علم نہیں اور فرمایا: **واتبع سبيل من أناب إلي** ، اس شخص کی پیروی کرو جس نے میری طرف انابت اختیار کی۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ مخلص اور متدین علماء کی پیروی کی جائے، اگر اللہ اور بندے کے درمیان اس واسطہ کو آپ پاپائیت سمجھتے ہیں تو یہ وہم ہے، اسے دور کیجئے۔

یہود ونصاریٰ تو مجموعی طور پر احبار ورہبان کو ارباباً من دون اللہ بنانے میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن امت مسلمہ اجتماعی اعتبار سے اس بیماری سے بحمد اللہ پہلے بھی محفوظ تھی، اور اب بھی محفوظ ہے، کچھ گمراہ لوگ اگر اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہوں تو علماء نے اسے رد کر دیا ہے، اس کی وجہ سے پوری امت کو اس کا مریض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

پاپائیت اور مولویت کو ایک جیسا ادارہ قرار دینا علم وعقل سے تہی دامنی کی دلیل ہے، بحمد اللہ اس امت نے مولویوں کو قرآن وحدیث کا عالم تو مانا ہے، خدا نہیں مانا ہے، اس کے لئے ثبوت درکار ہے کہ قرآن مولویت کے ادارے کا انکاری ہے، یہ قرآن پر غلط الزام ہے، بے جا تہمت ہے۔

’’نہ تو تشریح وتعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے‘‘ یعنی قرآن کی تشریح وتعبیر پر کسی اجارہ داری نہیں ہے، یہ جملہ بیسویں صدی میں ایجاد ہوا ہے، اور اس کو قرآن وحدیث کو بوجھ سمجھنے والوں نے اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ اب ان لوگوں کے لئے ضرب المثل یا

سکہ رائج الوقت بن گیا ہے، جو قرآن کی اور دین کی من مانی تشریح کرنا چاہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ دین اسلام کو اسی طرح مسخ کر دیں کہ جیسا مغربیت زدہ ذہنیتوں نے اپنی صورتوں، سیرتوں اور طور وطریق کو بگاڑ لیا ہے، کہ دیکھنے میں کہیں اسلام کا اثر اور نشان نظر نہ آئے، لیکن مسلمان ہونے کے مدعی رہیں، اسی طرح اسلام کی ایسی تعبیر وتشریح کی جائے کہ دورِ صحابہ کے اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہے، اور دعویٰ کئے جائیں کہ یہ اسلام ہی، بلکہ یہی اسلام ہے۔

اجارہ داری ایک بھونڈے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے علماء اسلام کی توہین ظاہر ہو رہی ہے، ورنہ مطلب یہ ہے کہ علماء نے قرآن وحدیث کی جو تشریح کی ہے، اور احکام اسلام کی جس طرح تعبیر کی ہے، ہم اس کے پابند نہیں، ہم خود بھی جیسے چاہیں تشریح کر سکتے ہیں، اور تعبیر کر سکتے ہیں، اور امت کو چاہئے کہ ہماری تشریح وتعبیر......خواہ علماء کے خلاف ہی ہو......قبول کر لے۔

لیکن اللہ کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ کسی اور فن کی تعبیر وتشریح کی اجازت آپ ہر شخص کو دے سکتے ہیں؟ قانون کی تشریح ایک ڈاکٹر کر سکتا ہے؟ میڈیکل سائنس کی تعبیر وتشریح ایک قانون داں وکیل یا جج کر سکتا ہے؟ سائنسی ایجادات میں کامرس کے محققین دخل دے سکتے ہیں؟ اس زمانے میں یہ تو قاعدہ مسلم ہے کہ ہر فن میں صاحب اختصاص (اسپیشلسٹ) ہونا چاہئے، ایک کے دائرے میں دوسرا دخل نہیں دے سکتا، پھر یہ کیا مذاق ہے کہ دین اسلام اور وحی الٰہی کی تشریح وتعبیر کا حق ہر شخص کو ہو، کیا اس میں صاحب اختصاص کی ضرورت نہیں ہے؟ یہ لوگ جو دنیاوی فنون کے حلقے میں نہایت صاحب عقل ہوتے ہیں، قرآن اور دین کے باب میں زبان کھولتے، اور قلم اٹھاتے ہیں، تو عقل کے دشمن ہوتے ہیں، اور یہی لوگ معزول شدہ

امت کو امامت کے منصب پر دوبارہ فائز کریں گے۔ **إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون**

شاذ صاحب! معاف کیجئے گا، میرا لہجہ گرم ہو گیا، مگر کیا کروں کہ ان بے تکی باتوں پر غیرت کو تاب نہیں رہتی، علماء امت کا وقار گرا کر اور قرآن کی من مانی تعبیر وتشریح کر کے، امت کو امامت کے منصب پر نہیں، دنیا وآخرت کے خسران میں ڈھکیل دیں گے۔

آپ نے لکھا ہے ''اہل ایمان کو تو چھوڑیئے اللہ تعالیٰ نے حلقۂ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے'' اس ارشاد پر غور کر رہا ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی!

آپ کا منشا شاید یہ ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے کسی آدمی کے صحیح العقیدہ ہونے یا بدعقیدہ ہونے کا فیصلہ تو درکنار، اس کی صحیح العقیدگی پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ آپ نے لکھا:

''اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کر سکے''۔

یعنی کسی کا عقیدہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ قرآن کی تعبیر وتشریح کے نام پر کچھ بھی کہتا ہو، کچھ بھی نظریہ رکھتا ہو، اس کی خوش عقیدگی پر شبہ نہیں وارد کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اللہ نے فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور وہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ آپ نے حوالہ بھی دیا ہے: **إن اللہ یفصل بینھم یوم القیامۃ۔**

چلئے چھٹی ہوئی، آپ نے قرآن کے اس جملہ سے جو مطلب اخذ کیا، اور جو تشریح آپ کرنی چاہتے ہیں، اس کی رُو سے حق وباطل کا فیصلہ دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا، قیامت پر یہ فیصلہ اُٹھ گیا ہے، اب کس منہ سے کسی کو کوئی گمراہ اور بدعقیدہ کہے۔

تو پھر ماضی کے ایک گمراہ شخص (۱) کی طرح یہی کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ اس وقت جو لوگ دنیا کی قیادت کر رہے ہیں وہی حق پر ہیں، یا کم از کم یہ کہ انھیں گمراہ نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا ہنود و بت پرست۔

قرآن کی ایسی ہی تعبیر و تشریح ہوگی، تو قرآن کا اور اسلام کا تو کچھ نہ بگڑے گا، اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کر رہے ہیں، لیکن اس طرح کی تعبیر و تشریح کرنے والے کہاں جائیں گے؟ اس پر غور کر لینا چاہیے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ دائرۂ وحی سے کون باہر آ گیا؟ وہ لوگ جو اس خط کے ذریعے دائرۂ وحی میں واپس آنے کی دعوت دے رہے ہیں، یا اس کے مخاطب اہل اسلام؟

خط کی تحریر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ داعی حضرات ہی کچھ باہر نکلے ہوئے ہیں۔

آپ نے طے کیا ہے بین الاقوامی سطح پر امت کے علماء و دانشوروں کا ایک مستقل فورم قائم کیا جائے، جہاں ایک نئی ابتداء کے لئے سنجیدہ غور و فکر کی بنیاد ڈالی جا سکے۔

یہ نئی ابتداء کیا ہوگی؟ کیا سنت ہوگی؟ تب تو وہ بہت پرانی ہے، کیا بدعت ہوگی؟ تب تو وہ قابل رد ہے۔

آپ کی یہ کوشش اگر اسے اہمیت دی جائے تو امت میں ایک انتشار کا پیش خیمہ ہوگی، اس سے زوال کی رفتار مزید بڑھے گی۔ امت کے لئے یہ نئی نئی راہیں مت کھولئے، البتہ اگر اسے اہمیت نہ دی گئی تو فنا ہو کر رہ جائے گی۔

امت مسلمہ کی ترقی اور بہبود کے لئے وہی راستہ اور طریقہ متعین ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے، یعنی ما أنا علیه و أصحابی، وہ طریقہ جس پر میں

ہوں، اور جس پر میرے صحابہ ہیں۔ اس معیار سے جو قریب تر ہو اور جس طریقے میں صحابۂ کرام کے مزاج وطبیعت کی خوبو زیادہ ہو وہی راستہ حق کے قریب ہے، اس کے لئے کسی فورم کی ضرورت نہیں، صحیح تربیت کی ضرورت ہے، اپنی زندگی میں اسی اسلام کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے، جو حضراتِ صحابہ کی زندگیوں میں تھا، وہی اسلام حق ہے۔

فماذا بعد الحق إلا الضلال

شاز صاحب! میں نے اپنی ناسمجھی کی تفصیل لکھ دی، یقیناً آپ کو گرانی ہوئی ہوگی، لیکن جس طرح کی باتیں آپ نے ہمیں سنائی ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی سننے کا حوصلہ پیدا کریں۔

اب سنئے کہ آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے جو الجھن ہوئی وہ تو ہوئی۔ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ ہم لوگوں کا ایمان کیا اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ لوگ اس طرح کے باغیانہ خیالات کا مخاطب ہم لوگوں کو بنانے کا حوصلہ کرنے لگے ہیں، ہم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اور سلف سے خلف تک اجتماعی طور پر، دین کو، ایمان کو، طریق رسول ﷺ کو، دستورِ صحابہ کو جو کچھ پایا ہے، یہ راگنی اس سے بالکل الگ اور بے جوڑ ہے، اسے بھی اگرچہ اسلام اور قرآن کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے، لیکن اسے اصل اسلام اور قرآن سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ان خود ساختہ خیالات کے پھندے سے نکلئے، اور قرآن وسنت کی جو تشریح بالاتفاق چلی آرہی ہے، اس سے انحراف مت کیجئے، فروعی اختلاف کوئی مضر چیز نہیں ہے، اصول میں کوئی اختلاف نہیں ہے، **ماأنا عليه أصحابي** کو خلوص دل سے مضبوط پکڑیئے۔

خدا کے حضور اپنا مصنوعی اسلام لے کر نہ جائیے، وہ قبول نہ ہوگا، وہی اسلام

قبول ہوگا، جوامت میں اجماعی طور پر مقبول رہا ہے۔

ان نئی نئی تشریحات وتعبیرات سے ممکن ہے دولت کے انبار سے آپ مستفید ہوں، خواہشات کی آزادی میں آپ کو لطف آئے، لیکن نہ یہ دولت کام آئے گی، اور نہ شہرت باعث نجات بنے گی، نہ خواہشات کی لذتیں باقی رہیں گی۔ اللہ سے ڈریئے، اور صراط مستقیم پر قائم رہیئے۔

﴿ رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَیْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیاً یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴾

اے ہمارے رب! جسے آپ نے جہنم میں ڈال دیا، اسے آپ نے ذلیل وخوار کر دیا، اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے، اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کی صدا لگا رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے، اے ہمارے رب تو ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے، اور ہم سے ہماری برائیوں کو محو کر دیجئے اور نیکوں کی معیت میں ہمیں وفات دیجئے، اے ہمارے رب! اور ہمیں وہ بات عطا فرمایئے جس کا آپ نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبان پر وعدہ فرمایا ہے، اور ہم کو بروز قیامت رُسوا نہ فرمایئے، بلاشبہ آپ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔

(۱) نیاز فتح پوری (م: ۱۹۶۶ء) ایڈیٹر نگار۔

☆☆☆☆☆

شعبان ۱۴۱۵ھ میں حضرت مولانا مدظلہ مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں تشریف لے گئے، وہاں ختم بخاری شریف کی تقریب تھی، دن میں یہ تقریب ہوئی، رات میں جلسہ عام تھا، اس میں تقریر کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی کثرت عبادت اور مجاہدہ کا ذکر آ گیا، تو وہ مشہور بات بھی ذکر فرمائی، جو ان کے تذکرے کی قدیم وجدید ہر کتاب میں موجود ہے، کہ انھوں نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ہے، پھر اس پر اشکال واستبعاد کا ذکر کرکے اس کا تفصیلی جواب دیا، لیکن دوسرے دن صبح ایک نوجوان .... جو شکل وصورت سے اسلام کا انگریزی ایڈیشن نظر آ رہا تھا............ آیا، اور مولانا سے الجھنے لگا کہ یہ بدعت ہے، اور امام ابوحنیفہ کے بارے میں یہ واقعہ غلط ہے، اس کا مستند حوالہ چاہئے، اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں اس سلسلہ میں خط وکتابت کروں گا۔ مولانا نے مدرسہ آ کر کتابوں کے حوالے لکھ کر بھیج دئے، تو اس کا جواب آیا، یہاں پہلے اس کا خط نقل کرتے ہیں، اس کے بعد حضرت مولانا مدظلہٗ کا مفصل جواب، جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

السلام علیکم! محترم مولانا اعجاز احمد صاحب

۳/ذوقعدہ کا خط مجھے ملا، آپ نے امام ابوحنیفہ کے متعلق حوالے نقل کئے ہیں، مگر نصِ قطعی اور صحیح احادیث سے اعراض کیا، قرآن کی آیت **قم اللیل إلا قلیلاً**، (رات میں نماز پڑھو مگر تھوڑی دیر) **انک تقوم ادنیٰ من ثلثی اللیل ونصفه وثلثه**، (تم دو تہائی رات کے قریب، اور نصف رات، اور ایک تہائی رات نماز پڑھتے ہو) **فاقرؤا ماتیسر من القرآن**، (جتنا قرآن میسر ہو پڑھو) **قلیلاً من اللیل مایهجعون**، (رات میں کم سوتے ہیں) ان تمام آیتوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، اگر امام ابوحنیفہ کا واقعہ صحیح مان لیا جائے۔

ثلاث رهطٍ والی حدیث جو مشکوٰۃ میں ہے، تین صحابیوں کا تذکرہ کہ انھوں نے **تقالوها مایفعل رسول الله ﷺ من العبادة**، (رسول اللہ ﷺ کی عبادت کو کم سمجھا تھا) **فقالوا نفعل کذا وکذا فذکر علیٰ اقوالهم، وقال أنا أتقاکم وأخشاکم عند الله ولٰکن أنام وأرقد وأتزوج النساء** (انھوں نے کہا کہ ہم ایسا ایسا کریں گے، آپ نے ان کی باتوں کا تذکرہ کرکے فرمایا: میں اللہ سے تمہارے مقابلے میں زیادہ ڈرنے والا ہوں، لیکن سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں) **أو کما قال علیه السلام وایضاً قال: ألا من رغب عن سنتی فلیس منی**، (نیز آپ نے فرمایا کہ جو میرے

طریقے سے منحرف ہوگا، اس کا مجھ سے تعلق نہیں) **فلماذا لا تتفکر علیٰ هٰذا الحدیث ، علیک أن تطالع المتن من المرجع**، (آپ اس حدیث پر کیوں غور نہیں کرتے، آپ کو چاہئے کہ اصل کتاب میں متن حدیث کا مطالعہ کریں)

حضرت سلیمان کے بارے میں تفہیم القرآن سورۂ ص میں **ولقد فتنا سلیمان** میں مولانا (مودودی) نے کسی حدیث کا انکار نہیں کیا ہے، میں نے تلخیص تفہیم القرآن کھول کر دیکھا ہے، اس بارے میں آپ کو کیا اور کہاں کس آیت کے ضمن میں اعتراض ہے، تفصیل سے لکھیں۔

آپ جماعت اسلامی کو کیوں خارج از اسلام فرقہ شمار کرتے ہیں؟ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے؟ جماعت اسلامی اپنے نوجوانوں سے تنگ آرہی ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟

جامعۃ الفلاح جماعت اسلامی کا کوئی مرکز نہیں بلکہ جماعت اسلامی کا ایک تعلیمی ادارہ ہے۔

امید کرتا ہوں کہ سنجیدگی کے ساتھ میرے خط کا جواب دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ حق کی ہدایت کرے۔ **ویجعلنا من الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه**۔

والسلام علیکم أخوکم

سلمان فارسی ۱۹۹۵/۵/۳ء

☆☆☆☆☆

برادرِ عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں آپ کا خط پڑھ شش وپنج میں پڑ گیا کہ جواب لکھوں یا خاموشی اختیار کروں؟ بات یہ ہے کہ جب علم بھی نہ ہو، عقل بھی بقدرِ ضرورت سے کم ہو، اور پھر آدمی نے طے کرلیا ہو سمجھنا نہیں ہے تو تخاطب کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، آپ نے قرآن کی چند آیتیں اور ایک دو حدیثیں پڑھیں، اور اسی کی بنیاد پر اساطین امت کی زندگیوں میں عیب جوئی کرنے بیٹھ گئے، ایسی صورت میں بجز خاموشی کے اور کیا چارہ ہے، تاہم چند سطریں رفعِ انتظار کے لئے لکھ دینا چاہتا ہوں۔

آپ نے یہ نص قطعی تو دیکھی کہ اللہ تعالیٰ نے **قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلاً** فرمایا

ہے، لیکن یہ نہیں دیکھا کہ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّ قِیَاماً بھی اسی قرآن کی نص قطعی ہے، آپ نے قَلِیْلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَایَهْجَعُوْنَ کو ملاحظہ فرمایا لیکن تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کو نہیں دیکھا، ثَلٰثَةُ رَهْطٍ اور حضرت سلمان فارسیؓ کا قصہ تو دیکھا مگر أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّیْلِ سَاجِداً وَّقَائِماً پر نظر نہیں پڑی، ان آیات کا ظاہر تو یہی ہے کہ پوری رات عبادت میں گذرے، اگر ان آیات میں آپ تاویل کریں گے تو دوسری نصوصِ قطعیہ میں بھی تاویل و تخصیص کی گنجائش ہو سکتی ہے

عزیزم! سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

سخن فہمی کا سلیقہ درکار ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ناقص علم اور ناتمام عقل والے کسی بات کا کوئی مطلب لے لیتے ہیں، اور پھر اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے مطلب کی رُو سے کتنی دوسری نصوص قطعیہ کا ابطال لازم آتا ہے، کتنے اکابر واساطین کی تجہیل وتحمیق لازم آتی ہے، آج کل کے شعراء وادباء جنھوں نے دین ومذہب کو بھی اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بنایا ہے، ان کے یہاں اس کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، اور جس جماعت (۱) سے آپ کی وابستگی ہے، اس کا تو طرۂ امتیاز یہی ہے کہ اپنی ناقص فہم کے بل بوتے پر امت کے اکابر واساطین پر پانی پھیرتی رہتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کثرت عبادت سے جہاں منع کیا جاتا ہے، وہاں عموماً اس کثرت کی حرمت نہیں ہوتی، بلکہ از روئے شفقت ایسا حکم دیا جاتا ہے، تاکہ مخاطب مشقت میں نہ پڑے، اور یہ بات بالکل بدیہی ہے، جو کام باعث رضامندی ہو، اور اس کے ادا کرنے میں کوئی مشقت جھیل رہا ہو، تو حکم دینے والا خوشی محسوس کرتا ہے، مگر مخاطب پر شفقت کی بنا پر زیادہ جدوجہد سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

کبھی اس لئے کثرت عبادت سے روکتے ہیں کہ کثرت کا جذبہ ہمیشہ باقی

نہیں رہتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمت وحوصلہ میں فتور واقع ہو، اور سرے سے کام ہی سے طبیعت اکتا جائے، اس لئے میانہ روی کا حکم دیا جاتا ہے، اگر ان احادیث وآیات کا کوئی یہ مطلب لیتا ہے کہ سرے سے تکثیر عبادت کسی کے حق میں اور کسی وقت جائز ہی نہیں ہے، تو اس کی خوش فہمی ہے، آخر بعض صحابہ اور تابعین سے رات رات بھر عبادات میں مشغول رہنا صحیح نقول سے ثابت ہے۔ حضرت عثمان ؓ سے ایک رات میں ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھنا منقول ہے، اب یا تو آپ کی عقل کے مطابق ان سب کو خلافِ سنت اور غلط کار کہئے، یا جو کچھ نقل کیا گیا، اس کو جھوٹ اور افتراء قرار دیجئے، یہ دونوں کام آپ تو بے تکلف کرلیں گے، کیونکہ آپ کے نزدیک قابل اعتماد صرف آپ کی عقل ہے، یعنی آپ کی عقل معصوم ہے، اور باقی سب غیر معصوم! مگر ہم لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ اپنی ناتمام عقل کے بل بوتے پر اتنی بڑی جرأت کریں۔

اور ہم ایسی عقل اور ایسے علم کو دور سے سلام کرتے ہیں، جو اکابر امت اور سلف صالح کی پاکیزہ زندگیوں کو خلافِ شریعت وسنت یا کذب وزور سے متہم سمجھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگ مختلف درجات کے ہوتے ہیں، لوگوں کے احوال علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتے ہیں، اور سب کے احکام الگ ہوتے ہیں، ایک غریب ہے، دوسرا مال دار ہے، کیا دونوں کا حکم یکساں ہوگا، ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بطور چندہ سونے کا ایک ڈلا پیش کرتا ہے، آپ ناراض ہوتے ہیں، اسے واپس کردیتے ہیں، ایک صاحب اپنا کل مال صدقہ کرنا چاہتے ہیں، آپ ایک تہائی کو کل قرار دے کر اتنا ہی قبول کرتے ہیں، اور حضرت صدیق اکبر اور حضرت عثمان **رضی اللہ عنہما** اپنا کل مال یا مال کی بہت بڑی مقدار پیش کرتے ہیں، اور آپ نہ صرف یہ کہ قبول فرماتے ہیں بلکہ بشارتیں بھی سناتے ہیں، تو کیا سب کا حکم یکساں ہوگا؟

صحابہ میں ہر رنگ کے لوگ رہے، بلکہ انبیاء کے الوان مختلف رہے، کسی میں نرمی، کسی میں گرمی، کسی میں جلال، کسی میں جمال، کسی پر گریہ، کسی پر خندہ، اور مختلف طبائع اور درجات کے احکام الگ الگ ہوتے ہیں، اگر ایسا تسلیم نہ کیا جائے تو نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں بہت کچھ تضاد لازم آئے گا۔

اگر امام ابوحنیفہؒ پوری رات نماز پڑھتے ہیں، عشاء کا وضو ان کے لئے فجر میں کام آتا ہے، یا اور بہت سے لوگوں کا یہی حال ہے، تو اپنے ناتمام علم اور ادھوری عقل لے کر ان کی کھال نہ نوچیئے، ان کا گوشت نہ کھایئے، ایک عام مسلمان کا گوشت کھانے والے کے حق میں بہت زہریلا ہوتا ہے، اور یہ حضرات تو اکابر امت ہیں، ان کا گوشت کتنا زہریلا ہوگا، کچھ محتاج بیان نہیں، ان کا گوشت، اپنے کھانے والوں کو کھا جائے گا۔

امام غزالی نے ’’احیاء العلوم‘‘ میں ابوطالب مکی کے حوالے سے چالیس تابعین کے متعلق تواتر کے طریق سے نقل کیا ہے کہ وہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، اور یہ وہ لوگ تھے، جو بیوی بچوں، عزیز واقارب، دوست احبا، تلامذہ واساتذہ سب کے حقوق ان لوگوں سے کہیں بہتر طریقے پر ادا کرتے تھے، جو انھیں حقوق کا نام لے کر فرائض وواجبات تک کو پامال کرتے ہیں، حرام چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

آپ بجائے اس کے کہ ان احادیث وآیات کو ان بزرگوں کے خلاف پیش کریں، اپنی خبر لیجئے کہ پوری رات نہ سہی، آدھی رات سہی، تہائی رات سہی، آخر کتنا حق ان آیات کا ادا کرتے ہیں، کتنا عمل ان پر کرتے ہیں، یہ آیات بزرگوں سے لڑنے کے لئے بطور اسلحہ کے نہیں نازل ہوئی ہیں، واللہ اگر عبادت کا ذرا ذوق ہوتا، تو سارا

اعتراض دھرا کا دھرارہ جاتا، مت لڑیئے ان اکابر سے، ان کی بدگوئی سے بچیئے، اس سے آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ لوگ امت کے متفق علیہ بزرگ اور نمائندے ہیں، اور ان کے سلسلے میں جو کچھ منقول ہے، ان کے روایت کرنے والے معتمد اکابر ہی ہیں، ان پر اتہام رکھنے کے بجائے اپنے نفس کو متہم گردانئے، اس میں زیادہ عافیت ہے۔

جو لوگ فرائض و واجبات تک میں کوتاہی کرتے ہیں، جو لوگ حرامِ صریح، جھوٹ، غیبت، بدگوئی سے بچ نہیں پاتے، ان کو کب جائز ہے کہ ان اکابر پر تنقید کے تیر چلائیں، لیکن طعن اکابر کی بدعت جن لوگوں میں سرایت کر جاتی ہے، ان سے اس چٹپٹی غذا کا چھوٹنا مشکل ہوتا ہے، تاہم اتنا لکھ دیا، شاید کچھ تنبہ ہو۔

میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کے لئے تفہیم القرآن کا حوالہ دیا تھا، اور آپ اسے تلخیص میں تلاش کر رہے ہیں، جب میرے ساتھ آپ کا یہ سلوک ہے جبکہ میں جواب دینے کے لئے موجود ہوں، تو بیچارے ابوحنیفہ یا ان کے متعلق مذکورہ روایات نقل کرنے والے تو اب عالم میں موجود نہیں ہیں، ان کے ساتھ آپ کا سلوک کیا ہوگا؟

دوسرا سلوک اس سے بھی ناروا ہے، میں نے جماعت اسلامی کو خارج از اسلام فرقہ کب قرار دیا ہے؟ کہ اس کا اتہام میرے اوپر آپ نے رکھا ہے، میں اسے اہل سنت سے خارج سمجھتا ہوں، اسلام سے نہیں۔

بھائی! اپنی خبر لو، جب میرے منہ پر یہ دیدہ دلیری ہے کہ جو بات میں نے نہیں لکھی ہے، اسے میرے سر تھوپ رہے ہو، تو عقل کے ساتھ دیانت کا بھی جنازہ نکلتا نظر آ رہا ہے۔

جماعت اسلامی اپنے نوجوانوں سے تنگ نہ آتی تو ایک پرانی تنظیم کو رد

کر کے اسے دوسری تنظیم بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، ان دونوں تنظیموں کا نام انگریزی میں ہے، اور مجھے اس سے مناسبت نہیں، اس لئے مجھے یاد نہیں، اس جماعت پر انگریزیت کا بین غلبہ ہے۔

جامعۃ الفلاح تعلیمی ادارہ ہے، جب تعلیمی ادارہ میں بے راہ روی کا یہ عالم ہے، تو دوسرے اداروں کا جو حشر ہوگا، وہ بالکل سامنے کی بات ہے۔

میری یہ معروضات امید تو نہیں کہ آپ کے لئے باعث شفا بن سکیں گی، لیکن اس سلسلے میں اب آپ مجھے کچھ نہ لکھیں، میرے پاس ضائع کرنے کے لئے اتنا وقت نہیں ہے۔

والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۰/ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ

(۱) جماعت اسلامی اور غیر مقلدیت، دونوں سے ان کا تعلق ہے، کریلا اور نیم چڑھا کا صحیح مصداق۔

☆☆☆☆☆

یہ مکتوب ایک اجلاس کی تقریب سے لکھا گیا تھا، اس اجلاس میں مکتوب نگار کو شرکت کی دعوت ملی تھی، شرکت سے معذرت میں یہ خط لکھا گیا تھا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

ذوالمجد والفضل! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی!

حضراتِ علماء کرام کے فتاویٰ کا خلاصہ موصول ہوا، سب جوابات کا حاصل ایک ہے، درحقیقت مسئلہ ہی اتنا بے غبار، واضح اور صاف ہے کہ اس میں کسی دوسری رائے کی گنجائش نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ جن لوگوں نے تمام مخلوق کی زندگی تنگ کر رکھی ہے، وہ عورت کی طرفداری کا جھنڈا لے کر اٹھے ہیں، اور طرفداری بھی ایسی کہ

دوسروں کے تمام حقوق پامال! جس ملک کی عدالت عالیہ میں ایسے عقل وخرد کے مالک منصف حضرات براجمان ہوں گے، اس ملک کا حال معلوم! اپنی آواز بلند کرنی عالم اسباب میں بہرحال ضروری ہے، چیخ وپکار ہوتی رہنی چاہئے، مگر یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو لوگ ہوش وخرد سے اس درجہ خالی ہوں، یا ہوش وخرد تو رکھتے ہیں مگر بدنیتی کے اس اعلیٰ مقام پر تشریف فرما ہوں، ان سے عرض ومعروض کا حاصل کیا؟ ؎

ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

اصل یہ ہے کہ سیکولر حکومت جس چیز کا حسین عنوان ہے، اس کی حقیقت محض کفر ہے، اور کفر کبھی اسلام کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کفر عاقبت بیں نہیں ہوتا، اس کی نگاہ محض ''عاجلہ'' پر ہوتی ہے، اس لئے اس سے توقع رکھنا کہ وہ اسلام کو ٹھنڈے پیٹ برداشت کرلے گا، انتہائی خوش فہمی ہے، ہاں ہماری چیخ وپکار، نعرۂ وہنگامہ کا اتنا اثر ہوگا کہ وہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر کچھ دنوں تک اپنی زبان روکے رکھے گا، پھر کسی اور عنوان سے اپنے خبث قلبی کا اظہار کرے گا، اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ پورے اسلام ہی کی چولیں مسلمانوں کے قلوب سے ہلا کر رکھ دے گا، اس کے لئے کفر تعمیر کی راہ سے بھی آرہا ہے اور تخریب کی راہ سے بھی۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک یہی تجربہ ہے، تعمیر ٹھنڈا زہر ہے، جس کی طرف عموماً اذہان نہیں جاتے، انھیں عطیات ونوازش، حقوق ومراعات کے نام پر ھنیئاً مریئاً کیا جارہا ہے، البتہ تخریب پر چونکنے والے سب ہوتے ہیں، لیکن ایک راستے سے زہر اندر اتارا جارہا ہو، اور دوسری راہ پر چوکی پہرہ لگایا جائے، اس سے کتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ میں ان اقدامات کا مخالف بالکل نہیں ہوں، جو جلسوں، تجویزوں، مطالبات کی صورت میں اجتماعی طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں، دنیا جب عالم اسباب ہے تو اسباب سے قطع نظر

کرنا بے ادبی ہے، ہاں اس سے آگے والے سبب پر میں اکابر قوم کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اور یہ سبب وہی ہے جو تجاویز کے آخری نمبر پر درج ہے، اکابر ملت اسٹیجوں سے زیادہ اگر مسلمانوں کے قلوب میں اتر کر خالص دینی و اُخروی نقطۂ نظر سے مسلم معاشرہ کے مسائل کا حل مسلمانوں کو سمجھائیں اور معاشرتی زندگی کو دینی روح سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو یہ بات اختیاری بھی ہے اور مسئلہ کا بہترین حل بھی ہے، آج دیکھا جارہا ہے کہ عبادات میں ایک آدمی خالص مومن ہوتا ہے، مگر جب وہی معاشرت کے میدان میں اترتا ہے تو کافر ومسلم کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، شادی بیاہ کے رسوم کو تو اب بہت سے لوگ برا سمجھنے لگے ہیں، لیکن میاں بیوی کے حقوق، ساس خسر اور بہو وغیرہ کے معاملات پر شریعت کے مطالبات کی تعمیل صفر کی حد پر ہیں، عورتوں کی میراث کا ہی مسئلہ کتنا سنگین ہے، کوئی ہوگا جو برضاء ورغبت عورتوں کی میراث دیتا ہوگا، لڑائی جھگڑے کے بعد بھی کتنے لوگ دیتے ہیں؟ اگر لوگ سب کے حقوق قاعدہ سے ادا کرتے رہیں تو بتایئے کہ ان کفار کی عدالتوں میں مقدمہ کیوں جائے۔ اگر مسلمان اکٹھی تین طلاق دینے کے بجائے ایک ہی طلاق کا دستور بنالیں تو طلاق ونکاح کے تین چوتھائی مسائل خود بخود حل ہوجائیں، لیکن افسوس کہ عام طور سے یہ باتیں دائرۂ معلومات سے بھی خارج ہیں۔ ہم مولوی لوگ بھی بیٹھیں گے تو حکومت پر تبصروں، اخباری حکایات، یا پھر اپنے اختلافات کی داستانوں سے بات آگے نہیں بڑھتی۔ ایک عام آدمی ہماری مجلس میں بیٹھے تو اپنی دینی معلومات اور ایمانی روح میں کسی قسم کا اضافہ نہ پائے گا۔ یہ بات کتنی دردناک ہے، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو معاشرتی مسائل سکھائے جائیں، بتائے جائیں، صرف پمفلٹ چھاپ کر نہیں، صرف مسلم پرسنل لاء کی دہائی دے کر نہیں، صرف حکومت کو گالیوں سے نواز کر

نہیں، یہ سب چیزیں سیاسی شعبدوں کا رنگ اختیار کر چکی ہیں۔ خالص اُخروی نقطۂ نظر سے جنت کی بشارت اور جہنم کی وعید سنا سنا کر! اس سے مسلمان کا قلب متاثر ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنے قلب میں ایمانی تاثر اور عمل میں اسلامی روح بیدار کریں۔ اعلیٰ پیمانے پر یہ کام کیا جائے، اور ثانوی درجے میں دوسرے امور انجام دئے جائیں۔ ہم نے مسلم پرسنل لاء کا ایک بڑا حصہ خود اپنی زندگیوں سے بے دخل کر دیا ہے، پھر اگر حق تعالیٰ نے تنبیہاً چند اور کے لئے دوسروں کو مسلط کر دیا ہے، تو ہمیں کدھر جانا چاہئے، بالکل بدیہی بات ہے۔

یہ بندہ تو سیاسی رنگ کے ان جلسوں سے باوجود اقرار افادیت کے یکسو ہے، میں اپنے اندر اس کا حوصلہ نہیں پاتا۔ حوصلہ مندوں کو دل سے اچھا جانتا ہوں اور کامیابی کے لئے ہمیشہ دعائیں کرتا ہوں، اس لئے شرکت تو میری اجلاس میں نہ ہوسکے گی، میں نے اپنے لئے دوسری راہ اختیار کی ہے، اور اپنی بساط بھر کوشش میں مصروف ہوں، کامیابی و ناکامی کو خدا حوالے کر کے اس کے انتظار سے بھی فارغ ہوں، کام کرنا، کئے جانا، اور کرتے کرتے حضورِ حق میں پیش ہو جانا، اسی کی نیت ہے۔ اور جس چیز کا حوصلہ نہیں پاتا، اس میں کود کر ادھر سے بھی جاؤں، یہ گوارا نہیں۔ ہاں یہ ضرور خواہش ہے کہ میری یہ تحریر اگر کسی درجہ میں بھی درخورِ اعتناء محسوس ہو تو شرکاءِ اجلاس کے سامنے پڑھ دی جائے، ورنہ کالائے بد بریش خاوند کے معاملہ پر بھی راضی ہوں۔

فقط والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یوم العاشوراء ۱۴۰۵ھ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا وسید المرسلین وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین أمابعد!

برادرعزیز! **عافاکم اللہ من البلیات والاسقام**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں آنعزیز کا مفصل مکتوب ملا، بہت خوشی ہوئی۔ دعاگوئی کی توفیق ہوئی، فون کی بلانے خطوط کا مبارک سلسلہ منقطع کردیا ہے، ورنہ مراسلت ومکاتبت جانبین کے لئے اس سے کہیں زیادہ نافع ہے، جوفون سے متصور ہے۔ تمہارے خط نے پچھلے دور کی یاد تازہ کردی، اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے، صحت وعافیت سے نوازے، تمہاری علالت سے دکھ ہوا، حق تعالیٰ صحت کاملہ نصیب فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

جس بیماری کا تم نے تذکرہ کیا ہے، اس کے لئے **سورۃ الحجر** (پارہ:۱۴) کی آخری آیات **وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَایَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَأْتِیَکَ الْیَقِیْنُ** ۔ ۴۱/مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کرواور اسے دن بھر میں چار بار پیو، کم از کم آدھا گلاس، ایک دن دم کرو تو اسے سات دن تک پیو، اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہوئی تو یہ تکلیف ختم ہوجائے گی۔

بزرگوں کے تذکرے میں جاذبیت ہوتی ہے، پھر جس کو ان حضرات سے مناسبت ہو، محبت ہو، پھر بیان وتحریر کا کچھ سلیقہ بھی ہو، تو تاثیر بڑھ جاتی ہے، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بیان وتحریر کا کچھ سلیقہ ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ مجھے اوائل عمر ہی سے بزرگوں سے، بزرگوں کے حالات سے بہت محبت وگرویدگی ہے، اس لئے بزرگوں کے حالات پڑھنے میں مجھے بہت دلچسپی ہوتی ہے، پھر جب قلم اٹھایا تو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمہ کے مبارک اور دلآویز حالات سے قلم کو چمک دمک ملی، اس کے بعد متعدد بزرگوں سے تحریر نے کسب فیض کیا۔ یہ حضرات محبوبانِ

الٰہی ہیں، ان کے تذکروں کی برکت سے میرا قلم بھی محبوب ہو گیا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، میں کیا اور میری حقیقت کیا؟ مگر جس ذات سے محبت کی تمنا بچپن سے دل میں پرورش پا رہی ہے، اس دولت سے تو شاید ابھی تک محروم ہوں، مگر اس کی طرف طبیعت کی بے تحاشا لپک محسوس کرتا ہوں، یہ لپک اور تمنا ہی ہے، جو محبوبانِ الٰہی کی خدمت میں مجھے لے جاتی ہے، اور جب ان کی خدمت کے نقوش کی حکایت کرتا ہوں تو اس پر ان کی روحانیت، نسبت مع اللہ اور نورانیتِ قلب دمک اٹھتی ہے، پھر جہاں جہاں اس نسبت کے اثرات ہوتے ہیں، محبت اور پسندیدگی پھیلتی جاتی ہے۔

تم کو کتاب جو پسند آئی، اس پسندیدگی میں جہاں بزرگوں کی روحانیت اور محبوبیت کا دخل ہے، وہیں خود تمہارے قلب کی خوبی کا بھی بڑا اثر ہے، اللہ تعالیٰ اس خوبی کو ترقی دیتے رہیں اور اسے سلیم سے سلیم تر بنائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مکان کی تعمیر میں سہولتیں اور ظاہری و باطنی برکتیں عطا فرمائیں۔ آمین

میرے لئے اور میری اولاد کے لئے دعا کرو، میری زندگی تو بغیر مکان کے اختتام کو پہونچ رہی ہے، سوچتا ہوں کہ کیا بچوں کی بھی ایسی ہی گزرے گی، اپنے لئے تو کبھی نہ خواہش ہوئی، نہ ارادہ ہوا، لیکن دل کی کمزوری بڑھاپے میں یہ دیکھو کہ جی چاہتا ہے کہ سب بیٹوں کا جدا جدا مکان ہو جائے، اس کے لئے دعا سے مدد کرو۔

میں تمہارے لئے، تمہاری اولاد کے لئے ہر خیر کی دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۴؍صفر ۱۴۳۱ھ

☆☆☆☆☆

تصانیف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

(۱) **تسہیل الجلالین** “شرح اردو جلالین شریف” (جلد اول)

(سورہ بقرہ تا سورہ نساء، سوا پانچ پارے)، صفحات:648 قیمت:400

(۲) **حدیث دوستاں**

دینی واصلاحی اور علمی وادبی مکاتیب کا مجموعہ، صفحات:730 قیمت:350

(۳) **حدیث دردِ دل**

مجلّہ المآثر، الاسلام، اور ضیاء الاسلام کے اداریئے صفحات:592 قیمت:300

(۴) **کھوئے ہوؤں کی جستجو**

مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ، صفحات:616 قیمت:200

(۵) **حیاتِ مصلح الامت**

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح، صفحات:528 قیمت:150

(۶) **مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ، صفحات:312 قیمت:150

(۷) **بطوافِ کعبہ رفتم** ـــ (سفرنامۂ حج) (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

حرمین شریفین (مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ) کے سفر کی روداد، صفحات:464 قیمت:300

(۸) **تہجد گزار بندے** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ، صفحات:472 قیمت300

(۹) **ذکرِ جامی**

ترجمان مصلح الامت ؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی، صفحات:216 قیمت:90

(۱۰) **حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف**

حضرت چاندشاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء کے حالات، صفحات:180 قیمت:70

(۱۱) **تذکرہ شیخ ہالیجوی ؒ**: سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم اورمجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ صفحات:224، قیمت:56

(۱۲) **مودودی صاحب اپنے افکارونظریات کے آئینہ میں**

مولانا بنوری ؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ۔ صفحات:184، قیمت:95

(۱۳) **حکایت ہستی** (جدیداضافہ شدہ ایڈیشن)

خودنوشت سوانح، ابتداءحیات سے اختتام طالب علمی تک۔ صفحات:400، قیمت:250

(۱۴) **کثرتِ عبادت** عزیمت یابدعت؟ قیمت ۲۸/روپے

(۱۵) **قتل ناحق** قرآن وحدیث کی روشنی میں قیمت ۱۶/روپے

(۱۶) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپے

(۱۷) شب برأت کی شرعی حیثیت قیمت ۴۰/روپے

(۱۸) اخلاق العلماء علماء کیلئے خاص چیز قیمت ۲۰/روپے

(۱۹) دینداری کے دودشمن حرصِ مال وحب جاہ قیمت ۴۰/روپے

(۲۰) فتنوں کی طغیانی ٹی۔وی پرایک فکرانگیزتحریر! قیمت ۱۵/روپے

(۲۱) اہل حق اوراہل باطل کی شناخت قیمت ۶۰/روپے

(۲۲) مالی معاملات کی کمزوریاں اورانکی اصلاح قیمت ۴۰/روپے

(۲۳) منصب تدریس اور حضرات مدرسین	قیمت ۴۵؍روپئے
(۲۴) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح	قیمت ۳۵؍روپئے
(۲۵) برکات زمزم ماءِ زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان	قیمت ۲۵؍روپئے
(۲۶) تصوف ایک تعارف!	قیمت ۸۰؍روپئے
(۲۷) خواب کی شرعی حیثیت	قیمت ۴۰؍روپئے
(۲۸) تکبر اور اس کا انجام	قیمت ۳۰؍روپئے
(۲۹) مسئلۂ ایصالِ ثواب	قیمت ۶۰؍روپئے
(۳۰) مروجہ جلسے بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح	قیمت ۳۰؍روپئے
(۳۱) رمضان المبارک: نیکیوں کا موسم بہار	قیمت ۴۰؍روپئے
(۳۲) علوم ونکات: (مجموعۂ مضامین) جلد اوّل، دوم	قیمت ۱۰۰۰؍روپئے
(۳۳) نمونے کے انسان	قیمت ۲۵۰؍روپئے

اسٹاکسٹ

مکتبہ ضیاء الکتب اتراری، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
PIN:276403 MOB:9235327576

دیوبند میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند (01336223294)

دہلی میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
فرید بک ڈپو، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ (01123289786)